مستشرقین کے خیالات کا تجزیہ

پروفیسر محمد اکرم طاہر

www.KitaboSunnat.com

محمد رسول اللہ ﷺ

مستشرقین کے خیالات کا تجزیاتی مطالعہ

بارگاہِ رسالت ﷺ میں

مَا اِنْ مَدَحْتُ مُحَمَّدًا بِمَقَالَتِی
لٰکِنْ مَدَحْتُ مَقَالَتِی بِمُحَمَّدٍ

"میں نے اپنے کلام کے ذریعے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مدح و ستائش نہیں کی بلکہ خود اپنے کلام کو حضور ﷺ کے ذکر سے دلکش بنایا ہے۔" (حضرت حسان بن ثابتؓ)

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

مستشرقین کے خیالات کا تجزیاتی مطالعہ

......

پروفیسر محمد اکرم طاہر

ادارہ معارف اسلامی منصورہ، لاہور

نام کتاب	:	محمد رسول اللہ ﷺ... مستشرقین کے خیالات کا تجزیاتی مطالعہ
مصنف	:	پروفیسر محمد اکرم طاہر
مطبع	:	ارقم آفاق پرنٹرز، لاہور
اشاعت اول	:	مارچ 2014ء (1100)
صفحات	:	464
قیمت	:	-/365 روپے

ISBN:978-969-9037-03-0

باہتمام: ادارہ معارف اسلامی
منصورہ، ملتان روڈ، لاہور۔ پوسٹ کوڈ: 54790، فون: 042-35414677
فیکس: 042-35432476، ای میل: imislami1979@gmail.com
ویب سائٹ: www.imislami.org

تقسیم کنندہ: مکتبہ معارفِ اسلامی، فون: 35432419,4-35419520-042

فہرست

حصہ سوم

پیش لفظ

اللہ تعالیٰ کے آخری نبی حضرت محمد ﷺ کی حیات مبارکہ پر بے شمار کتابیں تحریر کی گئی ہیں۔ تاریخ انسانی کی کوئی شخصیت ایسی نہیں جس کی زندگی پر اتنا وسیع اور تمام جزئیات کے ساتھ ہمہ جہت علمی کام ہوا ہو، جتنا آقا و مولیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوا ہے۔ یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔ اب تک دنیا کی مختلف زبانوں میں آپ کی سیرت پر مسلم و غیر مسلم اہل علم نے لاکھوں کی تعداد میں تصنیف و تالیف کا دقیع کام کیا ہے۔

انیسویں اور بیسویں صدی میں مغربی اہلِ علم نے حضور اکرم ﷺ پر متعدد کتابیں تحریر کیں۔ سیکڑوں مغربی اہلِ دانش نے حضور اکرم ﷺ کی تحسین و تعریف میں زورِ قلم صرف کیا ہے، لیکن مغربی مصنفین ایک بڑی تعداد نے آپؐ پر گوناگوں اعتراضات بھی کیے ہیں۔ ہر چند کہ ان کے اعتراضات نہایت بودے، غیر معقول اور بے وزن ہیں، تاہم مسلمان اہلِ علم نے ان اعتراضات کا مدلّل و مسکت جواب بھی تحریر کیا گیا ہے۔ اردو زبان میں اس موضوع پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں۔ سر سید احمد خاں بہت سے خیالات و افکار میں مغربی اندازِ فکر سے مرعوب و متاثر نظر آتے ہیں، حتیٰ کہ ان کا فلسفۂ ترقی و افزائش ملت بھی انگریز کی چاکری کا درس دیتا اور انھی کی تہذیب کا پرچار کرتا ہے۔ موصوف کی تفسیر قرآن بھی فکر غلامی و مرعوبیت کی مثالوں سے لبریز ہے۔ اس کے باوجود سیرت رسولؐ کے میدان میں ان کے قلم سے بھی کچھ مثبت تحریریں وقوع پذیر ہوئیں، جو خود سیرت کا اعجاز بھی ہے اور اس بات کا بیّن ثبوت کہ ایک کلمہ گو کے دل میں مقامِ مصطفیٰؐ غیر متزلزل ہوتا ہے۔ موصوف نے مستشرقین کی سیرت النبیؐ پر لکھی گئی کتب کا محاکمہ کیا اور سیرت النبیؐ سے متعلق بعض امور پر اپنی کتاب ''خطباتِ احمدیہ'' میں تحقیق و تدقیق پیش کی۔

جہاں تک مولانا شبلی نعمانی کا تعلق ہے انھوں نے اپنی کتاب سیرت النبیؐ میں مستشرقین کے مطالعہ سیرت کے نتائج پر اپنی ناقدانہ رائے قلم بند کی اور ان کی متعدد کوتاہیوں کی پوری تحقیق اور استدلال کے ساتھ تردید کی۔ سید مودودی نے بھی اپنی تحریروں بالخصوص اپنی تفسیر تفہیم القرآن میں جگہ جگہ مغربی مصنفین کے الزامات کے نہایت دل نشین اور مدلل جوابات دیے ہیں۔ گذشتہ دو صدیوں میں مغربی اہلِ قلم نے سیرت النبیؐ پر خاص توجہ دی۔ ان کی تحقیقات کا دائرہ حضور اکرم ﷺ کی شخصیت، آپؐ کی تعلیمات، آپؐ کی پیغمبرانہ حیثیت، آپؐ کے گھریلو حالات، آپؐ کی جنگی پالیسیوں، آپؐ کے دعوتی اقدامات اور آپ کے معاہدات و مراسلات تک وسیع رہا۔ دورِ جدید میں بعض مغربی مفکرین نے حضور پاک ﷺ کی سیرت کے اس پہلو پر قلم اٹھایا جو بلاشبہ اپنی اہمیت کے لحاظ سے بہت نمایاں ہے، یعنی آپ کی شخصیت، دعوت اور برپا کردہ نظام وانقلاب سے انسانیت کو بحیثیت مجموعی کیا ملا۔ اس کی بہترین مثال امریکی عیسائی مصنف مائیکل ایچ ہارٹ کی کتاب دی ہنڈرڈ (The Hundred) ہے۔ جس میں تاریخ انسانی کی ایک سو اعلیٰ ترین شخصیات کا تذکرہ ہے۔ محمد ﷺ ان میں پہلے نمبر پر ہیں۔ یہ بھی سیرت کا اعجاز ہے۔

سیرت النبیؐ پر لکھنے والے ان مغربی مصنفین کے یہاں ابتدا میں بہت سی باتیں غلط فہمیوں کی بنا پر زیرِ بحث آئی ہیں۔ قرونِ مظلمہ میں یورپ کی علمی، تہذیبی اور سیاسی حالت افسوس ناک حد تک دگرگوں تھی۔ مسلمانوں کے بارے میں ان کے قائم کردہ خیالات سنی سنائی اور غلط سلط باتوں پر مشتمل تھے۔ نیز ان میں ان کی خود ساختہ اور متعصبانہ فکر بھی شامل تھی۔ ان غلط فہمیوں اور معاندانہ طرز فکر نے مسلمانوں کے بارے میں یورپ کو صدیوں تک ایک ایسے خلجان میں مبتلا کیے رکھا جس کے اثرات آج بھی مغربی حکمرانوں کے رویوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان غلط فہمیوں کی بنا پر صدیوں تک مسلمانوں اور یورپین حکمرانوں کے درمیان صلیبی جنگیں ہوتی رہیں۔ چنانچہ ستمبر ۲۰۰۱ء میں امریکی صدر بش نے کانگریس کے اجلاس میں اپنی تقریر میں کہا کہ فوج مسلمانوں کے خلاف طویل صلیبی جنگ کے لیے تیار ہو جائے۔ یہودیوں اور عیسائیوں میں مسلمانوں کے خلاف نفرت

کے جذبات حضور اکرم ﷺ کے عہد ہی سے موجود رہے ہیں۔ اہل مغرب کو اپنی کم علمی، جہالت اور مذہبی تعصب کے باعث حضور اکرم ﷺ کی ذات گرامی اور ان کی دعوت وفکر میں بہت سی کوتاہیاں نظر آتی ہیں۔

زیر نظر کتاب میں ان شکوک وشبہات کا مدلل جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ فاضل مصنف نے اہلِ مغرب میں سے چند ممتاز اہل قلم کے سیرت النبیؐ کے متعلق افکار ونظریات پر بحث کر کے ان اعتراضات کے سطحی پن کا پول کھولا ہے۔ کارلائل، منٹگمری واٹ، مائیکل ایچ ہارٹ اور برنارڈ لیوس کے ان افکار کا جواب لکھا گیا ہے، جن کے اثرات پورے یورپ کے اہل علم میں سرایت کیے ہوئے ہیں۔ مصنف محترم نے بطور ایک مسلمان اپنے جذبات عقیدت کو بھی کتاب میں سمودیا ہے مگر یہ عقیدت بلا دلیل نہیں، ہر بات کا گہری سوچ سے مطالعہ کیا اور پھر حقائق کی روشنی میں غلط کو غلط قرار ہی نہیں دیا بلکہ اسے ثابت بھی کیا۔ ایک محقق کا یہی فرضِ منصبی ہوتا ہے کہ ہر بات کی دلیل پیش کرے۔

ادارہ معارف اسلامی کی شروع سے کوشش رہی ہے اور اب بھی الحمدللہ اس مقصد کے لیے مستعد ہے کہ اسلامی تعلیمات کے فروغ کے لیے عصر حاضر کے غیر اسلامی افکار ونظریات کا تنقیدی جائزہ لے اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں صحیح افکار پیش کرے۔ اس سے قبل بھی ہم سیرت النبیؐ پر کتابیں شائع کر چکے ہیں۔ زیر نظر کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ باطل افکار ونظریات ہر دور میں موجود رہے ہیں اور اسلام کبھی ان کے جواب سے عاجز نہیں رہا۔ مسلمان آج بھی معاصر لادینی افکار کا مقابلہ کر رہے ہیں۔

برادر گرامی قدر پروفیسر محمد اکرم طاہر دورِ طالب علمی میں راقم کے ساتھ اسلامی جمعیت طلبہ کے رکن تھے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد تدریس کے شعبے سے منسلک ہو گئے۔ ذوقِ مطالعہ شروع ہی سے قابل رشک تھا۔ ان کے بارے میں کئی بار خیال گزرتا کہ کاش وہ تدریس کے ساتھ ساتھ قلم وقرطاس سے بھی رشتہ جوڑ لیں۔ اللہ نے یہ آرزو پوری کر دی اور طاہر صاحب نے حج بیت اللہ کی سعادت

حاصل کرنے کے بعد اپنی ایمان افروز روداد حج ''پھر نظر میں پھول مہکے'' لکھ دی۔ ان کی یہ کتاب ادارہ معارف اسلامی نے مارچ ۲۰۰۹ء میں چھاپی۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ستمبر ۲۰۱۲ء میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہوا۔ اسی زمانے میں اکرم طاہر صاحب نے اپنے اس عزم کا اظہار کیا کہ وہ سیرتِ رسول پر مغربی مصنفین کی تحریروں کا جواب لکھنا چاہتے ہیں۔ ہمارے لیے ان کا یہ عزم باعث مسرت تھا۔ الحمدللہ ان کی خواہش اور ہماری ترغیب کے عمل میں ڈھلنے کی صورت اللہ نے پیدا کردی۔ کتاب کا مسودہ ہمیں موصول ہوا تو اس پر کچھ مزید کام کرنے کا فیصلہ ہوا۔ بنیادی طور پر یہ کتاب مصنف ہی کے مسودے پر مشتمل ہے۔ البتہ ہمارے ادارے کے رفقائے علمی بالخصوص محترم پروفیسر ظفر حجازی صاحب نے کئی ماہ کی محنت شاقہ اور مشاورت باہمی سے کتاب کو طباعت کے لیے تیار کیا۔ اب یہ کتاب نذرِ قارئین کی جارہی ہے۔

ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مصنف کی اس محنت کو قبول کرکے انھیں اس کا اجر جزیل عطا فرمائے۔ ہم اپنے کرم فرماؤں سے درخواست گزار ہیں کہ کتاب کا متن پڑھتے ہوئے جہاں بھی کوئی تسامح محسوس کریں، ہمیں اس سے ضرور مطلع فرمائیں۔ ہم ان آرا پر ہمیشہ کی طرح ممنون ہوں گے۔

۳ دسمبر ۲۰۱۳ء

حافظ محمد ادریس

ڈائریکٹر ادارہ معارف اسلامی

منصورہ، لاہور

مقدمہ

یہ ۱۹۷۱ء کی بات ہے۔ میں صحت کے کچھ مسائل سے دو چار تھا۔ میں نے سوچا کہ رسول اللہ ﷺ نے پوری انسانی زندگی کے بارے میں ہمیں ایک بہترین اور قابل عمل ضابطۂ حیات دیا ہے۔ آپ ﷺ نے جہاں روحانی اصلاح کے لیے واضح ہدایات دی ہیں وہاں اس مادی دنیا کی فلاح و بہبود کے لیے بھی مکمل رہنمائی دی ہے۔ حفظانِ صحت بھی انسانی زندگی کا بنیادی شعبہ ہے۔ کیوں نہ اس بارے میں بھی آپ ﷺ ہی کی ہدایات کو مشعل راہ بنایا جائے۔ تھوڑی سی تحقیق کے بعد ایک مختصر مضمون تیار ہوا جو ماہنامہ ''فاران'' (اپریل ۱۹۷۲ء) میں شائع ہوا۔ اساتذہ کرام اور احباب نے خوب حوصلہ افزائی فرمائی اور سیرت النبی ﷺ کے دوسرے پہلوؤں پر بھی انھی خطوط پر کام جاری رکھنے کی ترغیب دی۔ یہ خود میرے اپنے دل کی بھی آواز تھی۔ چنانچہ سیاسی اور قانونی نقطۂ نظر سے سیرت پاک ﷺ پر دو اور مضامین بھی ملکی رسائل و جرائد میں شائع ہوئے۔ اس کے بعد ایک لمبے عرصے کے لیے یہ سلسلہ منقطع رہا۔ اس کی دو بڑی وجوہات تھیں۔

ایک تو ہر لحظہ بڑھتی ہوئی تدریسی اور پیشہ ورانہ مصروفیات میں اس نازک ترین موضوع پر کام کرنے کے لیے مطلوبہ یکسوئی اور انہماک کا حصول ممکن نہ تھا۔ متعلقہ موضوعات پر مزید مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ سیرت پاک ﷺ جیسے مقدس اور ذمہ دارانہ موضوع پر قلم اٹھانے کے لیے وسعت مطالعہ اور پختگی عمر بھی ضروری شرائط ہیں۔ ہمارے بہت سے مشاہیر اہلِ قلم نے سیرت النبی ﷺ پر کام کرنے کا بیڑا اس وقت اٹھایا جب ان کی شامِ زندگی قریب ہو چکی تھی اور مطالعہ، مشاہدہ اور تحقیق کے متنوع زاویوں پر بھی انھیں اچھی خاصی دسترس حاصل ہو چکی تھی۔ ان حوالوں سے راقم الحروف کو اپنے بارے میں اب بھی اطمینان نہیں۔ پھر بھی محض اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد اس کام کا آغاز کیا اور قبل ازیں شائع شدہ مضامین کو بھی نئے تقاضوں کی روشنی میں Revisit

کیا۔ اِس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ اس عرصے میں اِس اہم موضوع پر کام بالکل ٹھپ ہو گیا تھا۔ اصل یہ ہے کہ مطالعہ برابر جاری رہا اور سیرت وعلمِ جدید کے حوالے سے جہاں کہیں نیا غنچۂ معنی کھلا نظرِ انتخاب نے اپنے دامن میں سجا لیا۔

اس موقع پر اپنے ایک اور تاثر کا اظہار بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ مولانا محمد علی جوہر کے بقول قرآن کی مثال ایک ہیرے کی سی ہے۔ ہیرے کی جتنی زیادہ تراش خراش کی جائے، اس کی چمک دمک میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ صاحبِ قرآن ﷺ کی سیرت پاک پر بھی جس قدر تدبر و تفکر کرتے جائیں، نئے نئے حقائق ومعارف کا دروازہ کھلتا چلا جائے گا۔ اب یہ راست باز اہلِ علم کا کام ہے کہ اس سعادت کے حصول کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔ یہ کوئی ایسا کام نہیں ہے جو کہ ہم خلا میں کرنے جا رہے ہیں۔ برصغیر میں اس روایت کا آغاز سر سید احمد خان نے ولیم میور کی کتاب Life of Muhammad کا محققانہ جواب ''خطبات احمدیہ'' لکھ کر کیا تھا۔ سید امیر علی کی The Spirit of Islam کی تاریخی اہمیت بھی ناقابلِ انکار ہے۔ اسی طرح شبلی نعمانی مرحوم، مولانا مودودی مرحوم، ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم، پروفیسر ظفر علی قریشی مرحوم، پیر کرم شاہ مرحوم، ڈاکٹر نثار احمد اور دار المصنفین اعظم گڑھ نے بھی قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ نئے حالات کی روشنی میں نئے علمِ کلام کے ساتھ جدید زبانوں میں اس روایت کو جاری رکھا جائے۔

یہ کتاب اپنے موضوع پر پہلی کوشش نہیں ہے۔ ڈاکٹر خالد علوی مرحوم کی کتاب ''انسانِ کامل ﷺ'' اپنے موضوع پر بہت کامیاب کوشش ہے۔ سید محمد اسمٰعیل کی ''رسولِ عربی ﷺ اور عصرِ جدید'' بھی اس موضوع پر قابلِ مطالعہ کتاب ہے۔ کتاب ہذا بھی اس ہی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ بعض موضوعات میں یکسانیت کے باوجود نقطۂ نظر (Approach) اور طریق کار (Technique) کا فرق بھی ہے جو مذکورہ کتب اور اس موضوع پر آئندہ ہونے والی تحقیقی کوششوں کی انفرادیت کا ضامن ہے اور ان کی وسیع اشاعت اور بالاستیعاب مطالعے کا جواز بھی۔

ایک خاص فرق یہ ہے کہ مستشرقین کے پھیلائے ہوئے بہت سے غلط تصورات ومفروضات پر بھی گرفت کی گئی ہے۔کتاب کا تیسرا حصہ مکمل طور پر مستشرقین کے لیے مختص ہے۔دوسرے حصے میں حسب ضرورت بعض مستشرقین کا سرسری حوالہ دیا گیا ہے۔تاکہ سیرتِ پاک جیسے مستقل بالذات موضوع کا انداز مدافعانہ نہ ہونے پائے۔تفصیلی مطالعے کے لیے مستشرقین کا انتخاب سوچ سمجھ کر کیا گیا ہے۔مغرب میں کارلائل کے بعد حضور ﷺ کی سیرت و کردار کو سنجیدگی کے ساتھ سمجھنے کے لیے کچھ کوششیں کی گئیں۔اب یہ بات طے ہوگئی تھی کہ گھسے پٹے اعتراضات کو بار بار دہرانے سے کام نہ چلے گا۔چنانچہ غیر جانبداری کا بھرم قائم رکھنے کے لیے سیرتِ پاک ﷺ کے بعض پہلوؤں کو بنظر استحسان بھی دیکھا گیا۔منٹگمری ڈبلیو واٹ بیسویں صدی کے نصف آخر میں استشراقی افق پر چھایا ہوا ہے۔کارلائل فنی لحاظ سے باقاعدہ مستشرق نہ تھا۔واٹ اگرچہ پڑھا لکھا مستشرق ہے لیکن اس کے کام کو کارلائل کا ہی جدید ایڈیشن قرار دیا جا سکتا ہے۔مائیکل ایچ ہارٹ فنی معنوں میں مستشرق نہیں۔ البتہ اپنے وسیع مطالعے اور تنقیدی صلاحیت کے ساتھ اس نے سیرتِ پاک کے بہت سے امتیازی پہلوؤں میں سے چند ایک پر انتہائی اختصار کے ساتھ قابل توجہ اور مثبت کام کیا ہے۔ بایں ہمہ اپنی تہذیبی اور ثقافتی حدود کے زیر اثر اس نے بعض مقامات پر ٹھوکریں کھائی ہیں جو اہل علم سے پوشیدہ نہیں ہیں۔برنارڈ لیوس اگرچہ بیسویں صدی کے نصف آخر سے اپنے کام میں مشغول ہے۔تاہم نائن الیون کے بعد مغربی ممالک میں اسلام اور عالم اسلام کے خلاف صلیبی و صہیونی طاقتوں کے لیے اس نے خصوصی طور پر فکری غذا فراہم کی ہے۔

کتاب کے بنیادی استدلال کا تعلق نبوت محمدی ﷺ کی واقعیت (Actuality) سے ہے۔

مکہ کی وادیٔ غیر ذی زرع میں پیدا ہونے والے محمد عربی ﷺ جلد ہی والدین کے سایہ عاطفت سے محروم ہو گئے۔دنیوی نقطہ نظر سے مکہ کے درِ یتیم ﷺ نے کسی معلم کے سامنے زانوئے تلمذ بھی تہہ نہیں کیا۔نبوت سے قبل بھی آپ کے اولین مخاطبین آپ کی شخصیت میں کسی اخلاقی کمزوری کی نشاندہی نہ کر سکے۔اعلانِ نبوت سے پہلے آپ ﷺ ایک انتہائی سلیم الطبع شخصیت کے طور پر

پہچانے جاتے تھے۔ تاہم آپ کی زبان پر کسی نے حقائق اور معارف کے وہ دریا بہتے نہیں دیکھے جس کا مشاہدہ اہلِ دنیا نے بعثت نبوی ﷺ کے بعد کیا۔ دنیا کی سب سے کم گو اور رواجی ثقافت سے بیزار شخصیت غارِ حرا کی تنہائیوں سے نکل کر شمعِ محفل بن گئی۔ اب ان کے ہاتھ میں وہ نسخۂ کیمیا تھا جس نے روزِ ازل سے بنی نوع انسان کو درپیش مسائل کا حل پیش کرنا تھا۔ بالیقین نسخۂ کیمیا سے مراد ہے قرآن اور احادیث صحیحہ۔ اوّل الذکر کو وحی جلی اور موخر الذکر کو وحی خفی کہا جاتا ہے۔ پہلی قسم کی وحی میں الفاظ و معانی دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں اور دوسری میں الفاظ آپ ﷺ کے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اس لافانی اور نافع ترین علم کا سرچشمہ اور ماخذ کیا ہے۔ قرآن حکیم نے خود ہی اس سوال کا جواب دیا ہے۔ اس روشنی کا ماخذ آپ کا ذاتی شعور اور لا شعور ہے نہ یہ کسی دنیوی معلم کے فیضانِ نظر کا کرشمہ۔ اَلرَّحْمٰنُ ۙ﴿۱﴾ (الرحمن:۱) "الرحمن نے قرآن کی تعلیم دی ہے۔" اور یہ کہ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۙ﴿۵﴾ (النجم:۵) "اسے زبردست قوت رکھنے والے (جبرائیل) نے تعلیم دی ہے جو بڑا صاحب حکمت ہے۔"

اب جس عالم الغیب ذات نے نبی آخر الزماں ﷺ کو خود "العلم" عطا فرمایا اور آپ ﷺ پر الکتاب نازل فرمائی، ان کے لیے "اُمّی" کا ترجمہ "ان پڑھ نبی" کرنا بالکل خلافِ واقعہ بات ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ علم و ہدایت کے اولین اور حتمی سرچشمے سے فیض یاب ہو کر دنیا کے سب سے بڑے عالم ہونے کا اعزاز رکھتے ہیں۔ اس لیے محتاط مفسرین نے "اُمّی" کا ترجمہ یا تو اس حوالے سے کیا ہے کہ آپ کا تعلق ام القریٰ (مکہ) سے ہے یا بنی اسمٰعیل کے حوالے سے، جنھیں یہود اس بنا پر اُمّی کہتے تھے کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے بعد کوئی پیغمبر آپ کی نسل میں اس منصب پر فائز نہ ہوا تھا۔

کتاب کے مآخذ کے بارے میں ایک وضاحت بہت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ ہمارے نزدیک سیرت پاک کے اولین اور مستند ترین مآخذ قرآن و سنت ہیں۔ اس دعوے کا مقصد سیرت ﷺ پر دوسری قدیم ترین تاریخی کتب کی کلی تغلیط یا تردید نہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر

کوئی بات قرآن وسنت کے بیانات سے ٹکرائے گی، تو اس باب میں دوسرے مآخذ قابل اعتنا نہ رہیں گے۔ یہ عین قدرتی بات ہے کہ مستشرقین نے ان اولین مآخذ کے بارے میں طرح طرح کے شبہات پیدا کرنے کے لیے پورا زور لگا دیا ہے۔ قرآن پاک کے بارے میں تو کوشش بسیار کے باوجود ان کی ''تحقیقی سرگرمیاں'' ناکامی سے دوچار ہوگئیں۔ لیکن حدیث کے بارے میں تواتر اور تسلسل کے ساتھ کام جاری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کتب حدیث کا درجہ استناد کے اعتبار سے اناجیل اربعہ سے بھی بڑھ کر ہے۔ اناجیل اربعہ (متی، مرقس، لوقا، یوحنا) کے راوی صرف چار ہیں جبکہ ایک ایک حدیث کے راویوں کی تعداد کہیں زیادہ ہے۔ کسی ایک روایت میں کوئی تشنگی محسوس ہو تو اس کی تکمیل یا تشریح وتفصیل باقی راویوں کے ہاں مل جاتی ہے۔ ان ابتدائی معروف مورخین (محدثین) کی تعداد بھی کم از کم چار ہزار ہے۔ شمع رسالت کے یہ پروانے ایک ایک بات کی تصدیق کے لیے مہینوں دور دراز علاقوں کا سفر کیا کرتے تھے۔ اس کے برعکس معاصر تاریخ محدود ترین راویوں کے ذریعے ہم تک پہنچی ہے۔ اس تاریخ میں مورخ کا ذاتی کردار بھی زیر بحث نہیں آتا۔ ہمارے پاس یہ جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں کہ دیانت وامانت اور غیر جانبداری کے لحاظ سے کسی مورخ کا پایہ استناد کیا ہے۔ روایات کے قبول واسترداد میں محدثین نے جرح وتعدیل کا جو معیار قائم کیا، بہت سے مورخین اس فن کی ابجد سے بھی ناآشنا ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سیرت نگاری میں کتب مغازی، کتب تاریخ اور کتب آثار الاخبار کا درجہ قرآن مجید اور کتب احادیث کے بعد آتا ہے۔

ایک دوسری وضاحت سیرت کے بعض پہلوؤں کے بیان میں غیر مسلم مصنفین اور مستشرقین کے تائیدی بیانات کے بارے میں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات اور فرامین کی غیر مشروط پیروی ہمارے صاحب ایمان ہونے کا لازمی تقاضا ہے۔ ان ارشادات کے بارے میں کسی بھی مسلم یا غیر مسلم کا کوئی تائیدی فقرہ ان کی قدر ومنزلت اور افادیت میں کوئی کمی یا اضافہ نہیں کرسکتا۔ راقم الحروف احادیث پاک کے بارے میں اپنے اس موقف کا برملا اظہار ضروری سمجھتا ہے جو ہمارے اکابر اور مشاہیر کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ میری مراد یہاں خاص طور پر مشہور صحابی رسول حضرت عمران بن

حصینؓ ہیں جو عہدِ فاروقی میں بصرہ میں معلم بنا کر بھیجے گئے۔ آپ لوگوں کو حیا کے بارے میں ایک مشہور حدیث سنا رہے تھے۔ حاضرین مجلس میں سے یمن کے بشیر بن کعب نامی ایک صاحب نے اخلاقیات کی کچھ کتب پڑھ رکھی تھیں۔ انھوں نے کہا۔ جی ہاں۔ پرانی کتابوں میں بھی حیا کے بارے میں اس قسم کے خیالات پیش کیے گئے ہیں۔ حضرت عمرانؓ کا چہرہ سرخ ہو گیا اور فرمایا:

''میں تجھ سے رسول اللہ ﷺ کی احادیث بیان کر رہا ہوں اور تو مقابلہ کرتے ہوئے اپنے صحیفوں اور کتابوں کی باتیں بیان کرتا ہے۔''

اس مضبوط مؤقف کے ہوتے ہوئے مختلف مقامات پر غیر مسلم اہلِ قلم کے حوالہ جات کو مصنف کی ذہنی مرعوبیت سے منسوب کرنا درست نہ ہوگا۔ مقصد صرف جدید رجحانات اور معلومات کی روشنی میں سیرت طیبہ کی تفہیم و توضیح ہے اور بس۔ قرآن و سنت پر ان حضرات کو اتھارٹی نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس لیے حسب ضرورت دوسرے مقامات پر نہ صرف مذکورہ مستشرقین کی منفی آرا کا ذکر کیا گیا ہے بلکہ اُن کا علمی احتساب بھی کیا گیا ہے۔ مراجع و حواشی میں بعض مقامات پر مستشرقین کے افکار و خیالات کا حوالہ دیتے ہوئے اصل اقتباسات بھی درج کر دیے گئے ہیں تاکہ انگریزی علم و ادب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات متعلقہ مصنفین و مستشرقین کے اندازِ نگارش سے بھی آگاہ ہو سکیں۔

قرآن حکیم کی آیات کے تراجم کے لیے زیادہ تر تفہیم القرآن اور ضیاء القرآن سے مدد لی گئی ہے۔

ایک اور بات یہ کہ اس کتاب میں سیاسیات، معاشیات، قانون اور نفسیات وغیرہ کے حوالے سے اسلامی احکامات کو تفصیل سے بیان کرنے کا محل نہ تھا۔ ان موضوعات پر تفصیل کے ساتھ الگ سے تحقیقی کتب دستیاب ہیں۔ مثال کے طور پر اسلامی معاشیات کے بارے میں ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی، ڈاکٹر انور اقبال قریشی، ڈاکٹر محمود ابو سعود، ڈاکٹر ابو الحمید ابو سلیمان، ڈاکٹر احمد نجار، ڈاکٹر محمد عمر چھاپڑا، ڈاکٹر ضیاء الدین احمد، پروفیسر خورشید احمد، ڈاکٹر محمد عمر زبیر، ڈاکٹر منظر کہف، ڈاکٹر انس زرقا، ڈاکٹر عبد الحمید براہیمی، ڈاکٹر منور اقبال، ڈاکٹر فہیم خان، مولانا محمد تقی عثمانی اور ڈاکٹر نور محمد غفاری نے دورِ حاضر میں خاصا قابلِ قدر کام کیا ہے۔ اس خاص موضوع سے دلچسپی رکھنے والے عالم اسلام

کے ان دانشوروں کی تحقیقات کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔ اسی پر دوسرے موضوعات اور ان کے محققین کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے۔ یہاں سیرتِ پاک کی روشنی میں صرف ابتدائی نقوش اور اشارات پر اکتفا کیا گیا ہے۔

کتاب کی ترتیب و تدوین میں پروفیسر سعید احمد عابد مرحوم، پروفیسر ظفر حجازی، پروفیسر منظور حسین عباسی، پروفیسر محمد نعیم، پروفیسر محمد عثمان اور محمد فاضل جیسے اہلِ علم حضرات کے قیمتی مشورے شامل رہے ہیں۔ پروفیسر ممتاز محی الدین غوری، حشمت علی لودھی، محمد اسلم طاہر القادری اور صابر نظامی مرحوم کی نوازشات حسبِ معمول حوصلہ افزا رہی ہیں۔ صابر نظامی حال ہی میں دوستوں کو داغِ مفارقت دے گئے۔ اللہ تعالیٰ انھیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ اپنی آخری علالت کے دوران ایک شب دو بجے انھوں نے مجھے فون کے ذریعے منیر نیازی مرحوم کا ایک نعتیہ شعر سنانے کے لیے بیدار کر دیا اور بقیہ رات میں اسی شعر کے سحر میں گرفتار رہا۔

میں جو اک برباد ہوں آباد رکھتا ہے مجھے
دیر تک اسمِ محمدؐ شاد رکھتا ہے مجھے

اپنے بیٹے حافظ محمد عمیر اکرم اور بھانجے عدنان شریف کے لیے بھی دُعاگو ہوں جنھوں نے قرآنی آیات کی تعیین اور انٹرنیٹ سے مطلوبہ مواد کی دستیابی میں بہت عرق ریزی سے کام کیا۔ اپنی اہلیہ روبینہ اکرم کے لیے بھی اظہارِ تشکر واجب ہے جنھوں نے سیرت پاک پر پڑھنے اور لکھنے کے لیے مجھے سازگار ماحول مہیا کیا۔ ادارہ السکام کمپیوٹرز کے شاہد لطیف صاحب اور محمد تبسم شاد صاحب کی کمپوزنگ کا انداز جداگانہ ہے، جس پر وہ بجا طور پر ہدیۂ تبریک کے مستحق ہیں۔

پروفیسر محمد اکرم طاہر

حضور اکرم ﷺ ...... مغربی مفکرین کی نظر میں

اس کائنات کے خالق و مالک نے دنیا کی کوئی چیز بے کار پیدا نہیں کی ۔ انسانوں کی تخلیق کا ایک بڑا مقصد یہ ٹھہرایا گیا کہ کون نیک عمل کرتا ہے ۔ اللہ کے برگزیدہ بندوں یعنی انبیا و رسل کے اعمال صالحہ سے بڑھ کر حسنِ عمل کی کون سی مثال پیش کی جا سکتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے آخری نبی حضرت محمد ﷺ کے اسوۂ حسنہ سے بڑھ کر کس انسان کی حیات مبارکہ کے اعمال محفوظ ہیں کہ انھیں نمونۂ عمل بنایا جائے ۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جہاں اپنی آخری وحی قرآن مجید کی حفاظت کی ذمہ داری کا اعلان کیا، وہاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ کو بہترین نمونۂ عمل قرار دے کر ان کے تمام اعمال کو اصحابِ رسول ﷺ کی زندگیوں کا جزو بنا دیا، جن کے نزدیک حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی تمام سعادت مندیوں کی معراج تھی ۔ اس بے لوث اور محض رضائے الٰہی کی بنیاد پر اطاعت ہی کی بدولت اللہ تعالیٰ نے انھیں یہ تمغۂ امتیاز عطا کیا: رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ ۔

صحابہ کرامؓ نے حضور اکرم ﷺ کی اطاعت و پیروی اتنے بھرپور انداز میں کی کہ آپ کی زندگی کا ایک ایک عمل چودہ سو برس کے بعد آج بھی پوری طرح روشنی میں ہے ۔ چند افراد ہی نہیں بلکہ کروڑوں، اربوں مسلمان آج بھی اسی قرآن کی تلاوت کرتے ہیں جو اللہ کے آخری نبی حضرت محمد ﷺ پر نازل ہوا، آج بھی مسلمان فرائض کی ادائیگی کا اسی طرح اہتمام کرتے ہیں جس طرح چودہ سو برس پہلے ہوتا تھا ۔ نماز، روزہ، حج زکوٰۃ، صدقہ، خیرات اور اللہ کے ذکر سے مسلمانوں کی زبانیں اور دل آج بھی اسی طرح تر و تازہ ہیں جس طرح قرن اول میں ہوتے تھے ۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ سے لے کر آج تک ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا کہ مسلمانوں نے تمام تر سیاسی نشیب و فراز کے باوجود اللہ کے دین سے منہ موڑا ہو اور اللہ کے آخری رسول حضرت محمد صلی

اللہ علیہ وسلم کی اطاعت سے انحراف کیا ہو۔ یہ دین اسلام کا ایسا معجزاتی ثبوت ہے جس کا اعتراف مشرق و مغرب کے اہل دانش نے ہمیشہ کیا ہے۔

مغربی مفکرین میں ایسے افراد بھی ہیں جنھیں دین اسلام کی صحیح تعلیمات نہیں پہنچیں اور جنھیں ناقص معلومات نے ایسی فکری گمراہی میں مبتلا کر دیا جس کا اظہار وہ عمر بھر کرتے رہے۔ اس سے مغربی ممالک کے لوگ دین اسلام کا غلط تصور لے کر مسلمانوں کے بارے میں منفی رویے میں مبتلا ہو گئے جس نے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان غلط فہمیوں کو جنم دیا اور ان غلط فہمیوں نے طرفین میں دوریاں پیدا کیں۔ ان غلط فہمیوں نے رفتہ رفتہ نزاع کی ایسی صورت اختیار کر لی کہ صدیوں تک صلیب و ہلال کا معرکہ سرگرم رہا اور یہ معرکہ حق و باطل آج بھی جاری ہے۔ امریکی صدر کی زبان سے یہ لسانی لغزش نہ تھی کہ امریکہ صلیبی جنگ لڑ رہا ہے، بلکہ عراق و افغانستان کے خلاف یہ ایک سوچی سمجھی جنگ تھی جس کا تسلسل عالم اسلام کے متعدد ملکوں میں نظر آتا ہے۔ مغرب اپنی اس غلط فہمی کی بنا پر دنیا بھر میں خصوصاً مسلم ممالک سے برسر پیکار ہے۔ دنیا کی دو بڑی عالمی طاقتوں کی سرد جنگ اب عالمی سطح پر اسلام کے خلاف متحد ہو گئی ہے۔ ان حالات میں شدید ضرورت اس امر کی ہے کہ انھیں اسلام، قرآن، اور اللہ کے آخری نبی حضرت محمد ﷺ کے متعلق اہل مغرب کو صحیح معلومات دی جائیں، ان کی غلط فہمیاں دور کی جائیں اور اسلام کے بارے میں ان کے پھیلائے ہوئے غلط تاثر کو زائل کیا جائے۔

مغرب کے بعض اہلِ علم ہر زمانے میں اسلام کے خلاف مطالعے میں منہمک رہے ہیں۔ دین اسلام کی اہم کتابیں ان کے زیر مطالعہ رہی ہیں۔ لیکن ایک عناد، ہٹ دھرمی اور مخالفانہ روش ان میں موجود رہی، جب کہ مغرب کے متعدد اہلِ علم نے کھلے دل سے حضرت محمد ﷺ، قرآن اور اسلام کے متعلق اپنے متوازن اور خیر سگالی کے جذبات کا اظہار کیا۔ ایسے مستشرقین کی بھی معقول تعداد موجود ہے جو اسلام کو عالمی سطح کا دین قرار دے کر بنی نوع انسان کے مستقبل کو اسلام سے وابستہ کر دیتے ہیں۔

زیر نظر کتاب میں ان مستشرقین کی غلط بیانیوں کا جائزہ لیا گیا ہے جن کے گمراہ کن خیالات نے مغربی ذہن کو پراگندہ کیا ہے۔ ان میں کارلائل، منٹگمری واٹ، مائیکل ایچ ہارٹ، آرم سٹرانگ کرن، ڈانٹے، ولیم میور، ہیولاک ایلس اور برنارڈ لیوس شامل ہیں۔

مصنف نے نہایت دیانت داری سے مستشرقین کی عبارتوں کا صحیح مفہوم بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ بعض مقامات پر انگریزی عبارت بھی دی ہے اور ترجمہ بھی۔ مصنف کو انگریزی زبان وادب پر پوری گرفت حاصل ہے۔ ان کا ترجمہ بھی سلیس اور عام فہم ہے۔ ان مستشرقین نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو غلط باتیں پھیلائی ہیں ان کی تردید دوسرے مصنفین نے بھی کی ہے۔ اردو زبان میں یہ روایت سرسید اور شبلی نعمانی کے دور سے چلی آ رہی ہے۔ بعض اہل قلم نے خاص خاص موضوعات پر مستشرقین کی تردید میں کتابیں تصنیف کی ہیں۔ مثلاً حضور اکرم ﷺ کی ازواج مطہرات ؓ کے حوالے سے جو اعتراضات ہوئے ان کے جوابات پر کتابیں لکھی گئیں۔ اسی طرح بعض مصنفین نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت و کردار پر مغربی اہل قلم کے اعتراضات کا جواب لکھا۔ بعض اہل قلم نے حضور اکرم ﷺ کے غزوات کے حوالے سے اعتراضات کیے ہیں۔ انھیں اسلامی اصول جنگ سے بے خبری کے باعث حضور اکرم ﷺ کے اقدامات کی تفہیم میں غلط فہمی ہوئی۔ اسلام میں جنگ وامن میں زندگی بسر کرنے کی الگ الگ ہدایات ہیں۔ اسلام ملک گیری کے خلاف ہے لیکن امن کے قیام کے لیے ظالموں اور خدا اور رسول کے باغیوں کے خلاف آلاتِ حرب اٹھانے کی اجازت دیتا ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے مدنی دور میں مسلمانوں کی جمعیت کو اللہ کی ہدایت کے مطابق میدان جنگ میں اتارا۔ کفار مکہ نے اللہ کی عبادت کی خاطر آنے والے مسلمانوں کو حدود حرم میں داخل ہونے سے روک دیا۔ یہ ایک ایسا جرم ہے جس کی مذمت اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کی ہے: يَسْأَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيهِ قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَكُفْرٌ بِهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَإِخْرَاجُ أَهْلِهِ مِنْهُ أَكْبَرُ عِنْدَ اللَّهِ (البقرہ ۲:۲۱۷)۔ ''لوگ پوچھتے ہیں ماہِ حرام میں لڑنا کیسا ہے؟ کہو: اس میں لڑنا بہت برا ہے مگر

راہِ خدا سے لوگوں کو روکنا اور اللہ سے کفر کرنا اور مسجد حرام کا راستہ خدا پرستوں پر بند کرنا اور حرم کے رہنے والوں کو وہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک اس سے بھی بڑا گناہ ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اجازت دی کہ وہ کفار اور منکرین حق کے خلاف ڈٹ جائیں، تاکہ امن قائم ہو اور اللہ کے احکام کے مطابق بنی نوع انسان زندگی بسر کریں، غزوات رسولؐ میں اور بھی حکمتیں موجود ہیں لیکن مغربی اہلِ علم ان پر غور نہیں کرتے اور اعتراضات کی بوچھاڑ کر دیتے ہیں کہ دین اسلام، جنگ کی ترغیب کیوں دیتا ہے اور یہ قتل وغارت کا حکم کیوں دیتا ہے۔ مسلمان اہلِ علم نے کسی دور میں بھی جہاد وقتال کے ذکر سے ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ فرنگی ذہنیت سے مرعوب بعض مسلمانوں نے جہاد وقتال کے بارے میں جمہور مسلمانوں کے موقف سے مختلف رائے کا اظہار کیا ہے۔

زیر نظر کتاب میں مستشرقین کے اعتراض کے تفصیلی جواب کے بجائے مختصر طور پر لیکن مدلل انداز میں جامع جواب دیا گیا ہے۔ مصنف کا اسلوبِ بیان لائق تعریف ہے۔ ان کا اسلوب علمی، تحقیقی اور تنقیدی نقطۂ نظر سے متوازن ہے۔ ثقیل اور متروک اصطلاحات کے استعمال سے دامن بچا کر، اظہارِ مدعا میں فصاحت و بلاغت کی خوبیاں قائم رکھی ہیں۔ یقیناً یہ کتاب سیرت النبیؐ پر لکھی گئی کتابوں میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔

پروفیسر ظفر حجازی

ادارہ معارف اسلامی

منصورہ، لاہور

حصہ اوّل

آفتابِ رسالت...... محمد رسول اللہ ﷺ

انسان جسے بجا طور پر اشرف المخلوقات کہا جاتا ہے، دو چیزوں...... مادی خواہشات اور روحانی ضروریات...... سے مرکب ہے۔ خالق کائنات کا ایک بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے کائنات کی وسعتوں میں انسان کی مادی ضروریات کی تسکین کے لیے وسائل رزق کا ایک ختم نہ ہونے والا خزانہ پیدا فرمایا۔ انسان خداداد صلاحیتوں سے کام لے کر اپنی مادی خواہشات کی تکمیل کے لیے ہر زمانے میں نئی نئی صورتیں نکالتا رہا ہے۔ خالق کائنات کا دوسرا بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے انسان کی روحانی اور اخلاقی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے بھی پورا بندوبست کیا ہے۔ ہر زمانے اور ہر قوم میں خدائے واحد کی طرف سے انبیا کرام انسانیت کی رہنمائی کے لیے تشریف لاتے رہے۔ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ان کے پیروکاروں نے ان کی تعلیمات فراموش کر دیں یا اُن کے مذہبی پیشواؤں نے محدود دنیوی مفادات کے لیے ان کی تعلیمات کو طرح طرح کی تاویلات بلکہ تحریفات سے مسخ کر ڈالا۔ اب ضرورت ایک ایسی شخصیت کی تھی جو خاتم النبیین ہو۔ جن کی نبوت کا فیضان دنیا کی تمام اقوام اور آنے والے ہر دور کے لیے عام ہو۔ جن کی تعلیمات اس طرح محفوظ و مامون ہوں کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں دستورِ حیات بن جائیں۔ بعثت محمدی ﷺ خالق کائنات کی طرف سے انسانیت کی اسی ازلی و ابدی پکار کا حتمی جواب ہے۔

بعثت نبوی ﷺ کے بہت سے انمول پہلو ایسے ہیں جو تا ابد بنی نوع انسان کے لیے عظمت، رحمت اور وحدت کا باعث ہیں۔

(۱) ادیان سابقہ کا مرکزی نکتہ عقیدۂ توحید تھا اور اسلام کا نکتہ ماسکہ بھی عقیدۂ توحید ہے۔ وحدتِ آدمیت کے جس تصور کی آبیاری اسلام کرنا چاہتا ہے اس کی بنیاد وحدت الٰہ پر ہی قائم ہے۔ تمام انبیا کرام اپنے اپنے زمانے میں عقیدۂ توحید پر زور دیتے رہے۔ قرآن حکیم میں عقیدۂ توحید کو ذہنوں میں راسخ کرنے کے لیے ہر ممکن استدلال سے کام لیا گیا۔ مشرکین کو سمجھانے کے لیے فرمایا گیا۔

لَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ (سورۃ الانبیا: ۲۲)

''اگر آسمان وزمین میں ایک اللہ کے سوا دوسرے خدا بھی ہوتے تو (زمین اور آسمان) دونوں کا نظام بگڑ جاتا۔ پس پاک ہے اللہ رب العرش اُن باتوں سے جو یہ لوگ بنا رہے ہیں۔''

وجودِ باری تعالیٰ کا انکار کرنے والوں کی ہدایت کے لیے ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ کائنات میں جو نظم، موزونیت اور توازن موجود ہے وہ صرف ایک خدائے واحد کی صفتِ تخلیق ہی کا شاہکار ہوسکتا ہے۔

الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۖ مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ۖ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ۝ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ ۝ (الملک: ۳-۴)

''تم الرحمٰن کی تخلیق میں کسی قسم کی بے ربطی نہ پاؤ گے۔ پھر پلٹ کر دیکھو، کہیں تمھیں کوئی خلل نظر آیا ہے؟ بار بار نگاہ دوڑاؤ۔ تمھاری نگاہ تھک کر نامراد پلٹ آئے گی۔''

عقیدۂ توحید کی موثر کارفرمائی کے ذریعے پیغمبر اسلام ﷺ نے فساد کو اصلاح میں، انتشار کو اتحاد میں، ظلم کو عدل میں، جہل کو علم میں اور دین و دنیا کی ثنویت (Dualism) کو وحدت میں

بدل دیا۔ یہ ثنویت انسانی معاشروں میں ہمیشہ سے موجود رہی ہے۔ نظامِ کائنات میں اسے زمین و آسمان کی دوئی، انسانی وجود میں جسم و روح کی دوئی اور نظامِ عمل میں کاروبار اور عبادت کی دوئی کی شکل میں دیکھا جا سکتا ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے ثنویت کی اِن تمام شکلوں کو ختم کر کے سب کو ایک ہی اقتدار کا تابع بنا دیا۔ یعنی اللہ کے اقتدار کا۔(۱)

(۲) تمام انبیا و رسل ایک ہی دین کی دعوت دیتے رہے۔ اس لیے قدرتی بات ہے کہ اس وحدت کا سب سے بڑا عملی مظاہرہ بھی انبیا کرام ہی نے پیش کیا۔ ایک طرف انبیا سابقہ ہیں جو اپنے بعد آنے والے نبی آخر الزماں ﷺ کی آمد کی خوشخبری سنا کر اپنے پیروکاروں کو آخری نبی ﷺ کی آمد اور اس کے استقبال کے لیے ذہنی اور فکری طور پر تیار کرتے رہے اور دوسری طرف پیغمبر آخر الزماں ﷺ ہیں جو گذشتہ انبیا کرام کا نہ صرف عزت و احترام کے ساتھ ذکر فرماتے تھے بلکہ آپ ﷺ نے قرآن میں مذکور پیغمبروں پر خصوصی طور سے ایمان لانے کا حکم دیا اور غیر مذکور پیغمبروں کی نبوت پر عمومی طور پر ایمان لانے کی روایت کا آغاز فرمایا۔ اس لحاظ سے دو پہلوؤں کا ذکر مناسب رہے گا۔

(الف) آپ ﷺ کی بعثت کا بنی نوع انسان پر یہ بہت بڑا احسان ہے کہ قرآن حکیم نے دُنیا کی تمام قدیم اقوام اور دور افتادہ علاقوں میں بھی انبیا کی بعثت کو ایک امر واقعہ کے طور پر تسلیم کیا۔ ارشاد ربانی ہے:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ ؕ (المومن:۷۸)

"اے نبی! تم سے پہلے ہم نے بہت سے رسول بھیجے ہیں۔ ان میں سے بعض کے حالات ہم نے تم کو بتائے ہیں اور بعض کے نہیں بتائے۔"

اسی طرح قرآن حکیم کے الفاظ میں آپ ﷺ نے گذشتہ تمام انبیائے کرام کے ساتھ اپنی وابستگی کا اعلان فرمایا۔

وَإِن مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ ○ (فاطر:۲۴)

''کوئی امت ایسی نہیں جس میں کوئی ڈرانے والا نہ آیا ہو۔''

یہی مضمون الفاظ کے معمولی اختلاف کے ساتھ سورۃ الرعد (۷)، سورۃ یونس (۴۷)، سورۃ الحجر (۸) اور سورۃ النحل (۳۶) میں بیان ہوا ہے۔ وحدتِ انسانی اور بین الاقوامی ہم آہنگی کے لیے اس سے بڑی محکم بنیاد اور کیا ہو سکتی ہے؟

قرآن حکیم میں بیان کردہ اس آفاقی اصول کے بعد یہ حقیقت بھی سامنے رہنی چاہیے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں میں سے صرف ۲۶ پیغمبروں کے اسمائے گرامی قرآن میں درج ہیں۔ ان کے علاوہ جتنے انبیا و رسل ہیں، متعین طور پر اُن کی حتمی تائید یا یکسر تردید کی پوزیشن میں ہم نہیں ہیں۔ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اِن سب بزرگ ہستیوں کا تعلق ایک خاص مدت اور ایک خاص علاقے تک محدود تھا۔ اُن کی تعلیمات کی حفاظت کا خدائی بندوبست بھی نہ کیا گیا تھا اور یہ کہ اُن کی تعلیمات کے نام پر جو کچھ موجود ہے اُس میں رطب و یابس دونوں طرح کے عناصر موجود ہیں۔ امام غزالیؒ کے بقول قدیم ترین مصلحین اخلاق اور فلسفی حضرات کی بہت ساری مثبت تعلیمات اُن کے پیشرو انبیا کرام کی تعلیمات سے ماخوذ ہیں۔(۲) قرآن و حدیث کے پیش کردہ اس عالمی اصول کے تحت بہت سے مسلمان محققین نے قدیم فلاسفۂ اخلاق اور مذہبی پیشواؤں کے معاملے میں خاصی وسیع المشربی اور رواداری سے کام لیا ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی کے نزدیک ''واقعہ یہ ہے کہ سقراط کو توحید ہی کی خاطر زہر کا پیالہ پینا پڑا۔(۳) ڈاکٹر نصیر احمد ناصر اور منصور الحمید کے نزدیک سقراط کا فکر و عمل اُسے ایک فلسفی کے بجائے انبیا کی صف میں شامل کرنے کے لیے کافی ہے۔(۴) سب سے زیادہ مشکل مہاتما بدھ کے معاملے میں پیش آتی ہے۔ بدھ کی تعلیمات کے شارحین اور محققین کا اصرار ہے کہ بدھ کے ہاں خدا کا تصور موجود نہیں ہے (یہ الگ بات کہ خدا کی خالی مسند پر خود بدھ کو

بیٹھا دیا گیا)۔ حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ موجود ہے اس میں بھی کہیں نہ کہیں تصورِ خدا کو واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً ''اے ذات اعلیٰ! مجھے اپنی پناہ میں لے لے۔ میں تیرا ادنیٰ غلام ہوں۔ جب تو مجھے اپنا لے گا تو میں ہر خوف سے آزاد ہو جاؤں گا۔ میں دوسروں کی بھلائی کے لیے کام کروں گا۔''(۵) مولانا مناظر احسن گیلانی کے نزدیک قرآن حکیم میں ذالکفل کے نام سے جس پیغمبر کا بار بار ذکر کیا گیا ہے اس سے مراد مہاتما بدھ کی شخصیت ہے۔(۶) ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے زردشت کی نبوت کے امکان کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔(۷) اسی طرح ہندوؤں کی مذہبی شخصیات...... رام اور کرشن جی...... کی جو تعلیمات ہمارے سامنے ہیں ان میں بھی بعض مقامات پر ابدی حق وصداقت چھپائے نہیں چھپ سکتی۔ مولانا مودودیؒ کے نزدیک ''بھگوت گیتا تحریف وتنسیخ کے کئی عملوں سے نکل کر جس شکل میں ہم تک پہنچی ہے، اس کے عمیق مطالعہ سے کم از کم اتنا معلوم ہوتا ہے کہ کرشن جی ایک موحد تھے۔''(۸) مثلاً ہندوؤں کی کتاب بھگوت گیتا (خدا کا گایا ہوا گیت) میں درج ہے۔

''وہ جن کی عقل پر خواہشات کے پردے پڑے ہوں، وہ نقلی خداؤں کو پوجتے ہیں۔''(۹)

اسی طرح اپنشد میں لکھا ہے۔

''خدا محض ایک ہے اور وہ وحدہ لا شریک (ایکم ادویتم) ہے۔''(۱۰)

برسبیل تذکرہ یہاں اس بات کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ غیر سامی اور سامی مذاہب کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو توحید ہی نہیں سب سے آخری نبی وہادی ﷺ کے بارے میں بھی ایسی بشارتیں اور نشانیاں ملیں گی جو صرف اور صرف پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ پہ ہی صادق آتی ہیں۔ گویا بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں۔

صرف ایک ہندومت کو ہی لیجیے۔

ہندوؤں کے ذوقِ اصنام پرستی نے ان کے مذہب کو بالآخر ایک ناقابل فہم دیومالا (Mythology) اور ایک لاینحل فلسفہ (Philosophy) بنا ڈالا۔ بت پرستی اور تناسخ کے

علاوہ عقیدۂ اوتار بھی ہندو مت کے اُن مشہور اصولوں میں شامل ہے جو دین اسلام کے بنیادی اصولوں سے متصادم ہیں۔ اس تصور کے مطابق ذات الٰہی زمانی وقفوں کے بعد لباسِ بشری اختیار کر کے انسانوں کی اصلاح کے لیے روئے زمین پر جلوہ گر ہوتی ہے۔ اِس عقیدے کو عیسائیوں کے عقیدۂ ابنیت مسیح اور الوہیت مسیح کی طرح ایک طرف رکھ دیا جائے تو آخری اوتار...... کلکی اوتار...... سے متعلق اُن کی بیان کردہ تمام علامات کا مصداق صرف اور صرف پیغمبر اسلام ﷺ ہیں۔ (۱۱) ڈاکٹر وید پرکاش نے اپنی کتاب ''کلکی اوتار اور نبی کریم ﷺ'' میں اس دعوے کو ٹھوس دلائل کے ساتھ ثابت کیا ہے۔ سنسکرت زبان اور ویدوں کے ماہرین ڈاکٹر گوند کوی راج، پروفیسر ڈاکٹر شری گوپال چند، کشور شرما، شری رام بھون مشرا، شری اندر شکلا اور ڈاکٹر رام سہائے مصر اشاستری نے اس تحقیق کی توثیق کی ہے۔ بقول مصنف مندرجہ ذیل حقائق ناقابل انکار ہیں۔

۱۔ کلکی اوتار کے والد کا نام وشنو بھگت (خدا کا غلام) اور والدہ کا نام سومتی (امن، سکوت و قرار ہے)۔ ہر دو الفاظ کا ترجمہ بالترتیب عبداللہ اور آمنہ بنتا ہے جو کہ پیغمبر اسلام ﷺ کے والدین ہیں۔

۲۔ کلکی اوتار کی پیدائش ایک جزیرے میں ہوگی۔ اس سے مراد جزیرہ نمائے عرب ہے۔

۳۔ کلکی اوتار کی بنیادی خوراک کھجور اور زیتون پر مشتمل ہوگی اور وہ انتہائی دیانتدار اور سچے انسان کی حیثیت سے شہرت حاصل کرے گا۔ یہ گویا سیرت النبی ﷺ کی مبادیات ہیں۔

۴۔ ویدوں اور مقدس کتابوں کے مطابق کلکی اوتار کو خدا اپنے پیغام رساں (فرشتے) کے ذریعے تعلیم دے گا اور یہ عمل ایک گھپا (غار) میں انجام پائے گا۔ اشارہ جبرئیل امین اور غارِ حرا کی طرف ہے۔

۵۔ خدا اس اوتار کو انتہائی برق رفتار گھوڑا سواری کے لیے دے گا جس پر وہ دُنیا کا سفر کرے گا۔ اشارہ سفرِ معراج کی سواری براق کی طرف ہے۔

۶۔ خدا اپنے اوتار کو غیب سے معجزاتی طور پر امداد پہنچائے گا۔ جنگ بدر میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے غیبی امداد کی جانب اشارہ ہے۔

۷۔ یہ اوتار زبردست شہسوار اور ماہر شمشیر زن ہوگا۔ غزوات نبوی میں پیغمبر اسلام ﷺ نے جو بہادری اور شجاعت کے جوہر دکھائے، ایک زمانہ اُس کا گواہ ہے۔ (۱۲)

سامی مذاہب...... یہودیت، عیسائیت اور اسلام میں بھی باہمی اعتراف عظمت کے نقوش د آثار بہت واضح ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے یہ تاریخی الفاظ اب تک محفوظ ہیں:

''خداوند سینا سے آیا اور سعیر سے ان پر طلوع ہوا اور فاران کے پہاڑ سے جلوہ گر ہوا اور اس کے داہنے ہاتھ میں ایک آتشیں شریعت ہوگی۔'' (۱۳)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے بعد حضور ﷺ کی تشریف آوری کا مژدہ کچھ یوں سنایا:

''لیکن وہ فارقلیط روح القدس ہے جسے باپ میرے نام سے بھیجے گا۔ وہی تمھیں سب چیزیں سکھائے گا اور سب باتیں جو کچھ میں نے تمھیں کہی ہیں تمھیں یاد دلائے گا۔'' (۱۴)

(ب) یہ بات کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے مختلف مواقع پر سابقہ انبیا کرام کے ساتھ اظہار یک جہتی کر کے وحدت انسانی کی مضبوط بنیاد رکھ دی، تاریخ کے بہت سے واقعات سے ثابت ہے۔

سفر طائف اور اس کے شدائد کے بعد آپ ﷺ حضرت زید ؓ کے ہمراہ ایک باغ میں قدرے آرام کے لیے تشریف فرما ہوئے۔ باغ کے مالک نے اپنے ایک غلام عداس کو کچھ کھجوریں دے کر آپ ﷺ کے پاس بھیجا۔ نبی اکرم ﷺ نے بسم اللہ پڑھ کر کھانا شروع کیا۔ عداس کو تعجب ہوا۔ اس نے کہا۔ خدا کی قسم! اس شہر میں کوئی بھی شخص اس کلام کو کہنے والا نہیں۔ آپ ﷺ نے عداس سے پوچھا۔ تم کس شہر کے رہنے والے ہو اور تمھارا دین کیا ہے؟ اس نے خود کو نصرانی کہا اور اپنا تعلق شہر نینویٰ سے بتایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اچھا اُس نینویٰ سے جہاں اللہ کے نیک بندے یونس علیہ السلام بن متی رہتے تھے۔ عداس نے کہا آپ یونس علیہ السلام بن متی کو کیسے جانتے

ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: وہ میرے بھائی نبی تھے اور میں بھی نبی ہوں۔ عداس نے آپ ﷺ کے دستِ مبارک اور پیشانی مبارک کو چوم لیا۔ بعض روایات کے مطابق عداس موقع پر مسلمان بھی ہو گیا تھا۔

تاجدارِ انبیا ﷺ کی ذات اقدس میں اللہ تعالیٰ نے تمام سابقہ انبیائے کرام کے کمالاتِ خصوصی جمع فرما دیے تھے۔ پھر بھی آپ ﷺ گذشتہ انبیائے کرام کے اعترافِ عظمت کو پسند فرماتے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکومت انسانوں کے علاوہ حیوانات، ہوا اور جنوں پر بھی قائم تھی۔ انھوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی: قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِي وَهَبْ لِي مُلْكًا لَّا يَنبَغِي لِأَحَدٍ مِّنۢ بَعْدِيٓ ۖ إِنَّكَ أَنتَ الْوَهَّابُ ۝ (ص:۳۵)۔ ''اے رب مجھے معاف کر دے اور مجھے وہ بادشاہی دے دے جو میرے بعد کسی کے لیے سزاوار نہ ہو۔ بے شک تو ہی اصل داتا ہے۔'' حضرت ابو ہریرہؓ کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ تسخیر قوم جن پر رسول اللہ ﷺ کو بھی قدرت حاصل تھی۔ پھر بھی آپ ﷺ نے اپنے اس اعزاز کا مظاہرہ مناسب نہیں سمجھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: گذشتہ رات ایک سرکش جن نے اچانک میری نماز میں خلل ڈالنے کی کوشش کی۔ میں نے اس کو پکڑ لیا اور ارادہ کیا کہ اس کو مسجد کے ستون کے ساتھ باندھ دوں تاکہ تم سب دن کے وقت اسے دیکھ سکو۔ مگر اس وقت مجھے اپنے بھائی سلیمان علیہ السلام کی دعا یاد آ گئی اور میں نے اِس جن کو ذلیل کر کے چھوڑ دیا۔ (بخاری)

فتح مکہ کے موقع پر نبی مکرم ﷺ نے اپنے خون کے پیاسے مفتوحین کے لیے عام معافی کا اعلان کرتے وقت فرمایا: ''آج میں تمھارے ساتھ وہی سلوک کرنے والا ہوں جو حضرت یوسف علیہ السلام نے (مقتدر ہونے کے بعد) اپنے بھائیوں سے کیا تھا یعنی ''آج کے دن تم سے کوئی مواخذہ نہیں۔ تم سب آزاد ہو۔'' سب جانتے ہیں کہ پیغمبر اسلام ﷺ استقامت کا کوہِ گراں تھے، پھر بھی حضرت یوسف علیہ السلام کی عزت افزائی کرتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا۔ ''اگر میں اتنی دیر ناحق جیل میں رہا ہوتا جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام رہے اور مجھے رہائی کے لیے بلوایا جاتا تو میں یہ رہائی

فوراً قبول کر لیتا۔"

رسول اللہ ﷺ نے اس بات کو بھی ناپسند فرمایا کہ کسی پیغمبر کے ساتھ آپ کا تقابل اس طرح کیا جائے کہ کسی دوسرے پیغمبر کی تحقیر کا کوئی پہلو نکلتا ہو۔ ایک یہودی نے ایک صحابی کے ساتھ بحث کرتے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حضور ﷺ سے افضل کہہ دیا۔ صحابی نے غصہ میں آ کر اس بات پر اسے تھپڑ رسید کر دیا۔ یہودی نے دربارِ رسالت میں استغاثہ دائر کر دیا۔ آپ ﷺ نے یہودی کے حق میں فیصلہ دیا اور ساتھ ہی فرمایا: "دوسرے پیغمبروں کے ساتھ موازنہ کرتے ہوئے میری تعریف میں مبالغہ نہ کیا کرو۔ روزِ قیامت جب سب لوگ بے ہوش ہو جائیں گے تو ہوش میں آنے والوں میں سب سے پہلا میں ہوں گا اور موسیٰ علیہ السلام کو اللہ کے تخت کے برابر کھڑا دیکھوں گا۔ موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے فرش کا ایک پایہ پکڑے ہوئے ہوں گے۔ میں نہیں جانتا کہ مجھ سے پہلے ہوش میں آ گئے ہوں گے یا انھیں کوہِ طور پہ بے ہوشی کا بدلہ دیا گیا ہوگا۔" (بخاری جلد ۲ کتاب التفسیر سورۃ الاعراف)

(۳) بعثتِ نبوی ﷺ بنی نوع انسان کے لیے دہری نعمت ہے۔ آپ ﷺ نے ایک طرف مخلوق سے خالق کو ملایا اور دوسری طرف انسان کو انسان سے ملا دیا۔ مخلوق کی خالق سے دوری اور بے اعتنائی کا عالم بھی عجیب تھا۔ کہیں اللہ کا کھلم کھلا انکار کیا جا رہا تھا۔ کہیں بے جان مورتیوں، بے حس درختوں اور موذی جانوروں نیز فطرت کی بے رحم طاقتوں کے سامنے سجودِ نیاز لٹائے جا رہے تھے اور کہیں تمام خدائی اختیارات اپنے جیسے انسانوں کو تفویض کر دیے گئے تھے۔ رسول اکرم ﷺ نے انسان کو شرفِ انسانیت سے آگاہ کیا۔ خوشی و غمی میں، عیش و طیش میں، امن و جنگ میں، بے بسی و سیادت غرض ہر حال میں خدائے واحد سے تمام اُمیدیں وابستہ کرنا سکھایا۔ دستِ سوال بھی اس ذات کے آگے دراز کیا اور اظہارِ تشکر بھی اسی سے کیا۔ فتح مکہ کے تاریخی موقع پر جب شہرِ مکہ میں آپ ﷺ داخل ہو رہے تھے تو سرِ اقدس بارگاہِ صمدیت میں جھکا ہوا تھا۔ اظہارِ عجز سے پیشانی مبارک بار بار اپنی اُونٹنی کے کجاوے سے چھو جاتی تھی۔ سفرِ طائف کے موقع پر جب ہر طرف سے پتھروں کی بارش ہو رہی تھی تو

خالق حقیقی کے ساتھ آپ ﷺ کے قلبی تعلق کی جو کیفیت تھی وہ آپ ﷺ کی اس دعا سے ظاہر ہے جو انتہائی مایوس کن حالات میں بھی خالق و مخلوق کے باہمی تعلقات کے لیے شاہ کلید کا درجہ رکھتی ہے۔

اللھم الیك اشکو ضعف قوتی، وقلة حیلتی وھوانی علی الناس، یا ارحم الراحمین انت رب المستضعفین، وانت ربی، الی من تکلنی؟ الی یعید یتجھمنی؟ ام الی عدو ملکته امری؟ ان لم یکن بك غضب علی فلا ابالی، ولکن عافیتك ھی اوسع لی، اعوذ بنور وجھك الذی اشرقت له الظلمات، وصلح علیه امر الدنیا والاخرة من ان تنزل بی غضبك، او یحل علی سخطك، لك العتبی حتی ترضی، ولا حول ولا قوة الا بك۔

''اے اللہ میں تجھ سے اپنی کمزوری اور تدبیر کی کمی اور لوگوں کی بے توقیری کی شکایت کرتا ہوں۔ اے ارحم الراحمین! تو کمزوروں کا خاص طور پر مربی اور مددگار ہے۔ تو مجھے کس کے سپرد کرے گا؟ کسی غضب ناک اور ترش رو دشمن کی طرف یا کسی دوست کی طرف کہ جس کو تو میرے امور کا مالک بنائے۔ اگر تو مجھ سے ناراض نہ ہو تو پھر مجھے کسی کی پروا نہیں، مگر تیری عافیت اور سلامتی میرے لیے باعث صد سہولت ہے۔ میں پناہ مانگتا ہوں تیری بزرگ ذات کے وسیلے سے جس سے تمام ظلمتیں منور ہیں اور اسی نور سے دنیا اور آخرت کا کارخانہ چل رہا ہے۔ میں اس سے پناہ مانگتا ہوں کہ تیرا غضب اور ناراضی مجھ پر اترے اور اصل مقصد تجھ ہی کو منانا اور راضی کرنا ہے۔ بندہ میں کسی شر سے پھرنے اور خیر کے کرنے کی قدرت نہیں مگر جتنی تیری بارگاہ سے عطا ہو جائے۔''(۱۵)

رسول اللہ ﷺ نے بندوں کو بندوں سے یوں ملایا کہ حقوق اللہ اور حقوق العباد میں فاصلے

سمٹ گئے۔ اللہ سے تعلق کا مدعی مخلوق سے بیزار نہیں ہو سکتا اور مخلوق سے پیار کرنے والا اللہ سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ انسانوں کے باہمی تعلقات میں ہر اس حرکت سے منع کر دیا گیا جو آپس میں نفرت وحقارت یا قطع تعلق کا باعث بن سکتی ہے۔ باہم ہنسی مذاق میں مخاطب کی عزتِ نفس کا خیال نہ رکھنا، تجسس (ایک دوسرے کے چھپے ہوئے عیوب کی کھوج میں لگے رہنا) تنابز بالالقاب (ایک دوسرے کے نام بگاڑنا)، سوئے ظن، غیبت اور بہتان اسلام کی رو سے سخت گناہ ہیں۔ باہمی تعلقات میں حسنِ ظن اور حسن اخلاق کو اصل اہمیت حاصل ہے۔ ایک حدیث پاک کے مطابق مومن بھائی سے مسکرا کر ملنا بھی صدقہ ہے۔ (ترمذی) مخاطب کے ساتھ نظریاتی مباحث میں بھی ''احسن'' طریقہ اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ بندوں کے باہمی تعلقات میں نبی اکرم ﷺ نے تمیز بندہ وآقا مٹا کر رکھ دی۔ ایک بڑھیا مسجد نبوی میں جھاڑو دیا کرتی تھی۔ ایک رات اس کا انتقال ہو گیا۔ لوگوں نے آپ ﷺ کے آرام کے پیشِ نظر اطلاع نہ دی اور رات گئے دفن بھی کر دیا۔ صبح آپ ﷺ کو اطلاع ہوئی تو سخت خفا ہوئے اور غریب خاتون کی قبر پر جا کر دُعائے مغفرت کی۔ باہمی تعلقات میں یہ بات بھی شامل تھی کہ معاشرتی زندگی میں بالخصوص گھریلو زندگی میں بچوں میں سے کسی کے ساتھ کوئی ترجیحی سلوک نہ کیا جائے۔ ایک صحابی اپنے ایک لڑکے کو ایک خادم دینا چاہتے تھے اور اس پر رسول اللہ ﷺ کی گواہی کے خواہاں تھے۔ آپ ﷺ نے پوچھا، ''کیا باقی بچوں کو بھی الگ الگ خادم دیا گیا ہے۔'' جواب نفی میں آیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں ناانصافی اور حق تلفی کی باتوں پر گواہ نہیں بنا کرتا۔'' حسنِ خلق کے معاملے میں مسلم اور غیر مسلم کا فرق بھی آپ ﷺ کے نزدیک بے معنی تھا۔ آپ ﷺ ایک یہودی کے مقروض تھے۔ وہ قرض کا تقاضا لے کر آیا اور نہایت بدتمیزی سے پیش آیا۔ حضرت عمرؓ کو اس کی حرکت پر سخت غصہ آیا اور وہ اسے مارنے کو دوڑے۔ آپ ﷺ نے مسکرا کر یہودی سے کہا: ''ابھی تو وعدہ کے مطابق ادائیگی میں تین روز باقی ہیں۔'' پھر عمر فاروقؓ سے فرمایا: ''عمر! میں اور یہودی تم سے ایک اور برتاؤ کے زیادہ مستحق تھے۔ تمھیں چاہیے تھا مجھے بہتر ادائیگی کے لیے کہتے اور اسے بہتر تقاضے کے لیے۔'' (البیہقی) اس کے

ساتھ ہی آپ ﷺ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو ہدایت کی کہ فلاں شخص سے کھجوریں لے کر اس کا قرض واپس کر دیں اور کچھ زائد بھی دیں کہ یہودی کو عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے سخت ڈانٹ جو پلائی تھی۔

انسانوں کے باہمی تعلقات کو تعمیری بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے رسولِ مکرم ﷺ نے معاشرے کے پسے ہوئے طبقوں کی امداد و استعانت کے لیے صاحبِ استطاعت لوگوں کو عملی طور پر اُبھارا۔ بیت المال سے یتامیٰ، مساکین، بیوگان اور مطلقہ خواتین کی امداد کے لیے نہ صرف قوانین سازی کی گئی بلکہ مختلف ترغیبات کے ذریعے غربا اور مستحق لوگوں کے لیے امدادِ باہمی کا ایک وسیع نیٹ ورک قائم کیا۔ رمضان کے روزے کو قصداً توڑ دینے کے لیے کفارۂ صیام، بیوی کی شان میں شانِ زوجیت کے خلاف نازیبا کلمہ بول دیا تو کفارۂ ظہار اور قسم کھا کر توڑ دی تو کفارۂ یمین اسی امدادِ باہمی کے نظام کی مختلف شکلیں ہیں۔ پڑوسیوں کے حقوق کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے اِس قدر تاکید فرمائی کہ صرف میراث میں اُنھیں شریک کرنے کی کسر باقی رہ گئی۔ جاہل اور آدابِ معاشرت سے نابلد لوگوں کے ساتھ نرمی اور ملاطفت سے پیش آنے کا حکم دیا گیا۔ ایک بدوی مدینہ میں آیا اور مسجدِ نبوی ہی میں پیشاب کرنے بیٹھ گیا۔ صحابہ کرام اُسے مارنے دوڑے۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ اِسے فارغ ہو لینے دو۔ وہ فارغ ہوا تو آپ ﷺ نے اُسے مسجد کے تقدس سے آگاہ کیا۔ پانی کا ڈول منگوایا اور غلاظت کو بہا دیا گیا۔ (مشکوٰۃ جلد اوّل) باہمی تعلقات کے لیے محض نصیحت اور ہدایت سے کام نہیں لیا گیا۔ جو لوگ رحمٰن کو چھوڑ کر شیطان کے پیچھے چل پڑیں اور ظلم و تعدی کو اپنا شعار بنا لیں، قانون کی طاقت سے بھی پہلے ان کا قریب ترین خیر خواہ ہی ان کا سب سے بڑا محتسب ہوتا ہے اور اپنے اس فرض کی ادائیگی پر وہ عند اللہ ماجور ہوگا۔ اس سلسلے میں رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا: اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ صحابہؓ نے پوچھا: یا رسول اللہ ﷺ! مظلوم کی بات تو سمجھ میں آتی ہے۔ ظالم کی مدد کیونکر کی جائے؟ آپ ﷺ نے فرمایا۔ ظالم کو ظلم سے روک دینا اس کی مدد کرنا ہے۔

(۴) زندگی چونکہ ایک مکمل وحدت کا نام ہے۔ اس لیے اسے روح و مادہ یا دین و دنیا کے دو

مختلف خانوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ روح و مادہ باہم اس طور پر متعلق ہیں کہ ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ دنیا کو ترک کر کے دین پر عمل کرنے کی ہر کوشش رہبانیت ہے اور دین کو بالائے طاق رکھ کر دنیا کے پیچھے بھاگنا چنگیزیت ہے۔ اسلام میں رہبانیت کی گنجائش ہے نہ چنگیزیت کی۔ اسلام میں تجارتی اور پیداواری سرگرمیوں کی خوب حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی واضح کر دی گئی کہ دنیا کی ساری سرگرمیاں بشمول سیاست و معیشت مقصود بالذات نہیں ہیں۔ اصل مقصد اور ہدف رضائے الٰہی کا حصول ہے۔ قرآن حکیم میں اس حقیقت کو یوں بیان کیا گیا ہے:

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَن ذِكْرِ اللَّهِ وَإِقَامِ الصَّلَاةِ وَإِيتَاءِ الزَّكَاةِ (سورۃ النور:۳۷)

''وہ (جواں) مرد جنھیں غافل نہیں کرتی تجارت اور خرید و فروخت یادِ الٰہی سے اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے سے۔''

دراصل اسلام کی اخلاقی و روحانی اقدار زندگی کے تمام مادی شعبوں میں برقی رو بن کر دوڑتی رہتی ہیں۔ جس سے بظاہر دنیاداری کے کام بھی عملاً دینی امور قرار پاتے ہیں۔ قرآن پاک میں مالی معاملات میں گواہی لکھنے کا طریقہ بتانے کے ساتھ ہی تاکید کر دی گئی کہ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ (البقرہ:۲۸۲) ''اور اللہ سے ڈرے جو اس کا رب ہے۔'' مالِ غنیمت کی تقسیم جیسے خالص معاشی مسئلے کو بیان کرنے کے بعد فرمایا گیا۔ إِن كُنتُمْ آمَنتُم بِاللَّهِ وَمَا أَنزَلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ (الانفال:۴۱) ''اگر تم اللہ پر اور جو کچھ ہم نے اپنے بندے پر حق و باطل میں فرق کرنے والے دن نازل کیا ہے اس پر یقین رکھتے ہو۔'' کفار سے جنگ و صلح کے بین الاقوامی قوانین بیان کرتے ہوئے بھی تعلیم دی گئی ہے کہ اگر کفار صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی جھکو۔ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ (الانفال:۶۱) ''اور اللہ پر توکل کرو۔'' سیرت النبی ہی وہ مثالی زندگی ہے جس میں دین و دنیا باہم شیر و شکر نظر آتے ہیں۔ اُم المومنین سیدہ عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ گھر میں خوش

طبعی فرماتے اور جونہی اذان کی آواز بلند ہوتی، آپ ﷺ جانب مسجد یوں روانہ ہوتے جیسے ہمیں جانتے تک نہیں ہیں۔ گویا گھریلو امور سے وابستگی مسجد کے اندر حقوق اللہ کی ادائیگی میں حارج نہ ہوتی۔ اس طرح مسجد میں حاضری حقوق العباد کی ادائیگی سے آپ ﷺ کو مستغنی نہ کرسکتی تھی۔ اسلام میں ہجرت کا درجہ جہاد سے بھی بڑھ کر ہے۔ پھر بھی آپ ﷺ نے حقوقِ والدین کی قیمت پر ہجرت کی اجازت نہ دی۔ حضرت عمرو بن العاص ؓ سے روایت ہے۔ ایک شخص حضور ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا۔ میں اپنے ماں باپ کو روتے ہوئے چھوڑ آیا ہوں کہ آپ ﷺ سے ہجرت پر بیعت کروں۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ واپس لوٹ جاؤ اور انھیں اس طرح ہنساؤ جیسے تو نے انھیں رُلایا ہے۔ (ابوداؤد۔ کتاب الجہاد)

(۵) انبیائے کرام میں رسول اللہ ﷺ خاتم النبیین ہیں تو سب سے بڑے معلّمِ اخلاق بھی آپ ﷺ ہی ہیں۔ حدیث پاک میں ہے "مجھے مکارم اخلاق کی تکمیل کے لیے مبعوث کیا گیا ہے۔" فضائل اخلاق کیا ہیں اور رذائل اخلاق کون کون سے ہیں؟ اس موضوع پر قدیم و جدید مفکرین و فلاسفہ کے ہاں بہت طویل مگر بے کیف مباحث ملتے ہیں۔ قدیم و جدید مفکرین میں سے بعض نے حصولِ لذت کو، بعض نے ترکِ لذت کو اخلاقیات کا جوہر قرار دیا۔ اسی طرح تاریخ کے مختلف ادوار میں کسی نے افادیت کو، کسی نے کاملیت (Perfection) کو، کسی نے مسکنت کو اور کسی نے قوت کو اخلاق کا ہم معنی سمجھا۔ الغرض معلّمین اخلاق کے ہاں تلاش بسیار کے بعد کوئی کام کی بات ملتی بھی ہے تو تعلق باللہ اور فکرِ آخرت جیسی اقدار کے بغیر اس کی افادیت مشکوک ہو جاتی ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے ان دو اعتقادی بنیادوں پر اخلاقیات کے ایسے تمام بنیادی مسائل کو حل فرمایا جو نکتہ وروں سے حل نہ ہو سکے تھے۔ بڑی سے بڑی اور مفصل بات کو چند جملوں بلکہ لفظوں میں اختصار کے ساتھ بیان کرنا آپ ﷺ کی منفرد خصوصیات میں سے ہے۔ صحیح احادیث میں آپ ﷺ سے مروی روایات حکمت و دانش کے جواہر پارے ہیں۔ نبی آخرالزماں ﷺ نے ایک مختصر جملے میں اُمت کو

خبردار کر دیا تھا۔ ”وہ شخص جو مجھے ان دو چیزوں کی ضمانت دے جو اس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان ہے (جنسی اعضا) اور جو اس کے جبڑوں کے درمیان ہے (زبان) میں اسے جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔“ شرم و حیا کے بارے میں ارشاد ہے: ”اگر تجھ میں حیا نہیں ہے تو جو چاہے کر۔“ امانت اور ایفائے عہد کے بارے میں فرمایا: ”وہ مومن نہیں جس میں امانت نہیں اور اس کا کوئی دین نہیں جو وعدہ کا پابند نہیں۔“ حق و صداقت کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا۔ ”کوئی مومن بزدل بھی ہو سکتا ہے، بخیل بھی ہو سکتا ہے مگر جھوٹا ہرگز نہیں ہو سکتا۔“ (ترمذی، ابوداود) رسول اللہ ﷺ کا ایک اور ارشاد پر امن معاشرتی زندگی اور بقائے باہمی کی مضبوط بنیاد فراہم کرتا ہے۔ ”تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے بھائی کے لیے وہی پسند نہ کرے جو کہ وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے۔“ اسی طرح نیکی اور بدی کی تعریف کرتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا: ”نیکی حسن خلق کا نام ہے اور بدی وہ کام ہے جو تو چھپ کر کرے اور تجھے ناگوار ہو کہ لوگ اس سے مطلع ہوں۔“ قرآن پاک میں بڑے بلیغ انداز میں نیکی کو ”معروف“ اور بدی کو ”منکر“ کہا گیا ہے یعنی نیکی وہ ہے جسے ہر انسان اپنے ضمیر کی گہرائیوں میں خیر سمجھتا ہے اور منکر وہ ہے جو ہر انسان کے نزدیک شر ہے۔

اخلاقیات کا ایک نزاعی مسئلہ یہ بھی ہے کہ اچھے مقاصد کے لیے غلط ذرائع کا استعمال جائز ہے یا نہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے مقاصد اور ذرائع میں اس تفریق کو بھی بے معنی ثابت کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ناجائز ذرائع کے استعمال سے انسان کامیاب ہو کر بھی گویا ناکام رہتا ہے اور جائز استعمال کر کے وہی انسان ہار کر بھی (اگر وہ وقتی طور پر ہار جائے) بالآخر کامیابی سے ہم کنار ہوتا ہے۔ کردار کے حسن و قبح کا اندازہ مقاصد کے ساتھ ساتھ ذرائع سے بھی لگایا جاتا ہے۔ قرآن حکیم میں ہمیشہ کے لیے طے کر دیا گیا ہے إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ (ہود: ۱۱۴) ”بے شک نیکیاں برائیوں کو کھا جاتی ہیں۔“ دعوت و تبلیغ کے بالکل ابتدائی مرحلے میں تمام مصلحین امت کے لیے لازم کیا گیا۔

اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ؕ (المومنون:۹۶) ''تم بدی کو اچھے طریقے سے دفع کرو۔''

اس بات میں شبہ کی گنجائش نہیں کہ بنیادی انسانی اخلاقیات عالمی برادری کا مشترکہ تہذیبی و ثقافتی ورثہ ہیں۔ اِن اخلاقیات کا تحفظ بہر صورت مقدم ہے۔ مقصد اور ذرائع میں مصنوعی تفریق کا ایک انتہائی ناگوار اثر یہ ہوا کہ الہامی تعلیمات کے حامل بعض اہلِ کتاب بھی گمراہ ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ قرآن حکیم نے ان کے ایک قول کا حوالہ دیا ہے۔ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ (آل عمران:۷۵) ''وہ کہتے ہیں امیوں (یعنی غیر یہودی لوگوں) کے معاملے میں ہم پر کوئی مواخذہ نہیں ہے۔'' بائبل قرض اور سود کے احکام میں اسرائیلی اور غیر اسرائیلی کے درمیان فرق روا رکھتی ہے۔ تو پردیسی کو سود پر قرض دے تو دے پر اپنے بھائی کو سود پر قرض نہ دینا۔(۱۶) تالمود میں ہے کہ اگر اسرائیلی کا بیل کسی غیر اسرائیلی کے بیل کو زخمی کر دے تو اس پر کوئی تاوان نہیں۔ مگر غیر اسرائیلی کا بیل اسرائیلی کے بیل کو زخمی کر دے تو اس پر تاوان ہے۔ اگر کسی شخص کو کسی جگہ پر کوئی گری پڑی چیز ملے تو اُسے دیکھنا چاہیے کہ گردو پیش کی آبادی کن لوگوں کی ہے۔ اگر اسرائیلیوں کی ہو تو اُسے اعلان کرنا چاہیے۔ غیر اسرائیلیوں کی ہو تو اُسے بلا اعلان وہ چیز رکھ لینی چاہیے۔(۱۷)

اخلاقی اصولوں کی بحث سے ہٹ کر دیکھا جائے تو اسلام میں اخلاقیات کوئی نظری و فکری مسئلہ نہیں، پوری عملی زندگی کا دستور ہے۔ رسول اکرم ﷺ کے اخلاقِ عالیہ کی مدح و توصیف کرتے ہوئے خود ربِّ ذوالجلال نے فرمایا: وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ○ (القلم:۴) ''اور بے شک آپ ﷺ اخلاق کے اعلیٰ مرتبے پر فائز ہیں۔'' علمائے کرام نے یہاں ایک خاص نکتے پر زور دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا وان لك خلقا عظيما ...... اس کا مطلب فقط یہ ہوتا کہ آپ ﷺ کے اخلاق اعلیٰ درجے کے ہیں۔ اس کے بجائے وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ...... کا پیرایہ بیان استعمال ہوا ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ آپ ﷺ کو اعلیٰ اخلاق پر قدرت حاصل ہے۔ بالفاظ دیگر آپ ﷺ سے اخلاقِ عالیہ کا فطری طور پر ظہور ہوتا ہے۔ سیرت پاک ﷺ کے ذخیرہ سے منتخب کردہ

مندرجہ ذیل واقعات اس امر کو واضح کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی اخلاقیات باتکلف (Laboured) نہیں بلکہ بے ساختہ (Spontaneous) تھیں۔

(الف) فتح مکہ کے موقع پر جب عکرمہ بن ابو جہل قبول اسلام کے لیے آ رہے تھے تو رسول اللہ ﷺ نے حاضرین کو پہلے سے تاکید کر دی کہ کوئی شخص بھی اُن کے باپ کے حوالے سے اُن کا ذکر نہ کرے۔ اس لیے کہ مُردوں کے حوالے سے زندہ لوگوں کی دل آزاری جائز نہیں۔

(ب) رسول اللہ ﷺ صحابہ کے ہمراہ ایک سفر میں تھے۔ چند اُونٹنیاں اِدھر اُدھر چر رہی تھیں اور اُن کے تھن دودھ سے بھرے ہوئے تھے۔ بعض نو مسلم صحابہ اپنی بھوک مٹانے کے لیے اِن اونٹنیوں کی طرف دوڑے۔ حضور ﷺ نے انھیں فوراً واپس پلٹ آنے کا حکم دیا اور فرمایا: ''ان اونٹنیوں کے مالکوں کی روزی کا دارومدار اللہ کے بعد اُن کے دودھ پر ہے۔ کیا تم یہ پسند کرو گے کہ اپنا توشہ دان ایک جگہ رکھ کر کہیں جاؤ اور واپس آ کر دیکھو کہ کوئی شخص اُن میں سے کھانے کا سامان لے اڑا ہے؟'' (ابن ماجہ)

(ج) ایک غزوہ میں کافروں کے چند بچے مسلمانوں کے ہاتھوں مارے گئے۔ رسول اللہ ﷺ کو خبر ہوئی تو آپ ﷺ کو شدید رنج ہوا۔ ایک صحابی نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! وہ تو مشرکوں کے بچے تھے۔ آپ ﷺ نے پھر اصرار کیا اور فرمایا: خبردار! بچوں کو قتل نہ کرو۔ بچوں کو قتل نہ کرو۔ ہر جان اللہ ہی کی فطرت پر پیدا ہوئی ہے۔ (مسند احمد۔ ج ۳)

رسول اللہ ﷺ کی تربیت کا اثر تھا کہ صحابہ کرام عام حالات میں ہی نہیں، عین حالتِ جنگ میں بھی عظمتِ انسانی کے پرچم کو سر بلند رکھتے۔ غزوۂ اُحد میں رسول اللہ ﷺ نے اپنی طرف سے حضرت ابو دجانہؓ کو ایک تلوار عطا فرمائی۔ اُنھوں نے اس تلوار سے بہادری اور جواں مردی کے خوب جوہر دکھائے۔ یہ تلوار اس وقت رُکی جب اس کی زد میں ایک مشرکہ آگئی جو اپنے سورماؤں کے لیے رجز گا رہی تھی۔ حضرت ابو دجانہؓ کو یہ بات سخت ناگوار تھی کہ رسول اللہ ﷺ کی عطا کردہ تلوار کسی عورت کے قتل سے خون آلود ہو۔ آپ ﷺ کی مسلسل تربیت سے صحابہ کرام کی زندگی میں جو

انقلاب عظیم رونما ہوا، رب ذوالجلال نے خود قرآن حکیم میں اس کی مدح سرائی کی:

وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (الحشر:۹)

"وہ اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ اپنی جگہ خود محتاج ہوں۔"

مفسرین کے مطابق یہ آیت انصار مدینہ کے حق میں نازل ہوئی تھی۔ کچھ دوسرے مفسرین نے اس آیت کے شانِ نزول میں ایک ایمان افروز واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ ایک دفعہ ایک مسافر رسول اللہ ﷺ کے ہاں تشریف لائے۔ آپ ﷺ نے گھر پیغام بھجوایا مگر اس وقت اُمہات المومنین میں سے کسی کے گھر میں سوائے پانی کے کچھ نہ تھا۔ آپ نے موجود صحابہ کو ایک رات کے لیے مہمانِ مذکور کو اپنے ہاں ٹھہرانے کی دعوت دی۔ ایک صحابی مہمان کو گھر لے گئے۔ بیوی نے بتایا کہ موجود کھانا صرف اُن کے اپنے بچوں کی بمشکل کفالت کر سکتا ہے۔ دونوں میاں بیوی نے طے کیا کہ بچوں کو بہلا کر سُلا دیا جائے اور چراغ بجھا کر مہمان کی خدمت میں کھانا پیش کیا جائے۔ مسافر کھانا کھائے گا۔ اہلِ خانہ اندھیرے میں ہاتھ منہ چلائیں گے اور مسافر کو ذہنی کوفت نہ ہوگی۔ وہ یہی سمجھے گا کہ میاں بیوی بھی کھانے میں شریک ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو اُن کا یہ عمل اِس قدر پسند آیا کہ قرآن پاک میں صیغہ جمع استعمال کرتے ہوئے اِس واقعہ کو مہمان نوازی کی ایک اجتماعی روایت بنا دیا۔ رسول اللہ ﷺ کا دائمی اعجاز یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ کی اخلاقی تعلیمات کو بروئے کار لا کر آج بھی حسنِ عمل کی قندیلیں جا بجا روشن کی جا سکتی ہیں۔

(۶) دُنیا بھر میں خوشنما اخلاقی تصورات کی کبھی کمی نہیں رہی۔ اصل کمی اُن تعلیمات پر عمل کرنے والوں کی ہے۔ کہتے ہیں ایک مسلح شخص نے مہاتما بدھ کی تعلیمات کا جوہر حاصل کرنے کے لیے طویل سفر کیا۔ بالآخر ایک نامور بھکشو نے بدھ کی تعلیمات کا خلاصہ کچھ یوں بیان کیا۔ "ہر قسم کے شر سے بچو۔ ہر قسم کے خیر پر عمل کرو اور اپنے خیالات ہمیشہ پاک صاف رکھو۔" اس شخص نے کہا۔ کوئی خاص بات بتاؤ۔ یہ باتیں تو پانچ برس کا ایک بچہ بھی بخوبی جانتا ہے۔ بھکشو نے کہا۔ جی ہاں ایسا ممکن ہے۔ لیکن اسیّ برس کے بھی چند لوگ ہی ایسے ہوں گے جو اِن باتوں پر عمل کرتے ہیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام کو گندم نما جو فروش قسم کے مذہبی پیشواؤں کے

بارے میں اپنے شاگردوں سے کہنا پڑا: "پس جو کچھ وہ تمھیں بتائیں، وہ سب کرو۔ مگر جو کام وہ کرتے ہیں وہ نہ کرو۔" (۱۸) قرآن پاک میں اہل کتاب کے مذہبی پیشواؤں کے قول و فعل میں تضاد کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا گیا: مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ؕ (الجمعہ:۵) "جن لوگوں کو توراۃ کا حامل بنایا گیا تھا، اُن کی مثال اس گدھے کی سی ہے جس پر کتابیں لدی ہوئی ہوں۔"

حضور ﷺ نے اپنے اسوۂ حسنہ سے ایمان اور عمل صالح میں حائل دوریاں بھی مٹا ڈالیں۔ صحابہ کرامؓ قول و فعل کی یکجائی کا مثالی نمونہ تھے۔ آپ ﷺ نے اُن کے علم و عمل کی توثیق کرتے ہوئے فرمایا: "میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں۔ تم اُن میں سے جس کی بھی پیروی کرو گے، ہدایت پاؤ گے۔" صحابہ کرامؓ اچھی طرح جانتے تھے کہ اسلام میں ایمان کے بغیر عمل اور عمل کے بغیر ایمان غیر معتبر ہیں۔ اب مذہب کچھ بے جان رسوم و رواج اور بے روح عبادات (Rituals) کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک زندہ حقیقت اور ایک زبردست قوتِ حیات بن گیا۔ قرآن و حدیث میں عبادت کے ایسے روایتی تصور پر کڑی تنقید کی گئی ہے جو فرد کے عمومی مزاج اور اجتماعی کلچر کا حصہ نہیں بنتا۔ حدیث پاک ﷺ میں ایک گروہ کے متعلق آتا ہے کہ وہ قرآن پڑھیں گے مگر قرآن ان کے حلق سے نیچے نہیں اُترے گا۔ وہ دین سے اس طرح نکل جائیں گے جس طرح تیر کمان سے نکل جاتا ہے۔ (بخاری، مسلم، موطا) قربانی کے متعلق قرآن پاک میں ہے لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ؕ "اللہ کے ہاں تمھارے جانوروں کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا، وہاں تو تمھارا تقویٰ ہی مقبول ہوتا ہے۔" (الحج:۳۷) نماز و روزہ جیسے بنیادی ارکانِ اسلام کی رسمی ادائیگی پر یقین رکھنے والوں کے لیے حدیث پاک ہے۔ "بہت سے نماز پڑھنے والے ایسے ہیں جنھیں نماز سے اُٹھنے بیٹھنے کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا اور بہت سے روزہ دار ایسے ہیں جن کے حصے میں بھوک پیاس کے سوا کچھ نہیں آتا۔" اہلِ عرب جو موسمی بنیادوں پر چند افعالِ خیر مثلاً مسجد حرام کی مجاوری اور حاجیوں کو پانی پلانے کو مدارِ نجات سمجھے ہوئے تھے، ان

کی اصلاح کے لیے سورۃ التوبۃ (۱۹۔۲۰) میں فرمایا گیا کہ تم لوگ اللہ کے نزدیک اُن لوگوں کے برابر نہیں ہو سکتے جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، اللہ کی راہ میں ہجرت کرتے ہیں اور اپنے جان و مال سے جہاد کرتے ہیں۔ اسی طرح سورۃ البقرہ کی مشہور آیت البر (۱۷۷) میں بھی واضح کر دیا گیا کہ مشرق و مغرب کی جانب منہ کر لینے سے کوئی شخص نیک نہیں بن جاتا۔ اسلام میں نیک وہ شخص ہے جو عقائد، معاملات اور عبادات کے لحاظ سے نیک ہو۔

> "نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ کو اور یومِ آخر اور ملائکہ کو اور اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب اور اس کے پیغمبروں کو دل سے مانے اور اللہ کی محبت میں اپنا دل پسند مال رشتہ داروں اور یتیموں پر، مسکینوں اور مسافروں پر، مدد کے لیے ہاتھ پھیلانے والوں پر اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے۔ نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے اور نیک لوگ وہ ہیں جب عہد کریں تو اُسے وفا کریں اور تنگی و مصیبت کے وقت میں اور حق و باطل کی جنگ میں صبر کریں۔ یہ ہیں راست باز لوگ اور یہی لوگ متقی ہیں۔"

آیت البر کے بارے میں اس امر کو جاننا بھی ضروری ہے کہ یہ آیت تحویلِ قبلہ کے موقع پر نازل ہوئی تھی۔ مسلمانوں کو بیت المقدس کے بجائے کعبۃ اللہ کی جانب رُخ کر کے نماز ادا کرنے کا حکم ہوا تو مدینہ کے اہلِ کتاب بالخصوص یہود نے آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ ان کا کہنا تھا یہ کیسا مذہب ہے جس میں سرِ شام قبلہ کسی طرف ہوتا ہے اور اگلی ہی صبح یہی قبلہ کسی دوسرے رُخ کی جانب منتقل ہو جاتا ہے۔ اس سیاق و سباق میں اہلِ کتاب کے اعتراض کا جواب بھی دیا گیا اور ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی کھول کر بیان کر دیا گیا کہ عبادت کی ظاہری اشکال کو مشینی انداز میں دہرا دینے سے کوئی شخص نیک نہیں بن جاتا۔ نیکی تو ایک جامع اصطلاح ہے۔ موضوع کی نزاکت اور مناسبت سے اس آیت میں معاملات کو عبادات سے بھی پہلے بیان کیا گیا۔

(۷) انبیا کرام نے اپنی صداقت کے ثبوت میں بہت سے معجزات بھی پیش کیے تھے۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے بھی اپنے اولین مخاطبین کے لیے بے شمار معجزات پیش کیے۔ بدقسمتی سے

مستشرقین کے ایک گروہ نے ان معجزات کا سرا سر انکار کر دیا۔ فرانسیسی مستشرق ڈاکٹر گستاؤ لی بان کا تعلق بھی اسی گروہ سے ہے۔ اس کا دعوٰی ہے:

''اگرچہ محمد ﷺ اپنے کو پیغمبر خدا اور نبی برحق سمجھتے تھے۔ پھر بھی آپ نے کبھی معجزے کا دعوٰی نہیں کیا۔ لیکن چونکہ از روئے روایت نبی کے لیے معجزہ کا ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا مورخین اسلام نے آپ کی طرف بھی چند معجزے منسوب کیے ہیں۔''(۱۹)

معجزاتِ نبوی کے منکر اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ ان معجزات کا تعلق چند خوش عقیدہ راویوں کے ''جوشِ انتساب'' سے ہرگز نہیں ہے۔ یہ معجزات بھی انھی مستند راویوں سے مروی ہیں جو سیرتِ پاک کے بارے میں ہماری بنیادی اور ضروری معلومات کا مآخذ ہیں اور جن کی ثقاہت کو قبول کیے بغیر کوئی مسلم بلکہ کوئی غیر مسلم سیرت نگار بھی دو گام آگے نہیں بڑھ سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ معجزات کے باب میں بھی اپنی ایک انفرادی اور امتیازی شان رکھتے ہیں۔ گذشتہ انبیا کرام کے معجزات کے عینی شاہد متعلقہ علاقوں اور زمانوں کے لوگ تھے۔ ایسے تمام معجزات کا علم آج ہمیں چند بچے کھچے صحائف آسمانی کے ذریعے سے ہی حاصل ہوتا ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ کے بہت سے معجزات کا تعلق بھی عصری مخاطبین سے تھا۔ تاہم حق تعالیٰ نے قافلہ راہِ ہدایت کے آخری حدی خواں ﷺ کو قرآن حکیم کی صورت میں سب سے بڑا اور زندہ جاوید معجزہ بھی عطا فرمایا۔ بلاشبہ دریاؤں کا رخ موڑ دینا اور مُردوں کو زندہ کر دینا بڑے معجزے ہیں۔ لیکن انسانی سوچ کے دھارے کا رخ موڑ دینا اور مردہ دلوں کو زندہ کر دینا ان سے بھی بڑا معجزہ ہے۔ اس معجزے کی بدولت صدیوں پر محیط روایات وتعصبات کے اسیر پتھر دل موم ہو گئے اور پیکرانِ محسوس کی عبادت کے خوگر انسان ایک حیی وقیوم مگر ان دیکھے اللہ کے اطاعت گزار بندے بن گئے۔

عقیدۂ توحید پر مبنی اس ذہنی وفکری انقلاب کا ایک منظر اہلِ دنیا نے وصالِ نبوی ﷺ کے

موقع پر بھی دیکھا تھا۔صحابہ کو حضور ﷺ سے جو محبت و عقیدت تھی اس کی کیفیت صلح حدیبیہ سے پہلے قریش کے ایک سفیر عروہ بن مسعود ثقفی (جو بعد میں مسلمان ہو گئے تھے) نے اہلِ مکہ کے سامنے کچھ یوں پیش کی تھی:

> ''محمد (ﷺ) جب وضو کرتے ہیں تو مسلمان ان کے غسالہ کو زمین پر گرنے سے پہلے اپنے ہاتھوں میں لینے کے لیے دوڑ پڑتے ہیں۔جب وہ بات کرتے ہیں تو سب کی آوازیں پست ہو جاتی ہیں۔ادب واحترام کی وجہ سے وہ انھیں آنکھ بھر کر دیکھتے نہیں ہیں۔''

دنیا و مافیہا سے محبوب تر اس شخصیت ﷺ کے انتقال کی خبر ان پر برقِ تپاں بن کر گری۔ آنِ واحد میں دنیا ان کے لیے گویا اندھیر ہوگئی۔حضرت عمر فاروقؓ جیسے مردِ آہن کے اعصاب جواب دے گئے۔انھوں نے تلوار نیام سے باہر نکالی اور کہا ''جو شخص کہے گا کہ محمد ﷺ فوت ہو گئے ہیں میں اس تلوار سے اس کی گردن مار دوں گا۔عین اس نازک موقع پر سیدنا حضرت ابو بکر صدیقؓ کی آواز گونجی۔''اے لوگو! جو شخص محمد ﷺ کو پوجتا تھا تو اُسے معلوم ہونا چاہیے کہ محمد ﷺ تو فوت ہو گئے۔لیکن جو شخص اللہ کی عبادت کرتا ہے تو یقیناً اللہ زندہ ہے اور اُس پر کبھی موت وارد نہ ہوگی۔''اس اندوہناک موقع پر قولِ صدیق جزوی طور پر ہی کارگر ہو سکتا تھا۔ان کے ہاں مکمل خود سپردگی قرآن وسنت کی سند کے ساتھ مشروط تھی۔اللہ کے محبوب پیغمبر اور اُن کے ہادی و رہنما ﷺ نے ان کی تربیت ہی اسی نہج پر کی تھی۔حضرت ابو بکر صدیقؓ سے بڑھ کر مزاجِ صحابہ کا رمز شناس کون ہو سکتا تھا۔لوہا گرم تھا۔وہ آگے بڑھے اور قرآن کی ایک آیت سے وہ شاہ ضرب لگائی جسے سنتے ہی نگاہوں پر سے تمام پردے ہٹ گئے۔سیدنا عمر فاروقؓ کو یوں لگا جیسے یہ آیہ مبارکہ آج اور اسی موقع کے لیے نازل ہوئی ہو:

> وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۚ أَفَإِن مَّاتَ أَوْ قُتِلَ انقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ ۚ وَمَن يَنقَلِبْ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ فَلَن يَضُرَّ اللَّهَ شَيْئًا ۗ وَسَيَجْزِي اللَّهُ الشَّاكِرِينَ ۝ (آل عمران: ۱۴۴)

"محمد اللہ کے رسول ہیں۔ ان سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں۔ اگر وہ وفات پا جائیں یا شہید کر دیے جائیں تو کیا تم اپنی ایڑیوں کے بل کفر کی جانب پھر لوٹ جاؤ گے؟ اور جو شخص اپنی ایڑیوں کے بل پھر جائے وہ اللہ کو ذرا بھی ضرر نہیں پہنچا سکتا۔ اور عنقریب اللہ شکر گزار بندوں کو نیک بدلہ دے گا۔"

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں مدینہ منورہ میں ہر شخص کی زبان اِس آیت کا ورد کر رہی تھی۔ اب صحابہ کرامؓ کو احساس ہوا کہ نہ صرف درِ یتیم ﷺ کی اُمت یتیم ہوگئی ہے بلکہ آپ کی محنت شاقہ سے قائم ہونے والی ریاست بھی لاوارث ہوگئی ہے۔ اسلام دشمن طاقتیں آپ کی وفات سے پیدا ہونے والے خلا سے بہت کچھ توقعات وابستہ کیے ہوئے تھیں۔ خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کو ابتدا ہی میں مرتدین، مانعین زکوٰۃ اور باغی قبائل کی سرکوبی کے لیے جو ہمہ جہتی اور ہمہ وقتی جنگ لڑنا پڑی، اس سے حالات کی سنگینی کا کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مذکورہ آیت مبارکہ کی سماعت کے بعد صحابہ کرامؓ یکسو ہوگئے کہ عقیدۂ توحید پر مبنی حکومت کا تسلسل اور استحکام کس قدر فوری اقدام کا متقاضی ہے۔ یہی موقع تھا جب غم واندوہ کے طوفان اور حزن وملال کے سیلاب کو اپنے اپنے سینوں میں دبائے یہ نفوسِ قدسیہ سقیفہ بنی ساعدہ میں پرامن انتقال اقتدار کے لیے شرعی حکم کے مطابق باہم مشاورت کے لیے جمع ہوگئے۔

یہ وہ زبردست انقلاب تھا جو حضورِ اکرم ﷺ کی صحبت میں رہنے سے صحابہ کرام کے اندر پیدا ہو چکا تھا۔(۲۰)

اللھم صل علی محمد و علی آل محمد

مراجع وحواشی

۱۔ سید قطب شہید...... اسلام میں عدلِ اجتماعی (العدالۃ الاجتماعیہ فی الاسلام)
ترجمہ ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی

۲۔ الغزالی...... (المنقذ من الضلال) Confessions of AlGhazali
Translated by Claud field
Sh. Muhammad Ashraf Lahore

۳۔ امین احسن اصلاحی...... فلسفے کے بنیادی مسائل قرآن حکیم کی روشنی میں (۱۹۹۱ء)...... فاران فاؤنڈیشن لاہور

۴۔ (الف) ڈاکٹر نصیر احمد ناصر...... سرگزشتِ فلسفہ حصہ دوم...... باب سقراط (۱۹۹۱ء)...... فیروز سنز لمیٹڈ لاہور
(ب) منصور الحمید...... سقراط (۱۹۹۴ء)...... دارالتذکیر لاہور

۵۔ رابرٹ وین ڈی ویر...... بدھ مت...... تاریخ، عقائد، فلسفہ مترجم ملک اشفاق (۲۰۰۷ء)
بک ہوم مزنگ روڈ لاہور
بحوالہ شانتی دیو بھدیکا آریادات ۲۔۷۔۹۔۲۸۔۳۳

۶۔ مختار حق...... نگارشات ڈاکٹر محمد حمید اللہ حصہ دوم...... بیکن بکس ملتان

۷۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ...... خطباتِ بہاول پور (۱۴۰۱ھ)...... اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور

۸۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ...... سیرتِ سرورِ عالم ﷺ جلد اول...... ادارہ ترجمان القرآن لاہور

۹۔ ڈاکٹر ذاکر نائیک...... اسلام اور ہندو مت بحوالہ بھگوت گیتا۔ باب ۷ آیت ۲۰
ترجمہ محمد زاہد ملک، مشتاق بک کارنر اُردو بازار لاہور

۱۰۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن...... Indian Philosophy
Vol-I

New York,Oxford University Press London. (1923)

۱۱۔ (الف) حمید اختر...... روزنامہ ایکسپریس ۲۴ جون ۲۰۰۵ء مضمون "کلکی اوتار"

(ب) ابن اکبر الاعظمی...... محمد ﷺ ہندو کتابوں میں...... دارالاندلس چوبرجی لاہور

۱۲۔ ڈاکٹر پنڈت وید پرکاش نے بجا طور پر کہا ہے۔ اب جبکہ گھوڑوں اور تلواروں کا زمانہ ختم ہو چکا ہے اور اُن کی جگہ گولا بارود اور میزائلوں نے لے لی ہے تو ہندو اپنے گھوڑ سوار اور شمشیر زن اوتار کا انتظار کیسے کر رہے ہیں۔ اس لیے انھیں پیغمبر اسلام ﷺ کو اپنا آخری اوتار تسلیم کر لینا چاہیے۔

۱۳۔ بائبل...... استثنا...... ۳۳...... ۲

اس آیت میں تین بشارتیں مذکور ہیں۔ (۱) طور سینا پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات کا عطا ہونا مراد ہے۔ (۲) ساعر ایک پہاڑی کا نام ہے۔ جو شہر ناصرہ مولد عیسیٰ میں واقع ہے۔ اس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت اور نزولِ انجیل کی طرف اشارہ ہے۔ (۳) فاران سے مراد ہے مکہ کا پہاڑ۔ اس میں نبی اکرم e کی رسالت اور نزولِ قرآن کی جانب اشارہ ہے۔

۱۴۔ بائبل...... یوحنا...... ۱۴...... ۲۶

مولانا محمد ادریس کاندھلوی نے اس موضوع پر بہت بصیرت افروز نکات پیش کیے ہیں۔ اُن کے نزدیک (۱) "اصل بشارت میں لفظ 'احمد' موجود تھا جیسا کہ انجیل برناباس میں اب بھی موجود ہے۔ (۲) جب انجیل کا عبرانی زبان سے یونانی زبان میں ترجمہ ہوا تو یونانیوں نے اپنی عادت کی بنا پر کہ وہ ترجمہ کرتے وقت ناموں کا ترجمہ بھی کر دیا کرتے تھے، آنحضرت ﷺ کے نام مبارک (احمد) کا ترجمہ بھی پیر کلوطوس سے کر دیا۔ (۳) جب یونانی نسخہ کا ترجمہ عربی زبان میں ہوا تو پیر کلوطوس کا معرب فارقلیط کر لیا گیا۔ (۴) ایک عرصہ تک اُردو، فارسی اور عربی نسخوں میں فارقلیط کا لفظ رہا۔ اس کے بعد اس کا ترجمہ روح القدس سے کیا گیا اور مسیحین روح القدس کے لفظ کو بطور تفسیر خطوط وحدانی میں لکھتے رہے۔ رفتہ رفتہ فارقلیط کے لفظ کو حذف کر دیا۔ (۵) پھر کسی نے فارقلیط کی جگہ 'روح القدس' کا لفظ اور کسی نے 'روح حق' کا لفظ اور کسی نے "مددگار" اور "تسلی دینے والے" کا لفظ رکھ دیا اور فارقلیط کے لفظ کو نسخوں سے بالکل حذف کر دیا۔ (۶) ان تحریفات وتغیرات کے باوجود پھر بھی مدعا حاصل ہے۔ اس لیے کہ بشارت میں فارقلیط کے جو اوصاف بیان کیے گئے ہیں وہ

محمد ﷺ پر پوری طرح منطبق ہوتے ہیں۔" (سیرت المصطفےٰ جلد اوّل)

۱۵۔ (الف) ابن کثیر...... البدایہ والنہایہ...... دار ابن کثیر بیروت۔لبنان

(ب) ابن ہشام...... دار احیاء التراث بیروت۔لبنان (نفیس اکیڈمی کراچی)

۱۶۔ بائبل...... استثناء...... باب ۲۳۔۱۹۔۲۰

۱۷۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ...... تفہیم القرآن (جلد دوم)...... تفسیر سورۃ الاعراف...... ادارہ ترجمان القرآن لاہور

۱۸۔ بائبل...... متی...... ۲۳:۲۔۳

۱۹۔ ڈاکٹر گستاولی بان...... Arabes-Des-Civilization...... ترجمہ "تمدن عرب" از علی بلگرامی...... مقبول اکیڈمی لاہور

۲۰۔ منٹگمری ڈبلیو واٹ...... Muhammad-The Prophet and Statesman

حصہ دوم

آفتابِ رسالت ﷺ کی ضیا پاشیاں

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو
آں کہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفیٰ او را بہا ست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ ست

پیغمبرِ انقلاب ﷺ ...... بحیثیت مدبّرِ سیاست

سیاست بظاہر ایک معتوب لفظ ہے۔ فی زمانہ سیاسی طالع آزماؤں نے علاقائی اور بین الاقوامی امن کو جس طرح خاکستر کر رکھا ہے، سیاسی جدوجہد میں اخلاقی اصولوں اور انسانی اقدار کو جس بے دردی سے پامال کیا جاتا ہے اس کی روشنی میں عام ذہن کسی نوع کی سیاسی سرگرمی کو شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھے تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ ایک شاعر نے سیاست دانوں کے مشکوک کردار کو کس خوبصورتی سے شعر کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔

خلوصِ دل میں نہ پاکیزگی ہے اشکوں میں
جہانِ عشق کا ماحول بھی سیاسی ہے

فی الواقع سیاست اگر وہی کچھ ہے جو ہم اپنے گردوپیش دیکھتے ہیں اور انصاف، عدل، توازن، رواداری اور وسیع النظر فی کی قدریں سیاسی نقطہ نظر سے بے معنی ہیں تو بلاشبہ حضور ﷺ کی زندگی سیاست کی جملہ آلودگیوں سے پاک صاف ہے۔ تاہم یہ رویہ سیرت اور فن سیاست دونوں پہلوؤں سے محل نظر ہے۔ نہ تو علم سیاست کو دجل وفریب اور کذب وافترا کا ہم معنی سمجھنا صحیح ہے اور نہ تاریخی اور دینی نقطہ نظر سے سیرت طیبہ کے سیاسی پہلو کی اہمیت کو کم کیا جاسکتا ہے۔ سیاست کتاب زندگی کا اہم ترین باب ہے۔ پیغمبر انسانیت ﷺ نے جہاں تہذیب وثقافت، معاشرت اور معیشت کے گیسو سنوارے، وہاں سیاسیات کی گتھیوں کو بھی ناخن حکمت سے سلجھایا۔ وقت کے شاطروں نے آپ ﷺ کے خلاف ہر پست اور گھٹیا حربہ آزمایا لیکن آپ ﷺ کی پیغمبرانہ فراست کے سامنے تمام مخالفتیں اور سازشیں ناکام ہوگئیں۔ سیاستِ نبوی ﷺ دراصل آسمانی رفعتوں اور زمینی حقیقتوں کے نقطہ اتصال کا دوسرا نام ہے۔ حیات طیبہ کے مطالعہ سے سیاسیات کے سنجیدہ طالب علم کو

جہاں یہ علم ہوتا ہے کہ فن سیاست کس چیز کا نام ہے وہاں یہ شعور بھی ملتا ہے کہ اس فن کی اعلیٰ و ارفع روایات کیا ہیں؟ گویا اسوۂ حسنہ کی بدولت سیاست بیانیہ (Descriptive) حدود سے نکل کر داعیانہ (Prescriptive) دائرے میں داخل ہو گئی۔ کم از کم نظری اور فکری سطح پر عصری و بین الاقوامی سیاست کا یہ بھی ایک معروف رجحان ہے۔(۱)

حضور ﷺ کے سیاسی مقام سے متعلق ایک اور غلط فہمی کو دور کرنا بھی ضروری ہے۔ ٹائن بی، واٹ اور بہت سے دوسرے مستشرقین کا دعویٰ ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ شروع میں تو ایک اخلاقی و روحانی مصلح تھے۔ لیکن ہجرت مدینہ کے بعد آپ ﷺ سیاسی انقلاب کے داعی بن گئے۔ چنانچہ آپ ﷺ کے مکی دور کو تبلیغی و اخلاقی اور مدنی دور کو کلیۃً سیاسی و توسیعی دور قرار دیا گیا۔ اخلاق و سیاست کی اسی تفریق کی بنا پر حضور ﷺ کی سیاسی زندگی کے مطالعے کا آغاز مدنی زندگی سے کیا جاتا ہے۔ بعض مسلمان اہلِ قلم بھی پورے خلوص کے ساتھ حضور ﷺ کی مکی زندگی کو جمالِ نبوی ﷺ کا دور اور مدنی زندگی کو جلالِ نبوی ﷺ کا دور قرار دیتے ہیں۔

یہ طرزِ فکر حیاتِ طیبہ کے جملہ پہلوؤں کی ناقص تعبیر پر مبنی ہے۔ اگر مطلب اس قدر ہے کہ حضور ﷺ کی عملی سیاست واضح طور پر ہجرت کے بعد شروع ہوتی ہے تو اس خیال کو قبول کر لینے میں حرج نہیں۔ لیکن اس سے مراد اگر یہ ہو کہ مکی زندگی میں حضور ﷺ صرف پیغمبر (Prophet) تھے اور مدنی دور میں محض مدبرِ سیاست (Statesman) نظر آتے ہیں یا یہ کہ حضور ﷺ کے پیغمبرانہ منصب پر آپ ﷺ کی سیاسی حیثیت بتدریج غالب آ گئی تو یہ بات بدیہی طور پر غلط ہے۔ اس لیے کہ آپ ﷺ کی پوری زندگی ایک مکمل وحدت (Organic whole) ہے۔ یہاں نبوت اور سیاست میں کوئی اصطلاحی تضاد موجود نہیں۔ دعوتِ اسلامی کے تبلیغی و اصلاحی دور میں سیاسی عزائم کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں اور سیاسی دور میں بھی اخلاقی وابستگی اپنے شباب پر نظر آتی ہے۔ مکی زندگی میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اعلان پورے جاہ و جلال کے ساتھ کیا جاتا ہے اور مدنی زندگی کے معرکہ ہائے حق و باطل میں بھی جمالِ نبوی ﷺ کے مظاہر جا بجا نظر آتے ہیں۔ مثلاً جب

آپ ﷺ مکہ کے قحط زدہ علاقے میں اقتصادی امداد بھیجتے ہیں تو اس کا خالص مقصد یہ ہے کہ دشمنوں کو بھی تکلیف میں دیکھنا خلق پیغمبری سے بعید ہے۔ اسیرانِ بدر کو مشکیں کس کر مسجد نبوی میں لایا گیا تھا۔ رات گئے آپ نے اُن کی آہ و بکا سنی تو آپ کو اُس وقت تک چین نہ آیا جب تک آپ کے حکم سے اُن سب کی مشکیں ڈھیلی نہ کر دی گئیں۔ جنگی قیدیوں سے حسن سلوک معاذ اللہ کوئی سیاسی چال نہیں ،انسانی جان کے غیر متزلزل احترام کا روحانی اظہار ہے۔ منافقین مدینہ کے کرتوتوں سے مسلسل چشم پوشی نہ کی جاتی تو دشمنوں کو پروپیگنڈا کرنے کا موقع مل جاتا کہ محمد ﷺ تو خود اپنے ہی ساتھیوں کا قتل عام کر رہے ہیں۔ اس روادارانہ پالیسی کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر آپ ﷺ ظاہری ثبوت کے بغیر ان کی باطنی عداوت ہی کی بنا پر سزا دیتے تو اسلامی قانون میں ایک نظیر قائم ہو جاتی۔ منافقت کا الزام لگا کر مخالفین کو تہہ تیغ کرنا جائز ٹھہرتا۔ فاتح مکہ ﷺ کی ایک ایک ادا سے پاک باطنی اور روحانیت جھلکی پڑتی ہے۔ خطبہ حجۃ الوداع آج بھی رنگ و نسل، ذات اور علاقوں میں بٹی ہوئی انسانیت کے لیے ایک عظیم روحانی پیشکش ہے۔

اسی طرح اسلام کے ابتدائی دور میں حضور ﷺ اپنی سیاسی ذمہ داریوں سے بے خبر نہ تھے۔ مکہ کے تاجر اور کعبہ کے مجاور خوب جانتے تھے کہ اسلام محض اخلاقی فضائل کا درس نہیں دیتا، سماجی مسائل کے بارے میں بھی واضح احکامات دیتا ہے۔ وہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ لاالہ الا اللہ سے مراد اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ ہے۔ (۲) اللہ تعالیٰ کو واحد ماننے کا مطلب اپنے سارے طبقاتی امتیازات سے دستبردار ہونا ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو وہ حضور ﷺ کی مخالفت میں یوں اپنا سب کچھ داؤ پر نہ لگا دیتے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ بعض نافہم لوگ اس دعوت کے سیاسی مضمرات سے غافل بھی تھے تو آپ ﷺ نے خود آگے بڑھ کر ان کی خوش فہمیوں کو دور کر دیا۔

ایک بار حضور ﷺ حدودِ حرم میں داخل ہوئے اور کعبہ کے کلید بردار عثمان بن طلحہ سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ آپ ﷺ کے لیے درِ کعبہ وا کر دے تا کہ آپ ﷺ نماز ادا کر سکیں۔ اس نے صاف انکار کیا۔ اس پر آپ ﷺ نے کامل یقین کے ساتھ فرمایا:

''ایک دن آئے گا جب یہ کنجی میرے اختیار میں ہو گی اور میں جسے چاہوں گا عطا کروں گا۔''

عثمان بن طلحہ نے کہا: ''پھر وہ دن ضرور قریش کی تباہی اور رسوائی کا دن ہو گا۔''

آپ ﷺ نے فرمایا۔ ''نہیں! اس دن وہ آباد اور باعزت ہوں گے۔'' (۳)

انھی دنوں رومی سلطنت کو ایرانیوں کے ساتھ مقابلے میں شکست فاش ہوئی۔ رومی بہر حال اہل کتاب تھے جبکہ ان کے ایرانی حریف پکے مشرک تھے۔ مشرکین مکہ رومیوں کی شکست اور ایرانیوں کی فتح پر مسلمانوں کے سامنے بغلیں بجاتے۔ وہ یہ دعویٰ بھی کرتے کہ آنے والا دور شرک کی بالادستی کا دور ہے اور مسلمان گویا ایک ہاری ہوئی جنگ لڑ رہے ہیں۔ اس وقت دور دور تک اس بات کا امکان نہ تھا کہ مستقبل قریب میں سیاسی حالات پلٹا کھا جائیں گے اور رومی کبھی دوبارہ سنبھل سکیں گے۔ خود مشہور مورخ گبن اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے خلاف اپنے تعصب کو چھپانے کی کوئی کوشش نہیں کرتا۔ اسی تعصب کے زیر اثر اس نے اسلام کی غیر معمولی ترقی اور تیز رفتار وسعت کو دو خود ساختہ منفی محرکات ...... عربوں کے جبلی لوٹ مار کے جذبے کی تسکین اور لامحدود جنسی آزادی ...... سے منسوب کیا۔ لیکن اس مقام پر وہ بھی قرآن کی معجزاتی سچائی پر حیرت کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکا۔ (۴) ہجرت سے چھ سات سال قبل سورۃ الروم کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں۔ جن میں عنقریب ایرانیوں کی شکست، رومیوں کی فتح اور خود مسلمانوں کی کامرانیوں کی خوشخبری دی گئی:

الٓمٓ ۝ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۝ فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ۝ فِیْ بِضْعِ سِنِيْنَ ۗ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ ۗ وَيَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ (الروم: ۱۔ ۴)

''ا۔ ل۔ م۔ رومی قریب کی سرزمین میں مغلوب ہو گئے ہیں اور اپنی اس مغلوبیت کے بعد چند سال کے اندر وہ غالب آ جائیں گے۔ اللہ ہی کا اختیار ہے پہلے بھی اور بعد میں بھی۔ اور وہ دن وہ ہو گا جب کہ اللہ کی بخشی ہوئی فتح پر مسلمان

خوشیاں منائیں گے۔"

ان آیات کے شانِ نزول کے بارے میں تفاسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ کفارِ مکہ اور مسلمانوں کے مابین عالمی سیاسی صورتِ حال بھی زیرِ بحث رہا کرتی تھی۔

قرآن کی مذکورہ آیات کا کفارِ مکہ نے مضحکہ اڑایا۔ ابی بن خلف نے تو باقاعدہ حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ شرط لگائی کہ اگر تین سال کے اندر رومی فتح یاب ہو گئے تو میں دس اونٹ دوں گا۔ بصورتِ دیگر حضرت ابوبکرؓ دس اونٹ دیں گے۔ (ابھی شرط کی حرمت کا حکم نازل نہ ہوا تھا۔) حضور ﷺ کو علم ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا۔ قرآن میں "فی بضع سنین" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ عربی زبان میں بضع کا لفظ دس سے کم کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس لیے آپ ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ کو ہدایت فرمائی کہ شرط کو دس سال تک بڑھا دو اور اونٹوں کی تعداد سو کر دو۔ یہ پیش گوئی غزوۂ بدر کے موقع پر یوں پوری ہوئی کہ اہلِ روم نے اہلِ عجم کو شکست فاش دے دی۔ قیصر و کسریٰ کی اس کشمکش کے مختلف ادوار میں پیغمبر اسلام ﷺ اور اہلِ اسلام کی دلچسپی یہ واضح پیغام دے گئی کہ حضور ﷺ روایتی معنوں میں کوئی مذہبی مصلح نہیں، ایک ایسے اولوالعزم پیغمبر ہیں جو سیاسی حالات و واقعات سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتے۔

اصلاحِ عقائد اور تطہیر افکار

افکار و نظریات کسی نظام اجتماعی کی اساس ہوتے ہیں۔ نئے افکار و عقائد پر مبنی نظام اسی وقت قائم ہو سکتا ہے جبکہ مروجہ اوہام و تخیلات کی بساط لپیٹ کر رکھ دی جائے۔ حضور ﷺ نے سب سے پہلے فکری اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ کفارِ مکہ کی ذہنی سطح جیسی کچھ تھی، اس کا اندازہ لگانا ہو تو ان مافوق الفطرت مطالبات کو ایک نظر دیکھ لینا کافی ہے جن کا سامنا حضور ﷺ کو کرنا پڑا۔ قرآن پاک میں ان مطالبات کی ایک فہرست کا ذکر کیا گیا ہے:

> "اور انھوں نے کہا ہم تیری بات نہ مانیں گے جب تک کہ تو ہمارے لیے زمین کو پھاڑ کر ایک چشمہ جاری نہ کر دے یا تیرے لیے کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ

پیدا ہو اور تو اس میں نہریں رواں کر دے یا تو آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہمارے اوپر گرا دے جیسا کہ تیرا دعوٰی ہے یا اللہ اور فرشتوں کو رُو در رُو ہمارے سامنے لے آئے یا تیرے لیے سونے کا ایک گھر بن جائے یا تو آسمان پر چڑھ جائے اور تیرے چڑھنے کا بھی ہم یقین نہ کریں گے جب تک کہ تو ہمارے اوپر ایک ایسی تحریر نہ اتار لائے جسے ہم پڑھیں۔" (بنی اسرائیل: ۹۰۔ ۹۳)

توحید، رسالت اور آخرت اسلامی نظام حیات کی فکری بنیادیں ہیں۔ سب سے پہلے حضور ﷺ نے انھی عقائد کو ذہنوں میں راسخ کرنے کی کوشش کی۔ کفار مکہ نے جواباً جو اعتراضات وارد کیے وہ اُن کی گمراہ ذہنیت کی پوری عکاسی کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے بارے میں بعض لوگوں کا عقیدہ یہ تھا کہ کائنات کو کسی خالق کی تخلیق ماننا ایک بے بنیاد بات ہے۔ اکثر لوگ خدائے برتر کو مانتے بھی تھے لیکن ساتھ ہی یہ عقیدہ بھی رکھتے تھے کہ بہت سی دوسری ہستیاں بھی خدا کی خدائی میں شریک ہیں اور خدا تک پہنچنے کے لیے ان کی چوکھٹ پر جبین نیاز جھکانا لازمی ہے۔ ان کو مخاطب کر کے فرمایا گیا: "اللہ کو چھوڑ کر جنھیں تم پکار رہے ہو انھوں نے ایک مکھی بھی پیدا نہیں کی ہے چاہے وہ سب مل کر ایسا کرنا چاہیں۔ بلکہ مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے جائے تو وہ اس سے چھڑا بھی نہیں سکتے۔ مدد چاہنے والے بھی کمزور اور جن سے مدد چاہی جاتی ہے وہ بھی کمزور۔" (سورۃ الحج: ۷۳۔ ۷۴)

رسول کو وہ زیادہ سے زیادہ ایک ایسی ہستی سمجھتے تھے جس سے ہمہ وقت محیر العقول واقعات صادر ہوتے رہتے ہیں۔ ان کا فیصلہ یہ تھا کہ گوشت پوست اور انسانی ضروریات رکھنے والا کوئی شخص رسول نہیں ہو سکتا۔

"اور وہ کہتے ہیں یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔" (الفرقان: ۷)

ان کو سمجھایا گیا کہ انسانوں کی ہدایت کے لیے انسان ہی کو مبعوث ہونا چاہیے۔

''ان سے کہو کہ اگر زمین میں فرشتے آرام سے چل پھر رہے ہوتے تو ہم ضرور آسمان سے کسی فرشتے کو ان کے لیے پیغمبر بنا کر بھیجتے۔'' (بنی اسرائیل:۹۵)

عقیدۂ آخرت اور حیات بعد از موت کو وہ لوگ خارج از امکان سمجھتے تھے۔ ان کی منطق یہ تھی کہ مر کر خاک ہو جانے کے بعد حیاتِ نو کیوں کر ممکن ہے۔ قرآن کریم نے انھیں یاد دلایا کہ خشک اور بنجر زمین بھی بارانِ رحمت کے بعد سرسبز و شاداب ہو جاتی ہے۔ ایک جگہ فرمایا: كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ۝ (الاعراف:۲۹) ''جس طرح اس نے تمھیں پیدا کیا ہے اسی طرح تم پھر پیدا کیے جاؤ گے۔'' رہی یہ بات کہ ہمارا نامۂ اعمال کہاں سے اکٹھا کیا جائے گا تو قرآن نے اس بارے میں بلیغ اشارہ کیا: قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ ۚ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ۝ (سورۃ ق:۴) ''زمین ان میں سے جو کچھ کھا لیتی ہے وہ سب ہمارے علم میں ہے اور ہمارے پاس ایک کتاب ہے جس میں سب کچھ محفوظ ہے۔'' جدید سائنس کے انکشافات کی روشنی میں ہمارے لیے یہ ماننا اور بھی آسان ہو گیا ہے کہ انسانی خیالات، اقوال و اعمال میں سے کوئی چیز بھی نظام کائنات سے محو نہیں ہوتی اور کسی وقت بھی ان کو پوری صحت کے ساتھ برسرِ عمل دکھانا ممکن ہوگا۔ (۵)

اس طرح حضور ﷺ ذہنی بیداری کا کام کرتے رہے۔ قرآن کے دلنشین طرزِ استدلال نے معترضین کے منہ بند کر دیے تھے۔ آپ ﷺ نے عرب کے بدوؤں کو انفس و آفاق میں فکر و تدبر کا خوگر بنایا۔ فکری انقلاب کے اس عمل میں قرآن کے ساتھ ساتھ حضور ﷺ کا بے داغ کردار بھی دعوتِ فکر دے رہا تھا۔ آپ ﷺ کی زندگی ایک کھلی کتاب تھی۔ فسق و فجور سے اٹے ہوئے ماحول میں آپ ﷺ کی مثال ایسی تھی جیسے سنگریزوں کے ڈھیر میں کوہِ نور ہیرا چمک رہا ہو۔ آپ ﷺ ہی کو یہ حق تھا کہ اہل عرب کو چیلنج کرتے فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۝ (یونس:۱۶) ''میں اس سے پہلے تم میں اپنی عمر گزار چکا ہوں۔ کیا تم پھر تعقل سے کام نہ لو گے۔''

حضور ﷺ کے کلمۂ انقلاب نے دیکھتے ہی دیکھتے عرب کے ساکن ماحول میں حرکت و حرارت کی توانا لہریں پیدا کر دیں۔ سعید روحیں آپ ﷺ کے گرد جمع ہوتی گئیں۔ مفاد پرستی کے بجائے

خدا پرستی کی یہ دعوت نسلی تفاخر، معاشی تفاوت اور سیاسی سیادت کے لیے برقِ خاطف سے کم نہ تھی۔ کس کی ہمت تھی کہ قرآن کے زورِ استدلال اور حضور ﷺ کے صاف وشفاف کردار کے مقابلے میں ٹھہرا رہتا۔ اس لیے کردار کشی (Character Assassination) کی مہم شروع ہوگئی۔ افواہ سازی کے کارخانے حرکت میں آ گئے۔ اس ضمن میں چند منظم کوششوں کا ذکر ضروری ہے۔

کفار کی سیاسی چالیں

ایام حج میں باہر سے آنے والے لوگوں میں دعوتی اثرات کو روکنے کے لیے قریشی سرداروں کی ایک مجلس شوریٰ دارالندوہ میں منعقد ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ کو نعوذ باللہ مجنوں، شاعر اور سحر زدہ شخص کے طور پر بدنام کرنے کے امکانات پر غور ہوا۔ ولید بن مغیرہ نے یکے بعد دیگرے سب تجاویز کو رد کر دیا۔ اس کی اپنی تجویز کو بالاتفاق منظور کر لیا گیا۔ طے پایا کہ محمد ﷺ کو ایک ایسے جادوگر کے طور پر پیش کیا جائے جن کا کلام سن کر باپ بیٹا اور میاں بیوی میں جدائی پڑ جاتی ہے۔(۶) سورۃ المدثر میں ولید بن مغیرہ کی انھی حرکتوں کی وجہ سے ان کا نام لیے بغیر مذمت کی گئی ہے۔ اس تجویز کی زہرناکی کو وہی لوگ محسوس کر سکتے ہیں جو قبائلی نظام میں خونی رشتوں کی اہمیت سے واقف ہوں۔(۷)

حضور ﷺ اور آپ کے صحابہؓ کے خلاف قبائلی عصبیت بھڑکانے کے علاوہ مذہبی تعصب بھڑکانے سے بھی دریغ نہ کیا گیا۔

حبشہ میں ان کا بھیجا ہوا وفد اپنے سفارتی تجربے اور تحائف کے باوجود ناکام رہا تو آخری خطرناک وار یہ کیا گیا: ''اے بادشاہ ان لوگوں نے اپنے آبائی مذہب کو تو چھوڑا ہی تھا، آپ کے مذہب کو بھی اختیار نہیں کیا۔ ذرا ان سے پوچھیے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ان کا عقیدہ کیا ہے؟ بادشاہ نے مسلمانوں سے اس بارے میں وضاحت طلب کی۔ حضرت جعفر طیارؓ نے سورۃ مریم کی آیات تلاوت کر دیں۔ ظاہر ہے مسلمان حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ابن اللہ نہیں، عبداللہ اور رسول اللہ مانتے ہیں۔ سورۃ مریم میں یہی عقیدہ بیان کیا گیا ہے۔ شاہِ حبش نے ایک تنکا اٹھا کر خود اعلانِ حق کیا

اور کہا بلاشبہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں جو کچھ پیش کیا گیا، وہ اس سے ایک تنکا بھی کم یا زیادہ نہیں ہیں۔

ہجرت حبشہ اس حقیقت کی بیّن دلیل ہے کہ دعوتِ اسلامی نے ابتدائی چند برسوں کے اندر مکۃ المکرمہ میں عربوں کے اندر فکر و عمل کا کتنا بڑا انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ مومن مردوں اور عورتوں نے دعوتِ دین کو قبول کرنے کے بعد وطن چھوڑ دیا، دین کو نہیں چھوڑا۔ نجاشی شاہِ حبش کے دربار میں حضرت جعفر طیارؓ کی ولولہ انگیز تقریر سے عیاں ہے کہ عقیدۂ توحید ایک زبردست قوت کا نام ہے اِس عقیدہ کی برکت تھی کہ اپنے قبائلی سرداروں کے سامنے چپ سادھ لینے والے اجنبی سرزمین میں شاہانِ وقت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے لگے۔ سردارانِ قریش کے استغاثہ کے بعد نجاشی نے مسلمان مہاجرین کو صفائی کا موقع دیا تو ان کے نمائندے حضرت جعفر طیارؓ کے مختصر خطاب سے دربار میں سناٹا چھا گیا:

> ”اے بادشاہ! ہم لوگ ایک جاہل قوم تھے۔ بتوں کی پوجا کرتے تھے۔ مردار کھاتے تھے۔ بدکاریاں کرتے تھے۔ اپنوں سے دشمنی رکھتے تھے۔ پڑوسیوں سے برا سلوک کرتے تھے۔ قوی لوگ کمزوروں کو کھا جاتے تھے۔ ہم اس جہالت میں تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم میں سے ایک رسول ہماری طرف بھیجا۔ جس کے نسب ،صدق و امانت اور پرہیزگاری سے ہم لوگ پہلے سے واقف تھے۔ اس نے ہم کو یہ دعوت دی کہ ہم اللہ کو ایک جانیں۔ اسی کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ بتوں کی پوجا جو ہم اور ہمارے باپ دادا کیا کرتے تھے چھوڑ دیں۔ سچ بولا کریں۔ امانت ادا کریں۔ اپنوں سے محبت و سلوک رکھیں۔ ہمسایوں سے نیک سلوک کریں۔ محارب اور خونریزی سے باز آئیں۔ یتیموں کا مال نہ کھائیں۔ عفیف عورتوں پر تہمت نہ لگائیں۔ نماز پڑھیں۔ صدقہ دیں۔ روزے رکھیں۔ پس ہم اس پر ایمان لے آئے۔ اللہ کی عبادت کرنے لگے۔

شرک و بت پرستی چھوڑ دی۔ حرام کو حرام اور حلال کو حلال جاننے لگے۔ اس جرم پر ہماری قوم ہم پر ٹوٹ پڑی اور اذیت دے کر مجبور کرنے لگی کہ ہم اللہ کی عبادت چھوڑ کر پھر بتوں کو پوجنے لگ جائیں اور خبائث کو بدستور سابق حلال سمجھیں۔ جب انھوں نے ہم پر قہر و ظلم کیا اور ہمارے فرائض مذہبی کی بجا آوری میں سدِ راہ ہو گئے تو ہم آپ کے ملک میں آپ کی پناہ میں آ گئے۔ ہمیں امید ہے کہ آپ کے ہاں ہم پر ظلم نہ ہوگا۔"(۸)

داعی ﷺ اور دعوت کے خلاف جھوٹا پروپیگنڈا ناکام ہوتا نظر آیا اور اہلِ ایمان کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہونے لگا تو دارالندوہ کے سیاسی دماغوں نے معاملے کو ایک دوسرے انداز سے حل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت حق و باطل کی کشمکش کھل کر سامنے آ گئی تھی۔ تاہم ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو ابھی خاموش تماشائی تھا۔ اس قسم کے لوگ بحرانی دور میں حالات و واقعات کا واضح شعور نہیں رکھتے اور روز افزوں کشمکش کے امکانی نتائج سے خائف ہوتے ہیں۔ انقلاب دشمن طاقتوں کی اپنی جگہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ ایسے لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کریں۔ اس سلسلے کی ایک کوشش حضور ﷺ کے سامنے مصالحت کی پیشکش تھی۔ کفار کو پوری توقع تھی کہ آپ ﷺ اس پیشکش کو مسترد کر دیں گے اور غیر جانبدار لوگ پکے پھل کی طرح ان کی گود میں آ گریں گے۔ چنانچہ ان کا ایک وفد جناب ابو طالب کے پاس پہنچ گیا۔ اس وفد میں تقریباً ۲۵ اشرافِ قریش شامل تھے۔ ان میں عتبہ بن ربیعہ، ابوجہل بن ہشام، ابوسفیان بن حرب اور امیہ بن خلف وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ کفار کے رویہ میں اس اچانک تبدیلی پر جناب ابو طالب کو حیرت ہوئی۔ انھوں نے حضور ﷺ کو بلا کر نصیحت کی کہ صنادید قریش سمجھوتہ کرنے آئے ہیں۔ ان کی بات کو ضرور وزن ملنا چاہیے۔ آپ ﷺ نے ارکانِ وفد سے سمجھوتے کی شرط پوچھی تو انھوں نے کہا۔ آپ ہمارے مذہب پر تنقید نہ کریں، ہم آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے دین سے تعرض نہ کریں گے۔ صاف ظاہر تھا کہ قریش رہ و رسم جاہلیت کو بہر صورت بچانا چاہتے تھے۔ ادھر اہلِ مکہ کی نظریں اس

مصالحانہ کوشش کے نتائج پر لگی ہوئی تھیں۔ آپ ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا:

نعم کلمة واحدة تعطونیها تملکون بها العرب و تدین لکم بها العجم۔ (۹)

''اچھا اے سرداران قریش! تم مجھے ایک کلمے کا قول دے دو جو تمھیں عرب و عجم کا مالک بنا دے گا۔''

یہ جواب متضاد سیاسی تقاضوں سے بیک وقت عہدہ برآ ہونے کی کامیاب ترین مثال ہے۔

۱۔ سرد جنگ میں جب فریق مخالف آمادۂ مصالحت ہو تو جواب میں چھوٹتے ہی ''نہیں'' کا لفظ عوام الناس کی ہمدردیاں کھو دینے کا باعث بنتا ہے۔ فریق مخالف رائے عامہ کو یہ تاثر دیتا ہے کہ ہم تو امن پسند ہیں البتہ دوسری جانب سے مخالفت برائے مخالفت پر اصرار ہے۔ حضور ﷺ نے اس بات کو ''لا'' سے نہیں بلکہ ''نعم'' سے شروع فرمایا۔ مقصود یہ تھا کہ میں بھی آپ سے متفق ہوں، صلح و آشتی اور امن و سکون کی خواہش قابل قدر ہے بس صرف ایک بات تصفیہ طلب ہے.........(۱۰)

۲۔ اصولوں کی قیمت پر سودے بازی کسی انقلابی دعوت کے مزاج ہی کے خلاف ہے۔ لیکن جب مخالفین مفاہمت کا شوشہ چھوڑ دیں تو جواباً اپنی طرف سے ایک متوازی شرط رکھ کر دشمن کو دفاعی پوزیشن پر دھکیل دیا جاتا ہے۔ حضور ﷺ نے ان کی بات کا جواب دینے کے بجائے اپنی طرف سے ایک شرط پیش کر دی۔ ابوجہل جھٹ بول اٹھا: ایک کیا ہم دس باتیں ماننے کو تیار ہیں۔ حضور ﷺ نے وہ کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پیش کیا، تو وہ خود ہی یہ کہتے ہوئے چل دیے۔ ''یہ بھی خوب کہی۔ یعنی ہم سارے معبودوں کو چھوڑ دیں۔'' نشانہ خطا ہو گیا۔ عوام یہ سوچنے پر مجبور ہوئے کہ عمائدین قریش ہی بے جا ہٹ دھرمی کر رہے ہیں۔ بات ہی کیا تھی جو ایک کلمہ مان لیتے اور روز روز کا جھگڑا ختم ہوتا۔ (۱۱)

۳۔ عام لوگ بے تابی سے مذاکرات کے نتائج کا انتظار کر رہے تھے۔ عوام تک ویسے بھی

حضور ﷺ کا موقف اور آپ ﷺ کا پروگرام پہنچنے نہیں دیا جاتا تھا۔ مذاکرات کی تفصیلات کا چرچا عام ہوا تو ایک تاثر یہ بھی ابھرا کہ پیغمبر اسلام ﷺ اور داعی انقلاب ﷺ کے مقابلے میں قریش کے پاس کوئی ٹھوس پروگرام نہیں ہے۔

ہجرت اور اسلامی حکومت کی تاسیس

سیاست نبوی ﷺ میں ہجرت مدینہ کو ایک اہم ترین موڑ کی حیثیت حاصل ہے۔ مخالفین کو اپنی دانش اور داؤ پیچ ناکام ہوتے نظر آئے تو جبر و تشدد کا سہارا لیا گیا۔ ایذا رسانی کے نئے نئے طریقے اہل ایمان پر آزمائے گئے۔ قائدِ انقلاب اور آپ ﷺ کے اہل خانہ کا سماجی اور اقتصادی بائیکاٹ کیا گیا۔ یہاں تک کہ حضور ﷺ پر قاتلانہ حملے کے منصوبے بنائے گئے۔ انھی حالات میں حضور ﷺ نے بعض صحابہؓ کو حبشہ چلے جانے کا حکم دیا۔ وہاں مسلمانوں کو بے شک تحفظ مل گیا۔ پھر بھی حبشہ کو مستقل دار الہجرت قرار نہیں دیا گیا کیونکہ یہ ملک عرب سے اتنی دور تھا کہ ہر دو مقامات کے مابین بآسانی رابطہ ممکن نہ تھا۔ حضور ﷺ کا سفرِ طائف بھی سازگار ماحول کی تلاش کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ طائف میں حالات جس قدر ناموافق نکلے اس کا اندازہ خود حضور ﷺ کے الفاظ سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ کسی موقع پر اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ نے آپ ﷺ کی زندگی کے سب سے تکلیف دہ زمانے کے متعلق پوچھا۔ تو آپ ﷺ نے سفرِ طائف کا حوالہ دیا۔ (مسند احمد) طائف سے واپسی پر آپ ﷺ نے ایام حج میں باہر سے آنے والے زائرین تک دعوت کا کام پھیلا دیا۔ یہاں بھی آپ ﷺ کا پیچھا نہ چھوڑا گیا۔ قریش کا ایک نمایندہ سائے کی طرح آپ ﷺ کے پیچھے لگا رہتا جو گلا پھاڑ پھاڑ کر آپ ﷺ کو مجنون اور جادوگر بتاتا۔ یہ شخص قبائل عرب کو خبردار کرتا کہ محمد ﷺ کو مدد دینا قریش کے خلاف کھلی جنگ میں شریک ہونا ہے۔ قریش کی حفاظتی تدابیر کے باوجود حضور ﷺ چند افراد سے تنہائی میں ملے۔ یہ لوگ یثرب کے قبائل ...... اوس و خزرج ...... سے تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے علمائے یہود سے ایک نئے پیغمبر کی آمد کے بارے میں بارہا سن رکھا تھا۔ یہود سے قربت کی بدولت تصورِ توحید بھی ان کے لیے کچھ ایسا اجنبی نہ تھا۔ ان لوگوں نے بخوشی

اسلام قبول کر لیا۔ اگلے سال ان کے کچھ اور افراد حلقۂ اسلام میں داخل ہوئے۔ ہر دو مواقع پر حضور ﷺ اور اہل یثرب کے درمیان جو عہد و پیمان ہوئے انھیں بیعت عقبۂ اولیٰ اور بیعت عقبۂ ثانیہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ آپ ﷺ کو مدینہ آنے کی دعوت دی گئی۔ بیعت سے پہلے حضرت اسعد بن زرارہؓ نے بیعت میں شریک حضرات سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''ذرا ٹھہریے! آپ کو کچھ معلوم بھی ہے کہ آپ لوگ کس چیز کا عہد کر رہے ہیں۔ جان لیجیے کہ تمام عرب و عجم کی مخالفت مول لینے کا عہد ہے۔ اگر آپ یہ بوجھ اٹھا سکیں تو بہتر ہے ورنہ صاف انکار کر دیجیے۔'' (صحیح بخاری) اس پر سب نے اقرار کیا کہ ہم کسی صورت اس دعوت سے منہ نہ موڑیں گے۔ یہ ایک اور ثبوت ہے اس امر کا کہ اسلام کی سیاسی اور بین الاقوامی اہمیت کے بارے میں کوئی الجھاؤ ذہنوں میں موجود نہ تھا۔ مدینہ کے لوگ بھی خوب سوچ سمجھ کر دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ انھیں اچھی طرح اندازہ تھا کہ وہ دنیا بھر کی استحصالی طاقتوں کے خلاف صف آرا ہو رہے ہیں۔

یہاں یہ امر بھی پیش نظر رہے کہ ہابس اور روسو جیسے سیاسی مفکرین کے نزدیک ریاست کا آغاز حاکم و محکوم کے مابین ایک باہمی سمجھوتہ سے ہوا تھا جسے وہ معاہدہ عمرانی (Social Contract) کا نام دیتے ہیں۔ گو یہ ایک قیاس آرائی ہے لیکن کسی بہتر نظریہ کی عدم موجودگی میں اسے قبول کر لیا گیا ہے۔ جہاں تک بیعت عقبہ کا تعلق ہے ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے الفاظ میں ''معاہدہ عمرانی کی بین اور واقعی مثال ہم کو بیعت عقبہ میں ملتی ہے جس میں مدینے والوں نے آنحضرت ﷺ کو اپنا سردار مانا۔ اپنے ملک میں آنے کی دعوت دی اور آپ ﷺ کے احکام کی تعمیل کا اقرار کیا۔'' (۱۲)

بیعت عقبہ ہجرت مدینہ کا پیش خیمہ ہے۔ حضور ﷺ نے اوس و خزرج کے بارہ قبائل کے لیے بارہ آدمی نامزد فرمائے جو اپنے اپنے گروہ میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذمہ دار تھے۔ حضرت مصعب بن عمیرؓ جیسے جوانِ رعنا کو آپ ﷺ نے معلم قرآن بنا کر اہل یثرب کے ساتھ روانہ فرمایا۔ حضرت مصعبؓ نے یثرب کے اجنبی ماحول میں اسلامی دعوت کی توسیع کے لیے دن رات ایک کر دیا۔ دعوت دین کے امکانات اور مدینہ کے سیاسی و معاشی حالات کے بارے

میں حضرت مصعبؓ کی رپورٹ انتہائی امید افزا تھی۔ واقعات کے اس تسلسل میں حکمِ ربی سے مدینہ دعوتِ اسلامی کا نیا مستقر طے پایا اور حضور ﷺ قاتلانہ حملے کے منصوبہ سے بچ کر مدینہ تشریف لائے۔

سفرِ ہجرت کے دوران غارِ ثور سے نکل کر آپ ﷺ درمیانی راستہ کو چھوڑ کر سمندر کے کنارے تشریف لے جا رہے تھے۔ انعام کے لالچ میں سراقہ بن مالک بن جعشم آپ ﷺ کا تعاقب کرتے ہوئے وہاں تک پہنچ گیا۔ اس سے پیشتر کہ اپنی کامیابی پر وہ بغلیں بجاتا، اُس کی گھوڑی کے قدم زمین میں دھنس گئے۔ تب وہ سمجھا کہ اُس کا مقابلہ کسی عام انسان سے نہیں، اللہ کے محبوب ترین نبی ﷺ سے ہے۔ اُس نے آنے والے دور کی تصویر دیکھتے ہوئے اپنے لیے جان کی امان طلب کی۔ رسول اللہ ﷺ کے حکم سے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے آزاد کردہ غلام عامر بن فہیرہ نے اُسے چمڑے کے ایک ٹکڑے پر امان نامہ لکھ کر دے دیا۔ (۱۳) اس مخدوش صورت حال میں بھی آپ ﷺ کی نظر دعوت اسلامی کے عالمی امکانات پر مرکوز تھی۔ جب وہ واپس ہونے لگا تو آپ ﷺ نے اُسے بشارت دیتے ہوئے فرمایا "سراقہ اُس وقت تیری کیا شان ہوگی جب تیرے ہاتھوں میں کسریٰ کے کنگن ہوں گے۔ سراقہ کے بارے میں آپ ﷺ کی یہ پیش گوئی خلافتِ فاروقی کے دور میں پوری ہوئی۔ (۱۴)

ہجرتِ مدینہ سے دُور رس فوائد حاصل ہوئے۔ مکہ میں مسلمان انفرادی طور پر اصلاحِ ذات اور تزکیۂ نفس کے مراحل سے گزر رہے تھے۔ اسلام کی سماجی و سیاسی تعلیمات (SocioPolitical Teachings) کو انھوں نے متشکل ہوتے نہ دیکھا تھا۔ مسلمان اپنے ہی گھر میں غریب الدیار تھے۔ جن کا اپنا وجود خطرے میں تھا وہ اب دشمنوں کے لیے خطرہ بن گئے۔ دارِ ارقم میں رازداری کے ساتھ دعوت و تربیت کا دور تمام ہوا۔ امرا اور بادشاہوں کو اعلانیہ قبولِ اسلام کی دعوت دی جانے لگی۔ جن کو ہر قسم کے قانونی حقوق سے محروم رکھا گیا، وہ خود اقلیتوں کو حقوق اور مراعات تقسیم کرنے لگے۔ مسلمانوں کی بے بسی قوت و شوکت میں بدل گئی۔ ملت کفر کے مقابلے میں ملت اسلامیہ مجتمع

ہوگئی۔ کفار کو بعد از وقت پتا چلا کہ حضور ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہؓ جانیں بچا کر فرار نہیں ہوئے بلکہ ایک مضبوط ریاست تشکیل دینے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ حضرت عمرؓ اور دوسرے صحابہؓ نے ہجرت کے انھی اثرات کو بچشمِ خود دیکھا اور اسلامی کیلنڈر کی ابتدا ہی واقعہ ہجرت سے کی۔

میثاقِ مدینہ

مدینہ کے یہود اور دوسرے قبائل کے ساتھ معاہدہ حضور ﷺ کی سیاسی زندگی کا ایک اور روشن باب ہے۔ مدینہ منورہ کی آبادی اس وقت پانچ ہزار کے لگ بھگ تھی۔ جس میں چند سو مسلمان اور باقی یہود اور دوسرے قبائل تھے۔ مسلمانوں میں مہاجرین اور انصار کے دو گروہ تھے۔ خود انصار بھی بڑے قبائل اوس وخزرج میں منقسم تھے۔ حضور ﷺ کے سامنے فوری مسئلہ یہ تھا کہ مختلف ومتضاد عناصر پر مشتمل آبادی میں اتحاد وتعاون کی فضا کیسے پیدا ہو۔ اوس وخزرج تو قبول اسلام کے بعد شیر وشکر ہو گئے۔ مہاجرین وانصار کے درمیان آپ ﷺ نے اسلامی اخوت کا لازوال رشتہ قائم کر دیا۔ اب گویا مسلمان، یہود اور دوسرے قبائل اپنی جداگانہ حیثیت میں موجود تھے۔ ان سب کے مذہبی معتقدات، سیاسی رجحانات اور طبقاتی مفادات باہم متصادم تھے۔ ایسے عالم میں اتحاد کی مشترکہ بنیادیں تلاش کرنا کوئی معمولی کام نہیں۔ اس کے لیے گہری نفسیاتی بصیرت اور غیر معمولی سیاسی شعور درکار ہوتا ہے۔ حضور ﷺ نے یہود اور دوسرے قبائل سے گفت وشنید کے بعد اہل مدینہ کے لیے ایک متفقہ دستور کا اعلان فرمایا۔ اس دستور کی کل ۵۳ دفعات ہیں۔ (۱۵) اس دستور سے پتا چلتا ہے کہ حضور ﷺ نے مطلوبہ سیاسی اصول مختلف گروہوں سے منوا لیے۔ یوں مدینہ کی وفاقی ریاست کی داغ بیل پڑی۔ یہاں اس دستور کی دو دفعات کا اجمالی جائزہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

ایک دفعہ یہ تھی کہ ہر قسم کے جھگڑوں کا آخری فیصلہ رسول اللہ ﷺ کریں گے۔ اس سے قانون وعدالت کے حتمی اختیارات حضور ﷺ کے ہاتھ میں آ گئے اور مدینہ کی سوسائٹی میں مرکزیت پیدا ہوگئی۔

ایک اور دفعہ یہ تھی کہ مدینے پر حملہ ہوا تو معاہدہ کے سب فریق مل کر اس کا مقابلہ کریں گے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ مستقبل کی امکانی جنگوں میں مدینہ اور اس کے نواح کے قبائل مسلمانوں کا ساتھ دینے کے پابند ہو گئے۔ قریش مکہ یہود کی تائید وحمایت سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

اس میثاق کی قابل ذکر خصوصیت یہ ہے کہ یہودی بہ حیثیت قوم اس میں شامل نہیں تھے۔ ان کے دس قبائل کا علیحدہ علیحدہ ذکر کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کسی یہودی قبیلے کو غداری کے سبب سزا دی گئی تو بقیہ قبائل کم وبیش اس سے لاتعلق رہے۔

پیغمبر انقلاب ﷺ...... تلواروں کے سائے میں

مواخات اور میثاق مدینہ سے نوزائیدہ ریاست میں امن وامان کی فضا قائم ہوئی۔ مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے سیاسی اثر ورسوخ سے اہل مکہ پیچ وتاب کھانے لگے۔ وہ اہل مدینہ کے خلاف بھرے بیٹھے تھے کہ مسلمانوں کو پناہ کیوں دی گئی ہے۔ یہاں معاملہ ہی اور تھا۔ اہل مدینہ مسلمانوں کے بازوئے شمشیر زن بن چکے تھے۔ اسی اثنا میں سرداران قریش نے رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کو ایک تحکمانہ خط بھیجا۔ اس میں کہا گیا تھا:

> ”تم لوگوں نے ہمارے مجرم کو اپنے ہاں پناہ دی ہے۔ اب یا تو تم خود انھیں قتل کر ڈالو یا مدینہ سے نکال دو۔ ورنہ ہم قسم کھاتے ہیں کہ تمھیں روند ڈالیں گے اور تمھاری عورتوں پر تصرف کریں گے۔“ (ابوداؤد)

میثاقِ مدینہ میں دفاعِ مدینہ سے متعلق دفعات کی شمولیت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس یقینِ کامل کا مظہر تھیں کہ اہلِ مکہ کسی بھی مناسب وقت پر پوری قوت سے مدینہ کی ریاست پر حملہ آور ضرور ہوں گے۔ (۱۶) ادھر مدینہ کے گردونواح میں پھیلے ہوئے بعض قبائل بھی آمادۂ پیکار تھے۔ آنے والے سال مخالفین کی جارحانہ یورشوں کا چیلنج پیش کر رہے تھے۔ حضور ﷺ کی پیغمبرانہ حکمت عملی اس چیلنج سے پہلو بچانے کی نہیں بلکہ چیلنج کو قبول کرنے کی تھی۔ آپ ﷺ نے بڑھ کر اس تجارتی راستے کو اپنے حلقۂ اثر میں لے لیا جہاں سے قریش کے تجارتی کارواں شام یا مصر جاتے

تھے۔ ۲ھ میں قبیلہ جہنیہ کے بعض سرداروں سے معاہدہ ہوا اور اسی سال ینبوع کے نواح میں بسنے والے قبائل بنوضمرہ، بنو مدلج، بنو زرعہ اور بنو العربہ سے دوستی اور غیر جانبداری کے معاہدے کیے گئے۔ یہ سب قبیلے مدینہ اور بحیرہ قلزم کے وسطی علاقہ میں بستے تھے اور یہیں سے قریش کے تجارتی قافلوں کا گزر ہوتا تھا۔(۱۷) اس سے بھی پہلے مخالف قبائل پر ہیبت بٹھانے کے لیے حضور ﷺ نے مجاہدین کے چھوٹے چھوٹے کئی دستے روانہ کیے۔ آپ ﷺ شوریدہ سر قبائل کو یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ مدینہ میں باقاعدہ نظام حکومت قائم ہو چکا ہے اور اس کا ایک ایک شہری حالات پر کڑی نظر رکھے ہوئے ہے۔(۱۸) ابوسفیان کے تجارتی قافلہ کی بروقت اطلاع بھی انھی کارروائیوں کے دوران ملی۔ ان فوجی دستوں کی پیش قدمی کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مجاہدین کی Field Training کا اچھا خاصا انتظام ہو گیا۔ بعد کی جنگوں میں مسلمان سپاہ نے جس اعلیٰ تنظیم اور نظم وضبط کا ثبوت دیا وہ بڑی حد تک ان ابتدائی مہمات کا بھی مرہون منت ہے۔(۱۹)

مدینہ کی ریاست ہمہ وقت ہنگامی حالات سے دو چار تھی۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو دشمنانِ اسلام سے جنگ کرنے کی اجازت عطا فرمائی:

أُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۙ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّاۤ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ؕ
(الحج:۳۹۔۴۰)

”اجازت دے دی گئی اُن لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جا رہی ہے، کیونکہ وہ مظلوم ہیں اور اللہ یقیناً اُن کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دیے گئے، صرف اِس قصور پر کہ وہ کہتے تھے، ہمارا رب اللہ ہے۔“

اس ضمن میں اسلام کے نظریہ جنگ اور نظریہ اقتدار کو بیان کرتے ہوئے صراحت کر دی گئی کہ اسلام جنگ برائے جنگ یا اقتدار برائے اقتدار کا قائل نہیں، اس کا مقصود اقامتِ صلوۃ، ایتائے زکوۃ، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی اقدار پر مشتمل سماج کا قیام ہے۔

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ۝

(سورۃ الحج: ۴۱)

''جنھیں ہم اگر زمین میں اقتدار سونپ دیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، بھلائی کا حکم دیں گے اور برائی سے روکیں گے۔''

ہجرت کے بعد کفار مکہ اور دوسرے قبائل سے جو جنگیں ہوئیں انھوں نے عرب کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ فریقین کی افرادی قوت اور مادی وسائل کا موازنہ کیا جائے تو مسلمانوں کی پوزیشن سنگین حد تک کمزور نظر آتی ہے۔ لیکن معلمِ کتاب وحکمت ﷺ نے اپنی عدیم المثال قوت فیصلہ اور حقیقت پسندانہ منصوبہ بندی سے دشمن کے حواس مختل کر دیے۔ اپنی قوتِ اختراع (Improvisation) سے ہر محاذ پر غنیم کو غیر متوقع حالات سے دو چار کر دیا۔ یہاں تک کہ دشمن جارحیت کے بجائے دفاعی جنگ لڑنے پر مجبور ہو گیا۔ جنگِ بدر، جنگِ اُحد اور جنگِ خندق وغیرہ میں مسلمانوں کی کامیابیوں کو حضور ﷺ کی کامیاب منصوبہ بندی کے پس منظر میں دیکھنا چاہیے۔ مشہور مؤرخ گبن کے بقول بعثت نبوی ﷺ سے پہلے عرب میں سترہ سو کے قریب چھوٹی بڑی جنگیں لڑی جا چکی تھیں۔ جنگ کی عام روایت یہ تھی کہ قبائل بے خبری میں مخالفین پر ٹوٹ پڑتے اور لوٹ مار کر کے واپس چلے جاتے۔ عرب کی حربی تاریخ میں حضور ﷺ کی ندرتِ فکر وعمل نے انقلاب انگیز اور اخلاق آمیز اضافے فرمائے۔

جنگ بدر میں صفوں کو ترتیب دے کر حضور ﷺ نے عربوں کی عسکری تاریخ میں نظم وضبط کے تصور کو داخل کیا۔ مسلمانوں کے ہراول دستہ نے پہل کر کے چشموں اور کنوؤں پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح آپ ﷺ نے دشمن کو بہتر دفاعی پوزیشن لینے سے باز رکھا اور اُسے اپنی پسندیدہ زمین Ground of own choice میں لڑنے پر مجبور کر دیا۔ اسلامی لشکر کی صفوں کا معائنہ فرماتے ہوئے آپ ﷺ نے ہدایت کی کہ جب تک دشمن زد میں نہ آئے اُس پر تیر اندازی نہ کی جائے۔

اس ہدایت کے سبب مسلمان اپنی جگہ خوب جم کر لڑے اور جو تھوڑے سے تیر موجود تھے ان کو کفایت سے استعمال کیا گیا۔ اسلحہ کی کمی کے مسئلے کا حل بھی ڈھونڈ لیا گیا۔ تیر اندازوں کے قریب پتھروں کے ڈھیر لگا دیے گئے۔ دشمن کی بڑھتی ہوئی فوج کو تیر چلا کر اور پتھر برسا کر تتر بتر کر دیا گیا۔

شکست کا بدلہ لینے کے لیے اگلے ہی سال کفار میدانِ اُحد میں پہنچے۔ گھمسان کا رن پڑا۔ مسلمانوں کو بھاری جانی و مالی نقصان اٹھانا پڑا۔ ان کے سارے دفاعی انتظام درہم برہم ہو گئے۔ تیر اندازوں کی غلطی نے اچھی بھلی فتح کو عارضی شکست میں تبدیل کر دیا۔ تاہم یہ عارضی شکست بھی حضور ﷺ کی جنگی حکمت عملی اور اس کی افادیت کا بیّن ثبوت ہے۔ ماہرین جنگ کا کہنا ہے کہ ''کسی سپہ سالار کی عظمت کا فیصلہ محض اس کی کامیابیوں کو دیکھ کر نہیں کیا جاتا۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ طریق جنگ کیا تھا۔'' حضور ﷺ نے کوہ اُحد کو پشت پر رکھا اور مشرق کی جانب چالیس تیر اندازوں کو مقرر کر کے تاکید کی کہ خواہ کچھ بھی ہو تم ہرگز یہ جگہ نہ چھوڑنا۔ فن جنگ کی اصطلاح میں رسول اللہ ﷺ کی جانب سے یہ مشہور دفاعی اصول All Round Defence کا استعمال تھا۔ جنگ اُحد میں دشمن نے فتح کے نشے میں مسلمان شہدا کی لاشوں کی بے حرمتی کی۔ حضور ﷺ خود شدید زخمی ہوئے۔ آپ ﷺ کی شہادت تک کی افواہ پھیلائی گئی جس سے مسلمان بددل اور دشمن بے خوف ہو گئے۔ محسوس ہوتا تھا کہ فاتحین بدر مکمل طور پر دشمن کے رحم و کرم پر ہیں۔ حضور ﷺ نے اس نازک موقع پر بھی حالات پر اپنی گرفت ڈھیلی نہ پڑنے دی اور کفار کا گھیرا توڑ کر پہاڑ پر مورچہ بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ یہاں آپ ﷺ نے اپنے رفقا کو از سرِ نو منظم کیا۔ دشمن کو نہ صرف یہ کہ مدینہ پر حملہ کرنے کی جرأت نہ ہوئی بلکہ دوسری صبح آپ ﷺ نے باقی ماندہ فوج کے ساتھ دور تک حملہ آوروں کا تعاقب کیا۔

مکہ اور مدینہ کے درمیان بنو مصطلق کا طاقتور قبیلہ آباد تھا۔ حضور ﷺ کے مخبروں نے اطلاع دی کہ یہ لوگ مدینہ پر حملے کے لیے اکٹھے ہو رہے ہیں۔ حضور ﷺ ان کا انتظار کیے بغیر تیزی سے

اُن کی کمین گاہ پر جاپہنچے۔ وہ لوگ اس اچانک حملہ سے سراسیمہ ہو گئے۔ مسلمانوں نے انھیں بآسانی زیر کرلیا۔ عرب کے قبائلی معاشرے میں حمیت جاہلیہ کے تحت مخالفت برائے مخالفت کا چلن عام تھا۔ ایسے معاشرے میں شادی کے سماجی ادارے کو حلیفوں کی تعداد بڑھانے اور حریفوں کا زور توڑنے کے لیے بخوبی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ حضور ﷺ کی حیات طیبہ میں تعددِ ازواج کی حکمت کا ایک پہلو یہ بھی ہے۔ گرفتار شدگان میں بنو مصطلق کے سردار حارث بن ابی ضرار کی بیٹی جویریہ بھی تھیں۔ انھوں نے اسلام قبول کرنے کا اعلان کر دیا۔ حارث بھی قبول اسلام کر چکے تھے۔ حضور ﷺ کا مقصد اس قبیلے کو صرف زیر کرنا نہیں تھا بلکہ آپ ﷺ مسلمانوں سے ان کی سیاسی مغائرت کو بھی ختم کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ عرب کے قبائلی نظام میں قوت کا محور اور اطاعت کا مرجع قبیلے کا سردار تھا۔ حضور ﷺ نے قریبی تعلقات قائم کرنے کی خاطر حضرت جویریہؓ کو اپنے نکاح میں لے لیا۔ مسلمانوں نے تمام قیدیوں کو حضور ﷺ کے قرابت دار قرار دے کر آزاد کر دیا۔ شیخ قبیلہ سے آپ ﷺ کی رشتہ داری قائم ہونے کے بعد مسلمانوں کے خلاف بنو مصطلق کی قبائلی عصبیت کا خاتمہ ہو گیا۔ اس ازدواجی رشتہ کے ساتھ اسلامی مملکت کی سرحد مکہ کی سمت سو (۱۰۰) میل آگے بڑھ گئی۔

۵ھ میں دس ہزار نفوس پر مشتمل لشکر جرار نے مدینہ پر یلغار کر دی۔ مدینہ کے یہود و منافقین...... کے مابین طے پایا کہ عین حالت جنگ میں یہ لوگ مسلمانوں کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیں گے۔ حضور ﷺ کے پاس صرف تین ہزار مجاہدین موجود تھے۔ آپ ﷺ نے کفار کو اُن کے مرکز سے دور ایک تھکا دینے والی جنگ میں اُلجھانے کا فیصلہ کرلیا۔ مدینے کے تین اطراف میں سنگلاخ میدان اور جنگلات تھے۔ صرف شمال مشرق سے حملے کا امکان تھا۔ وہاں دو پہاڑیوں کے درمیان آپ ﷺ نے اتنی چوڑی خندق کھدوائی جسے گھوڑ سوار بھی پار نہیں کر سکتے تھے۔

خندق کی کھدائی کے وقت صحابہ کرامؓ سے ایک سخت چٹان ٹوٹ نہیں رہی تھی۔ اس اطلاع پر حضور ﷺ تشریف لائے۔ بسم اللہ کہہ کر آپ ﷺ نے ایک ضرب لگائی تو چٹان کا ایک حصہ ٹوٹ گیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اللہ اکبر! مجھے شام کی کنجیاں دے دی گئیں۔“ دوسری ضرب لگائی تو

چٹان کا ایک اور حصہ کٹ گیا۔ فرمایا: ''اللہ اکبر! مجھے فارس دیا گیا۔'' تیسری ضرب لگائی تو چٹان کا باقی ماندہ حصہ بھی ریزہ ریزہ ہو گیا۔ پھر فرمایا: ''اللہ اکبر! مجھے یمن کی کنجیاں دے دی گئیں۔''(۲۰)

خندق کے پیچھے آپ ﷺ نے جبل سلع کے مقام پر فوج جمع کر دی۔ کفار اس اچھوتی جنگی چال کر دیکھ کر دم بخود رہ گئے۔ بیس بائیس روز تک اکا دکا جھڑپیں جاری رہیں۔ وقتی فائدے کے لیے اکٹھے ہونے والے حملہ آوروں کی اکثریت طوالتِ جنگ سے دل برداشتہ ہو گئی۔ مدینہ کے یہود و منافقین قریش کی آخری اُمید تھے۔ اِدھر حضور ﷺ کی جانب سے بھی شر پسندوں پر کڑی نگرانی تھی۔ آپ ﷺ نے بنو قریظہ کے عزائم معلوم کرنے کے لیے فوراً جاسوس روانہ کیے۔ ان کو ہدایت تھی کہ ملّی مفاد کے خلاف جھوٹی سچی کوئی افواہ عوام میں نہ پھیلنے پائے۔ چنانچہ آپ ﷺ کے نمائندوں نے جب بنو قریظہ کی غداری کی تصدیق کی تو علامتی انداز میں بس اتنا کہا ''عضل وقارہ''(۲۱) یعنی انھوں نے اسی طرح غداری کی ہے جیسے عضل وقارہ کے لوگوں نے کی تھی۔(۲۲) جنگ کے آخری ایام میں حضور ﷺ نے ایک نو مسلم حضرت نعیم بن مسعودؓ کی خدمات سے کام لیا۔ حضرت نعیمؓ نے قریش اور بنو قریظہ کے درمیان گٹھ جوڑ کو ختم کرا دیا۔ اس مرحلے پر طوفانِ باد و باراں میں کفار کا جمِ غفیر محاصرہ اٹھا کر واپسی پر مجبور ہوا۔

مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کی کوششیں بری طرح ناکام ہو گئیں۔ جنگِ خندق میں کفار کی پسپائی سے دشمنانِ اسلام کی کمر ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گئی۔ مدینہ کا جنگی مطلع صاف ہوا تو حضور ﷺ نے حالات کا یہ تجزیہ کیا کہ اب قریش مزید حملے نہ کر سکیں گے اور آئندہ نبرد آزمائی دشمن کی حدود میں ہو گی۔ (صحیح بخاری)

حالات کا نقشہ اب بھی مسلمانوں کے لیے زیادہ باعث اطمینان نہ تھا۔ اہلِ مکہ اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ پسپا ضرور ہو گئے مگر وہ اپنے مرکز میں بیٹھ کر بھی مدینہ کی نوزائیدہ ریاست کے لیے ایک مستقل خطرہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ دوسری طرف جانبِ شمال خیبر میں ایک اور خطرناک اور عیار دشمن بھی سر اٹھا رہا تھا۔ اپنی بدعہدیوں اور سازشوں کی سزا میں مدینہ سے جلا وطن ہونے والے

یہود خیبر میں منظم ہو گئے۔ مسلمانوں کے خلاف انھوں نے سازشوں کا نیا جال پھیلانا شروع کر دیا۔ جنگ خندق میں قبائل عرب کو مدینہ پر چڑھا لانے میں ان کے سردار حُیی بن اخطب اور کنانہ بن ربیع پیش پیش تھے۔ کفار مکہ کی شرمناک ہزیمت سے یہود کی آتش انتقام اور بھڑک اٹھی۔ قوموں کی زندگی میں ایسے مواقع آتے ہیں جب انھیں بیک وقت کئی دشمنوں سے مقابلہ کرنا ہوتا ہے۔ اس وقت کامیابی کی ایک صورت یہ ہوتی ہے کہ مختلف دشمنوں کو اپنے خلاف متحد نہ ہونے دیا جائے اور ہر ایک سے علیحدہ علیحدہ مقابلہ کیا جائے۔ جرمنی کا مردِ آہن بسمارک کسی ملک کے خلاف فوجی اقدام سے پہلے اسے مکمل طور پر بے یار و مددگار Isolate کر دیتا تھا۔ وحدت جرمنی کے اصل دشمن آسٹریا کو الگ تھلگ رکھنے کے لیے اس نے روس، فرانس اور اٹلی سے سیاسی اتحاد کیا اور جب ۱۸۶۲ء میں اس نے آسٹریا پر حملہ کیا تو کوئی یورپی طاقت آسٹریا کی مدد کو نہ آسکی۔ پھر شکست خوردہ دشمن آسٹریا کو اس نے فرانس کی جنگ میں دخل دینے کا موقع نہ دیا۔ بسمارک سے ڈیڑھ ہزار سال قبل رسول اللہ ﷺ نے اس حربی حکمتِ عملی کو اختیار فرمایا۔ حضور ﷺ کے سامنے اس وقت اصل کام یہ تھا کہ دو بڑے دشمنوں کے درمیان انقلاب کا راستہ کیسے بنایا جائے۔ کسی ایک دشمن کے خلاف اندھا دھند جنگ چھیڑنے کا مطلب دوسرے دشمن کو یہ موقع دینا تھا کہ وہ مسلمانوں کی غیر حاضری میں مدینہ پر چڑھائی کر دے۔ انھی دنوں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ایک خواب میں عمرہ ادا کرنے کی بشارت دی۔ نبی کا خواب چونکہ سچا ہوتا ہے اس لیے یہ خواب بھی اشارۂ غیبی تھا کہ امن و شانتی اور صلح و آشتی کا راستہ خیبر سے نہیں، مکۃ المکرمہ کی طرف سے ہو کر گزرتا ہے۔ چنانچہ اس شرحِ صدر کے بعد آپ ﷺ نے صلح کے لیے قریش کو ترجیح دی۔ (۲۴) عرب کی تہذیب و ثقافت میں قریش کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ دورِ جاہلیت کی برائیوں کے باوجود ان میں چند اخلاقی خوبیاں بھی تھیں۔ مستقبل میں اسلامی ریاست کو ان کی تعمیری صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانا تھا۔ جہاں تک خیبر کے یہود کا تعلق ہے، مسلمانوں کے اعتماد کو وہ بارہا مجروح کر چکے تھے۔ مدینہ کے شہری ہوتے ہوئے بھی یہود نے اوس اور خزرج کی مدفون عداوتوں کو بھڑکانے کی کوشش جاری رکھی۔ میثاقِ مدینہ

کے بعد مسلمانوں کے سامنے اُن کا سیاسی تشخص ماند پڑتا گیا۔ اسلامی معاشرے میں ان کے سودی کاروبار کا مستقبل بھی تاریک ہو گیا۔ اس لیے وہ خود بھی محسوس کر رہے تھے کہ مسلمانوں کے ساتھ بقائے باہمی کا سوال خارج از امکان ہے۔ یہ بات کہ اُس وقت اہلِ کتاب یہودِ خیبر کے مقابلے میں اہلِ مکہ کی انفرادی اور اجتماعی طور پر اخلاقی پوزیشن بہت بہتر تھی، واقعہ ہجرت سے صاف طور پر معلوم ہوتی ہے۔ خصوصاً ایفائے عہد کے بارے میں بھی اُن کا ریکارڈ بہت بہتر تھا۔ سفرِ ہجرت میں حضور ﷺ نے ایک مکی شخص عبداللہ بن اریقط کو بدرقہ کے طور پر ساتھ لیا کیونکہ وہ مدینہ منورہ کے طویل اور غیر معروف راستے کو اچھی طرح جانتا تھا۔ ظاہر ہے یہ معاملہ معمولی اُجرت پر طے ہوا تھا۔ دوسری طرف قریش مکہ نے آپ ﷺ کی گرفتاری کے لیے سو سرخ اونٹوں کا اعلان کر رکھا تھا۔ عبداللہ بن اریقط کی جگہ کوئی اور غیر عرب شخص ہوتا تو بڑے اور زیادہ پُرکشش انعام کی لالچ میں ڈبل کراس کرتے ہوئے حضور ﷺ کے ساتھ بے وفائی اور دغابازی سے گریز نہ کرتا۔ یہودِ خیبر کے مقابلے میں مشرکین مکہ کے ساتھ صلح کو اِس تناظر میں بھی دیکھنا چاہیے۔ اب سوال یہ تھا کہ اس سکیم کو بروئے کار کیونکر لایا جائے۔

کسی صاحبِ بصیرت اور مدبر سیاست دان سے یہ توقع بھی کی جاتی ہے کہ اس کی پالیسیاں حالات کے حقیقت پسندانہ جائزے پر مبنی ہوں اور اُن کا نفاذ بھی موزوں وقت پر کیا جائے بصورت دیگر مفید ترین اقدامات کے نتائج بھی تباہ کن نکلتے ہیں۔ ۱۹۴۱ء میں اگر ہٹلر روس کے بجائے برطانیہ پر حملہ کر دیتا تو شاید برطانیہ بھی ہتھیار ڈال دیتا لیکن ماسکو میں متعین مارکسی نظریات کے حامل برطانوی سفیر سٹیفورڈ کرپس (۱۸۸۹ء۔ ۱۹۵۲ء) Stafford Cripps کی کامیاب سفارتی جدوجہد سے روس اور جرمنی کے درمیان قبل از وقت جنگ چھڑ گئی اور یہ جنگ ہٹلر کے لیے زوال کا باعث بن گئی۔ ۶ھ میں حدیبیہ کی جانب نبی اُمی ﷺ کی پیش قدمی صحیح سمت میں ایک بروقت اقدام تھا۔

پیغمبرِ انقلاب ﷺ مذاکرات کی میز پر......... صلح حدیبیہ

حضور ﷺ اپنے چودہ سو جانثاروں کے ساتھ عمرہ ادا کرنے کے ارادے سے نکلے۔ قربانی

کے جانور ساتھ تھے۔ حدیبیہ کے مقام پر پڑاؤ ڈالا گیا۔ قریش کو بھی خبر ہوگئی۔ حضور ﷺ نے اپنے نمائندوں کے ذریعے انھیں یقین دلایا کہ ہم جنگ و جدل کے لیے نہیں، عمرہ ادا کرنے آئے ہیں۔ قریش کے لیے دوگونہ مشکلات پیدا ہوگئیں۔ معروف اور مسلّمہ روایات کے مطابق اپنے دشمن کو بھی وہ خانہ کعبہ میں مراسم عبادت ادا کرنے سے روک نہ سکتے تھے۔ ذی القعدہ کے مہینے کی حرمت توڑ کر اگر وہ مسلمانوں کے خلاف اعلان جنگ کرتے تو عرب کی رائے عامہ کا ردِ عمل شدید ہوتا۔ دوسری طرف اگر وہ مسلمانوں کو چپ چاپ عمرہ کرنے کے لیے راستہ دے دیتے تو سارے ملک میں ان کے وقار اور سیادت کی دھجیاں اُڑ جاتیں۔ کفار نے مسلمانوں کو طرح طرح سے مشتعل کرنے کی کوشش کی تاکہ ماہِ حرام کی حرمت توڑنے کا الزام بھی مسلمانوں کے سر تھوپ سکیں۔ لیکن حضور ﷺ کی رہنمائی اور صحابہ کرامؓ کے بے مثال نظم و اطاعت نے حالات کو بگڑنے نہ دیا۔ اس وقت قریش مکہ کی حالت کچھ ایسی تھی جسے شطرنج کے کھیل میں Zag Zwang کا نام دیتے ہیں۔ اس وقت کھلاڑی جو بھی ممکنہ چال چلے اسے کسی نہ کسی کھائی میں ہی گرنا ہوتا ہے۔

اب کفار کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ پُر امن تصفیہ کے لیے سفارتی کوششوں میں شریک ہوں۔ مذاکرات ہوئے اور اُن کے نتیجے میں وہ مشہور اور تاریخی معاہدہ طے پایا جسے اسلامی انقلاب کی جدوجہد میں فیصلہ کن مرحلے کا درجہ حاصل ہے۔ سرداران قریش نے اپنی طرف سے سہیل بن عمرو جیسے بہترین سفارت کار کو مذاکرات کے لیے منتخب کیا۔ اُس نے اپنے تئیں مسلمانوں کو نیچا دکھانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا اور صلح کے مسودے کی حتمی تکمیل سے پہلے مجوزہ الفاظ کے بارے میں خوب کج بحثی بلکہ ہٹ دھرمی سے کام لیا۔ اُس کے پیہم اصرار پر ہی معاہدے کی دستاویز پر بسم اللہ الرحمن الرحیم کے بجائے باسمك اللھم کے الفاظ لکھے گئے۔ اُس کا کہنا تھا اللہ تک تو معاملہ ٹھیک ہے۔ میں نہیں جانتا کہ رحمٰن کیا ہے اور رحیم کیا ہے۔ اسی طرح اُس کے بے لچک رویے کی وجہ سے معاہدے کے آغاز میں محمد رسول اللہ کے بجائے محمد بن عبداللہ کے الفاظ رقم کرنا پڑے۔ آغاز میں تو بعض مخلص صحابہ کرام کو بھی اس معاہدے کے

بارے میں مسلمانوں کے بظاہر کمزور موقف پر شدید تحفظات تھے۔ سہیل بن عمرو تو بربنائے کفر ویسے بھی مومنانہ فراست سے عاری تھا۔ اس کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ پیغمبر اسلام ﷺ کے نزدیک اس بظاہر پسپائی کے پیچھے کتنی بڑی پیش قدمی کے وسیع امکانات موجود ہیں۔ یعنی ایک پایدار معاہدے کے ذریعے ایک ایسے پر امن ماحول کا قیام جس میں آپ اطمینان کے ساتھ دوسرے بڑے حریف سے نمٹ سکیں اور اندرون و بیرون ملک دعوت کو پھیلا سکیں۔ بظاہر اس معاہدے میں قریش کی من مانی شرائط قبول کر لی گئیں۔ مسلمان عمرہ کیے بغیر واپس جانے کے پابند ہوئے جس سے بعض اکابر صحابہ بھی مضطرب ہوئے۔ خصوصاً وہ صحابہ کرام جو اپنی عجلت پسندی کی وجہ سے حضور ﷺ کے خواب کی تعبیر اُسی سال دیکھنے کے خواہاں تھے۔ تاہم وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ معاہدہ کی دفعات جس طرح مسلمانوں کی قوت وحشمت اور کفار کی بے چارگی میں اضافہ کرتی گئیں، اس سے یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ کفار کی قلمرو میں سیاسی امور کا بڑے سے بڑا ماہر بھی اس قدر اہلیت نہیں رکھتا کہ سیاست نبوی کے رموز سے آگہی کا دعویٰ ہی کر سکتا ہو۔

آخری تجزیے میں صلح حدیبیہ سے قریش مکہ کو ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ مسلمان اُس سال عمرہ کیے بغیر واپس چلے گئے اور کفارِ مکہ کی جھوٹی انا کی تسکین ہوگئی۔ دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ اب اُن کے تجارتی قافلے معلوم ومشہور تجارتی شاہراہوں پر بلا خوف وخطر سفر کرنے لگے۔ مسلمانوں کو اِس معاہدے سے بے پایاں سیاسی فتوحات حاصل ہوئیں۔

سب سے پہلی کامیابی جو اس معاہدے سے مسلمانوں کو حاصل ہوئی وہ خود یہ معاہدہ ہی ہے۔ بین الاقوامی قانون کی رُو سے معاہدہ دو خود مختار قوموں کے درمیان ہوتا ہے۔ کفار اس سے قبل مسلمانوں کو ایک قوم تسلیم کرنے پر تیار نہ تھے۔ ان کی نگاہ میں مسلمانوں نے ان کا قومی شیرازہ منتشر کر کے رکھ دیا تھا۔ کفار کی ساری کوششوں کا مقصد ان "باغیوں" کا ہر قیمت پر استیصال تھا۔ معاہدہ حدیبیہ میں انھوں نے مسلمانوں کو ایک علیحدہ قوم اور اسلامی حکومت کو آزاد اور خود مختار حکومت تسلیم کر لیا۔

معاہدے کی ایک دفعہ یہ تھی کہ مکہ سے بھاگ کر مدینہ پناہ لینے والے مسلمان کو واپس کرنا ہوگا لیکن اگر مدینہ سے کوئی شخص مکہ بھاگ جائے تو واپسی عمل میں نہ آئے گی۔ معاہدے کی اس دفعہ سے کفار کے پندار کو بڑا سہارا ملا تھا۔ بعد ازاں مکہ سے بھاگے ہوئے مسلمانوں نے مدینہ کا رُخ کرنے کے بجائے مقام عیص پر جمع ہونا شروع کر دیا۔ اُن کی چھاپہ مار سرگرمیوں سے کفار کے تجارتی قافلوں کے لیے ایک نئی مصیبت اُٹھ کھڑی ہوئی۔ قریش کی استدعا پر معاہدہ کی یہ دفعہ کالعدم قرار دے دی گئی۔

اگر یہ بات درست ہے کہ سیاسی مدبر اپنی لچک دار انگلیوں سے ایک پرندے کی آغوش میں سے ایک ایک کر کے سارے انڈے یوں نکال لیتا ہے کہ پرندے کو خبر تک نہیں ہوتی۔ (۲۴) تو صلح حدیبیہ اس لحاظ سے بھی ایک بے مثال دستاویز ہے۔ صلح حدیبیہ کے بعد کچھ مسلمان عورتیں مدینہ پہنچ گئیں۔ کفار نے مطالبہ کیا کہ معاہدے کے مطابق انھیں واپس کر دیا جائے۔ حضور ﷺ نے ایسی عورتوں کو یہ کہہ کر واپس کرنے سے انکار کر دیا کہ معاہدے میں ''رجل'' یعنی مرد کا ذکر ہے، عورت کا نہیں۔ معاہدے کا متن دیکھا گیا تو اس کے صریح الفاظ کفار کے ذہنی افلاس کی چغلی کھا رہے تھے۔ یعنی:

> وعلى ان لا ياتيك منا رجل وان كان على دينك الا رددته علينا۔ (صحیح بخاری)
>
> ''اور ہمارا جو آدمی آپ ﷺ کے پاس جائے گا، آپ ﷺ اسے لازماً واپس کریں گے خواہ وہ آپ ﷺ ہی کے دین پر کیوں نہ ہو۔''

اس اثنا میں وحی الٰہی (سورۃ الممتحنہ: ۱۰) کے ذریعے بھی مومن عورتوں کو دارالکفر میں واپس بھیجنے سے منع کر دیا گیا تھا۔ (۲۵)

معاہدے کی رُو سے دوسرے قبائل کو بھی اختیار دے دیا گیا کہ وہ دونوں فریقوں میں سے جس کے ساتھ چاہیں حلیفانہ معاہدے کر سکتے ہیں۔ قبیلہ بنو بکر نے قریش کے ساتھ اور بنو خزاعہ نے

مسلمانوں کے ساتھ رشتہ اتحاد استوار کرلیا۔

معاہدہ کی سب سے اہم شق یہ تھی کہ فریقین میں آیندہ دس سال تک جنگ بند رہے گی۔ یوں حضور ﷺ نے دوسری انقلاب دشمن قوتوں کے ساتھ آیندہ جنگوں میں قریش کو غیر جانبدار بنا دیا۔ تاریخی دلچسپی کی خاطر یہ بتانا بے جا نہ ہوگا کہ قریش کے کہنہ مشق ڈپلومیٹ اور صلح حدیبیہ کی سخت شرائط کے ماسٹر مائنڈ سہیل بن عمرو نے فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کرلیا تھا۔

بنی غطفان اور اہل خیبر نے صلح حدیبیہ کی ان نرم شرائط سے یہ مطلب اخذ کیا کہ حضور ﷺ نے قریش کے آگے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ حدیبیہ سے حضور ﷺ کی واپسی کے فوراً بعد انھوں نے مدینہ کی سرحدوں پر چھیڑ چھاڑ شروع کردی۔ غزوہ خیبر سے صرف تین روز پہلے بنو غطفان کے ایک گروہ نے مدینہ کی چراگاہ پر حملہ کرکے ایک صحابی کو شہید کیا اور چلتے بنے۔ یہ واقعہ غزوۂ ذی قرد کے نام سے مشہور ہے۔ حضور ﷺ نے اس منہ زور دشمن کو ضرب کاری لگانے کا تہیہ کرلیا۔ آپ ﷺ چودہ سو صحابہ کے ساتھ اس تیزی سے روانہ ہوئے کہ تین دن میں آٹھ منزلیں طے کرکے مقام رجیع تک جا پہنچے۔ آپ ﷺ نے بنو غطفان و خیبر کے مواصلاتی روابط کو کاٹ دیا۔ غطفان یہ سمجھتے رہے کہ حملہ کا رخ ہماری جانب ہے۔ اس طرح حضور ﷺ نے اہلِ خیبر کو قریش و غطفان سمیت سارے حلیفوں سے الگ تھلگ کردیا اور ڈیڑھ دو ماہ میں اُن کے سارے قلعے فتح ہوگئے۔ فتح خیبر صلح حدیبیہ کا پہلا سیاسی ثمر تھا۔ قریش اپنی آنکھوں کے سامنے اہلِ خیبر کے انجام کو دیکھتے رہے، لیکن مسلمانوں کے ساتھ جنگ بندی کے معاہدے کی بنا پر وہ بے بس تھے۔ یہی نہیں بلکہ صلح حدیبیہ کے بعد اسلام اس برق رفتاری سے پھیلا کہ اُنیس سال میں اتنے آدمی مسلمان نہیں ہوئے تھے جتنے صلح کے بعد صرف دو سال میں ہوگئے۔ (۲۶) سفر حدیبیہ میں حضور ﷺ کے ہمراہ چودہ سو جاں نثار تھے۔ تقریباً دو سال بعد آپ ﷺ فتح مکہ کے لیے روانہ ہوئے تو آپ ﷺ کے جلو میں دس ہزار صحابہ کا لشکر تھا۔ تین سال کے اندر اندر اسلامی حکومت دس گنا پھیل گئی۔

معاہدے کی یہ خوبیاں جب عملاً سامنے آگئیں تو وہ صحابہؓ جنھیں شرح صدر نہ ہوسکا تھا، مثبت

ترین نتائج دیکھ کر اپنی غلطی کا احساس کیے بغیر نہ رہ سکے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت جابر بن عبداللہؓ اور حضرت براء بن عازبؓ نے حضور ﷺ کی اصابت فکر کا اعتراف ان الفاظ میں کیا۔

"لوگ فتح مکہ کو فتح سمجھتے ہیں حالانکہ ہم اصل فتح صلح حدیبیہ کو سمجھتے ہیں۔"

پیغمبرِ انقلاب ﷺ عالمی سیاست کے افق پر

دعوتِ اسلامی کے مختلف مراحل میں حضور ﷺ اپنے پیغام کے عالمی کردار کے بارے میں واضح اشارے پیش فرماتے رہتے تھے۔ اب وقت آ گیا تھا کہ اس سمت میں پیش رفت کی بنیاد رکھ دی جائے۔

صلح حدیبیہ کے بعد مکہ کی جانب سے اطمینان ہوگیا تو حضور ﷺ نے اندرونِ عرب اور بیرونِ عرب میں دعوتی و تبلیغی خطوط بھیجے۔ حاکم مصر مقوقس کی طرف حاطب بن ابی بلتعہؓ، شاہِ عمان جعفر بن جلندی کی طرف حضرت عمرو بن العاصؓ، والی بحرین منذر بن ساوی کی طرف علا بن الحضرمیؓ، امیر شام حارث بن ابی شمر غسانی کی طرف شجاع بن وہب اسدیؓ، ہودہ بن علی صاحب یمامہ کی طرف حضرت سلیط بن عمرؓ، شاہ ایران خسرو پرویز کی طرف حضرت عبداللہ بن حذافہؓ مکتوباتِ نبوی لے کر پہنچے۔ ان مکتوبات میں حضور ﷺ نے دعوت اسلامی کی شان اور نبوت کے منصب جلیلہ کو نمایاں فرمایا تھا۔ طرز تحریر سادہ اور باوقار تھا۔ فرمانرواؤں کے نام یہ مکتوبات عریضے نہیں، فرامین تھے۔ اس بے باکانہ خطاب نے سلاطین عصر اور اُن کے حواریوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ وہ سوچنے لگے کہ حضور ﷺ کی سیاسی قوت کو Underrate کرنا دانش مندی نہیں ہوگی۔ عین اُس وقت جب کہ دو عالمی طاقتوں ......روم و ایران...... کے مابین معرکہ آرائی میں روم کو شاندار فتح نصیب ہوئی، حضور ﷺ کے قاصد حضرت دحیہ کلبیؓ ہرقل قیصر روم کے لیے پاس جو خط لے کر گئے اس کے الفاظ کی وجاہت و شوکت ملاحظہ ہوں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم، من محمد عبداللہ ورسولہ الی ھرقل عظیم الروم، سلام علی من اتبع الھدیٰ، أما بعد: فانی

ادعوك بدعاية الاسلام،اسلم تسلم يوتك الله اجرك مرتين ، فان توليت فان عليك اثم الاريسيين و ياهل الكتب تعالوا الى كلمة سواء بيننا و بينكم الا نعبد الا الله ولا نشرك به شيا ولا يتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون الله فان تولوا فقولوا اشهدوا بانا مسلمون۔ (۲۷)

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔محمد کی جانب سے جو اللہ کا بندہ اور رسول ﷺ ہے ہرقل سردار روم کے نام۔سلامتی ہے اس کے لیے جس نے ہدایت کی پیروی کی۔بعد ازاں میں تم کو اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔اسلام قبول کرلو۔تمام آفات سے تم محفوظ رہو گے اور اللہ تعالیٰ تمھیں دوہرا اجر عطا کرے گا۔اگر تم نے رُوگردانی کی تو تم پر واضح رہنا چاہیے کہ تمھاری رعیت کی گمراہی کا وبال بھی تمھارے اوپر ہوگا۔''

''اے اہل کتاب! آؤ۔ایسی بات پر جمع ہو جاؤ جو تمھارے اور ہمارے درمیان یکساں طور پر تسلیم شدہ ہے اور وہ (بات) ہے کہ ہم سب اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کریں اور نہ کسی کو اُس کا شریک ٹھہرائیں اور نہ ہم اللہ کے سوا کسی دوسرے کو اپنا رب قرار دیں اور اگر وہ روگردانی کریں تو کہہ دو! تم گواہ رہو کہ ہم تو مسلمان ہیں۔''

جب شام کی فوجوں نے کسریٰ ایران کو شکست دی تو ہرقل اس فتح پر اظہار تشکر کے لیے ایلیا (بیت المقدس) کے دورے پر تھا۔اس موقع پر والی بصریٰ نے حضور ﷺ کا خط اسے پہنچایا تھا۔ صلح حدیبیہ کے بعد خطہ عرب میں امن وامان کا دور دورہ ہوا تو قریش مکہ کے تجارتی قافلے بھی ایک بار پھر اطمینان کے ساتھ اکنافِ عرب میں آنے جانے لگے۔ایک ایسے ہی تجارتی کارواں کے ساتھ ابوسفیان ان دنوں ملکِ شام میں موجود تھا۔ہرقل نامہ مبارک کے نفس مضمون اور اسلوب نگارش کو دیکھ کر دنگ رہ گیا تھا۔وہ مزید معلومات کا متمنی تھا۔ابوسفیان کا بیان ہے کہ مقامی حکام نے مجھے

اپنے بیس ساتھیوں سمیت شام میں ڈھونڈ نکالا اور ہرقل کے روبرو پیش کر دیا۔ ہرقل کے دربار میں پیغمبر اسلام ﷺ کے بارے میں جو گفتگو ہوئی اس کی مکمل تفصیل بخاری شریف میں موجود ہے۔ خصوصاً دو سوالات ہرقل کے گہرے تاریخی شعور کی غمازی کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ جس نئے پیغمبر کی خطۂ عرب میں آمد ہوئی ہے، اس کے پیروکار اشراف (یعنی مال دار) طبقے کے لوگ ہیں یا ان کا تعلق کمزور اور پسے ہوئے طبقات سے ہے۔ دوسرا یہ کہ مسلمانوں کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے یا گھٹ رہی ہے۔ ابوسفیان نے جب یہ بتایا کہ حضور ﷺ کے پیروکاروں کی اکثریت کا تعلق مجبور و مقہور طبقات سے ہے اور یہ کہ ان کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے تو ہرقل کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ اگرچہ اپنے اقتدار و اختیار کی خاطر اس نے اسلام کی دعوت قبول نہ کی لیکن آنے والے دور کی ایک دھندلی تصویر اس کے سامنے آ چکی تھی۔ ہرقل کی انفعالی کیفیت کو خود ابوسفیان نے محسوس کیا چنانچہ یہ لوگ جب ہرقل کے دربار سے نکلے تو ابوسفیان نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ''ابو کبشہ (۲۸) کے بیٹے (حضور ﷺ) کا معاملہ تو بڑا زور پکڑ چکا۔ اس سے تو بنو اصفر (رومیوں) کا بادشاہ بھی ڈرتا ہے۔'' ابوسفیان نے فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کر لیا۔ بعد میں ایک موقع پر اس نے ہرقل کے دربار میں ہونے والے اس مکالمہ کی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ رسول اللہ ﷺ کا دین غالب آ کر رہے گا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے میرے اندر اسلام کی محبت کو پختہ کر دیا۔''

خسرو پرویز شاہِ فارس کا ردِ عمل گستاخانہ تھا۔ جب نامۂ پیغمبر ﷺ اسے پڑھ کر سنایا گیا تو وہ آگ بگولا ہو گیا۔ نامۂ مبارک کو چاک کرتے ہوئے اس نے کہا۔ ''میرے نام سے پہلے اپنا نام لکھتے ہوئے میری رعایا میں سے ایک معمولی غلام (نقل کفر کفر نباشد) کو جرأت کیسے ہوئی۔'' اس نے بڑی رعونت کے ساتھ اپنے یمن کے گورنر بازان کو لکھا کہ حجاز میں نبوت کا دعویٰ کرنے والی اس شخصیت کو گرفتار کر کے میرے پاس بھیج دو۔ رسول اللہ ﷺ کو خبر ہوئی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ اس کی بادشاہت کو پارہ پارہ کر دے گا۔'' انھی دنوں گورنر یمن بازان نے اپنے دو آدمیوں

کو اپنے خط کے ساتھ مدینہ منورہ کی جانب روانہ کیا جس میں آپ ﷺ کو کسریٰ کے دربار میں حاضر ہونے کا حکم دیا گیا تھا۔ انھوں نے اپنا مدعا بیان کیا۔ حضور ﷺ نے انھیں اگلی صبح دوبارہ ملاقات کا وقت دیا۔ صبح کے وقت جب وہ حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''کسریٰ کو تو اس کے بیٹے شیرویہ نے قتل کر دیا ہے۔'' اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی آپ ﷺ کو یہ خبر دے دی تھی۔ وہ سخت متعجب ہوئے۔ اسی حیرت اور مایوسی کے عالم میں جب وہ یمن واپس گئے تو خبر کی تصدیق ہو گئی۔ نئے شاہِ کسریٰ نے اپنے ایک خط میں گورنر یمن کو یہ بھی لکھا تھا کہ عرب کی جس شخصیت کے بارے میں میرے باپ نے کچھ احکامات جاری کیے تھے، تا حکم ثانی انھیں معطل سمجھا جائے۔ اس واقعہ کی وجہ سے باذان اور اس کے بہت سے ایرانی ساتھی بھی مسلمان ہو گئے۔ (۲۹)

ان خطوط کے جواب میں کچھ اور لوگوں کا ردِ عمل بھی اشتعال انگیز تھا۔ حضور ﷺ کے قاصد حارث بن عمیرؓ حاکمِ بصریٰ کے نام نامۂ مبارک لے کر گئے۔ شرحبیل بن عمرو غسانی نے بین الاقوامی آداب کو بالائے طاق رکھتے ہوئے مکتوب نبوی ﷺ کو چاک کر دیا۔ قاصد رسول ﷺ شہید کر دیے گئے۔ یہ مذموم اقدام مدینہ کے خلاف کھلی جنگ کا اعلان تھا۔ سریہ موتہ ۸ ھ اسی حادثے کا ردِ عمل ہے۔ حضور ﷺ نے حضرت زید بن حارثہؓ کی سرکردگی میں تین ہزار صحابہ کا لشکر جانب شام روانہ فرمایا۔ غسان کے قریب ایک لاکھ رومی سپاہ مقابلہ پر آ گئی اور ہرقل کی طرف سے ایک لاکھ مزید آنے سے کل تعداد دو لاکھ ہو گئی۔ قلتِ تعداد کے باوجود مسلمانوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ حضرت زیدؓ، حضرت جعفر بن ابی طالبؓ اور حضرت عبداللہ بن رواحہؓ یکے بعد دیگرے شہید ہوتے گئے۔ اس موقع پر باہمی مشورہ سے حضرت خالد بن ولیدؓ نے مسلمانوں کی کمان سنبھالی۔ حضرت خالد بن ولیدؓ نے دشمن کو خوفزدہ کرنے کے لیے میمنہ کو میسرہ اور میسرہ کو میمنہ میں بدل دیا۔ دشمن نے سمجھا کہ مسلمانوں کو تازہ دم کمک پہنچ گئی ہے اور وہ پیش قدمی نہ کر سکا۔ حضرت خالدؓ نے آہستہ آہستہ اسلامی لشکر کو پیچھے ہٹانا شروع کیا۔ دشمنوں نے اِسے بھی ایک جنگی چال سمجھا۔ اُن کے خیال میں مسلمان انھیں عرب کے وسیع اور تپتے ہوئے صحرا میں گھیر کر تباہ کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کا پیچھا

کرنے کی جرأت نہ کی۔ چنانچہ حضرت خالدؓ بڑی حاضر دماغی کے ساتھ فوج کو دشمن کے نرغہ سے بچا لائے۔

بظاہر یہ مہم بے نتیجہ رہی۔ پھر بھی اس سے انکار ممکن نہیں کہ مسلمانوں کو جنگی نوعیت کی بہت سی کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ اولاً مٹھی بھر صحابہؓ نے رومیوں کے ٹڈی دل لشکر کے مقابلے میں جو کامیاب مزاحمت کی، وہ شام کے عرب قبائل پر مسلمانوں کی دھاک بٹھانے کو کافی تھی۔ مدینہ کے شمال میں حدودِ شام تک مسلمانوں کے سیاسی اثرات پھیل گئے۔ اس خونریز معرکے کے بعد بنو سلیم، اشجع، غطفان، ذبیان اور خزارہ وغیرہ سرکش قبائل نے بھی اسلام قبول کر لیا۔ ثانیاً مسلمانوں کو رومیوں کی قوت اور جنگی حکمت عملی (Strategy) کے بارے میں مفید معلومات حاصل ہوئیں۔ ثالثاً رومی مدینہ پر حملہ آور ہونے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ ان کو بھی علم ہو گیا کہ مسلمان ناقابل تسخیر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ۹ ھ میں حضور ﷺ خود تیس ہزار کا لشکر لے کر تبوک پہنچے تو رومیوں کو مقابلے میں آنے کی جرأت تک نہ ہوئی۔

حضور ﷺ کے ان خطوط کے جواب میں بعض شہنشاہوں نے جو معاندانہ رویہ اختیار کیا اس سے یقین ہو گیا کہ عرب میں اسلامی نظام کے نفاذ کو عالمی طاقتیں برداشت نہیں کریں گی۔ ان طاقتوں نے محسوس کر لیا تھا کہ مدینہ میں جو انقلابی تحریک پروان چڑھ رہی ہے اس کا سیلاب انسانی بادشاہت اور اس کے اداروں کو خس وخاشاک کی طرح بہالے جائے گا۔

حضور ﷺ کے تبلیغی خطوط اور بیرونِ ملک آپ ﷺ کی فوجی مہمات میں مسلمانوں کے لیے یہ ہدایت موجود تھی کہ اسلام کوئی علاقائی یا قومی مذہب نہیں، رب العالمین کی طرف سے آخری عالمی پیغام ہے۔ عالمی سیاسیات میں فعال کردار ادا کرنے کے لیے ملت اسلامیہ کو خاصی تیاری کی ضرورت تھی۔ اِدھر خطۂ عرب ہی تاحال مکمل طور پر اسلامی اقتدار میں شامل نہ ہوا تھا۔ اہل مکہ برابر کی طاقت کے ساتھ میدان میں موجود تھے۔ ایسے حالات میں قریش نے مسلمانوں کی قوت کا غلط اندازہ لگاتے ہوئے خود ایک ایسی حماقت کر ڈالی جس سے خطۂ عرب کی سیاسی وحدت کا راستہ ہموار ہو گیا۔

جاء الحق وزھق الباطل...... فتح مکہ

موتہ سے اسلامی لشکر کی واپسی کو کفار مکہ نے مسلمانوں کی شکست پر محمول کیا۔ اُن کا خیال تھا کہ طاقت کا توازن مسلمانوں کے حق میں بگڑ گیا ہے۔ تازہ پسپائی سے وہ دل شکستہ ہیں۔ اس لیے معاہدۂ حدیبیہ کو توڑنے کا موزوں وقت آگیا ہے۔ اس ارادے سے انھوں نے اپنے حلیف قبیلے بنو بکر کی پیٹھ ٹھونکی اور مسلمانوں کے حلیف بنو خزاعہ پر رات کے وقت حملہ کرا دیا۔ اس شب خون میں بنو خزاعہ کا بہت زیادہ جانی و مالی نقصان ہوا۔ وہ لٹے پٹے دربار رسالت ﷺ میں پہنچے اور معاہدہ حدیبیہ کی دہائی دی جس کے تحت مسلمان اُن کی حمایت کے پابند تھے۔ حضور ﷺ نے معاہدے کی خلاف ورزی پر کفار سے جواب طلبی کی اور تین شرطیں پیش فرمائیں۔

۱۔ مقتولین کا خون بہا ادا کیا جائے۔

۲۔ قریش بنو بکر کی حمایت سے دستکش ہو جائیں۔

۳۔ پہلی دونوں شرطیں منظور نہ ہوں تو معاہدے کے خاتمے کا اعلان کر دیا جائے۔

اہلِ مکہ نے پہلی دونوں شرائط کو مسترد اور معاہدے کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ وہ بنو خزاعہ پر ظلم میں برابر کے شریک ہیں۔ کہنے کو تو انھوں نے معاہدے کو یک طرفہ طور پر منسوخ کر دیا۔ مگر جب اس کے نتائج و عواقب پر غور کیا تو بہت ٹپٹائے۔ اُن کا سردار ابو سفیان سابقہ معاہدے کی تجدید کے لیے مدینہ پہنچا۔ بہر حال اب تک پل کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا تھا۔ ابو سفیان کو اپنے مشن میں ناکامی ہوئی اور وہ اپنا سا منہ لے کر واپس چلا آیا۔ حضور ﷺ دس ہزار صحابہ کے ساتھ عازم مکہ ہوئے۔ بیت اللہ کی حرمت کے پیش نظر آپ ﷺ کی خواہش تھی کہ خونریزی کے بغیر مکہ فتح ہو جائے۔ آپ ﷺ اس قدر تیز رفتاری سے مکے کے قریب جا پہنچے کہ کفار کو تیاری کی مہلت نہ ملی۔ رات کے وقت آپ ﷺ نے دور دور تک آگ کے الاؤ روشن کرا دیے تاکہ دشمن مسلمانوں کی کثرت تعداد سے مرعوب ہو جائے۔ حضرت عباسؓ ابو سفیان کو لے کر دربار رسالت میں حاضر

ہوئے۔ وہ کلمہ پڑھ کر مشرف بہ اسلام ہوا۔ ابوسفیانؓ کے قبول اسلام سے کفار کی رہی سہی مرکزیت بھی جاتی رہی۔ حضور ﷺ نے فوج کے چار حصے کر کے شہر کے مختلف اطراف سے پیش قدمی کی اور مسلمانوں نے مکہ پر پوری طرح قبضہ کر لیا۔ یہ ہر لحاظ سے پُرامن قبضہ تھا۔ بس ایک آدھ جگہ جدال وقتال کی معمولی نوبت آئی۔

فاتحین عالم مفتوحہ علاقوں میں داخلے کے وقت خون کی ندیاں بہا کر اپنے جلال و جبروت کا مظاہرہ کرتے آئے ہیں۔ فاتح مکہ ﷺ کی شان نرالی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ جو شخص بھاگ نکلے اس کا تعاقب نہ کیا جائے۔ جو ہتھیار ڈال دے وہ خود کو محفوظ سمجھے اور جو شخص ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے۔ وہ بھی مامون ہے۔ اِسی طرح جو شخص اپنے گھر کا دروازہ بند کر لے یا بیت اللہ میں داخل ہو جائے اُس کو بھی امان ہے۔ صحن کعبہ میں فاتح اور مفتوح بالمقابل ہیں۔ اہل مکہ مجرموں کے کٹہرے میں کھڑے ہیں۔ آپ ﷺ نے صرف پندرہ اشخاص کے بارے میں حکم دیا کہ اگر وہ کعبۃ اللہ کے پردوں سے لپٹے ہوئے بھی پائے جائیں تو اُن کو قتل کر دیا جائے۔ یہ لوگ فوجداری جرائم کے مرتکب تھے یا اُنھوں نے ارتداد کا ارتکاب کر کے دشمن کی صفوں میں شمولیت اختیار کر لی تھی یا پھر ہجوگوئی کے ذریعے توہین رسالت کی تھی۔ اِن میں سے بھی چھ کے سوا باقی سب کو صحابہ کرام یا صحابیات کی سفارش پر معاف کر دیا گیا۔ ان میں ہند بھی شامل ہے جس نے حضور ﷺ کے پیارے چچا حضرت حمزہؓ کا کلیجہ چبایا تھا۔ ہبار بن اسود بھی ہے جو اس فاتح اعظم ﷺ کی بیٹی حضرت زینبؓ کا قاتل ہے۔ وحشی بھی ہے جس نے جنگ اُحد میں حضرت حمزہؓ کو نیزہ مار کر شہید کیا تھا۔ دفعتاً زبان رسالت حرکت میں آتی ہے اور سب مجرمین معاف کر دیے جاتے ہیں۔ اسلام کے سب سے بڑے دشمن ابوجہل کے بیٹے عکرمہ بن ابوجہل کچھ دیر فرار رہنے کے بعد قبول اسلام کے لیے حاضر خدمت ہوئے تو آپ ﷺ نے انھیں بھی اپنے دامن عافیت و رحمت میں جگہ عطا فرمائی۔ فاتحین آٹھ سال بعد اپنے آبائی گھروں تک آئے ہیں لیکن فاتح ﷺ کا حکم ہے کہ اپنے اپنے مکان مفتوحین کے پاس ہی رہنے دو اور کسی چیز پر اپنا حق نہ جتاؤ۔ لوگ عفو کے

اس کوہِ گراں اور حلم کے بحرِ بیکراں کو دیکھ کر تصویرِ حیرت بنے بیٹھے ہیں۔ اِدھر فاتح اعظم ﷺ کی عالی ظرفی کا ایک اور مظاہرہ ابھی باقی ہے۔ حدودِ حرم میں وہی عثمان بن طلحہ کلید کعبہ لیے کھڑا ہے جس نے کبھی آپ ﷺ کے لیے خانہ کعبہ کا دروازہ بند کر دیا تھا۔ حضرت علیؓ نے درخواست کی کہ کنجی مجھے عنایت کر دی جائے۔ حاضرین منتظر ہیں کہ یہ اعزاز کسے حاصل ہوتا ہے۔ دوسرے ہی لمحے یہ کنجی دوبارہ عثمان بن طلحہ کو سونپ دی جاتی ہے۔ آپ ﷺ نے کنجی عنایت کرتے ہوئے فرمایا: ''یہ ہمیشہ کے لیے تمھارے خاندان میں رہے گی۔ تم لوگوں سے اسے وہی چھینے گا جو ظالم ہوگا۔'' (۳۰)

پروفیسر فلپ کے ہتی دعوے سے کہتا ہے۔

Hardly a triumphal entry in ancient annals is comparable to this.(۳۱)

''قدیم تاریخ میں کوئی فاتحانہ داخلہ، فتح مکہ کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔''

فصاحت و بلاغت کا مرقع ...... خطباتِ نبوی

انقلابی تحریکوں میں فن خطابت کا بھی اہم رول ہوتا ہے۔ ارسطو کے بقول 'سیاست و خطابت لازم وملزوم ہیں'۔ اسلامی انقلاب کے مختلف مراحل میں حضور ﷺ کے مختصر مگر جامع خطبات کی اہمیت مسلّم ہے۔ آپ ﷺ افصح العرب تھے۔ زبان و بیان پر آپ ﷺ کو مکمل قدرت حاصل تھی۔ تاہم پیشہ ور خطیبوں کے برعکس آپ ﷺ کے ہاں گفتار و کردار میں کسی تضاد کا نشان نہیں۔ آپ ﷺ کی ہر بات از دل خیزد و بر دل ریزد کا مصداق تھی۔ فتح مکہ کے موقع پر آپ ﷺ نے جو مختصر سا خطبہ دیا اس کا ایک ایک لفظ جاذبِ توجہ ہے۔ خطبہ کے اقتباسات ملاحظہ ہوں:

''اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ تنہا ہے۔ اُس کا کوئی شریک نہیں۔ اس نے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا۔ اپنے بندے کی مدد کی اور تنہا سارے جتھوں کو شکست دی۔
اے قریش کے لوگو! اللہ نے تم سے جاہلیت کے غرور اور باپ دادا پر فخر کا خاتمہ کر دیا۔ تمام لوگ آدم علیہ السلام سے ہو اور آدم علیہ السلام مٹی سے تھے۔''

بعد ازاں نبی اکرم ﷺ نے قرآن پاک کی آیت تلاوت فرمائی:

يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَٰكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَٰكُمْ شُعُوبًا وَقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوٓا۟ ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ ٱللَّهِ أَتْقَىٰكُمْ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ۝ (سورۃ الحجرات: ۱۳)

''اے لوگو! ہم نے تمھیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمھیں قوموں اور قبیلوں میں تقسیم کیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ اللہ کے نزدیک سب سے باعزت وہی ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔ بے شک اللہ جاننے والا اور خبر رکھنے والا ہے۔''

اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا!

قریش کے لوگو! تمھارا کیا خیال ہے میں تمھارے ساتھ کیا سلوک کرنے والا ہوں؟

انھوں نے کہا!

اچھا۔ آپ ﷺ کریم بھائی ہیں اور کریم بھائی کے صاحبزادے ہیں۔

آپ ﷺ نے فرمایا! تو میں تم سے وہی بات کروں گا جو حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے کی تھی کہ لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْم۔

آج تم سے کوئی مواخذہ نہیں۔ جاؤ تم سب آزاد ہو۔''

حضور ﷺ کے خطبات میں سب سے زیادہ اہمیت خطبہ حجۃ الوداع کو حاصل ہے۔ اس خطبے میں آپ ﷺ نے عورتوں اور غلاموں کے بارے میں خصوصی تاکید فرمائی۔ حج کے دن، مہینے اور مکہ کے شہر کی حرمت کی طرح آپ ﷺ نے ایک دوسرے کا خون اور مال حرام قرار دیے۔ جاہلیت کے خون معاف کیے تو سب سے پہلے اپنی جانب سے ربیعہ بن حارث کا خون معاف کیا۔ جاہلیت کے سود معاف کیے اور سب سے پہلے اپنے چچا عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کا سود معاف فرمایا۔ لیکن غزوہ حنین کے بعد تقسیم غنائم کے موقع پر آپ ﷺ کا خطبہ سیاسی نقطۂ نظر سے اہم ترین

ہے۔ یہ خطبہ آپ ﷺ کی پیغمبرانہ حکمت وتدبر اور عربی فن بلاغت کا بے نظیر نمونہ ہے۔

اس کا پس منظر یہ ہے کہ فتح مکہ کے بعد بھی نظام جاہلیت کی پروردہ قوتیں اپنی بقا کے لیے آمادۂ جنگ تھیں۔ یہ قوتیں حنین کے مقام پر منظم ہوئیں۔ دشمن قبائل اپنے مال واسباب، عورتیں اور بچے تک میدان میں لے آئے۔ اُن کا خیال تھا کہ اپنے اہل وعیال اور جائیداد کو دیکھتے ہوئے کوئی سورما میدانِ جنگ سے فرار ہونا پسند نہ کرے گا۔ گو انھیں ابتدائی مرحلے میں خاصی کامیابی ہوئی، پھر بھی جنگ کا آخری مرحلہ ان کی مکمل شکست پر منتج ہوا۔

غزوۂ حنین میں چھ ہزار جنگی قیدی، ۲۴ ہزار اونٹ، چالیس ہزار سے زیادہ بکریاں اور چار ہزار اوقیہ چاندی مسلمانوں کے ہاتھ آئی۔ فتح کے بعد یہ سب اثاثہ مسلمانوں کی تحویل میں آ گیا۔ حضور ﷺ نے اپنے اور عبدالمطلب کے خاندان کے حصے کے قیدیوں کو آزاد کر دیا۔ آپ ﷺ کی پیروی میں انصار ومہاجرین نے بھی ایسا ہی کیا۔ کچھ لوگ اپنے حصے کے قیدی رضا کارانہ چھوڑنے میں متامل تھے۔ ایسے قیدیوں کے لیے آپ ﷺ نے چھ چھ اونٹ فی شخص ادا فرما کر ان کو رہائی دلا دی۔ جنگ حنین میں مکہ کے دو ہزار نومسلم بھی شریک تھے۔ مالِ غنیمت کا بیشتر حصہ آپ ﷺ نے انھی کو عطا فرمایا۔ صفوان بن اُمیہ کا بیان ہے "رسول اللہ ﷺ مجھے حنین کے مال میں سے دیتے گئے۔ کیفیت یہ تھی کہ آپ ﷺ مجھ کو تمام مخلوق میں پہلے سب سے زیادہ برے معلوم ہوتے تھے اور اب یہ حالت ہوگئی کہ رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کر کوئی ہستی اللہ تعالیٰ نے میرے لیے محبوب نہیں رکھی تھی۔"

غزوۂ حنین کے غنائم سے تالیفِ قلب کے لیے مالِ کثیر حضور ﷺ نے مکہ کے نومسلموں کو عنایت فرمایا تو انصار کے گروہ میں چہ میگوئیاں ہوئیں۔ بعض لوگوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ "محمد ﷺ اپنی قوم سے جا ملے۔" آپ ﷺ تک بھی یہ اطلاعات پہنچیں۔ آپ نے فوراً انصار کو جمع کیا اور ان سے تصدیق چاہی۔ انھوں نے عرض کیا آپ ﷺ نے جو سُنا وہ صحیح ہے۔ یہ باتیں ہمارے ذمہ دار افراد نے نہیں کہیں۔ یہ چند نوجوانوں کے خیالات ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔

''اے گروہ انصار یہ تمہاری سرگوشیاں کیسی ہیں جو مجھ تک پہنچی ہیں اور تمہارے دل میں یہ غم وغصہ کیسا ہے جو تم نے مجھ پر کیا ہے۔ کیا میں تمہارے پاس اس حالت میں نہیں آیا کہ تم گمراہ تھے پھر اللہ نے تمھیں ہدایت دے دی۔ تم محتاج تھے اللہ نے تمھیں غنی کر دیا۔ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے اللہ نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا؟''

انصار بولے! بے شک اللہ ورسول کا احسان اور فضل وکرم سب سے بڑھ کر ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے گروہ انصار! کیا تم مجھے جواب نہیں دو گے؟''

انصار نے کہا۔ یارسول اللہ ﷺ! ہم آپ کو کیا جواب دیں۔ اللہ ورسول ﷺ ہی کا احسان وکرم ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں۔ اللہ کی قسم! تم چاہتے تو جواب دیتے اور تم اپنی بات میں بالکل سچے ہوتے اور تمہاری سچائی کو مانا بھی جاتا کہ تو ہمارے پاس اس حالت میں آیا کہ لوگوں نے تجھے جھٹلایا تھا۔ ہم نے تیری تصدیق کی۔ تجھے لوگوں نے بے یارومددگار چھوڑا تھا۔ ہم نے تیری مدد کی۔ تجھے ہم وطنوں نے نکال دیا تھا۔ ہم نے تجھے پناہ دی۔ تو مفلس تھا۔ ہم نے تجھے آسودگی دی۔

گروہ انصار! کیا تم دنیا سی حقیر چیز کے لیے رنجیدہ ہو گئے۔ حالانکہ اس سے میں نے کچھ لوگوں کی حوصلہ افزائی کرنا چاہی تاکہ وہ اسلام لے آئیں اور تمھیں میں نے تمہارے اسلام کے سپرد کیا۔ اے گروہ انصار! کیا تم اس بات سے خوش نہیں کہ لوگ اُونٹ بکریاں لے جائیں اور تم اپنے گھروں میں رسول اللہ ﷺ کو لے جاؤ۔

قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں محمد (ﷺ) کی جان ہے۔ اگر ہجرت نہ ہوتی تو میں انصار کا ایک فرد ہوتا اور اگر اور لوگ ایک گھاٹی میں اور انصار دوسری گھاٹی میں

Black Sea
Constantinople
BYZANTINE EMPIRE
ARMENIA
Frontier zone
Caspian Sea
Aral Sea
R. Oxus
Marv
Tus
Herat
ANATOLIA
MESOPOTAMIA
Rayy
CRETE
Antioch
SYRIA
SASANID EMPIRE
Mediterranean Sea
Damascus
Ctesiphon
Hamadan
Isfahan
Caesarea
Jerusalem
GHASSAN
HIRA
Kufa
PENTAPOLIS
Alexandria
Babylon
Persepolis
Persian Gulf
EGYPT
HIJAZ
Khaybar
KINDA
NAJD
Medina
ARABIA
UMAN
R. Nile
Red Sea
Mecca
YAMAMA
NUBIA
YEMEN
Ma'rib
HADRAMAUT
ETHIOPIA
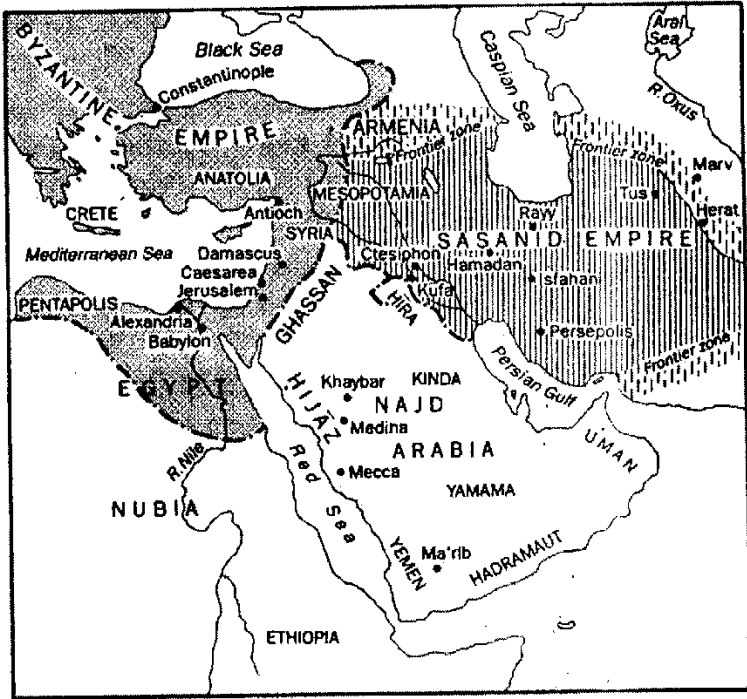
بعثتِ نبوی ﷺ کے وقت عرب اور بیرونِ عرب کی سیاسی تقسیم
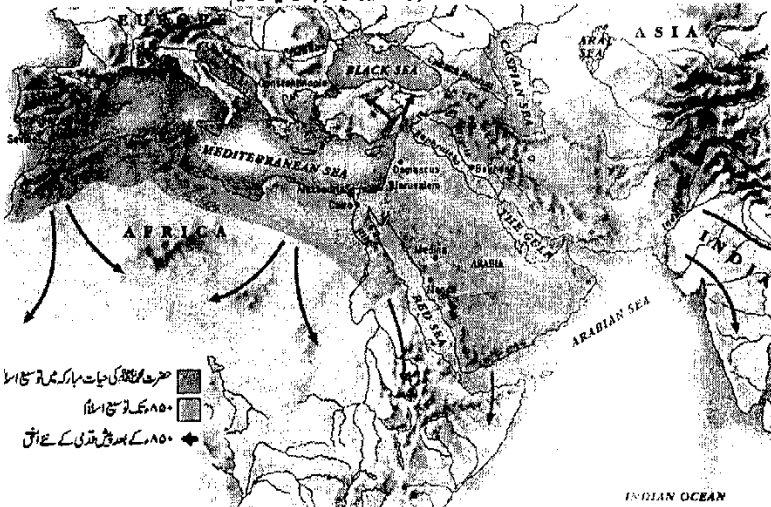
اسلام کی برق رفتار پیش قدمی

چلتے ہوتے تو میں انصار کے ساتھ چلتا ہوتا۔ اے اللہ! انصار پر، اُن کی اولاد پر، ان کی اولاد کی اولاد پر رحم فرما۔" (۳۲)

اس خطبے کی اثرانگیزی دیدنی تھی۔ انصار پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔ اُن کی ڈاڑھیاں آنسوؤں سے تر ہو گئیں۔ وہ بیک زبان پکار اُٹھے۔ رضینا برسول اللہ قسماً و حظاً۔ "ہم رسول اللہ ﷺ کی تقسیم پر راضی ہیں۔"

حضور ﷺ کی سیاسی حکمتِ عملی کا یہ ایک اجمالی بیان ہے۔ آپ ﷺ نے ایک ایسی ریاست کی بنیاد رکھی۔ جس نے آگے چل کر قیصر و کسریٰ کی حکومتوں کے تخت اُلٹ دیے۔ آگسٹس کی رومن ایمپائر سات سو برس کی فتوحات کا نتیجہ تھی۔ یہ عظیم سلطنت ھن اور گوتھ (Goth) قوموں کے حملوں کے سامنے ایک صدی بھی نہ ٹھہر سکی اور اس طرح تباہ ہوئی کہ چند بچے کھچے نشانات کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ اسلامی حکومت نصف صدی سے کچھ زائد عرصے میں قائم ہو گئی۔ وہ ایرانی سلطنت جس نے روما کی فوجوں کو تقریباً ہزار برس روکے رکھا۔ اسلامی ریاست کے مقابلے میں دس سال کے اندر اندر سپر انداز ہو کر رہی۔ لاریب اسلام نے انسان کو اس قعرِ مذلت سے نکالا جس میں یونان و روم اور فارس و ہند کی تہذیبوں نے اسے ڈال رکھا تھا۔ اسلام کی کامیابی کا راز یہی ہے۔ (۳۳)

سب سے بڑھ کر یہ اعجاز ہے اُس صحرا نشیں پیغمبر ﷺ کا جس نے سیاست کے منہ زور گھوڑے کو اخلاق کی لگام دی۔ جس نے مسند اقتدار پر طاغوتی قوتوں کی اجارہ داری کو ٹھکرا دیا اور ثابت کر دیا کہ تاریخ ساز انقلاب کے لیے انسانیت کش ذرائع اختیار کرنا ضروری نہیں۔ بلند آدرش، فکرِ صالح، عمل پیہم اور قوتِ ایمان سے کامیابی نہ صرف ممکن ہے بلکہ یقینی۔

سیاستِ نبوی ﷺ کا بین الاقوامی مزاج

مدینہ کی حکومت دس سال میں ۲۷۴ مربع میل یومیہ کے حساب سے بڑھی۔ مؤرخین اور محققین اسلام کی اس وسیع اشاعت پر انگشت بدنداں ہیں۔ حضور ﷺ نے دنیا کی جغرافیائی صورت حال کو مکمل طور پر تبدیل کر دیا۔ اس سے بھی بڑا کارنامہ یہ ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی نبوت کی برکت

سے دنیا کا سیاسی مزاج بدلا۔ فتح مکہ کے موقع پر حضور ﷺ کی ہدایت پر ابوسفیان کو ایک تنگ گھاٹی کے پاس پہاڑی کے اوپر سے اسلامی لشکر کی پیش قدمی کا نظارہ کرایا گیا۔ ابوسفیان مبہوت ہو کر رہ گیا۔ اُس نے حضرت عباسؓ سے کہا "عباس! تمھارے بھتیجے کی بادشاہت تو بہت دور تک قائم ہو گئی ہے۔" حضرت عباسؓ نے جواب دیا۔ "یہ بادشاہت نہیں، نبوت ہے۔" حقیقت یہ ہے کہ آپ ﷺ نے بین الاقوامی سیاسیات میں حریت، مساوات، رواداری اور عدل و انصاف کی شاندار روایات قائم کیں۔ واقعتاً یہ اقتدار کی جنگ نہیں، اقدار کی جنگ تھی۔ ان اقدارِ عالیہ کا مختصر جائزہ پیشِ خدمت ہے:

ا۔ اسلامی انقلاب بنی نوعِ انسان کے لیے سچی آزادی کا پیام لے کر آیا۔ نظامِ جاہلیت نے بنی نوع انسان کو جن ناروا پابندیوں میں جکڑا ہوا تھا اسلام نے ان میں سے بعض کو فی الفور اور بعض کو بتدریج ختم کر ڈالا۔ انسان پر انسان کی خدائی کا دور تمام ہوا۔ قرآن پاک میں حضور ﷺ کی بعثت کا ایک بڑا مقصد یہ بیان کیا گیا ہے۔ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۚ (الاعراف:۱۵۷) "یہ پیغمبر ان کے بوجھ اُتارتا ہے اور اُن زنجیروں سے آزاد کرتا ہے جو انھوں نے اپنے گلے کا طوق بنا رکھی ہیں۔" اسلام نے غلامی کے ادارے پر بھی حکیمانہ انداز سے ضربِ کاری لگائی۔ ایک حدیث پاک میں ہے۔ "اے معاذ! اللہ نے سطحِ زمین پر کوئی چیز ایسی پیدا نہیں کی جو غلام آزاد کرنے سے زیادہ اُسے پسند ہو۔ اسی طرح روئے زمین پر کوئی چیز اس نے پیدا نہیں کی جو طلاق سے زیادہ اُسے مبغوض ہو۔" قتلِ ناحق کی سزا کے لیے ایک صورت یہ بھی رکھی گئی ہے کہ غلام آزاد کر دیا جائے۔ سید قطب شہیدؒ نے یہاں ایک بڑے پتے کی بات کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ایک آزاد کے قتل کی سزا کے طور پر ایک غلام کو آزاد کرنا بہت معنی خیز ہے۔ دراصل ایک آزاد آدمی کی زندگی کا خاتمہ ہونے سے جو کمی ہوئی ہے، اسلام کے نزدیک اس کی تلافی ایک غلام کو آزاد کرنے سے ہی ہو سکتی ہے۔ گویا "اسلام کے نزدیک آزادی عین زندگی ہے اور

غلامی عین موت ہے۔" (۳۴)

۲۔ عہد جاہلیت میں جنگ کا کوئی ضابطہ اور قاعدہ مقرر نہ تھا۔ دشمن کے ہر فرد حتیٰ کہ عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور اپاہجوں تک کو موت کے گھاٹ اُتار دیا جاتا۔ لاشوں کی بے حرمتی کر کے آتش انتقام کو ٹھنڈا کیا جاتا۔ جنگی قیدیوں کے ساتھ جانوروں سے بدتر سلوک ہوتا۔ دورِ جدید میں کچھ روشن دماغ ماہرین نے یہ رائے ظاہر کی کہ جنگ کے بھی حدود و آداب مقرر ہونے چاہییں۔ بحث و تمحیص کے بعد جنیوا اور ہیگ کنونشنز میں کچھ اصول وضع بھی کیے گئے۔ لیکن دو عظیم جنگوں میں یہ اصول بن کھلے غنچوں کی طرح مرجھا کر رہ گئے۔ بین الاقوامی قانون کے ماہر پروفیسر نپولڈ (Nippold) کو کہنا پڑا۔ "جنگ کا کسی قانون سے کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ جنگ میں قانونی تحفظات نہیں، جنگی تقاضے اہمیت رکھتے ہیں۔" (۳۵) حضور ﷺ نے اپنی بہترین جنگی حکمتِ عملی سے جنگ کو ایک سائنس بنا دیا...... ایک ایسی سائنس جس میں آرٹ کے جمالیاتی پہلوؤں کی خوبصورت آمیزش ہے۔ دورانِ جنگ بلا ضرورت درختوں کو کاٹنے یا عورتوں، بچوں اور بوڑھوں پر ہاتھ اُٹھانے سے حکماً روک دیا۔ فتح مکہ کے موقع پر تقریباً ہر شخص کو امان دی الا یہ کہ کوئی شخص خود ہی اپنی جان کا دشمن نہ ہو۔ خواجہ غلام السیدین کا یہ کہنا مبالغہ نہیں "محسن انسانیت ﷺ نے جنگ کو بھی ایک تعلیمی ادارہ بنا دیا۔"

۳۔ بعثت نبوی ﷺ سے پہلے جنگیں نسلی، علاقائی اور لسانی بنیادوں پر لڑی جاتی تھیں۔ گذشتہ صدی میں بھی دو عظیم جنگیں نیشنلزم کے جذبہ سے لڑی گئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عالمی امن اور جارحانہ قوم پرستی ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ حضور ﷺ چاہتے تو اپنی دعوت کے لیے عربی قومیت کا آسان سا نعرہ (Slogan) استعمال کر سکتے تھے۔ آپ ﷺ قومیت پرستی کے راستے سے نہیں، اس کے مقابلے میں آگے بڑھے۔ واقعہ ہجرت سے یہ سبق ملتا ہے کہ اصولوں کے معاملے میں وطن مالوف کو ترک کر دینا بہتر ہے بہ نسبت اس سے کہ وطنیت پرستی کے لیے اصول چھوڑ دیے جائیں۔ آپ ﷺ نے تمام انسانوں کو بلا امتیاز نسل ایک اصولی دعوت پر

جمع ہونے کی دعوت دی۔حبش کے بلالؓ، روم کے صہیبؓ اور فارس کے سلمانؓ ملت واحدہ کے افراد قرار پائے۔اس دعوت کی روح کو جنگوں میں بھی ملحوظ رکھا گیا۔حضور ﷺ کا ارشاد ہے: من نصر قومہٗ علیٰ غیر الحق فھو کالبعیر الذی ردیٰ فھو ینزع بذنبہ۔"جو شخص کسی ناجائز معاملہ میں اپنی قوم کی مدد کرتا ہے،اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی اُونٹ کنوئیں میں گر رہا ہو اور یہ اس کی دُم پکڑ کر لٹک گیا ہو تو یہ بھی اُس کے ساتھ جا گرا۔"(ابوداؤد)

۴۔ زمانہ قدیم سے لے کر عہد جدید تک بالعموم سیاسی معاہدات کی حرمت کا پاس نہیں کیا گیا۔سیکولر سیاست کے فکری امام میکیاولی کی تعلیم ہے کہ"بادشاہ کے لیے نہ تو ممکن ہے اور نہ ضروری کہ وہ اپنے عہد و پیمان پر اُس وقت بھی قائم رہے جب ایسا کرنے سے نقصان پہنچتا ہو۔"وہ کہتا ہے۔"عہد توڑنے کے لیے بادشاہ ہزار بہانے تلاش کرسکتا ہے۔"(۳۶)حضور ﷺ کی زندگی میں کوئی ایک واقعہ بھی نہیں ملتا جب آپ ﷺ نے سیاسی مصلحت (Reason of the State) کے نام پر معاہدات کی خلاف ورزی کو روا رکھا ہو۔حضور ﷺ نے سیاسی قوتوں کے ساتھ تاریخ ساز معاہدات کیے۔میثاقِ مدینہ ڈاکٹر حمید اللہ صدیقی کی تحقیق کے مطابق دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور ہے۔(۳۷) قبل ازیں معاہدۂ حدیبیہ کا تفصیلی ذکر ہو چکا ہے۔ہجرت کے نویں سال نجران کے عیسائیوں سے جو معاہدہ ہوا اُس میں انھیں مکمل مذہبی آزادی کی ضمانت دی گئی۔ان معاہدات سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ﷺ سیاسی مسائل کو سیاسی پلیٹ فارم پر حل کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔ایک اور اہم بات یہ ہے کہ عہد شکنی کسی حال میں گوارا نہ تھی۔معاہد قوم کے افراد کی حفاظت کے لیے سخت ہدایات جاری فرمائیں۔ارشاد ہوا۔"جو کوئی کسی معاہد کو قتل کرے،اُسے جنت کی خوشبو تک نصیب نہ ہو گی حالانکہ اُس کی خوشبو چالیس سال کی مسافت تک پہنچتی ہے۔"اسلامی فوج اُس دشمن کا تعاقب بھی نہیں کرسکتی جو بھاگ کر مسلمانوں کی معاہد قوم کے ہاں پناہ لے لے۔فریق ثانی معاہدے کی خلاف ورزی کرتا تو آپ ﷺ اُسے وضاحت کا موقع یا اعلانیہ معاہدے کے خاتمے کا نوٹس دیتے۔الغرض حضور ﷺ کے معاہدات نے دنیا میں نئے

سیاسی فکر و نظر کی بنیاد رکھی۔

۵۔ نبی اکرم ﷺ نے جو نظام حکومت قائم کیا، اس میں شورائیت کی روح پوری طرح موجود تھی۔ شورائیت کسی بھی معقول جمہوری نظام کی روح ہے۔ سورۃ الشوریٰ میں اہلِ ایمان کی سات نمایاں صفات کا ذکر ہے جن کی وجہ سے ان کا شمار اہلِ جنت میں ہوگا۔ ان میں سے ایک صفت ہے وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (الشوریٰ:۳۸) ''ان کا ہر کام مشورے سے ہوتا ہے۔'' مشورے کا ذکر نماز اور انفاق کے درمیان ہوا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شورائی نظام قائم کرنا نماز کی طرح فرائض میں سے ہے۔ سورۃ آل عمران میں اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو حکم دیا وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (آل عمران:۱۵۹) ''ہر اہم معاملے میں ان سے مشورہ کیجیے۔'' حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں۔ ما رئیت رجلاً اکثرا ستشارۃ للرجل من رسول اللہ۔ (ترمذی) ''میں نے ایسا شخص نہیں دیکھا جو رسول اللہ ﷺ سے زیادہ لوگوں سے مشورہ کرنے والا ہو۔'' ابن جریر، طبری، ابن جوزی، امام رازی، قرطبی اور علامہ آلوسی جیسے مفسرین کا کہنا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو مشورہ لینے کا حکم اس لیے دیا گیا تاکہ امت میں شورائیت کی سنت قائم ہو جائے۔ آپ ﷺ ہر غیر منصوص معاملہ میں مشورہ لیتے خواہ اس کا تعلق امور دینی سے ہو، جنگ سے ہو یا انتظامی معاملات سے۔ غزوۂ خندق کے موقع پر جب خندق کے پار دشمن کا دباؤ بہت بڑھ گیا۔ تو آپ ﷺ نے بنی غطفان کے سرداروں کے ساتھ مدینہ کے پھلوں کا ایک تہائی دے کر انھیں دشمن سے الگ ہونے کی پیشکش کی۔ تاہم حتمی فیصلہ سے قبل آپ ﷺ نے مشاورت کا اہتمام کیا۔ انصاری سرداروں حضرت سعد بن معاذؓ اور حضرت سعد بن عبادہؓ نے کہا۔ ''اگر یہ اللہ اور رسول ﷺ کا حکم ہے تو سرِ تسلیم خم ہے۔ ورنہ ہم اس مصالحت کے حق میں نہیں۔ اہلِ غطفان ہم سے دور جہالت میں کچھ حاصل نہ کر سکے۔ اب تو اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایمان کی دولت سے نوازا ہے۔'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ ''اگر یہ اللہ کا حکم ہوتا تو میں مشورہ کیوں کرتا۔'' چنانچہ اس مشاورت کے بعد بنی غطفان سے مصالحت کے امکان کو مسترد کر دیا گیا۔ (۳۸)

۶۔ بین الاقوامی سیاسیات کا مسلّمہ اصول ہے کہ سفیر امن و سلامتی کے پیامبر ہوتے ہیں۔ ان کا تحفظ بین الاقوامی امن کا لازمی تقاضا ہے۔ المناک حقیقت یہ ہے کہ حضور ﷺ کے بعض انتہائی معتبر سفراء کو مخالف قبائل یا دشمن اقوام نے بے دردی سے شہید کر کے جنگ کے شعلوں کو دانستہ ہوا دی۔ نبی محتشم ﷺ سفراء کے ادب و احترام کا خاص خیال رکھتے۔ مدعی نبوت مسیلمہ کذاب کا سفیر جب اس کی طرف سے نبوت میں شرکت کا اشتعال انگیز پیغام لے کر پہنچا تو آپ ﷺ نے اس قدر فرمایا۔''اگر سفیروں کا قتل منع نہ ہوتا تو میں تجھے قتل کرا دیتا۔'' اسلامی عہدِ اقتدار میں سفیروں کو بر بنائے عہدہ حکومت اور عوام کی طرف سے خاص تحفظ حاصل رہا ہے۔ سید امیر علی کی تحقیق کے مطابق مستقل سفیروں کے تقرر کا آغاز یورپ سے دو سو سال پہلے مسلمانوں میں ہوا۔(۳۹) آج اکیسویں صدی میں امریکی حکام کے ایماء پر افغانستان کے سابق سفیر ملا عبدالسلام ضعیف پر جو قیامت گزری اس کا اندازہ ان کی خودنوشت داستان ''جرم ضعیفی'' سے لگایا جا سکتا ہے۔ رسوائے زمانہ امریکی فلم The Innocene of Muslims کے خلاف لیبیا میں ہونے والے پرتشدد عوامی مظاہروں کے دوران امریکی سفیر کرسٹوفر سٹیونز کی ہلاکت بھی اسلامی نقطۂ نظر سے قطعاً بلا جواز اور سراسر غیر ذمہ دارانہ اقدام ہے۔

۷۔ حضور ﷺ کی جملہ سیاسی مساعی کا محور عالمی امن کا قیام تھا۔ اسلامی ریاست کے سربراہ کی حیثیت سے دس سال کے قلیل عرصے میں آپ ﷺ نے مثالی امن قائم کر دیا۔ بیرونی ممالک کے سربراہوں کو آپ ﷺ نے جو دعوتی خطوط لکھے، ان میں بھی صاف صاف فرمایا۔''اسلام قبول کرلو سلامتی میں آ جاؤ گے۔'' تاہم امن کے نام پر ظالم و مظلوم میں بقائے باہمی کا وہاں کوئی تصور نہ تھا۔ حضور ﷺ نے بعثت سے قبل بھی معاہدہ حلف الفضول میں شرکت فرمائی۔ اس معاہدے کی ایک اہم شق یہ تھی کہ مکہ میں جو بھی مظلوم نظر آئے خواہ وہ مکہ کا باشندہ ہو یا کسی اور جگہ کا، سب اس کی حمایت اور اعانت کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں گے اور اس کا حق دلا کر رہیں گے۔ رسول اللہ ﷺ بعثت کے بعد فرمایا کرتے تھے۔''میں عبداللہ

بن جدعان کے مکان پر ایک ایسے معاہدے میں شریک تھا کہ مجھے اس کے عوض سرخ اونٹ بھی پسند نہیں اور اگر (دور) اسلام میں اس عہد و پیمان کے لیے مجھے بلایا جاتا تو میں لبیک کہتا۔"(۴۰)

۸۔ اقلیتوں کے ساتھ حسن سلوک بین الاقوامی دنیا کے لیے پیغمبر انقلاب ﷺ کا ایک اور عطیہ ہے۔اقلیتوں سے ایک ہی خواہش کی گئی تھی کہ وہ اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے خلاف کسی سازش میں شریک نہ ہوں۔عرب کے یہودیوں نے پے در پے اس اصول کو بری طرح پامال کیا۔اب یہ خواہش ہی کی جاسکتی ہے کاش وہ ایسا نہ کرتے اور ظاہر ہے خواہشات سے سیاسی حقیقتیں تبدیل نہیں ہوتیں۔انھوں نے ہر وہ کام کیا جو بادشاہ کے خلاف جنگ (Waging War against the King) اور انہدام ریاست (Dilapidation of the State) کے زمرے میں آتا ہے۔جہاں جہاں یہود و نصاریٰ اور دوسری اقلیتوں نے ریاست کے بنیادی اصولوں کا احترام کیا وہ ہر طرح کے احترام اور تحفظ کے مستحق ٹھہرے۔خود اقلیتیں بھی اسلامی ریاست میں پوری طرح مطمئن تھیں۔رومی شہنشاہ کانسٹنٹائن نے حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کی باہمی آویزش کے دنوں میں مسلم مملکت کے عیسائیوں کو خفیہ ایلچی بھیج کر بغاوت پر اکسایا۔انھیں یقین دلایا گیا کہ اگر آپ لوگ بغاوت کر دیں تو شہنشاہ کی فوج بھی حملہ کر کے اس جنگ کو منطقی انجام تک پہنچا دے گی۔مگر ان عیسائیوں نے جو کہ ان رومی حکمرانوں کی سابق رعایا تھے، جواب دیا کہ وہ مسلمانوں کو ان پر ترجیح دیتے ہیں۔(۴۱)

الغرض حضور ﷺ نے عصری سیاست کو بین الاقوامی سیاسیات کے دائمی تقاضوں سے آشنا کر دیا۔

اللھم صل علی محمد و علی آل محمد

مراجع وحواشی

۱۔ (الف) آیدم کیوپر، جیسیکا کیوپر...... The Social Science Encyclopaedia

Services Book Club.(1989)

اصل الفاظ یہ ہیں:

" Political Science is, consequently, both concerned with what should be and what is. This is one reason why some believe that the term science should not be taken too literally in the context of the study of politics, as political science is more than science in the normal sense of the word; it is both descriptive examination and prescriptive philosophy." (Article by J. Blondel/University of Essex)

(ب) سی۔ایم۔جوڈ...... :Philosophy

(VI-The Philosophy of Politics:Chapter)

The English University Press London.(1963)

۲۔ سید قطب شہید...... جادہ و منزل (معالم فی الطریق) ترجمہ خلیل احمد حامدی

۳۔ ابن حجر العسقلانی...... الاصابہ فی تمیز الصحابہ...... المکتبہ التوفیقیہ القاھرہ۔مصر

۴۔ (الف) مولانا ظفر علی خان...... غلبہ روم، سورۃ الروم کی ابتدائی آیات کی تاریخی تفسیر (۲۰۰۷ء، یکتا کتابیں لاہور

(ب) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ...... تفہیم القرآن جلد سوم، تفسیر سورۃ الروم

(ج) ایڈورڈ گبن...... History of the Decline and Fall of Roman Empire

گبن کے اصل الفاظ ہیں:

"At the time this prediction is said to have been delivered, no prophecy

could be more distant from its accomplishment since the first twelve years of Hiraclius announced the approaching dissolution of the empire."

۵۔ وحید الدین خاں...... علم جدید کا چیلنج (۱۹۸۴ء)...... مجلس نشریات اسلام کراچی

۶۔ ابن ہشام

۷۔ نعیم صدیقی...... محسن انسانیت e

۸۔ ابن ہشام

۹۔ ایضاً

۱۰۔ سیارہ ڈائجسٹ رسول نمبر...... مقالہ "مکہ کی سرد جنگ" از محمود فاروقی

۱۱۔ ایضاً

۱۲۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ...... عہد نبوی میں نظام حکمرانی...... مرکزی اردو بورڈ کراچی

۱۳۔ (الف) صحیح بخاری (ب) زاد المعاد (ج) طبقات (د) الاستیعاب

۱۴۔ محمد حسین ہیکل...... حضرت عمر فاروقؓ (۲۰۰۷ء)...... الحمد پبلی کیشنز لاہور

فتح مدائن کے بعد بشر بن خصاصیہ بہت سا بیش قیمت مالِ غنیمت لے کر مدینہ منورہ پہنچے۔ اس مال میں شاہِ کسریٰ کا قیمتی لباس اور دوسرے لوازمات بھی موجود تھے۔ حضرت عمرؓ نے سراقہ بن جعشمؓ کو بلا کر انھیں کسریٰ کا لباس پہنا دیا۔ فرمایا "اللہ اللہ! بنو مدلج کا ایک اعرابی اور اس کے جسم پر کسی کا یہ ملبوس۔ اے سراقہ! ایسے دن کب آتے ہیں کہ تیرے جسم پر کسریٰ اور آلِ کسریٰ کا یہ پر تکلف اور شاہانہ لباس تیرے اور تیری قوم کے لیے مجد و شرف کا باعث بنے۔"

۱۵۔ ڈاکٹر حمید اللہ...... رسول اللہ ﷺ کی حکمرانی و جانشینی

(The Prophet's establishing a State and his Succession)

(۲۰۰۶ء) مترجم پروفیسر خالد پرویز بیکن بکس ملتان

۱۶۔ بریگیڈیئر گلزار احمد...... غزواتِ رسول اللہ ﷺ ۲۰۰۵ء (تیسرا ایڈیشن)...... اسلامک پبلی کیشنز لاہور

۱۷۔ ڈاکٹر حمید اللہ...... عہد نبوی ﷺ کے میدانِ جنگ

۱۸۔ نعیم صدیقی...... محسن انسانیت ﷺ...... الفیصل ناشران لاہور

۱۹۔ ایضاً

۲۰۔ (الف) سنن النسائی...... دار السلام الریاض۔ سعودی عرب

(ب) مسند احمد..... المکتبہ الاسلامی بیروت۔ لبنان

(ج) ابن اسحق..... دار الکتب العلمیہ بیروت۔ لبنان

۲۱۔ نعیم صدیقی..... محسن انسانیت ﷺ

۲۲۔ ایک قبیلے کا نام ہے۔ ماہ صفر ۶ ھ میں اس قبیلے کا ایک وفد مدینہ آیا۔ حضور ﷺ سے انھوں نے استدعا کی کہ ہم میں سے کچھ لوگ مسلمان ہو گئے ہیں۔ ہماری تربیت اور اصولِ دین سے واقفیت کے لیے کچھ معلمین بھیج دیجیے۔ حضور ﷺ نے ان کے ساتھ دس صحابہؓ کو روانہ کر دیا۔ مقام رجیع پر پہنچ کر ان ننگ انسانیت لوگوں نے اپنے قول کی خلاف ورزی کی اور سوائے حضرت خبیبؓ اور حضرت زیدؓ کے تمام صحابہؓ کو شہید کر ڈالا۔ باقی دو صحابہ کو قریش مکہ کے سپرد کیا جنھوں نے ان کو سرعام تختہ دار پر لٹکا دیا۔ اس سے اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ مسلمان اس دور میں کس قماش کے مخالفین کے درمیان گھرے ہوئے تھے۔

۲۳۔ ڈاکٹر حمید اللہ..... رسول اکرم ﷺ کی سیاسی زندگی..... نفیس اکیڈیمی کراچی

۲۴۔ اوریانا فلاسی..... Interview with History / (۱۹۷۶ء)

(Interview with Ali Bhutto)

Houghton Mifflin Boston

۲۵۔ صفی الرحمٰن مبارکپوری..... الرحیق المختوم..... المکتبہ سلفیہ لاہور

۲۶۔ (الف) تاریخ طبری جلد ۳ (ب) طبقات ابن سعد جلد ۳

۲۷۔ صحیح بخاری

۲۸۔ ”ابو کبشہ آپ ﷺ کے دادا یا نانا میں سے کسی کی کنیت تھی اور کہا جاتا ہے کہ آپ ﷺ کے رضاعی باپ (حلیمہ سعدیہؓ کے شوہر) کی کنیت تھی۔ بہر حال ابو کبشہ غیر معروف شخص ہے اور عرب کا دستور تھا کہ جب کسی کی تنقیص کرنی ہوتی تو اسے اس کے آباو اجداد میں سے کسی غیر معروف شخص کی طرف منسوب کر دیتے۔“ (الرحیق المختوم)

۲۹۔ تاریخ طبری جلد ۳

یہاں اس امر کا حوالہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ عہدِ فاروقی میں عراق وایران کی تسخیر کے لیے کامیاب جہادی مہمات سرانجام دی گئیں۔ ایک ایسی ہی مہم میں امیر لشکر حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کو ایرانی سپہ سالار رستم کی طرف سفارتی مشن کے لیے منتخب کیا۔ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے رستم کے دربار میں جو تقریر کی اس نے سامعین کو مبہوت کر دیا۔ زیر دست لوگوں نے کہا: خدا کی قسم! اس عربی نے سچی بات کہی۔ بالا دست لوگوں نے کہا: اس نے ایسی بات کہی ہے کہ ہمارے غلام (جلد یا بدیر) اس کے

کیمپ میں چلے جائیں گے۔ خدا ہمارے پہلوں کو غارت کرے۔ وہ کس قدر احمق تھے کہ انھوں نے اس قوم کے معاملے کو معمولی سمجھا۔

۳۰۔ (الف) تاریخِ طبری...... دار ابن کثیر بیروت۔ لبنان

(ب) طبقات ابن سعد...... دار الاحیاء التراث بیروت۔ لبنان

۳۱۔ فلپ کے ہٹی...... A Short History of the Arabs

Regenery Publishing Luc 2nd Revised.(1970)

۳۲۔ ابن ہشام

۳۳۔ ایم این رائے...... Historical Role of Islam

۳۴۔ سید قطب شہیدؒ...... اسلام اور عدلِ اجتماعی...... اسلامک پبلی کیشنز لمیٹیڈ لاہور

۳۵۔ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ...... الجہاد فی الاسلام طبع دوم (۱۹۴۱ء)...... اسلامک پبلی کیشنز لمیٹیڈ لاہور

۳۶۔ میکیاولی...... The Prince

۳۷۔ ڈاکٹر حمید اللہ...... The Prophet's establishing a State and his Succession

۳۸۔ (الف) ابن ہشام

(ب) تاریخ طبری

۳۹۔ سید امیر علی...... A short History of the Saracens

Macmilan and Co Limited London.(1953)

۴۰۔ ابن سعد...... طبقات ج ۱۔

۴۱۔ ڈاکٹر حمید اللہ...... The Prophet's establishing a State and his Succession

---❀❀❀---

رحمۃ للعالمین ﷺ کا معاشی اسوۂ حسنہ

سیدنا حضرت یوسف علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے تعبیر خواب کا خصوصی ملکہ عطا فرمایا تھا۔ سورۃ یوسف میں ان خوابوں کا ذکر موجود ہے جن کی آپ نے صحیح صحیح تعبیر بتادی تھی۔ ایک بھیانک خواب شاہِ مصر نے اِن دنوں دیکھا جب زنانِ مصر کی سازشوں کی وجہ سے صریحاً ناانصافی کرتے ہوئے اُن کو حوالہ زنداں کر دیا گیا تھا۔ بادشاہ کے قاصد نے ان سے کہا تھا:

''اے یوسف، اے صدیق! بتائیے ہمیں (اس خواب کی تعبیر) کہ سات موٹی تازی گائیں ہیں، کھا رہی ہیں انھیں سات لاغر گائیں اور سات خوشے ہیں سرسبز اور دوسرے (سات خوشے) خشک، تاکہ میں (آپ کا جواب لے کر) واپس جاؤں لوگوں کی طرف، شاید وہ (آپ کے علم وفضل کو) جان لیں۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا: کہ تم کاشت کرو گے سات سال تک حسبِ دستور، تو جو تم کاٹو گے، اسے رہنے دو خوشوں میں مگر تھوڑا سا (ضرورت کے لیے نکال لو) جسے تم کھاؤ۔ پھر آئیں گے اس (خوشحالی) کے بعد سات (سال) بہت سخت، کھا جائیں گے جو ذخیرہ تم نے پہلے سے جمع کر رکھا ہوگا۔ ان کے لیے مگر تھوڑا سا جو تم محفوظ کرلو گے۔ پھر آئے گا اس عرصہ کے بعد ایک سال جس میں مینہ برسایا جائے گا لوگوں کے لیے اور اس سال وہ (پھلوں کا) رس نکالیں گے۔'' (سورۃ یوسف: ۴۶۔۴۹)

ان آیات کی تفسیر میں مفتی محمد شفیعؒ لکھتے ہیں:

''جس طرح انبیا کرام اور علمائے امت کا یہ فریضہ ہے کہ وہ لوگوں کی آخرت درست کرنے کی فکر کریں۔ اسی طرح ان کو مسلمانوں کے معاشی حالات پہ بھی نظر رکھنی

چاہیے کہ وہ پریشان نہ ہوں۔ جیسے یوسف علیہ السلام نے اس موقع پر تعبیر خواب بتا دینے کو کافی نہیں سمجھا بلکہ رحیمانہ اور خیر خواہانہ مشورہ بھی دیا کہ پیداوار کے تمام گیہوں کو خوشوں کے اندر رہنے دیں اور بقدر ضرورت صاف کر کے غلہ نکالیں تاکہ آخر سالوں تک خراب نہ ہو جائے۔ یہ تجربے کی بات ہے کہ جب تک غلہ خوشوں کے اندر رہتا ہے۔ غلہ کو کیڑا نہیں لگتا۔"(۱)

حضرت یوسف علیہ السلام کے اِس بصیرت افروز مشورہ کے بعد شاہِ مصر نے آپ کو اپنا معتمد خاص بنانے کی پیشکش کی تھی اور آپ نے وزارت خزانہ کا قلمدان یہ کہہ کر قبول کیا تھا:

قَالَ اجْعَلْنِي عَلَىٰ خَزَائِنِ الْأَرْضِ ۖ إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ ○
(یوسف:۵۵)

"تم مجھے مقرر کر دو زمین کے خزانوں پر۔ بے شک میں حفاظت کرنے والا اور (معاشی مسائل کا) ماہر ہوں۔"

پیر کرم شاہؒ اس آیت کی توضیح کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔"یعنی میں ناجائز اخراجات کی حفاظت کر سکتا ہوں اور بامقصد اور نفع بخش مقامات پر خرچ کرنے کے اصولوں سے اچھی طرح واقف ہوں۔"(۲)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ نبوت اور معیشت باہم متغائر و متصادم نہیں ہیں۔تمام انبیا کرام للہیت،عبودیت اور تقویٰ و احسان کے اعلیٰ ترین مقام پر فائز تھے۔اپنے عمل اور اسوہ سے انھوں نے دنیا کو یہ سبق دیا کہ نیک آدمی وہ نہیں جو کشاکش زندگی سے کنارہ کش ہو کر ویرانوں اور صحراؤں میں اللہ کو تلاش کرتا پھرے۔اصل نیک شخص وہ ہے جو زندگی کے بنیادی امور اور روزمرہ سرگرمیوں میں نہ صرف بھرپور دلچسپی لیتا ہے بلکہ حکیمانہ رہنمائی بھی پیش کرتا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام ہی نہیں، جتنے انبیائے کرام مبعوث ہوئے،سب کے سب کسی نہ کسی حیثیت سے معاشی امور میں دخیل رہتے تھے۔حضرت نوح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل

میں متوقع طوفان سے اہلِ ایمان کو بچانے کے لیے تیس گز اونچی تین منزلہ کشتی بنائی تھی۔ پہلی منزل چوپایوں اور درندوں کے لیے تھی۔ درمیانی منزل انسانوں کے لیے اور اوپر کی منزل پرندوں کے لیے مختص تھی۔ گویا حضرت نوح علیہ السلام بڑھئی کے کام میں خوب ماہر تھے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ نے لوہے کو نرم کر دیا تھا اور وہ زرہیں فروخت کر کے روزی کماتے تھے۔ حضرت ادریس علیہ السلام درزی کا کام کرتے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بکریاں چرایا کرتے تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کاشت کاری کرتے تھے۔ قبل از نبوت حضور رسالت مآب ﷺ بچپن میں بکریاں چرایا کرتے اور جوانی میں ایک معاہدہ کے مطابق سیدہ خدیجہؓ کے لیے تجارتی سفر بھی کیا کرتے تھے۔ آپ ﷺ کے زمانہ تجارت کو یاد کرتے ہوئے قیس بن سائب مخزومی فرماتے ہیں۔ زمانہ جاہلیت میں رسول اللہ ﷺ میرے شریکِ تجارت تھے۔ آپ بہترین شریک تھے۔ نہ جھگڑتے تھے اور نہ کسی قسم کا مناقشہ کرتے تھے۔ (۳) بکریاں چرانے کے بارے میں حضرت جابر بن عبداللہؓ کی روایت میں ہے کہ ہم مقام الظہران میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے۔ ہمیں وہاں پیلو کے پھل چنتے دیکھ کر آپ ﷺ نے فرمایا، سیاہ دیکھ کر چنو۔ وہ زیادہ خوش ذائقہ اور لذیذ ہوتے ہیں۔ ہم نے پوچھا۔ یارسول اللہ! کیا آپ بکریاں چراتے تھے (جو آپ کو یہ بات معلوم ہوئی)؟ آپ ﷺ نے فرمایا۔ ”ہاں کوئی نبی ایسا نہیں گزرا جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں۔“ (۴) انبیائے کرام کے ان معمولات میں ایک حکمت یہ پوشیدہ ہے کہ روزی کمانے کے لیے مذکورہ معاشی سرگرمیاں کسی انسان کے لیے باعث ننگ و عار نہ ہونی چاہییں۔ اصل اہمیت رزقِ حلال اور کسبِ حلال کو حاصل ہے اور یہ کہ معاشی جدوجہد اخلاقی و روحانی ترقی کے راستے میں حائل نہیں ہو سکتی۔ مولانا روم کہتے ہیں۔ ”دنیا کا ساز و سامان پانی کے مانند ہے اور اس میں انسان کا قلب ایک کشتی کی طرح ہے۔ پانی جب تک کشتی کے نیچے اور ارد گرد ہے تو کشتی کے لیے مفید ہے اور اگر کشتی کے اندر داخل ہو جائے تو یہی کشتی کے ڈوبنے کا باعث بن جائے گا۔“ (۵) انبیائے کرام کے اپنے عمل سے یہ بھی ثابت ہے کہ طلب و رسد کے قوانین، بیع و شرا کے اصول و ضوابط، متاجر اور آجر کے تعلقات اور منڈی کی معیشت

کے اُتار چڑھاؤ کے بارے میں بھی وہ براہ راست علم اور تجربہ رکھتے تھے۔

قرآن مجید میں رزقِ حلال کے لیے معاشی جدوجہد کی زبردست حوصلہ افزائی کی گئی ہے اور رزقِ حلال کی کوشش کو اللہ تعالیٰ کا فضل تلاش کرنے کا نام دیا گیا ہے۔

فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (الجمعہ:۱۰)

''پھر جب نماز (جمعہ) پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرتے رہو شاید کہ تمھیں فلاح نصیب ہو جائے۔''

حج ایک انتہائی اہم روحانی عبادت ہے۔قرآن حکیم نے اس معاملے میں بھی روحانیت اور مادیت کو باہم ملا دیا ہے۔قبل از اسلام لوگ حج کے لیے جاتے وقت زادِراہ لینے کو شانِ تقویٰ کے خلاف سمجھتے اور پھر ضرورت کے وقت دوسرے لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے تھے۔قرآن حکیم میں اس راہبانہ تصور پر بھی ضرب کاری لگائی گئی۔

''اور (حج کے سفر میں) زادِ راہ ساتھ لے جایا کرو، کیونکہ بہترین زادِ راہ تقویٰ ہے۔''(البقرہ:۱۹۷)

بعض حضرات حج کے سفر میں تجارت کو بھی روحانیت کے منافی جانتے تھے۔قرآن حکیم میں یہ غلط فہمی بھی دور کر دی گئی، بشرطیکہ حج کے مناسک متاثر نہ ہوں۔

''تم پر اس بارے میں کوئی گناہ نہیں کہ تم (حج کے دوران تجارت یا مزدوری کے ذریعے) اپنے پروردگار کا فضل تلاش کرو۔''

حالت احرام میں دوسری بہت سی پابندیوں کے ساتھ ہر نوع کے شکار پر بھی پابندی ہے، البتہ احرام اُتار دینے کے بعد حکم ہے:

''ہاں احرام کی حالت جب ختم ہو جائے تو شکار تم کر سکتے ہو۔''(المائدہ:۲)

الغرض زمین میں انسان کے لیے ذرائع معاش کا پیدا کیا جانا اللہ تعالیٰ کے عظیم احسانات

میں سے ہے۔اس کا بنیادی تقاضا ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کے لیے شکر گزاری کا رویہ اختیار کرے۔

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝ (الاعراف:۱۰)

''ہم نے تمھیں زمین میں اختیارات کے ساتھ بسایا اور تمھارے لیے یہاں سامانِ زیست فراہم کیا، مگر تم کم ہی شکر گزار ہوتے ہو۔''

ایک دوسرے مقام پر اس مضمون کو یوں ادا کیا گیا ہے۔

وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ (القصص:۷۳)

''یہ اس کی رحمت ہے کہ اس نے تمھارے لیے رات اور دن بنائے، تاکہ تم (رات میں) سکون تلاش کرو اور (دن کو) اپنے رب کا فضل تلاش کرو، شاید کہ تم شکر گزار ہو۔''

معاشی سرگرمیوں کی اہمیت کو ایک امر واقعہ کے طور پر بیان کرنے کے بعد صیغۂ امر و نہی کو استعمال کرتے ہوئے اپنے جائز مال کو اخروی فائدے کے لیے استعمال کرنے اور دنیاوی آرام و راحت کے لیے اپنا جائز حصہ ترک نہ کرنے کی بھی تلقین کر دی گئی۔ارشاد ربانی ہے:

وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا (القصص:۷۷)

''جو مال اللہ تعالیٰ نے تجھے دیا ہے، اس سے آخرت کا گھر بنانے کی فکر کر اور دنیا میں سے بھی اپنا حصہ فراموش نہ کر۔''

معاشی پہلو کی اس اہمیت کے باوجود اس غلط فہمی کی کوئی گنجایش نہیں کہ اسلام کے نزدیک معیشت ہی زندگی کا مطلوب و مقصود ہے۔حقیقت یہ ہے کہ توازن و اعتدال اسلامی تعلیمات کی امتیازی شان ہے۔جس طرح رہبانیت کا اسلام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں، ایسے ہی مادی خوشحالی بھی

مقصود بالذات نہیں ہے۔ مطالعۂ قرآن سے پتا چلتا ہے کہ خدا فراموش اقوام بے تحاشا مادی ترقی کے باوجود صفحۂ ہستی سے مٹا دی گئیں۔ قرآن حکیم میں متعلقہ آیات اس باب میں اس قدر واضح ہیں کہ کسی قسم کے اشتباہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ صرف تین مقامات ملاحظہ ہوں۔

(۱) وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۭ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا ۚ فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا ۭ وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ ○ (القصص: ۵۸)

”کتنی بستیوں کو ہم نے ہلاک کر دیا جو اپنی معیشت پر اترائیں، اب دیکھ لو ان گھروں کو، کم ہی کوئی ان کے بعد ان گھروں میں بسا ہے اور ہم ہی ان کے وارث ہوئے۔“

(۲) كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ○ وَّزُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ ○ وَّنَعْمَةٍ كَانُوْا فِيْهَا فٰكِهِيْنَ ○ كَذٰلِكَ ۣ وَاَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ○ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَاۗءُ وَالْاَرْضُ وَمَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ ○ (الدخان: ۲۵-۲۹)

”کتنے ہی باغ اور چشمے اور کھیت اور شاندار محل تھے جو وہ چھوڑ گئے۔ کتنے ہی عیش کے سروسامان جن میں مزے کر رہے تھے، ان کے پیچھے دھرے رہ گئے۔ یہ ہوا ان کا انجام اور ہم نے دوسروں کو ان چیزوں کا وارث بنا دیا۔ پھر نہ آسمان ان پر رویا نہ زمین اور ذرا سی بھی مہلت ان کو نہ دی گئی۔“

(۳) فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ۭ حَتّٰٓي اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ○ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۭ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ (الانعام: ۴۴-۴۵)

''پھر جب انھوں نے اس نصیحت کو جو انھیں کی گئی تھی، بھلا دیا تو ہم نے ہر طرح کی خوشحالیوں کے دروازے ان پر کھول دیے، یہاں تک کہ جب وہ ان بخششوں میں، جو انھیں عطا کی گئی تھیں، خوب مگن ہو گئے، تو اچانک ہم نے انھیں پکڑ لیا اور اب یہ حال تھا کہ وہ ہر خیر سے مایوس تھے۔ اس طرح ان لوگوں کی جڑ کاٹ کے رکھ دی گئی، جنھوں نے ظلم کیا تھا اور تعریف ہے رب العالمین کے لیے۔''

قرآن پاک میں یہ وضاحت بھی کر دی گئی ہے کہ جس نصیحت کو فراموش کر دینے کی پاداش میں مذکورہ قوموں کو نیست و نابود کر دیا گیا، وہ نصیحت دراصل کیا تھی؟ قرآن کے اولین مخاطبین اور بعد میں آنے والی قوموں کو واضح کر دیا گیا کہ تباہ شدہ اقوام نے کتاب اللہ کے احکام و حدود کو اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی میں نافذ کرنے سے انکار کر دیا تھا اور اگر وہ لوگ احکام الٰہی سے بغاوت نہ کرتے تو ان پر ایسی معاشی برکات کا نزول ہوتا جو ان کے وہم و گمان سے بھی ماورا تھیں۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ (المائدہ:۶۶)

''کاش انھوں نے تورات اور انجیل اور دوسری کتابوں کو قائم کیا ہوتا جو ان کے رب کی طرف سے ان کے پاس بھیجی گئی تھیں۔ ایسا کرتے تو ان کے لیے اوپر سے رزق برستا اور نیچے سے ابلتا۔''

دنیا کے تمام خدا بیزار معاشروں میں یہ قدرِ مشترک رہی ہے کہ وہ پیدائش دولت اور افزائش دولت کو محض اپنی ذہانت و فطانت کا کرشمہ سمجھتے ہیں اور اسی لیے صرفِ دولت کی ہر شکل کو بھی صرف اپنا ہی استحقاق گردانتے ہیں۔ انبیا کرام چونکہ اس طرز فکر اور طرز معیشت و معاشرت کے سب سے بڑے ناقد ہوتے ہیں، اس لیے مفاد پرست طبقات (Vested Interests) آگے بڑھ کر ان کے خلاف مورچہ زن ہو جاتے ہیں۔ قرآن حکیم میں دولت کے بہت بڑے پجاری کا قول بایں الفاظ نقل کیا گیا ہے۔

''قارون نے کہا، یہ سب مال و دولت مجھے اپنی ہنر مندی سے ملا ہے۔'' (اس لیے میں اس کا حقیقی مالک ہوں اور مجھے اس پر ہر طرح کے تصرف کا حق حاصل ہے)۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم نے دعوتِ توحید کے جواب میں جو کچھ کہا وہ دُنیا بھر کے مترفین اور اُن کی روایتی مذہبیت کی لفظ بہ لفظ عکاسی کرتا ہے۔

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا۔ (ہود:۸۷)

''اے شعیب کیا تمھاری نماز تمھیں اس بات کا حکم دیتی ہے کہ ہم اپنے باپ دادا کے معبودوں کو چھوڑ دیں، یا اپنے اموال میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف کرنا ترک کر دیں۔''

عربوں کے معاشی حالات قبل از اسلام

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ قدیم عرب نیم وحشی قبائل تھے اور بقیہ دنیا سے کٹے ہوئے تھے۔ یہ بات مکمل طور پر درست نہیں۔ عملاً یہ ایسا علاقہ تھا جس کی سرحدوں کے آس پاس عالمی طاقتیں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا تھیں اور اس عالمی کشمکش میں عرب قبائل اپنے معاشی مفادات کے تحفظ و فروغ کی مختلف صورتیں نکالنا جانتے تھے۔ یہاں تجارت اور بینک کاری کا نظام بھی موجود تھا۔(۶) زمانہ قدیم میں جنوبی عرب کے معاشرہ کی بنیاد زراعت پر تھی۔ غلہ کے علاوہ طرح طرح کے مصالحوں، لوبان اور عطریات کو بھی اس علاقہ کی مشہور پیداوار سمجھا جاتا تھا۔ مصالحے اور عطریات وغیرہ تو اُن کی مشہور برآمدت میں شمار ہوتی تھیں۔(۷) چنانچہ بیرون عرب خطۂ عرب کی ایک وجہ شہرت یہاں کے مصالحے اور عطریات بھی رہے ہیں۔(۸) ہر سال عرب کے مختلف علاقوں میں تجارتی میلے لگا کرتے تھے۔ سب سے مشہور میلہ مکہ کے قرب و جوار میں عکاظ کے مقام پر لگتا تھا۔ مکہ کئی لحاظ سے عربوں کا تجارتی ہیڈ کوارٹر تھا۔ اس کے مرکز ہونے کی ایک وجہ یہ تھی کہ یہ یمن، شام اور شمال کی طرف جانے والے راستے پر واقع تھا۔(۹) یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ قریش دُنیا کے اولین

بین الاقوامی تاجروں میں سے تھے۔(۱۰)

بعثت نبوی ﷺ سے قبل کفار مکہ کم و بیش ہر اس معاشی برائی میں مبتلا تھے جو اسلام کے نظام عدل و مواسات کی عین ضد سمجھی جاتی ہے۔ ذخیرہ اندوزی، سود، قمار وغیرہ کو وہ لوگ تجارتی معمولات کا درجہ دیتے تھے۔ محروم و مجبور طبقات کے استحصال کی جو مختلف شکلیں ان کے ہاں رائج تھیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آج کے سرمایہ داروں کی طرح وہ ''بکارِ خویش'' خوب ہوشیار تھے۔ مکے کے سٹہ باز تجارتی قافلوں کی آمد اور روانگی کے بارے میں شرطیں لگا کر بھی رقم کمانے کا ہنر جانتے تھے۔ یہ لوگ دودھ دینے والے جانوروں کو فروخت کرنے سے دو تین دن پہلے ان کے تھن باندھ دیتے، تاکہ وقتِ فروخت وہ زیادہ دودھ دیں۔ تاجر حضرات کھیتوں کی ممکنہ پیداوار قبل از وقت خرید کر قبضہ کر لیتے اور بعد ازاں من مانی قیمت پر فروخت کر دیتے۔ یہ لوگ اکتناز اور احتکار (Hoarding) کے ذریعے اشیائے خوردنی کی مصنوعی قلت پیدا کر کے ناجائز انتفاع کی صورت نکالنے میں بھی خوب ماہر تھے۔ موجودہ زمانے کی سٹہ بازی (Speculation) کا بھی ان کے ہاں رواج تھا۔ اس کے مطابق مال اور قیمت کے عدمِ وجود کے باوجود سودے طے پا جاتے اور پھر کسی ایک فریق کے مکمل نفع اور دوسرے فریق کے مکمل خسارے پر منتج ہوتے۔ غلامی کے ادارے کی بدترین شکل کی موجودگی سے پتا چلتا ہے کہ بیگار کا رواج عام تھا۔ کعبہ کی تولیت بھی قریش کی تجارتی اجارہ داری میں معاون تھی۔ ان کے تجارتی قافلے قبائل کی لوٹ مار سے محفوظ رہتے۔ وہ سب کچھ برداشت کر لیتے، مگر اپنے تجارتی مفادات پر زد پڑنے کے متحمل نہ ہوتے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ کے قبولِ اسلام کے بعد وہ اُن کے درپے آزار ہوئے، مگر جب احساس ہوا کہ ان کا قبیلہ مکہ کے تجارتی کاروانوں کے لیے راستے میں مزاحم ہو سکتا ہے تو انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ (صحیح بخاری جلد ۱) اسی طرح حضرت سعد بن معاذؓ کو بھی انھوں نے طوافِ کعبہ سے روکنا چاہا، مگر جب انھوں نے مدینہ کے قریب سے گزرنے والے قریشی قافلوں کو روکنے کی بات کی تو ان کے ہوش ٹھکانے آ گئے اور وہ خون کے گھونٹ پی کے رہ گئے۔ (صحیح بخاری جلد ۲) [دیکھیے ص ۱۶۲* کے تحت]

عربی معاشرہ نیک لوگوں سے یکسر خالی نہ تھا۔ ظلم و جور اور فسق و فجور کے اس یبوست زدہ ماحول میں بھی 'حنفا' کے نام سے کچھ لوگ موجود تھے۔ یہ لوگ دین ابراہیمی کے پیروکار ہونے کے مدعی تھے۔ ذاتی طور پر یہ حضرات انفرادی اصلاح کے لیے کوشاں تھے۔ تاہم اس بات کے شواہد نہیں ملتے کہ انھیں کبھی سنجیدگی سے لیا گیا ہو یا انفرادی سطح پر کیے گئے چند صالح اعمال سے مروجہ نظام Status quo کے لیے کوئی حقیقی خطرہ لاحق ہوا ہو۔ یہی صورت ہمیں مدنی معاشرے میں بھی نظر آتی ہے۔ اہلِ مدینہ زیادہ تر زراعت پیشہ تھے۔ وہاں اہلِ کتاب یہود سے توقع کی جا سکتی تھی کہ حرام و حلال میں تمیز کریں گے لیکن وہ بحیثیت مجموعی خود سود کی لعنت میں مبتلا تھے۔ ان کے مذہبی رہنما بھی ان حالات کے ساتھ سمجھوتہ کر چکے تھے۔ قدرتی طور پر وہ اس ظالمانہ معاشی نظام کے خلاف کوئی آواز بلند نہ کر سکتے تھے جس کے ساتھ ان کے دیرپا معاشی مفادات وابستہ ہو چکے تھے۔ ان کے اس طرزِ فکر و عمل کو قرآن پاک میں یوں بیان کیا گیا ہے:

لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ (المائدہ:۶۳)

''کیوں ان کے علما اور مشائخ انھیں گناہ پر زبان کھولنے اور حرام کھانے سے نہیں روکتے؟ یقیناً بہت ہی برا کارنامۂ زندگی ہے جو وہ تیار کر رہے ہیں۔''

بعثت نبوی ﷺ کے بعد

بعثت نبوی ﷺ کے بعد مکی سورتوں میں ایک ایک کر کے ان تمام معاشی ناانصافیوں کی پرزور مذمت کی گئی جو اہلِ ثروت کے کلچر کا حصہ بن چکی تھیں۔ یہ لوگ ناپ تول میں بے ایمانی کرتے تھے۔ فرمایا گیا:

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۝ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ۝ (المطففین:۱۔۳)

''تباہی ہے ڈنڈی مارنے والوں کے لیے جن کا حال یہ ہے کہ جب لوگوں سے

لیتے ہیں تو پورا لیتے ہیں اور جب ان کو ناپ تول کر دیتے ہیں تو انھیں گھاٹا دیتے ہیں۔"

ہر جائز و ناجائز ذریعے سے مال سمیٹنا اور جمع کیے رکھنا بہت سے لوگوں کے لیے واحد ذریعہ عزت و عظمت تھا۔ ایسے لوگوں کو وعید سنائی گئی:

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ۝ الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهُ ۝ يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ ۝ كَلَّا لَيُنْبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ۝ (الھمزۃ:۱۔۴)

"بڑی خرابی ہے ہر اس شخص کے لیے جو عیب چین اور بدگو ہے جس نے مال جمع کیا اور گن گن کر رکھا۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال اس کے پاس ہمیشہ رہے گا۔ ہرگز نہیں وہ پھینکا جائے گا توڑ دینے والی آگ میں۔"

اپنی دنیا بنانے کی دھن میں یہ لوگ اس حد تک مگن تھے کہ محرومین کے حقوق کی ادائیگی ان کے ایجنڈے سے ہی خارج ہوگئی۔ اس قارونی ذہنیت کی مذمت کے لیے قرآن میں "التکاثر" کی اصطلاح استعمال کی گئی:

أَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۝ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝ (التکاثر:۱۔۲)

"تم لوگوں کو زیادہ سے زیادہ اور ایک دوسرے سے بڑھ کر دنیا حاصل کرنے کی دھن نے غفلت میں ڈال رکھا ہے۔ یہاں تک کہ اسی فکر میں تم لب گور تک پہنچ جاتے ہو۔"

ایسے لوگوں کی بھی نشاندہی کر دی گئی جو روزِ جزا کے منکرین یا پورے دین کی تکذیب کرتے ہیں۔

فَذٰلِكَ الَّذِي يَدُعُّ الْيَتِيمَ ۝ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِينِ ۝ (الماعون:۲۔۳)

"پس یہی وہ بدبخت ہے جو دھکے دے کر نکالتا ہے یتیم کو اور دوسروں کو ترغیب

نہیں دیتا کہ غریب کو کھانا کھلائیں۔"

قرآن پاک میں اہل جنت اور اہلِ دوزخ کے درمیان ہونے والی ایک مختصر گفتگو کی جھلک بھی دکھائی گئی ہے۔ اہلِ جنت، اہلِ دوزخ سے سوال کریں گے کہ کس چیز نے تمھیں دوزخ میں داخل کیا؟

قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ○ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ○ (المدثر: ۴۳-۴۴)

"وہ کہیں گے کہ ہم نماز نہیں پڑھا کرتے تھے اور مسکین کو کھانا بھی نہیں کھلایا کرتے تھے۔"

وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور رضا کے مابین فرق سمجھنے سے بھی قاصر تھے۔ اپنے مجرمانہ ضمیر کو مطمئن کرنے کے لیے انھوں نے تقدیر کا بھی ایک خود ساختہ اور گمراہ کن تصور گھڑ لیا تھا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ غریب و امیر کی تقسیم اللہ کی مرضی سے ہے اور کوئی دوسری قوت اس "فطری" نظام میں خلل کیوں ڈالے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗٓ ۖ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○ (یٰسین: ۴۷)

"جب انھیں کہا جاتا ہے کہ خرچ کرو اس مال سے جو تمھیں اللہ نے دیا ہے۔ تو کفار ایمان والوں سے کہتے ہیں: کیا ہم انھیں کھلائیں جنھیں اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو خود کھلا دیتا۔ (اس طرح سوچنے اور کہنے والو) تم بالکل بہک گئے ہو۔"

حضور اکرم ﷺ کی ولادتِ باسعادت دنیا بھر میں ایک بالکل نئے اور بنیادی انقلاب کی نوید جانفزا تھی۔ چند سال کے لیے درِ یتیم ﷺ کو اپنے ساتھ لے جانے کے بعد حضرت حلیمہ سعدیہ اور ان کے خاندان کے دن پھر گئے۔ خشک سالی کی وجہ سے جن بکریوں کا دودھ تک خشک ہو گیا

تھا، وہ اب سب افراد خانہ کے لیے کفیل ہو گئیں۔ مکہ سے مدینہ کی جانب ہجرت کرتے ہوئے حضور ﷺ اور حضرت ابو بکر صدیقؓ راستے میں عارضی قیام کے لیے اُم معبد نامی خاتون کے ہاں ٹھہرے تھے۔ آپ ﷺ کے مبارک قدموں کی برکت سے اُم معبد کی کمزور اور بیمار بکری نے خلافِ توقع اتنا وافر دودھ دیا کہ سب نے سیر ہو کر پیا۔ اہلِ نظر کے لیے یہ بامعنی اشارے تھے کہ آنے والے دور میں آپ ﷺ کے ہاتھوں ایک عظیم معاشی انقلاب کا سورج طلوع ہو گا۔ ایک ایسا انقلاب جو غریب و امیر، حاکم و محکوم، اور مزدور و مالک سب کے لیے عدل و انصاف کا ضامن ہو گا۔

قابلِ غور بات یہ ہے کہ معروف معنوں میں مذہبی زندگی کے جو مظاہر اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں اور اس کے پیغمبروں کے ساتھ خاص سمجھے جاتے ہیں، اسلام میں وہاں بھی بندگانِ خدا کی معاشی بہبود و اصلاح کی جا بجا صورتیں نظر آتی ہیں۔ معراج دوسرے پیغمبروں کو بھی ہوئی اور اس کا مقصد اولوالعزم پیغمبروں کو ان حقائق کا براہِ راست مشاہدہ کرانا تھا جن کو دنیادار لوگ بلا سوچے سمجھے جھٹلا دیتے ہیں۔ سفرِ معراج میں نبی محترم ﷺ نے مابعد الطبیعاتی حقائق کا نہ صرف براہِ راست مشاہدہ فرمایا بلکہ حقوق العباد میں زیادتی کرنے والوں کا انجامِ بد بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ روایات کے مطابق:

☆ ''حضور ﷺ نے ان لوگوں کو دیکھا جو یتیموں کا مال ظلماً کھاتے ہیں۔ ان کے ہونٹ اونٹ کے ہونٹوں کی طرح تھے اور وہ اپنے منہ میں پتھر کے ٹکڑے اور انگارے ٹھونس رہے تھے جو دوسری جانب اُن کے پاخانے کے راستے سے نکل رہے تھے۔''

☆ ''آپ ﷺ نے سود خوروں کو دیکھا۔ ان کے پیٹ اتنے بڑے تھے کہ وہ اپنی جگہ سے اِدھر اُدھر نہیں ہو سکتے تھے اور جب آلِ فرعون کو آگ پر پیش کرنے کے لیے لے جایا جاتا تو ان کے پاس سے گزرتے وقت انھیں روندتے ہوئے جاتے تھے۔''

☆ ''آپ ﷺ کا گزر ایک ایسی لکڑی کے پاس سے ہوا جو سرِ راہ واقع ہے۔ جو کپڑا اور جو چیز بھی اُسے چھو لے، اُسے چیر پھاڑ دیتی ہے۔ جبرائیل علیہ السلام نے بتایا کہ یہ آپ ﷺ کی

اُمت کے وہ لوگ ہیں جو راستے میں چھپ کر بیٹھ جاتے اور لوگوں کا مال لوٹ کر کھا جاتے ہیں۔" (البیہقی۔ روایت ابو ہریرہؓ)

اس کے برعکس انفاق فی سبیل اللہ کرنے والوں کو آپ ﷺ نے بشارت بھی سنائی۔

"میں نے ایک ایسی جماعت کو دیکھا جو ایک دن میں بیج بوتے اور اسی دن فصل بھی کاٹ لیتے۔ میں نے جبرائیل امین سے پوچھا یہ کون لوگ ہیں؟ جبرائیل علیہ السلام نے جواب دیا: یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کی راہ میں (اپنے مالوں سے) جہاد کرنے والے ہیں۔ ان کی ایک نیکی کا بدلہ سات سو نیکیوں سے بھی زیادہ دیا جاتا ہے۔ یہ لوگ جو کچھ بھی خرچ کرتے رہتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس کا بہتر بدلہ عطا فرما دیتا ہے۔" (زرقانی، مواہب الدنیا، الخصائص الکبریٰ)

انفاقِ فی سبیل اللہ کے غیر معمولی اجر کا تعلق محض اُخروی زندگی کے ساتھ نہیں ہے۔ اس دنیا میں بھی ایسے لوگوں پر اللہ کی رحمتوں کا نزول ہوتا ہے اور ان کے رزق میں برکت دی جاتی ہے۔ صحیح مسلم میں موجود ایک روایت کا خلاصہ اس حقیقت کا بین ثبوت ہے۔ ایک مسافر ایک لق و دق صحرا سے گزر رہا تھا۔ اچانک ایک مخصوص جگہ پر مطلع ابر آلود ہوا۔ دور ایک پہاڑی پر موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ بارش کا پانی پہاڑی سے بہتا ہوا ایک نالے میں شامل ہوگیا۔ مسافر تحیر کے عالم میں نالے کے بہاؤ کے ساتھ چل پڑا۔ اس نے دیکھا کہ ایک بوڑھا شخص اس نالے سے اپنے کھیت کو سیراب کیے جا رہا ہے۔ مسافر نے بوڑھے کسان سے اس رحمت خصوصی کا سبب دریافت کیا۔ کسان نے بتایا میں اپنی فصل کو تین حصوں میں تقسیم کرتا ہوں۔ ایک حصہ اپنے اہل وعیال کی ضروریات پر خرچ کرتا ہوں۔ دوسرے حصے سے نئی فصل کے لیے بیج وغیرہ کا بندوبست کرتا ہوں اور تیسرا حصہ اللہ کی راہ میں صدقہ کر دیتا ہوں۔

واضح رہے کہ ایک طرف نبی اکرم ﷺ نے لوگوں کو ناحق مال کھانے اور سود خوری وغیرہ کی ہلاکت آفرینی سے آگاہ کیا اور زکوٰۃ و صدقات کی صورت میں انفاق فی سبیل اللہ کی تلقین کی تو دوسری طرف یہ تعلیم دی کہ وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ (محمد:۳۸) اور اللہ غنی ہے اور تم سب محتاج

ہو۔" نیز انھیں خودداری اور عزتِ نفس کا ولولہ انگیز درس بھی دیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے افضل ہے۔" ایک طرف آپ ﷺ نے اہلِ ثروت کو یہ شعور بخشا کہ اللہ کے دیے ہوئے مال سے غربا، یتامیٰ اور مساکین کا حصہ نکالنا ان پر کوئی احسان نہیں ہے، بلکہ ان کا حق ہے۔

وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ۝ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ۝

(المعارج: ۲۴۔۲۵)

"ان کے مالوں میں مقررہ حق ہے سائل ومحروم کا۔"

اس حق کی عدم ادائیگی پر قرآن پاک میں بدترین اور دردناک عذاب کی خبر سنائی گئی:

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ۝ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ۭ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ۝

"دردناک سزا کی خوشخبری دو ان کو جو سونے اور چاندی کو جمع کر کے رکھتے ہیں اور انھیں اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ ایک دن آئے گا کہ اس سونے چاندی پر آگ دہکائی جائے گی اور پھر اس دن لوگوں کی پیشانیوں، پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا۔ یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا، لو اب اپنی سمیٹی ہوئی دولت کا مزا چکھو۔" (التوبۃ: ۳۴۔۳۵)

اور دوسری طرف حضور ﷺ نے محنت کی عظمت کا بھی ناقابل فراموش سبق سکھایا۔ حضرت سعد بن ابی وقاص ؓ ایک محنت کش صحابی تھے۔ ہتھوڑا چلاتے چلاتے ان کے ہاتھ میں گٹے پڑ گئے۔ حضور ﷺ نے ان کے ہاتھ میں کھردرا پن محسوس کیا۔ حضرت سعد ؓ نے عرض کیا: "اپنے اہل و عیال کی روزی کے لیے روزانہ ہتھوڑا چلاتا ہوں۔" آپ ﷺ نے ان کے ہاتھ چوم لیے اور فرمایا: "یہی وہ ہاتھ ہے جس سے اللہ اور اس کا رسول محبت کرتے ہیں۔" (اسد الغابہ)

رزقِ حلال کے لیے جدو جہد کو بھی رسول اللہ ﷺ نے جہاد قرار دیا۔ صحابہ کرامؓ نے ایک مضبوط جسم والے نوجوان کو حج کے موقع پر تلاشِ معاش کے لیے نکلتے دیکھا تو فرمایا: "کیا ہی اچھا ہوتا جو اس شخص کی صحت اور پھرتی اللہ تعالیٰ کی راہ میں صرف ہوتی۔" اس پر حضور ﷺ نے فرمایا۔ "ایسا نہ کہو کیونکہ اگر وہ مانگنے سے بچنے اور لوگوں کا محتاج نہ ہونے کے لیے محنت کرتا ہے تو وہ اللہ کی راہ میں ہے اور اگر اپنے ماں باپ یا بال بچوں کی پرورش کے لیے محنت کرتا ہے تو وہ بھی اللہ کی راہ میں ہے۔" توکل علی اللہ ایک مومن کی بنیادی صفت ہے۔ حدیث پاک ہے۔ "اگر تم اللہ تعالیٰ پر صحیح معنوں میں توکل کرو گے تو وہ تمھیں بھی پرندوں کی طرح رزق دے گا۔ وہ صبح خالی پیٹ نکلتے اور شام کو بھرے پیٹ واپس آتے ہیں۔" یہاں یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پرندوں کو ان کے گھونسلوں کے اندر بیٹھے بیٹھے رزق دینے کی بات نہیں کی۔ پرندے اپنے گھونسلوں سے باہر آ کر تلاشِ رزق کے لیے نکلتے ہیں۔ تب انھیں اپنا حصۂ رزق حاصل ہوتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اسلام توکل کے کسی راہبانہ تصور کو ہرگز قبول نہیں کرتا۔ اپنے اہل وعیال کے مستقبل کی فکر کرنا ضروریات دین میں سے ہے۔ ایک صحابی حضرت جابر بن عبداللہؓ نبی کریم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور اپنی تمام دولت فی سبیل اللہ وقف کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ آپ ﷺ نے دریافت فرمایا۔ کیا تمھاری اولاد ہے؟ جب انھوں نے اثبات میں جواب دیا تو آپ ﷺ نے ہدایت فرمائی کہ اپنے پیچھے اپنی اولاد کو اس حالت میں نہ چھوڑو کہ وہ دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلائیں۔ (بخاری) رسول اللہ ﷺ بنی نضیر والی کھجوریں فروخت کر کے اپنے اہلِ خانہ کے لیے ایک سال کی خوراک کا بندوبست کیا کرتے تھے۔ (صحیح بخاری) امام بخاریؒ نے کتاب الزکوٰۃ میں ایک الگ باب اس امر کے بیان میں باندھا ہے کہ بہترین صدقہ وہ ہے جس کو دینے کے بعد بھی دینے والے کے پاس اتنی رقم رہ جائے کہ وہ دوسروں سے مستغنی ہو سکے۔

بہت سی تدبیروں کے باوجود بھی بہت سے باصلاحیت لوگ زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے قطعاً مناسب نہیں کہ وہ لوگوں کی زکوٰۃ وصدقات اور عطیات کے منتظر

رہیں۔ بہترین منصوبہ بندی سے ایسے لوگوں کو بھی اپنے پاؤں پر کھڑا کیا جاسکتا ہے۔ سچ کہا گیا ہے۔ ''کسی کو مچھلیاں پکڑنے کا فن سکھا دینا اس سے بہتر ہے کہ اسے خیرات کے طور پر کھانے کے لیے روزانہ ایک مچھلی مہیا کی جائے۔'' سیرت النبی ﷺ میں ایسی ہی خود کفالت کا عملی درس دیا گیا ہے۔ ایک صحابیؓ دربارِ رسالت ﷺ میں سائل بن کر حاضر ہوئے۔ ان کے ہاں صرف ایک کمبل اور ایک پیالہ تھا۔ آپ ﷺ نے ان سے دونوں چیزیں منگوائیں اور صحابہؓ کے سامنے فروخت کے لیے پیش کر دیں۔ ایک صحابیؓ نے ایک درہم قیمت لگائی۔ حضور ﷺ نے قبول نہ کی اور کسی دوسرے گاہک کی طرف دیکھا۔ دوسرے صحابیؓ نے انھی اشیا کے لیے دو درہم کی پیشکش کی۔ دونوں درہم لے کر آپ ﷺ نے سائل کو دے کر فرمایا کہ ایک درہم سے کلہاڑی خریدو۔ وہ کلہاڑی خرید لایا تو آپ ﷺ نے اپنے دستِ مبارک سے اس میں دستہ لگایا۔ پھر آپ ﷺ نے انھیں جنگل میں لکڑیاں کاٹنے کے لیے بھیج دیا اور ساتھ ہی ہدایت فرمائی کہ پندرہ یوم سے قبل ملاقات کے لیے حاضر نہ ہوں۔ اس وقفے کے بعد آپ ﷺ نے ان کا حال دریافت فرمایا۔ انھوں نے عرض کیا کہ اس دوران انھیں دس درہم کی آمدن ہوئی۔ اس آمدنی میں سے چند درہم ضروری کپڑوں اور اناج کی خرید کے لیے صرف کیے گئے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''یہ اس سے بہتر ہے کہ تم کسی سے بھیک مانگو اور قیامت کے دن رسوائی اُٹھاؤ۔'' (جامع ترمذی، ابن ماجہ)

مدینہ منورہ کی اسلامی معیشت

ہجرت کے بعد نبی اکرم ﷺ نے مہاجرین و انصار کو مواخات کے ذریعے بھائی بھائی بنا دیا۔ نظام مواخات کے ذریعے یہ عملی پیغام دیا گیا کہ اسلامی معاشرہ تنازع للبقا (Struggle for Existence) کے بجائے تعاون فی البقا (Cooperation for Existence) کے اصول پر قائم ہوتا ہے۔ ہجرت سے قبل مدینہ کے تجارتی بازار پر یہود کی اجارہ داری تھی۔ اس اجارہ داری کے بل پر وہ غریب اور متوسط لوگوں کا خوب استحصال کرتے۔ اپنی بہترین مالی پوزیشن کی وجہ سے انھیں بہت سیاسی رسوخ بھی حاصل تھا۔ بعد از ہجرت نبی اکرم ﷺ نے مسلمانوں کے لیے ایک

الگ بازار قائم کیا جس میں اسلامی اصولوں کے مطابق تجارتی لین دین کیا جاتا تھا اور کسی قسم کی دھوکہ بازی ملت کے اجتماعی وجود کے خلاف سنگین جرم تصور کی جاتی تھی۔ رسول اللہ ﷺ بعض اوقات بازار کا خود دورہ فرماتے اور ظلم و زیادتی کی تمام ممکنہ صورتوں کے خاتمے کا حکم دیتے۔ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ بازار کی صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے وہاں تشریف لے گئے۔ آپ نے ایک شخص کو کسی جنس کا وزن کرتے دیکھا تو فرمایا: زن وارجح (ترمذی، نسائی، ابوداؤد)۔ ''وزن کرتے وقت قدرے جھکتا تولو۔'' ایک ایسے ہی دورے کے وقت گندم کے لگے ہوئے ایک ڈھیر میں آپ نے ہاتھ ڈال کر تھوڑا سا اناج چیک کیا تو وہ گیلا نکلا۔ آپ ﷺ نے باز پرس کی تو دکاندار نے جواب دیا کہ یہ بارش میں گیلا ہو گیا تھا۔ چونکہ لوگ گیلی گندم نہیں خریدتے اس لیے میں نے خشک گندم سے ڈھانپ دیا۔ آپ ﷺ سخت ناراض ہوئے اور فرمایا: من غش فلیس منا ''جو ملاوٹ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔''

اسلام میں معاشی مسئلے کی اہمیت کا اندازہ اِس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ہجرت کے بعد جو افراد اور گروہ مسلمان ہوتے تھے اُن کے لیے مدینہ منورہ منتقل ہو جانا ضروری تھا۔ یہاں اُن کی تعلیم و تربیت اور تہذیبی شناخت کا مناسب انتظام موجود تھا۔ تاہم اگر کسی قبیلے کا علاقہ مدینہ شریف کے قرب وجوار میں ہوتا تو اُس کو سابقہ مسکن میں رہنے کی اجازت دے دی جاتی۔ ابن سعد نے قبیلہ مزینہ کی مثال دی ہے جو پانچ ہجری میں مسلمان ہوا۔ یہ قبیلہ سینکڑوں افراد پر مشتمل تھا اور مدینہ منورہ سے صرف بیس میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ وہیں اُن کی تعلیم و تربیت کا انتظام کر دیا گیا۔(۱۱) ابن سعد ہی کے مطابق ایک نو مسلم قبیلے کی راہنمائی کے لیے آنحضرت ﷺ نے ایک معلم بھیجا۔ معلم نے معروضی حقائق کو نظر انداز کر کے انھیں کہا، جو ہجرت نہ کرے وہ مسلمان نہیں سمجھا جائے گا۔ اہلِ قبیلہ نے دربارِ رسالت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ اپنا علاقہ چھوڑنے میں انھیں غیر ضروری طور پر معاشی نقصان کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اِس نقصان کو برداشت کرنے کے لیے وہ ہجرت کا مفہوم اور مقصد بھی سمجھنا چاہتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے اُن کی مشکلات کا اندازہ لگا کر انھیں اپنے علاقے میں

رہنے کی اجازت دے دی۔(۱۲)

انفاق فی سبیل اللہ اور زکوٰۃ وعشر کے ابتدائی احکام مکی دور میں دیے جا چکے تھے۔ان احکامات کی تنفیذ وترویج کو تادیر افراد کی ذاتی صوابدید پر نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔مدینہ منورہ میں اسلامی حکومت کے قیام کے بعد نظام زکوٰۃ وصدقات کو منظم کرنے کی ضرورت تھی۔اسلامی حکومت کے چار بنیادی مقاصد میں سے یہ بھی ایک اہم فریضہ ہے۔(۱۳) بحیثیت پیغمبر اور بحیثیت سربراہ ریاست اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ہدایت فرمائی:

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ؕ

(التوبۃ:۱۰۳)

”اے نبی ﷺ وصول کیجیے ان کے مالوں سے صدقہ تاکہ آپ ﷺ پاک کریں انھیں اور بابرکت فرمائیں انھیں اس ذریعہ سے نیز دعا مانگیے ان کے لیے۔“

ان احکامات و ہدایات کے بعد اسلام کے نظام زکوٰۃ وصدقات پر مبنی معاشی تعلیمات کو اداراتی (Institutional) شکل دے دی گئی۔

مدینہ منورہ کی اسلامی حکومت کے ذرائع آمدن یہ تھے:(۱۴)

۱۔زکوٰۃ وعشر، ۲۔جزیہ، ۳۔خمس، ۴۔فے، ۵۔اوقاف، ۶۔قرضِ حسنہ، ۷۔ہنگامی ضرریات کے لیے صدقات وٹیکس۔

۱۔زکوٰۃ وعشر

اسلام کا نظامِ زکوٰۃ وعشر ایک لحاظ سے اجتماعی انشورنس کا نظام ہے اور ایک دوسرے لحاظ سے یہ جدید انشورنس سے ایک بالکل مختلف چیز ہے۔جدید انشورنس میں انسان اپنی کمائی میں سے خرچ کر کے کماتا ہے جبکہ زکوٰۃ وعشر کے ذریعے سے معاشرے کے محروم افراد کو جو کچھ حاصل ہوتا ہے اس کو صرف اغنیا ادا کرتے ہیں۔(۱۵)

زکوٰۃ کے بارے میں پانچ بنیادی باتوں کا تعین لازمی ہے۔(۱) کس مال پر زکوٰۃ نکالی

جائے؟ (۲) زکوٰۃ کا نصاب کیا ہے؟ (۳) زکوٰۃ کس شرح سے ادا کی جائے؟ (۴) زکوٰۃ کتنی مدت بعد عائد ہوتی ہے؟ (۵) زکوٰۃ کے مصارف کیا ہیں؟ قرآن حکیم میں صرف مصارفِ زکوٰۃ کے متعلق ہدایات دی گئی ہیں۔ باقی امور کا جواب اسوۂ حسنہ سے ملتا ہے۔ بنیادی اصول یہ ہے کہ ہر وہ مال جس میں نشوونما کی صلاحیت ہے، اس پر زکوٰۃ عائد ہوتی ہے۔ اس مال کی چھ قسمیں ہیں۔ (۱) زرِ نقد یا حصص (۲) مالِ تجارت (۳) مویشی (۴) زمینی پیداوار (۵) فے یا غنیمت (۶) معادن و رکاز (برآمد شدہ دفینے)

ان میں سے ہر ایک کے لیے زکوٰۃ کا نصاب مختلف ہے۔ پہلی قسم کے اہل ثروت کا نصاب یہ ہے کہ ان کے مال کی قیمت ساڑھے سات تولے (۸۷ گرام) سونے کی قیمت کے برابر ہو۔ اسی طرح پانچویں قسم کے اموال کا کوئی نصاب نہیں ہے۔ یہ جتنی بھی ہوں ان پر زکوٰۃ عائد ہوگی۔ ہر ایک حصے کی شرحِ زکوٰۃ بھی مختلف ہوگی۔ اصل الاصول یہ ہے کہ کسی مال کے حصول میں جتنا وقت، محنت اور سرمایہ لگتا ہے، شرحِ زکوٰۃ اس حساب سے کم ہے۔ پانچویں گروہ پر زکوٰۃ بیس فیصد ہے۔ تو چوتھے گروہ پر بارش سے ہونے والی فصل پر زکوٰۃ دس فیصد ہے اور پہلے گروہ پر صرف اڑھائی فیصد ہے۔ زکوٰۃ نکالنے کی مدت میں بھی فرق رکھا گیا ہے۔ زرِ نقد کی زکوٰۃ ایک سال بعد نکالی جائے گی۔ اموالِ غنیمت و فے سے اس وقت زکوٰۃ وصول کی جائے گی جب اس کا قبضہ ہوگا۔ زمینی پیداوار پر زکوٰۃ اس وقت واجب الادا ہوگی جب فصل حاصل ہوگی اور یہ سال میں دو تین مرتبہ بھی ہو سکتی ہے۔ معدنیات پر ائیویٹ ملکیت میں ہوں تو دھائی فیصد زکوٰۃ ہے اور در آمد شدہ دفینوں میں سے خمس (۲۰ فیصد) وصول کیا جائے گا۔

۲۔ جزیہ

غیر اقوام جو اسلامی اقتدار و حاکمیت کو تسلیم کر لیں، ان پر جزیہ کے نام سے وہ ٹیکس عائد کیا گیا ہے جس کا ذکر سورۃ التوبۃ میں آیا ہے۔ جزیہ کی مقدار ہر قوم کے حالات اور افراد کی معاشی حیثیت کے مطابق ہوتی تھی۔ بالعموم مالداروں سے ۴۸ ردرہم، متوسط لوگوں سے ۲۴ ردرہم اور کم آمدنی

والوں سے ۱۲ ؍ درہم سالانہ کے حساب سے وصول کیے جاتے تھے۔ ان معمولی اور برائے نام رقوم کے بدلے ان کی جان، مال، عزت، آبرو اور مذہبی آزادی کی مکمل ضمانت دی جاتی تھی۔ بچوں، بوڑھوں اور عورتیں کو جزیہ کے معاملے میں معذور سمجھا جاتا تھا۔ جس طرح اسلام میں غلط فہمی اور زیادتی سے بچنے کے لیے کاروباری معاملات کو ضبطِ تحریر میں لانے پر زور دیا گیا ہے، اسی طرح سیاسی معاملات میں بھی تحریری دستاویزات کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔ نجران کے عیسائیوں کو جزیے کی ادائیگی کے بدلے جو حقوق و مراعات دی گئیں، وہ تحریری شکل میں محفوظ کی گئیں تاکہ آیندہ کسی حکمران کے لیے بلا جواز ذمیوں کو ان کے حقوق سے محروم کرنا ممکن نہ رہے۔ اس باب میں بھی صحابہ کرام اور تابعین نے زہد و اتقا کی شاندار مثالیں قائم کی ہیں۔ حضرت عبادہ بن ثابتؓ ایک دفعہ دمشق کے ایک گاؤں کے قریب سے گزرے۔ انھوں نے اپنے ایک ساتھی سے مسواک لانے کو کہا۔ پھر اسے یہ کہتے ہوئے روک دیا کہ یہاں ذمیوں کے ساتھ جو معاہدہ ہوا تھا اس میں اُن کے درختوں سے مسواک کاٹنے کی بات طے نہیں ہوئی تھی۔

۳۔ خمس

زمانۂ جاہلیت میں غنیمت کا مال اسی کی ملکیت تھا، جس کے ہاتھ یہ مال لگ جاتا۔ البتہ رئیس قبیلہ بہترین مال اپنے لیے رکھ لیتا۔ اسلام نے اموالِ غنیمت (Spoils of war) کی جمع و تقسیم کے لیے قواعد و ضوابط بنائے۔ سب مالِ غنیمت ایک جگہ اکٹھا کیا جاتا۔ سورۃ الانفال (۴۱) کے مطابق اس کے پانچ حصے کیے جاتے۔ چار حصے مجاہدین کے درمیان تقسیم ہوتے اور پانچواں حصہ بیت المال میں داخل کیا جاتا۔

۴۔ فے

کفار کے جو مال مسلمانوں کے قبضے میں آتے ہیں، اس کی دو صورتیں ہیں۔ پہلی صورت میں جنگ کے بعد فتح کی صورت میں دشمن کی جو املاک مسلمانوں کو حاصل ہوتی ہیں۔ انھیں اموالِ غنیمت کہا جاتا ہے۔ دوسری صورت میں لڑائی کے بغیر ہی دشمن ہار مان لیتا ہے، اس طرح جو

اموال حاصل ہوتے ہیں، انھیں فے کہا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پہلی قسم کے اموال کا ذکر کرتے ہوئے قرآن نے ان کی نسبت مسلمانوں کی طرف کی اور فرمایا:

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ (الانفال:۴۱)

''اور معلوم رہے کہ تم کو کسی چیز سے کچھ بھی مالِ غنیمت ملے۔''

جبکہ دوسری قسم کے اموال کے لیے جو بیان اختیار کیا، ان کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف فرمائی:

وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ (الحشر۔۶)

''اور جو مال پلٹا دیے اللہ نے اپنے رسول کی طرف۔''

جنگ کے بعد مفتوحہ زمینیں ایک طے شدہ حصے پر سابقہ مالکان کے قبضے میں رہنے دی جاتیں اور ان پر جزیہ یا خراج عائد کر دیا جاتا۔ سب سے پہلے یہودی قبیلہ بنونضیر کے اموال بغیر جنگ کے مسلمانوں کو حاصل ہوئے تھے اور اس پس منظر میں اموالِ فے کے متعلق آیاتِ مبارکہ نازل ہوئی تھیں۔

۵۔ اوقاف

زمانۂ جاہلیت میں اوقاف کا نظام موجود نہ تھا۔ حضور ﷺ نے اصل مال کو باقی رکھ کر اس کے منافع کو عام کر دینے کی صورت وقف کے نام سے قائم کی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عہد مبارک میں اوقاف بھی قومی آمدنی کا ایک قابل لحاظ حصہ تھے۔ بعض اوقاف آپ ﷺ کی ترغیب وتشویق سے وجود میں آئے۔ اس بارے میں نبی اکرم ﷺ کی وہ حدیث پاک خصوصاً لائق توجہ ہے جس میں آپ ﷺ نے علمِ نافع اور اولادِ صالح کے علاوہ صدقہ جاریہ کا ذکر فرمایا جو موت کے بعد بھی نفع رساں رہتا ہے۔ اسلام میں پہلا وقف حضور ﷺ نے قائم فرمایا۔ دوسرا وقف حضرت عمر فاروق ؓ نے قائم فرمایا۔ فتح خیبر کے بعد انھیں مالِ غنیمت میں جو زمین حاصل ہوئی وہ انھوں نے وقف کر دی۔ حضرت عثمان غنی ؓ کی طرف سے بئر رومہ اور حضرت علی المرتضیٰ ؓ کی ینبوع کے علاقہ میں زمینیں عہد

رسالت میں وقف کی نمایاں مثالیں ہیں۔حضرت ابو طلحہؓ نے مسجد نبوی کے قریب ایک باغ فی سبیل اللہ وقف کر دیا تھا۔ پھر مالِ غنیمت میں نبی اکرم ﷺ کے جو مخصوص حصے تھے، وہ بھی عملاً اوقاف تھے۔اموالِ بنی نضیر، فدک، خیبر، وادی القریٰ اور تیما کی پیداوار کا نصف حصہ بھی بعض روایات کے مطابق آپ ﷺ نے مصالح عامہ کے لیے وقف کر رکھا تھا۔(۱۶)

۶۔قرضِ حسنہ

قرآن حکیم میں قرضِ حسنہ کی اصطلاح سودی قرض کی تردید کے لیے استعمال کی گئی ہے۔فقہا نے اس کی تعریف یہ کی ہے کہ "ایک متمول شخص کسی ضرورت مند کی ضرورت پوری کرنے کے لیے اپنی رقم سے اُسے اس طرح فائدہ پہنچائے کہ اُس کا کوئی بدل (سود وغیرہ) اُس سے حاصل نہ کرے۔" یہ قرض ایک فرد بھی حاصل کر سکتا ہے اور کوئی ادارہ یا خود ریاست بھی۔ یہ مسلمان سے بھی حاصل کیا جا سکتا ہے اور غیر مسلم سے بھی۔حدیث شریف میں اس کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔حضرت ابوامامہؓ کی ایک روایت کے مطابق "حضور ﷺ نے فرمایا۔ایک آدمی جنت میں داخل ہوا اُس نے جنت کے دروازے پر لکھا ہوا دیکھا۔صدقے کا اجر دس گنا اور قرضِ حسنہ کا اٹھارہ گنا ہے۔" (طبرانی) بعض اوقات رسول اللہ ﷺ جنگی ضروریات کے لیے قرضِ حسنہ بھی لیتے تھے۔کاروباری معاملات میں آپ ﷺ کی مثالی دیانت، امانت اور ساکھ کی وجہ سے ایسے قرضے یہود بلکہ کفار سے بھی مل جاتے۔روایات کے مطابق صفوان خویطب اور ابن ربیعہ جیسے مالدار کفار سے آپ ﷺ نے جنگی اخراجات کے لیے قرضے حاصل کیے۔غزوۂ حنین کے موقع پر ایک ایسا ہی قرضہ صفوان بن امیہ سے لیا گیا۔

۷۔ہنگامی ضروریات کے لیے صدقات

کوئی بھی حکومت ہر لحظہ بڑھتی ہوئی ضروریات کے لیے اور خصوصاً ہنگامی صورتِ حال میں معلوم اور معروف ذرائع آمدنی پر ہی اکتفا نہیں کر سکتی۔اس صورت میں صاحبِ حیثیت لوگوں کی طرف سے ایثار کے لیے خوش دلانہ آمادگی (Involvement) بہت ضروری ہے اور یہ تعاون

صاحب امر کے بے لوث کردار کے بغیر ممکن نہیں۔ جب عام کارکن پیٹ پر ایک پتھر لے کر حاضر ہو تو صاحب امر کے پیٹ پر پہلے سے دو پتھر موجود ہونے چاہییں۔ اس مثالی کردار کی وجہ سے حضور ﷺ نے لوگوں کی انفرادی ضروریات کی فراہمی کے لیے جب بھی اپیل کی، مطلوبہ وسائل فراہم ہونے میں دیر نہ لگی۔ غزوۂ تبوک کے موقع پر جملہ مسلمین و مسلمات نے دل کھول کر دفاعی فنڈ میں عطیات پیش کر دیے۔

غیر متوقع و ناگہانی ضروریات مثلاً قحط، سیلاب، زلزلہ اور جنگ کی صورت میں حکومت صاحب حیثیت لوگوں پر عوامی مفاد میں مزید ٹیکس عائد کر سکتی ہے۔ ایسے ٹیکسوں کو شرعی اصطلاح میں ضرائب کہتے ہیں۔ اسلامی نظم معیشت میں ایک اور مد اموالِ فاضلہ کے نام سے معروف ہے۔ اس میں وہ اموال شامل ہیں جو کسی لاوارث مسلمان یا ذمی کی وفات کی صورت میں یا کسی ذمی کی بغاوت اور کسی مسلم کے ارتداد کے نتیجے میں آپ سے آپ مملکت اسلامیہ کی ملکیت قرار پاتے ہیں۔(۱۷)
عام مسلمان جائز تجارت، بیع و شرا، ہبہ، ہدیہ اور وراثت کے ذریعے مال کی ملکیت حاصل کرتا ہے۔ اسلامی مملکت میں سربراہِ حکومت پر اس باب میں بھی کچھ پابندیاں ہیں۔ مثلاً سربراہِ حکومت یا عامل کو اندرون ملک یا بیرون ملک جو ہدایا وصول ہوتے ہیں وہ بھی ریاست کی ملکیت قرار پاتے ہیں۔ صحیح مسلم میں متعدد طرق سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے ابن اللبیہ کو عامل بنا کر بھیجا اور بعض روایات کے مطابق بنی سلیم کا صدقہ وصول کرنے کے لیے بھیجا۔ وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور کہا یہ مال تو آپ کا ہے اور یہ مال مجھے ہدیہ میں ملا ہے۔ حضور ﷺ ناراض ہوئے۔ آپ نے اُن سے دونوں طرح کا مال وصول کیا اور فرمایا ”تو نے اپنے باپ اور ماں کے گھر میں بیٹھ کر نہ دیکھا کہ تیرے پاس کہاں سے ہدیہ آتا ہے۔“

زکوٰۃ و صدقات، جزیہ اور دوسرے سرکاری واجبات کی وصولی کو شفاف (Transparent) بنانے کے لیے رسول اللہ ﷺ نے انتہائی دیانت دار محصلین کا تقرر فرمایا۔ سہولت کی خاطر بسا اوقات رئیسانِ قبائل کو بھی عاملین مقرر کر دیا جاتا تھا۔ صاحب مال اپنے اموالِ ظاہرہ کے کل

صدقات کو حضور ﷺ کے عاملین کے سپرد کرتا تھا۔ البتہ اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ میں صاحب مال کو اختیار تھا کہ عاملین کے سپرد کرے یا خود زکوٰۃ کے مصارف میں صرف کرے۔ (۱۸) زکوٰۃ کے احکام، مختلف چیزوں پر زکوٰۃ اور زکوٰۃ کی مختلف شرحوں کو لکھوا کر آنحضرت ﷺ نے مختلف اُمرا کو اُن کے علاقے میں بھیجا تھا۔ (سنن الدارقطنی) سرکاری واجبات کی وصولی کے لیے بے جا سختی کی ہرگز اجازت نہ تھی۔ اِن فرائض کی انجام دہی کرتے ہوئے اگر نادانستہ طور پر کسی کی جان و مال کو نقصان پہنچ جائے تو شریعت میں اُس کی تلافی کے لیے ضمان کا انتظام کیا گیا ہے۔ حضور ﷺ نے ایک صحابی ابوجہم بن حذیفہؓ کو کسی علاقے میں محصل زکوٰۃ بنا کر بھیجا۔ وہاں پر اُن کا کسی شخص سے جھگڑا ہو گیا۔ اس جھگڑے میں وہ شخص زخمی بھی ہو گیا۔ مضروب شخص اور اس کے لواحقین نے دربارِ رسالت میں استغاثہ دائر کر دیا جس پر نبی کریم ﷺ نے اُن کو ہرجانہ ادا کیا۔ (بخاری۔ مسلم۔ ابوداؤد) زکوٰۃ کی وصولی کے لیے اِس قسم کی ناخوش گوار صورتِ حال سے بچنے کے لیے حضور ﷺ نے محصلین زکوٰۃ کو سخت الفاظ میں تنبیہ فرمائی۔ غامدیہ نامی خاتون پر زنا کے اقراری جرم کے بعد جب حد جاری کر دی گئی تو حضرت خالد بن ولیدؓ نے اُس کے بارے میں کچھ نامناسب الفاظ کہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ خالد! اپنی زبان کو روکو۔ اُس اللہ کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے۔ اُس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر ظالمانہ محصول وصول کرنے والا بھی ایسی توبہ کرتا تو بخش دیا جاتا۔

یہ وہ مشہور ذرائع تھے جو ریاست و حکومت کی ضروریات اور عوام کی فلاح و بہبود کے لیے احکام الٰہی کی روشنی میں اختیار کیے گئے۔ کسی بھی قدیم و جدید ریاست کے مجموعی نظام اور قومی و ملکی مصارف کو سامنے رکھا جائے تو یہ تمام ذرائع بظاہر بہت زیادہ متنوع نہیں ہیں۔ اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ جن مکروہ و مذموم ذرائع سے قدیم و جدید ریاستیں اپنے قومی خزانے کا منہ بھرتی ہیں وہ سب کے سب اسلامی ریاست میں قطعاً ممنوع اور قابل دست اندازی پولیس ہیں۔ اسلامی ریاست میں سودی کاروبار کا نام و نشان نہیں ملتا۔ جو لوگ سود لینے اور دینے پر مصر تھے، ان کے خلاف ریاستی سطح پر اللہ اور رسول کی جانب سے کھلی جنگ کا اعلان کر دیا گیا۔ فحاشی اور اشاعت فحش کے ذریعے

ٹیکسوں کا دائرہ بڑھانے کی راہیں بھی بند کر دی گئیں۔شراب کی تیاری اور اس کی خرید و فروخت کا اسلامی معاشرے میں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہر ایسا کاروبار بھی کلیتاً ناجائز ہے جس میں ایک فریق کے مکمل نفع اور دوسرے فریق کے مکمل نقصان کا شائبہ بھی ہو۔ جو بھی تجارت ہوگی وہ بلا اکراہ اور رضا کارانہ رضامندی سے مشروط ہوگی۔

عہدِ رسالت ﷺ میں تقسیم دولت (Distribution of Wealth) کے بنیادی خطوط بھی طے کر دیے گئے تھے۔شروع ہی میں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ اسلام مساوی تقسیم دولت (Equal Distribution of Wealth) کے بجائے منصفانہ تقسیم دولت (Equitable Distribution of Wealth) کا داعی ہے۔(۱۹) اس نظام کا اصل الاصول یہ تھا کہ دولت کا بہاؤ مختلف طریقوں سے بے کس، بے حیثیت اور صاحب ضرورت افراد کی طرف جاری رہے۔ بعض اسلامی احکامات سے انحراف اور گناہوں سے کفارہ کے لیے مساکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب دی گئی۔ اسلام کا نظام میراث بھی ارتکازِ دولت (Concentration of Wealth) کے بجائے گردشِ دولت (Circulation of Wealth) کا ضامن ہے۔اسلام میں ایک شخص کو اپنی جائیداد اور مال کے ایک تہائی حصے کے بارے میں وصیت کا حق حاصل ہے۔ جو لوگ اپنے حق سے تجاوز کر کے اپنی وصیت کے ذریعے شرعی وارثوں کو اُن کے حق سے محروم کرتے ہیں اُن کے بارے میں سخت وعید موجود ہے۔حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”مرد و عورت ساٹھ برس تک اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں مگر جب اُن کی موت کا وقت قریب آتا ہے تو وصیت کے ذریعے (وارثوں) کو نقصان پہنچاتے ہیں۔لہٰذا اُن کے لیے دوزخ ضروری ہو جاتی ہے۔“ (ابوداؤد) گردشِ دولت کو یقینی بنانے کے لیے قرآن حکیم میں واضح حکم موجود ہے جو کہ اسلامی نظامِ معیشت کی روحِ رواں کہا جا سکتا ہے۔

كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنكُمْ (الحشر:۷)

”تا کہ دولت تم میں سے اغنیا کے درمیان ہی گردش نہ کرتی رہے۔“

یہ آیت کریمہ اموالِ فے اور اس کی تقسیم کے ضمن میں نازل ہوئی۔ فے سے حاصل ہونے والے منقولہ اور غیر منقولہ اموال میں کوئی تفریق نہیں کی گئی۔ اموالِ فے میں سے کوئی حصہ بطور حق مجاہدین میں تقسیم نہ کیا جاتا۔ حضور ﷺ سارے کا سارا مال احکام الٰہی کے مطابق تقسیم فرما دیتے۔ آپ ﷺ سربراہِ ریاست کی حیثیت سے اپنے اہل وعیال کے لیے ایک سال کا نفقہ لے لیتے اور باقی جہاد اور مصالح عامہ کے لیے خرچ فرما دیتے۔ مصالح عامہ میں غربا کی کفالت، مقروضوں کے قرض کی ادائیگی، یتامیٰ اور بیواؤں کی مدد حتیٰ کہ غیر شادی شدہ افراد کی شادی جیسے امور شامل تھے۔ (۲۰)

مالِ غنیمت کے نظام میں رسول اللہ ﷺ نے جو اصلاحات رائج کیں، ان کے مطابق یہ مال بنیادی طور پر اجتماعی مال تھا، اس لیے اسے ایک ہی جگہ اکٹھا کیا جاتا تھا۔ چار حصے مجاہدین کے لیے تھے۔ پیدل مجاہدین کو ایک اور گھڑسوار مجاہدین کو ان کی ضروریات کے مطابق دو یا تین حصے دیے جاتے تھے۔ ایسی مثالیں بھی ہیں کہ جو لوگ کسی معقول شرعی عذر کی بنا پر جہاد میں شرکت نہ کر سکے، ان کو بھی مالِ غنیمت میں سے حصہ دیا گیا۔ پانچواں حصہ جو اللہ اور رسول کے لیے خمس کے نام پر الگ کیا جاتا، وہ بھی عملاً مصالح عامہ پر خرچ ہوتا تھا۔ آیت خمس کے مطابق آپ ﷺ ایک حصہ اپنی اور ازواجِ مطہرات کی ضروریات کے لیے اور دوسرا حصہ اپنے قرابت داروں کے لیے لیا کرتے تھے۔ باقی تین حصے واضح طور پر یتامیٰ، مساکین اور مسافروں کی طرف منتقل ہوتے تھے۔

زکوٰۃ کی تقسیم کے لیے قرآن پاک میں آٹھ مصارف بیان کیے گئے ہیں:

إِنَّمَا الصَّدَقَٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسَٰكِينِ وَالْعَٰمِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِى الرِّقَابِ وَالْغَٰرِمِينَ وَفِى سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ ۖ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ (سورۃ التوبۃ: ۶۰)

"یہ صدقات تو دراصل فقیروں اور مسکینوں کے لیے ہیں اور ان لوگوں کے لیے ہیں

جو صدقات کے کام پر مامور ہوں اور ان کے لیے جن کی تالیفِ قلب مطلوب ہو،
نیز یہ گردنوں کو چھڑانے اور قرض داروں کی مدد کرنے میں اور اللہ کی راہ میں مسافر
نوازی میں استعمال کرنے کے لیے ہیں۔ایک فریضہ ہے اللہ کی طرف سے۔"

محولہ بالا آیت میں (۱) فقیر سے مراد ہر وہ شخص ہے جو اپنی ضرورت کے لیے دوسروں کا محتاج ہو۔اس میں یتیم بچے، بیوہ عورتیں، بے روزگار اور حوادت کا شکار ہونے والے لوگ شامل ہیں۔(۲) مساکین وہ لوگ ہیں جو بظاہر سفید پوش ہوں اور اپنی خود داری کی بنا پر کسی کے آگے دستِ سوال دراز نہ کرسکیں۔(۳) عاملین وہ سرکاری کارندے اور افسر ہیں جو مجاز اتھارٹی کی جانب سے زکوٰۃ کی وصولی پر مامور ہوتے ہیں۔یہ لوگ بھی اپنی تنخواہ زکوٰۃ کی مد سے وصول کرتے ہیں۔(۴) مؤلفۃ القلوب میں یا تو وہ کفار ہیں جو محض مالی مفادات کے لیے اہلِ کفر کی صفوں میں شامل ہو جاتے ہیں اور کچھ مالی مراعات کے ساتھ انھیں حق و باطل کی کشمکش میں کم از کم غیر جانبدار اور کمزور کر دیا جائے یا وہ نومسلم ہیں جن کی مالی مدد کرکے انھیں اسلام کا مستقل مطیع و فرمانبردار بنایا جاسکتا ہے۔اس باب میں اب تین آرا ہیں۔(الف) امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک عہدِ ابوبکر صدیقؓ و حضرت عمرؓ سے یہ مد ساقط ہو چکی ہے۔(ب) امام شافعیؒ کے مطابق صرف فاسق مسلمانوں کی تالیفِ قلب جائز ہے۔بقول ان کے حضور ﷺ تالیفِ قلب کے لیے کفار کو مالِ غنیمت سے دیتے تھے نہ کہ زکوٰۃ میں سے۔(ج) بعض فقہا کے مطابق مؤلفۃ القلوب کا حصہ حسبِ ضرورت باقی ہے۔(۵) فی الرقاب سے مراد زکوٰۃ کے ذریعے غلاموں کو آزاد کروانا ہے۔زکوٰۃ کی اس مد کے ذریعے سے غلاموں اور جنگی قیدیوں کی عام آزادی کی راہ ہموار ہوتی ہے۔(۶) غارمین سے مراد ہر وہ شخص ہے جو اپنا قرضہ ادا نہ کرسکے۔بعض فقہا کے مطابق شرط یہ ہے کہ یہ قرضہ کسی ناجائز اور غیر شرعی کام کے لیے نہ لیا گیا ہو۔(۷) فی سبیل اللہ کے الفاظ میں خاصی وسعت ہے۔ضرورت مند حجاج کرام، مجاہدین، یتیم خانوں اور ہسپتالوں میں غریبوں اور ضرورت مندوں کو اس مد میں سے مدد دی جاسکتی ہے۔(۸) ابن السبیل سے مراد وہ مسافر ہیں جو دورانِ سفر محتاج ہو جائیں خواہ اپنے وطن میں وہ صاحبِ نصاب

ہی کیوں نہ ہوں۔ قرآنِ حکیم میں جہاں سیروا فی الارض کا حکم ہے وہاں سیاحت کے فروغ کے لیے مقیم لوگوں کو بھی فیاضی اور سخاوت کی تعلیم دی گئی۔(۲۱) تاکہ مسلم معاشرے کے کسی بھی شہر میں کوئی غریبِ شہر نہ رہے۔

اموالِ فے کے ذریعے سے بھی اسلام میں تقسیمِ دولت کے وسیع پھیلاؤ کا منظر سامنے آتا ہے۔ غنیمت صرف وہ اموال منقولہ ہیں جو دورانِ جنگ عساکر اسلامی کے ہاتھ لگیں۔ جنگ کے بعد اموال غیر منقولہ کی طرح اموال منقولہ بھی فے کے قرآنی حکم میں داخل ہیں۔ ان پر خمس کے اصول کا اطلاق نہیں ہوتا۔ جو اموال و اراضی مسلمانوں کو لڑائی کے بغیر یا صلح کے نتیجے میں حاصل ہوں وہ فے کہلاتے ہیں۔ ان کی تقسیم کے متعلق سورۃ الحشر میں رہنمائی دی گئی ہے۔

اس حکم کی رو سے پہلا حصہ اللہ و رسول ﷺ کا ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ السلام اس حصے میں سے اپنے اہل و عیال کے اخراجات اور جہاد کی ضروریات کے لیے خرچ فرماتے۔ آپ ﷺ کے وصال کے بعد اس حصے کا حقدار کون ہے؟ اس باب میں دو اقوال ہیں۔ ایک یہ کہ یہ حصہ اب مسلمانوں کے خلیفہ وقت کو ملے گا۔ دوسری رائے یہ ہے کہ یہ حصہ بھی بیت المال میں داخل ہوگا اور آپ ﷺ کے مشن کی توسیع کے لیے صرف ہوگا۔ رشتہ داروں سے مراد بنی ہاشم و بنی مُطلب ہیں۔ اس کی غایت یہ تھی کہ حضور ﷺ اپنے ان اعزا و اقارب کی مدد بھی کر سکیں جو صاحب احتیاج ہوں۔ آپ ﷺ کے بعد مسلمانوں کے باقی مساکین، یتامیٰ اور مسافروں کے ساتھ ہی بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب کے حقوق بھی بیت المال سے ادا کیے جاتے تھے۔ اس بنا پر البتہ ان کو ترجیح دی گئی کہ زکوٰۃ میں ان کا حصہ نہیں ہے۔ خلفائے راشدین بشمول حضرت علیؓ نے اموال فے کی تقسیم میں انھی اصولوں کو پیش نظر رکھا۔

باقی تین حصوں کے بارے میں کوئی بڑا اختلاف نہیں ہے۔ بعض ضمنی تفصیلات کو چھوڑ کر اس بات پر عموماً اتفاق ہے کہ یہ سارا مال مسلمانوں کے اجتماعی مصالح کے لیے ہے۔ اس کی تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ گردش دولت کے بارے میں اسلام کے جس زریں اصول کا قرآن حکیم میں

ذکر ہے، وہ انھی آیات کے تناظر میں نازل ہوا تھا۔ یہ ایک اور عملی ثبوت ہے اس امر کا کہ زکوٰۃ، فے اور دوسرے قومی ذرائع آمدنی سے اسلامی مملکت میں دولت اوپر سے نیچے کی طرف یوں گردش کرتی ہے کہ قومی و ملی سرمائے میں بھی اضافہ ہوتا ہے اور عام آدمی کی قوتِ خرید بھی مستحکم ہوتی ہے۔

یہاں اس بات کی وضاحت ناگزیر ہے کہ مفتوحہ اراضی خواہ لڑائی سے حاصل ہوں یا صلح کے ذریعے مسلمانوں کے قبضے میں آئیں ان پر غنیمت کے احکام کا اطلاق نہیں ہوتا۔ ان کے بارے میں سنت سے مختلف طریقہ ہائے کار ثابت ہیں۔ بنو نضیر کو مدینہ سے جلا وطن کرنے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے ان کی جایداد کا ایک حصہ مہاجرین میں تقسیم فرمایا اور مؤاخات کے موقع پر انصار نے جو کچھ مہاجرین کو پیش کیا تھا وہ تشکر و امتنان کے جذبات کے ساتھ دوبارہ ان کو واپس کر دیا گیا۔ اموال بنی نضیر میں سے صرف تین انصاری صحابہ..... حضرت ابودجانہؓ، حضرت سہل بن حنیفؓ اور حضرت حارث بن علقمہؓ..... کو حصہ دیا گیا، کیونکہ یہ لوگ معاشی لحاظ سے بہت کمزور تھے۔ فتح مکہ کے بعد آپ ﷺ نے مکہ کے تمام مکانات اور اراضی کو اہلِ مکہ کے پاس رہنے دیا اور ان کی زمینوں کو عشری قرار دیا گیا۔ بعض فقہا کے نزدیک مکہ چونکہ دارالحج ہے اس لیے اس کی جایداد یں اور اراضی اوقاف المسلمین ہیں۔ (۲۲) بعض متشدد فقہا مکہ کے مکانات کو کرایہ پر دینے اور زمین کو اجارہ پر دینے کے حق میں بھی نہیں ہیں۔ اہلِ خیبر کے معاملے میں آپ ﷺ نے بالکل ایک الگ پالیسی بنائی۔ یعنی پانچواں حصہ نکالنے کے بجائے پیداوار کا پورا نصف حصہ بیت المال کی تحویل میں لے لیا۔ اس طرح یہ نظیر قائم ہوگئی کہ خلیفہ برحق حالات کے مطابق ایسی اراضی کے بارے میں اجتماعی مفاد کو سامنے رکھتے ہوئے مشاورت سے کوئی فیصلہ کر سکتا ہے۔

خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے دورِ خلافت میں سوادِ عراق کی زمینوں سے متعلق صحابہ کرام کے ساتھ کئی مشاورتی نشستیں منعقد کیں۔ حضرت زبیرؓ، حضرت بلالؓ جیسے صحابہ اس بات پر مُصر تھے کہ مفتوحہ اراضی کو فاتح فوجوں کے درمیان تقسیم کر دیا جائے۔ حضرت علیؓ اور دوسرے اصحاب کی رائے تھی کہ اِن زمینوں کو سابقہ مالکان کے پاس رہنے دیا جائے تاکہ یہ مسلمانوں کے لیے ذریعہ

آمدنی کے طور پر موجود رہیں۔ تیسرے مکتبہ فکر کی نمایندگی حضرت معاذ بن جبلؓ کر رہے تھے۔ اُن کے نزدیک بڑی بڑی جایدادیں چند فاتحین کے ہاتھوں میں دے دینا قرآنی اصولِ فے کے خلاف ہے۔ کئی روز کی بحث کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت عمرؓ کا سینہ حق کے لیے کھول دیا۔ قرآن حکیم کے گہرے مطالعے کے بعد ان کو وہ نص صریح مل گئی جس سے باقی صحابہ کرام کو بھی شرحِ صدر حاصل ہوا۔ آپ نے سورۃ الحشر میں مالِ فے کی تقسیم کے متعلق آیت کا حوالہ دیا جس میں فرمایا گیا ہے:

مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ... لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ ... وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ ... وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ... (الحشر: ۷۔۱۰)

''جو کچھ بھی اللہ ان بستیوں کے لوگوں سے اپنے رسول کی طرف پلٹا دے وہ اللہ اور رسول اور رشتہ داروں اور یتامیٰ و مساکین اور مسافروں کے لیے ہے...... نیز وہ مال ان مہاجرین کے لیے ہے جو اپنے گھروں اور جایدادوں سے باہر کیے گئے ہیں......(اور وہ ان لوگوں کے لیے بھی ہیں) جو ان مہاجرین کی آمد سے پہلے ہی ایمان لا کر دارالہجرت میں مقیم تھے......(اور وہ ان لوگوں کے لیے بھی ہے) جو ان اگلوں کے بعد آئے ہیں۔''

اب یہ بات کھل کر سامنے آ گئی کہ مذکورہ اراضی کو فاتحین کی نجی ملکیت میں دے دیا جائے تو آیندہ کے لیے اُمہ کا حصہ باقی نہیں رہتا۔ (۲۳) اب اس فیصلے کے مطابق اِن زمینوں کے مالک قانونی طور پر (Dejure) مسلمان تھے۔ سابقہ مالکوں کی حیثیت اگرچہ کاشت کاروں کی تھی لیکن عملاً (Defacto) سابقہ زمینوں پر وہ بدستور قابض رہے۔ اُن کی زمینوں پر بیع، رہن اور وراثت کے

حقوق بھی انھیں حاصل تھے۔ گویا تمام علاقے کو مسلمانوں کی اجتماعی ملکیت قرار دیا گیا۔ سابقہ مالکوں کو ذمی قرار دے کر ان پر جزیہ وخراج عائد کیا گیا جو مسلمانوں کی فلاح وبہبود پر خرچ ہوتا تھا۔

کیا غزواتِ نبوی ﷺ کا بنیادی محرک محض معاشی مفاد تھا؟

کارل بروکلیمان اور منٹگمری واٹ (۲۴) جیسے مستشرقین نے حسب عادت اس مقام پر بھی اُنگلی رکھ دی ہے اور اپنی ساری تحقیقی وتصنیفی کاوشیں اس امر کو ثابت کرنے میں لگا دی ہیں کہ اسلامی انقلاب محض ایک معاشی واقتصادی زلزلہ تھا جس کے دوگانہ مقاصد تھے۔ اولاً عربوں کی جبلی لوٹ مار اور قبائلی مار دھاڑ کے جذبے کی تسکین۔ ثانیاً مدینہ کی بڑھتی ہوئی مسلم آبادی کے لیے معاشی وسائل کی فراہمی۔ یہ لوگ اس حد تک دعویٰ کرتے ہیں کہ مسلمانوں کی عسکری "مہم جوئی" سے مکہ کے پُرامن تاجر طبقہ کی شام کی جانب آزادانہ تجارت کو شدید خطرہ لاحق ہو گیا۔ اہل مکہ کو دانستہ اشتعال دلایا گیا جس کے بعد جنگِ بدر اور بعد کے خونی معرکے برپا ہوئے اور یہ کہ مدینہ وخیبر کے یہود اور شمال مشرق کی جانب مہمات کے پس پردہ بھی اقتصادی محرکات کارفرما تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ غزوات وسرایہ سراسر مذہبی نوعیت کے تھے اور اقتصادی پہلو محض ثانوی حیثیت رکھتا تھا۔ عمرۃ القضا کے کوئی اقتصادی اہداف نہ تھے۔ فتح مکہ کے بعد واضح طور پر مسلمان وہاں سے خالی ہاتھ نکلے تھے۔ سریہ طفیل بن عمرو دوسی قبیلۂ دوس کے بت ذوالکفین کو تباہ کرنے کے لیے بھیجا گیا۔ اس کی کوئی اقتصادی اہمیت نہ تھی۔ حضرت علیؓ کی سرکردگی میں ایک سریہ قبیلہ طے کے بت فلس کی بربادی کے لیے روانہ کیا گیا۔ حضرت زید بن حارثہؓ کی سرکردگی میں ایک سریہ جانب حسمی بھیجا گیا۔ مالِ غنیمت کے طور پر ایک ہزار اونٹ، پانچ ہزار بکریاں اور سو بچے قیدی کر کے لائے گئے۔ رئیس قبیلہ زید بن رفاعہ جزامی اپنے کچھ ساتھیوں سمیت پہلے سے مسلمان ہو چکے تھے۔ اُن کی سفارش پر اہلِ قبیلہ کا سب مالِ واسباب واپس کر دیا گیا اور قیدی آزاد ہو گئے۔ اس پر پورے قبیلہ نے اسلام قبول کرنے کا اعلان کر دیا۔ (۲۵)

اسی در منٹگمری ایسے واقعات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے پورے وثوق سے دعویٰ کرتا ہے:

The faith of even one man in Islam was, to him, far better than the greatest booty).۲۶(

"کسی ایک انسان کا دولتِ ایمان سے سرفراز ہونا آپ (ﷺ) کے نزدیک غنیمت کی بڑی سے بڑی دولت سے بدرجہا بہتر تھا۔"

غزوۂ موتہ اور غزوۂ اُحد میں مسلمانوں کو خود بہت نقصان اُٹھانا پڑا۔ غزوہ سویق ابوسفیان کی جارحانہ کارروائی کے جواب میں پیش آیا۔ رات کی تاریکی میں مدینہ کے بعض یہود کے تعاون سے اپنے ایک دستے کے ساتھ اُس نے مدینہ کے قریب عریض نامی مقام پر اچانک حملہ کر دیا۔ اس حملے میں ان لوگوں نے کھجور کے کچھ درخت کاٹ دیے اور باقی جلا ڈالے۔ حضور ﷺ کو جونہی خبر ملی، آپ نے صحابہؓ کے ساتھ تعاقب کیا۔ ایک انصاری اور اس کے حلیف کو قتل کر کے وہ لوگ بھاگ نکلے اور گھبراہٹ میں اپنا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے ستو، توشے اور کچھ سامان پھینک گئے۔ یہ وہ کل غنیمت تھی جو اس غزوہ میں مسلمانوں کو حاصل ہوئی۔ (۲۷) مدینہ کے قبائل یہود...... بنو قینقاع، بنونضیر اور بنو قریظہ...... کے بارے میں قدیم تاریخوں میں جو کچھ شامل ہو گیا ہے اس میں بہت مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہے۔ یہ بات البتہ طے شدہ ہے کہ مدینہ سے جلاوطن ہوتے وقت اسلحہ وغیرہ کو چھوڑ کر بہت سا مال منقولہ انھیں ساتھ لے جانے کی اجازت دی گئی اور وہ لوگ جاتے وقت اپنے مکانوں کے دروازے اور کھڑکیاں تک اُکھاڑ کر لے گئے۔ حضور ﷺ نے مسلمانوں کو پابند کیا کہ اُدھار کی جو رقوم اُن کے ذمے ہیں وہ بھی تین یوم کے اندر جلاوطن یہودیوں کو واپس کر دی جائیں۔ (۲۸) بنونضیر کے دو افراد...... یامین بن عمیرؓ اور ابوسعید بن وھبؓ...... کے قبول اسلام کے بعد اُن کا مال واسباب بھی اُن کی اپنی ملکیت قرار پایا۔ (۲۹)

غزوۂ خندق میں یہی غنیمت تھا کہ قبائل عرب کی متحدہ طاقت کی آمد سے پہلے مسلمانوں نے اپنی پکی ہوئی فصلیں بالعموم بروقت کاٹ لی تھیں۔ غزوۂ خیبر اور اس کے بعد فدک اور وادی القریٰ کی مہمات سے یقیناً مسلمانوں کو بہت سے مالی واقتصادی فوائد حاصل ہوئے۔ لیکن یہ بات کہ تمام

غزوات اور سرایا کا بنیادی مقصد اعلائے کلمۃ اللہ تھا اور اقتصادی فوائد ان کے ثانوی ثمرات تھے، تاریخ کی ناقابل تردید شہادتوں سے ثابت ہوتی ہے۔ یہاں اس واقعہ کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ معرکۂ خیبر کے دوران جب قلعہ نطاۃ محاصرے میں تھا، اہلِ خیبر کے ایک حبشی چرواہے کی تقدیر بدل گئی اور اُس نے دربارِ رسالت ﷺ میں حاضر ہو کر اسلام قبول کرلیا۔ اُس کے پاس یہود کی بہت سی بکریاں موجود تھیں۔ اُس نے ان بکریوں کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے پوچھا۔ آپ ﷺ نے حالتِ جنگ میں بھی امانت و دیانت کے اُصول پر آنچ نہ آنے دی۔ آپ ﷺ کی ہدایت کے مطابق اُس چرواہے نے اُن بکریوں کو یہودی قلعہ کے پاس لے جا کر ان کی آبادی کی جانب ہانک دیا اور خود خالی ہاتھ واپس آگیا۔ پھر اسی جہاد میں شرکت کی اور جامِ شہادت نوش کیا۔(۳۰)

مفتوحین کے حقوق کے بارے میں نبی اکرم ﷺ کو جو فکرمندی رہتی، اس کے لیے اراضی خیبر و فدک کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ فتح کے بعد اہل خیبر نے درخواست کی کہ انھیں ان زمینوں سے بے دخل نہ کیا جائے۔ آیندہ سے وہ اِن زمینوں پر کاشت کار کے طور پر کام کریں گے اور ہر فصل کے بعد نصف پیداوار مسلمانوں کو دے دیں گے۔ ادھر مطلوبہ تعداد میں مسلمان کاشت کار موجود نہ تھے۔ اس لیے بٹائی کے اصول پر معاہدہ ہوگیا۔ ہر سال مشہور انصاری صحابی حضرت عبداللہ بن رواحہؓ پیداوار کی تقسیم کے لیے بھیجے جاتے۔ اُنھوں نے تمام پیداوار کا تفصیلاً جائزہ لیا۔ اچھی اور ردی کھجوروں کو ملا کر دو برابر کے ڈھیر لگا دیے۔ یہودیوں کو اختیار دیا گیا کہ دونوں حصوں میں سے جو حصہ چاہیں منتخب کرلیں۔ اُن کے قائدین نے بے ساختہ کہا۔ ''اسی عدل و انصاف کی وجہ سے زمین و آسمان قائم ہیں۔''(۳۱) خلفائے راشدین کے دور میں بھی قرآن حکیم کے اس اصول پر باقاعدہ عمل کیا گیا جس میں حکم دیا گیا ہے۔ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭ اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ (المائدہ:۸) ''کسی قوم کی دشمنی تمھیں اس امر پر مائل نہ کرے کہ تم انصاف نہ کرو۔ ضرور انصاف کرو کہ یہ تقویٰ کے قریب ہے۔'' چنانچہ جزیہ کے متعلق بھی یہ بات ریکارڈ پر ہے کہ اہل ذمہ کی مالی پوزیشن کمزور یا بہتر ہونے پر جزیہ کی مقدار

میں بھی کمی بیشی کر دی جاتی تھی۔ خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ نے ایک یہودی کو گداگری کرتے دیکھا تو فرمایا "یہ کوئی انصاف نہیں ہے کہ جوانی میں تو ہم ان لوگوں سے جزیہ لیں اور بڑھاپے میں انھیں بھکاری بننے دیں۔" انھوں نے فوراً بیت المال سے اس کے لیے باقاعدہ وظیفہ مقرر کر دیا۔

جزیہ کا ذکر آیا ہے تو تاریخ اس واقعہ کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی جو حمص کی فتح کے موقع پر پیش آیا۔ پہلے مرحلے پر مسلمانوں کو بظاہر حتمی فتح ہوئی۔ اہل شہر سے جزیہ وصول کر لیا گیا۔ لیکن چند روز بعد جنگی مصلحت کے تحت شہر خالی کر کے شام کے شہر جابیہ جانے کا فیصلہ ہوا۔ مسلمانوں کے سپہ سالار حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ نے اہل شہر کو جمع کیا اور ان سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ جزیہ کی وصولی کا ایک بڑا مقصد اہل ذمہ کے دفاع کی ذمہ داری قبول کرنا بھی ہے۔ اب جبکہ ہم آپ کا دفاع کرنے سے قاصر ہیں تو اس رقم پر اب ہمارا کوئی حق نہیں ہے۔ چنانچہ جمع شدہ رقم اہل شہر کو واپس کر دی گئی۔

یہاں قدرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ عہد نبوی ﷺ کے تمام اموالِ غنیمت نے کس حد تک مسلمانوں کی نئی ریاست اور اس کے عوام کی معاشی فلاح و بہبود میں حصہ ادا کیا۔

ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی نے اس موضوع پر بہت مفید بحث کی ہے۔ ان کا کہنا ہے:

"اگر ہم پورے جزیرہ نمائے عرب کی عہد نبوی ﷺ کی کل مسلم آبادی کی کم سے کم تعداد...... پانچ لاکھ مسلم...... تسلیم کر لیں تو صرف ایک سال میں مسلم مصارف و اخراجات کا تخمینہ کم سے کم شرح زندگی کے اوسط کی بنیاد پر لگ بھگ تین سو ملین درہم آئے گا اور پورے دس سالہ مدنی دور کے کل مصارف کا تخمینہ تین ہزار ملین درہم ہوگا۔ اس حساب سے صرف مدنی آبادی کے ایک سال کے مصارف کا میزان پورے دس برسوں میں حاصل شدہ مال غنیمت کے تخمینہ سے چوبیس گنا زیادہ آتا ہے اور اگر پورے دس سال کے مصارف مدینہ کو شمار و حساب سے کیا جائے تو کل مالیت اموال صرف تین اعشاریہ چار فیصد رہ جاتی ہے۔ ان اعداد

شمار کی روشنی میں اگر پورے جزیرہ نمائے عرب کی مسلم آبادی کے صرف ایک سال کے مصارف کو مدنظر رکھا جائے تو حاصل شدہ غنائم کی مجموعی رقم ہیچ مچ صفر بن جائے گی۔“(۳۲)

ایک اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خود مسلمانوں کی جہادی وعسکری مہمات پر آنے والے مجموعی مصارف کی روشنی میں جمع وتفریق کا میزانیہ کیا بنتا ہے؟

مصنف مذکور اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

”مدنی دور کے دس سالہ غزوات وسرایا میں شریک ہونے والے تمام مجاہدین کی تعداد کے مطابق حساب کریں تو مسلم مجاہدین کی کل تعداد ایک لاکھ بنتی ہے اور ان پر ہونے والے مصارف کا کل میزان پندرہ ملین دینار یا ایک سو اسی ملین درہم تک پہنچتا ہے۔ اگر ہم قریش مکہ کی مضبوط معیشت کے بالمقابل مدنی مسلم معیشت کو کمزور اور فروتر تسلیم کر کے حساب کریں اور غزوات پر مسلم مصارف کو قریش کا صرف ایک تہائی خرچ مان لیں تو پانچ ملین دینار یا ۶۰،۳۳ ملین درہم کے قریب کل مصارف کا میزان آتا ہے۔ قریشی مصارف کے مقابلہ میں ہم کسی حد تک بھی مسلم مصارف کو کم کرتے جائیں یہ حقیقت بہرحال اپنی جگہ رہتی ہے کہ دس سالہ مدت میں حاصل ہونے والے اموال غنیمت کی رقم مصارف کے مقابلہ میں صفر سے بھی نیچے اتر جاتی ہے۔ مال غنیمت کی آمدنی اور مسلم فوجی تیاریوں پر صرفہ کا توازن برقرار رکھنے کی واحد صورت یہ رہ جاتی ہے کہ مصارف کے میزان کو تیس گنا سے بھی گھٹا دیں مگر یہ نہ انصاف کے قرین ہوگا نہ حقیقت کے اور نہ منطق وعقل کے۔ ایک آخری صورت جو مستشرقین اور جدید مورخین نے اختیار کی، یہ رہ جاتی ہے کہ ہم آمدنی اور مال غنیمت کی تو بات کریں اور مسلم افواج کے مصارف کو سرے سے خاطر میں نہ لائیں۔ اس صورت میں نفع ہی نفع، آمدنی ہی

آمدنی اور فائدہ ہی فائدہ نظر آئے گا مگر کیا یہ سچ بھی ہوگا۔" (۳۳)

یہ حقیقت بہرصورت پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ عربوں کی پوری تاریخ میں پہلی بار ایک باقاعدہ منظم ریاست وجود میں آئی تھی اور کوئی بھی ریاست محض عسکری ذرائع یا مالِ غنیمت سے ملکی معیشت کو چلانے کی تادیر متحمل نہیں ہوسکتی۔ ویسے بھی تمام قرائن وشواہد سے واضح ہوتا ہے کہ عہد نبوت میں اسلامی ریاست کی معیشت کے چار مستقل مآخذ تھے یعنی تجارت، زراعت، صنعت وحرفت اور محنت و مزدوری۔ (۳۴) اموالِ غنیمت کا حصہ اس پوری معیشت میں زیادہ سے زیادہ دو فیصد تھا۔ اسلامی مملکت عہدِ حاضر کی کسی ملٹی نیشنل کمپنی کے مماثل نہیں جس کا مقصد غریب اور پسماندہ عوام کی جیب پر ہاتھ صاف کرکے اپنی تجوریاں بھرنا ہوتا ہے اور چونکہ جہادِ اسلامی کا بنیادی مقصد مالِ غنیمت یا کشور کشائی نہیں ہے اس لیے نہ صرف مالِ غنیمت بلکہ تمام ممکنہ اور جائز ذرائع سے حاصل شدہ مال و دولت کو بھی اسلامی معاشرے میں اسراف وتبذیر کی نذر نہیں کیا جاتا۔ جائز کام میں ضرورت سے زیادہ خرچ کرڈالنے کو اسراف کہتے ہیں جب کہ سرے سے ہی کسی ناجائز کام میں کسی قسم کے خرچ کو تبذیر کہا جاتا ہے۔ ایک صحابی نے حضور ﷺ سے سوال کیا کہ کیا وضو میں بھی اسراف ہوسکتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ ہاں، اگرچہ تم ایک بہتی ہوئی ندی کے کنارے پر وضو کررہے ہو۔ اس ارشاد مبارک کی حکمت علم معاشیات کے ایک مشہور اصول سے معلوم کی جاسکتی ہے۔ یعنی رسد اگر زیادہ بھی ہوجائے تو طلب کو بڑھا دینا مناسب نہیں۔ طلب کی زیادتی کا اثر لامحالہ قیمتوں اور افراطِ زر وغیرہ پر پڑتا ہے۔ (۳۵) اسلامی معاشرہ روایتی معنوں میں ایک صارفین کا معاشرہ (Consumer Society) نہیں ہے۔ اسلامی معیشت میں صارف کو اسراف، بخل، بے جاتعیش اور نمود ونمائش سے گریز کا سخت حکم دیا گیا ہے۔ اسی طرح جمع شدہ وسائل کو تادیر منجمد حالت میں جمع رکھنا بھی ممکن نہیں ہے۔ ان پر صدقاتِ واجبہ ونافلہ کا حکم عائد ہوتا ہے۔ بنابریں اسلامی معاشرے میں سرمایہ کاری کے ذریعے بھی گردشِ دولت کا رجحان فروغ پذیر ہوتا ہے۔

مذکورہ چاروں مستقل مآخذ میں سے تجارت، محنت اور زراعت کے بارے میں اسلامی

تعلیمات کا خلاصہ قدرے تفصیل کے ساتھ درج کیا جاتا ہے۔

تجارت

خطیب الانبیا حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کو تجارتی امور میں اخلاقی اصولوں کو پیش نظر رکھنے کی تلقین کی۔ آپ علیہ السلام نے انھیں ناپ تول میں ڈنڈی نہ مارنے کی نصیحت بھی کی۔ سورۃ ہود میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ۝

(ہود: ۸۵)

''اور لوگوں کو اُن کی چیزوں میں گھاٹا نہ دیا کرو اور نہ زمین میں فساد پھیلاتے پھرو۔''

''بخس'' کی تفسیر کرتے ہوئے مفسرین نے لکھا ہے کہ اس میں کسی شخص کو اس کی جائز ملکیت کے فائدہ سے محروم کرنا یا کسی کو دھوکے میں رکھ کر اس کی قیمتی چیز کو اونے پونے داموں میں خرید لینا وغیرہ شامل ہیں۔ حضور ﷺ نے منع فرمایا کہ کسی کی مجبوری سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے من مانی قیمت پر کوئی چیز خریدی جائے۔ یہ رویہ بھی ''بخس'' کے زمرے میں شمار ہوتا ہے۔ (۳۶) اس آیت میں یہ تنبیہ بھی کر دی گئی ہے کہ معاشی معاملات میں ناانصافی اور ظلم دراصل فساد فی الارض ہے۔ ایسی صورت میں بالآخر محرومین کا ہاتھ مترفین کے گریبان تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر تاج اُچھالے جاتے اور تخت گرائے جاتے ہیں۔ معاشرہ کے امن وسلامتی کے لیے ضروری ہے کہ ناانصافی، ظلم اور استحصال کا ہر راستہ بند کیا جائے۔ قرآن حکیم نے صاف وشفاف تجارت کے لیے بہت جامع اصول بیان کر دیا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ (النساء: ۲۹)

''اے ایمان والو! نہ کھاؤ مال ایک دوسرے کے آپس میں ناحق مگر یہ کہ تجارت

ہو آپس کی خوشی سے۔"

اس حکمِ الٰہی میں باہمی رضامندی سے تجارت کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔ ہر ایسے کاروبار سے بچنے کا حکم دیا گیا جس میں ناجائز انتفاع کا شائبہ بھی ہو۔ اس ایک آیت کے ذریعے بھی جوا، قمار، سٹہ بازی اور ربا سود کی ساری شکلیں ناجائز اور حرام ٹھہرتی ہیں۔ فقہا نے اس حکم کی روشنی میں بیع باطل اور بیع فاسد کی صورتیں بھی بیان کی ہیں۔ پہلی صورت میں مال موجود نہیں ہوتا اور زبانی کلامی سودا طے پا جاتا ہے۔ دوسری صورت میں مال تو موجود ہوتا ہے لیکن فریقین کی خوش دلانہ رضامندی کا عنصر منقود ہوتا ہے۔ اہلِ عرب اعلیٰ نسل کے گھوڑوں اور دوسرے جانوروں کے بچوں کی پیدائش سے بھی بہت پہلے ان کا سودا کرنے کے عادی تھے۔ کسی ایسی چیز کی خرید و فروخت جو موقع پر موجود نہ ہو اور آیندہ بھی بیچنے والے کے بس میں نہ ہو، "غرز" کہلاتا ہے۔ ابن ماجہ کی روایت کے مطابق کسی چیز کے عیب کو چھپا کر بیچنے والے پر اللہ تعالیٰ کا سخت غضب نازل ہوتا ہے۔ اسے ضرر کہتے ہیں۔ اسلامی نقطۂ نظر سے تجارت میں ضرر کی اجازت ہے، نہ غرر کی گنجایش۔

اسلامی احکامات کے مطابق تجارت کرنے والوں کو حضور ﷺ نے بشارت دی تھی۔ حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے، حضور ﷺ نے فرمایا "سچا تاجر جو امانت دار ہو، وہ انبیا، صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا۔" (ترمذی)۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرامؓ تجارت بھی اس ذوق و شوق کے ساتھ کرتے تھے جیسے وہ عبادت میں مصروف ہوں۔ یہ ایک عجیب حسنِ اتفاق ہے کہ تمام عشرۂ مبشرہ کا تعلق کم و بیش پیشۂ تجارت سے تھا۔ (۳۷) مسلمان تاجروں کے حسنِ اخلاق نے دین کی ترویج و اشاعت میں جو کردار ادا کیا، وہ میدانِ جنگ کے مجاہدین سے کسی طور کم نہیں۔ یہ ایک زندہ حقیقت ہے کہ ملائیشیا، انڈونیشیا، فلپائن، برونائی (دارالسلام) اور جنوبی ایشیا کے بعض دوسرے ممالک میں کوئی جہادی مہم روانہ نہیں کی گئی۔ ان تمام علاقوں میں اسلام مسلمان تاجروں کے ذریعے پھیلا۔

ایک دوسرے کے مال باطل طریقوں سے نہ کھانے کی قرآنی ہدایت پر بھی نبوی معاشرے میں سختی سے عمل کیا جاتا تھا۔ کسی جگہ کوئی انحرافی صورت نظر آتی تو رسول اللہ ﷺ فوراً

گرفت فرماتے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے ایک غزوہ میں کسی شخص نے اون کا کچھ حصہ چھپا لیا۔ بعد میں اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور دربارِ رسالت میں حاضر ہوا۔ آپ ﷺ نے یہ کہہ کر اسے واپس کر دیا: ''اس وقت میں اسے سارے لشکر میں کیسے تقسیم کر سکتا ہوں۔ اب تم خود قیامت کے روز اس کو لے کر اللہ کے سامنے جواب دہ ہو گے۔'' اسی طرح آپ ﷺ نے فرمایا: ''دیکھو ایسا نہ ہو کہ میں قیامت میں کسی کو اس طرح دیکھوں کہ اس کی گردن پر (مالِ غنیمت میں سے چرایا گیا) ایک اونٹ لدا ہو۔ وہ شخص اگر مجھ سے شفاعت کا طالب ہو گا تو میں اُس کو صاف جواب دے دوں گا کہ میں نے حکمِ الٰہی پہنچا دیا تھا۔ اب میں کچھ نہیں کر سکتا۔'' (بخاری۔ مسلم) مسلمان حکام اور صلحائے امت اس معاملے میں بہت محتاط رہے ہیں۔ وہ اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ اکل حرام کے ساتھ ساری عبادت و ریاضت اور اُس کی قبولیت معرضِ خطر میں پڑ جاتی ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے اپنے ایک صحابی سے فرمایا: ''اے کعب بن عجرہ! وہ گوشت جو حرام رزق سے پیدا ہو وہ جنت میں داخل نہیں ہو گا۔'' حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ جب بھی بیت المال کے معائنے کے لیے تشریف لے جاتے تو عطریات کے قریب سے گزرتے ہوئے اپنی ناک کو کپڑے سے ڈھانپ لیتے مبادا کہ قومی اِملاک میں ناجائز تصرف کے مرتکب ٹھہریں۔ ایک بزرگ کسی مسلمان کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ تھوڑی دیر بعد مریض کا انتقال ہو گیا۔ رات کا وقت تھا انھوں نے فوراً اُٹھ کر موجود چراغ کو بجھا دیا اور اپنے پیسوں سے تیل منگوا کر چراغ کو ازسرِ نو روشن کیا۔ دوسرے لوگوں نے اس کی وجہ پوچھی انھوں نے کہا۔ جب تک یہ شخص زندہ تھا، چراغ اس کی ملکیت تھا اور اس کی روشنی استعمال کرنا درست تھا۔ اس کے انتقال کے بعد اس کی ہر چیز پر ورثا کا حق ہے۔ اب چراغ سمیت اس کی ہر چیز ہم اس کے وارثوں کی اجازت سے ہی استعمال کر سکتے ہیں اور وہ سب یہاں موجود نہیں۔ (۳۸)

محنت

سرمایہ اور محنت یقیناً دو مختلف عاملین پیدائش ہیں۔ لیکن آخری تجزیے میں سرمایہ مجتمع محنت

یعنی Accumulated Labour اور محنت یا انسانی وسائل بالقوت سرمایہ یعنی Potential Capital کا دوسرا نام ہے۔ اسلامی روایات کی روشنی میں مسلم مفکرین نے محنت کی اہمیت کو تسلیم کرنے میں کسی بخل سے کام نہیں لیا۔ ایک نمایندہ مثال علامہ ابن خلدون کی ہے۔ ابن خلدون کے بقول محنت کے بغیر نہریں، چشمے اور قدرتی خزانے تک ضائع ہو جاتے ہیں۔ اگر بھینس گائے اور بکری کے تھنوں میں دودھ ہو لیکن دودھ دوہنے والا ہاتھ موجود نہ ہو تو تھن سوکھ جاتے ہیں۔ (۳۹)

انبیا کرام کا یہ خاصہ رہا ہے کہ انھوں نے خود محنت و مزدوری کر کے دنیا میں محنت اور محنت کار کا مقام بلند کر دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حکمت الٰہی کے تحت فرعون کے محل میں پرورش پائی۔ دورِ جوانی میں آپ اسرائیلی بستیوں میں تشریف لے جاتے اور قبطی حکومت کے کارندوں کے ظلم وستم کو دیکھ کر اصلاح احوال کے بارے میں سوچتے۔ آپ ہی نے فرعون کو سمجھایا کہ مسلسل کام کی وجہ سے مزدور لوگ کمزور ہو جائیں گے اور کارکردگی میں مجموعی کمی سے قومی نقصان ہو گا۔ چنانچہ اس نے ہفتے میں ایک دن کی چھٹی کے احکام جاری کر دیے۔ (۴۰) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خود بھی جناب شعیب کے ہاں ایک معاہدے کے مطابق دس سال تک محنت مزدوری میں بسر کیے اور اُن کی بکریاں چرائیں۔ (بعض دوسری روایات کے مطابق یہ اللہ کے نبی حضرت شعیب علیہ السلام تھے۔)

حضور رسالت مآب ﷺ نے اپنے بہت سے ذاتی کام خود کر کے محنت کی عظمت کا عملی درس دیا۔ بچپن اور نوجوانی میں چند قیراط کے عوض آپ ﷺ اہل مکہ کی بکریاں چرایا کرتے تھے۔ (۴۱) جنگِ احزاب میں آپ ﷺ نے خندق کی کھدائی کے لیے دوسرے صحابہ کے شانہ بشانہ ایک عام مزدور کے طور پر شب و روز کام کیا۔ یوں آپ ﷺ کو اس بات کا براہِ راست تجربہ تھا کہ بندۂ مزدور کے اوقات کتنے تلخ ہوتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ ہمہ وقت غریبوں اور مظلوموں کے حقوق کے لیے کوشاں رہتے۔ مکی دور کا مشہور واقعہ ہے کہ ابوجہل نے قبیلہ اراش کے ایک شخص سے کچھ اونٹ خریدے اور طے شدہ رقم کی ادائیگی سے صاف مکر گیا۔ وہ شخص مسجد حرام میں آ کر رؤسائے قریش کے سامنے فریاد کناں ہوا کہ ابوالحکم نے مجھ بے نوا اور غریب الوطن کا حق مار لیا

ہے۔حاضرین میں سے کوئی شخص بھی ابو جہل سے اس بابت کچھ کہنے کے لیے تیار نہ تھا۔البتہ تفریح طبع کے لیے انھوں نے حرم شریف کے ایک کونے میں حضور ﷺ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ وہی تمھارا حق دلا سکتے ہیں۔اُس کی درخواست پر آپ ﷺ فوراً ابو جہل کے گھر گئے۔اُس نے اندر سے پوچھا۔کون ہے؟ آپ ﷺ نے پورے وقار کے ساتھ جواب دیا۔"میں محمد (ﷺ) ہوں...... باہر آؤ۔"اس آواز میں جانے کیا تاثیر تھی کہ آپ ﷺ کو دیکھتے ہی اُس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔آپ ﷺ نے ابو جہل کو حکم دیا۔"اس اراشی کا حق ادا کر دو۔"اس نے بلا تاخیر اس اجنبی شخص کے واجبات ادا کر دیے۔ابو جہل کے ساتھیوں کو معلوم ہوا تو انھوں نے کہا۔"ہمیں تم سے اِس بزدلانہ حرکت کی بالکل اُمید نہ تھی۔"اُس نے اپنی بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔"میں تو اُن کی آواز سن کر ہی خوف زدہ ہو گیا تھا۔پھر میں جب باہر نکلا تو مجھے محسوس ہوا کہ اُن کے پاس ایک خوفناک اُونٹ جبڑے کھولے کھڑا ہے۔اب بھلا میں یہ مطالبہ پورا نہ کرتا تو کیا کرتا۔"(۴۲) رسول اللہ ﷺ تو بے زبان جانوروں کے حقوق کے لیے بھی بے چین اور متفکر رہے۔انسانوں کے بارے میں آپ کی فکر و تشویش کا عالم کیا ہوگا؟ آپ ﷺ نے فرمایا"جب تم لوگ سرسبزی و شادابی کے زمانہ میں سفر کرو تو اونٹوں کو زمین کی سرسبزی و شادابی سے فائدہ پہنچاؤ اور جب قحط کے زمانہ میں (بنجر علاقہ میں) سفر کرو تو اُن کو تیزی کے ساتھ چلاؤ۔"(ابوداؤد) آپ ﷺ کے معجزات میں سے ہے کہ آپ ﷺ نے ایک اونٹ کے مالک سے فرمایا"یہ اونٹ تمھاری شکایت کرتا ہے۔تم اس سے بار برداری کا کام تو خوب لیتے ہو اور اس کے کھانے اور آرام سے غافل ہو۔"(سنن ابوداؤد)

رسول اللہ ﷺ کے مندرجہ ذیل ارشادات محنت اور مزدور کے تقدس کی عکاسی کرتے ہیں:

۱۔ حضرت رافع بن خدیجؓ سے روایت ہے: رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا،کون سی کمائی حلال اور طیب ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:"انسان کے ہاتھ کی مزدوری اور وہ بیع و شرا جس میں جھوٹ اور فریب نہ ہو۔"

۲۔ نبی اکرم ﷺ کا ایک اور ارشاد گرامی ہے: ''جو شخص اپنی روزی کمانے کے لیے کام کرے اور اس کا مطمع نظر اللہ کی رضا ہو، اس کی مثال حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی طرح ہے کہ انھوں نے اپنے ہی بیٹے کو دودھ پلایا اور اس کی اجرت بھی پائی۔'' (۴۳)

۳۔ ایک بار حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے کسی عجمی غلام کو برا بھلا کہا، رسول اللہ ﷺ نے تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا: ''تم میں ابھی تک جاہلیت کی بو پائی جاتی ہے۔'' انھوں نے عرض کیا!: ''یارسول اللہ ﷺ! کیا اس بڑھاپے میں بھی؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں''۔ پھر فرمایا: ''تمھارے غلام (ملازم) تمھارے بھائی ہیں۔ اللہ نے ان کو تمھارے ماتحت کر دیا ہے۔ تو جس کے ماتحت اللہ تعالیٰ نے اس کے کسی بھائی کو کر دیا ہے، اسے چاہیے کہ جو وہ خود کھائے، وہ ان کو کھلائے اور جو خود پہنے، ان کو پہنائے۔'' (بخاری۔ کتاب الایمان)

۴۔ ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے پہلی اُمت کے تین آدمیوں کا قصہ بیان فرمایا جو غار میں پھنس گئے تھے۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے نیک اعمال کو بیان کر کے اس مصیبت سے نجات کی دُعا مانگی۔ تیسرا شخص جس کی دُعا کے بعد سب لوگ غار سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو گئے، وہ ایک متاجر تھا۔ اس کا مزدور اجرت لیے بغیر چلا گیا تھا۔ اس شخص نے اس کی اجرت تجارت میں لگا دی جس سے بہت منافع ہوا۔ کافی عرصہ بعد مزدور نے واپس آ کر اپنی اجرت طلب کی تو متاجر نے کہا کہ یہ تمام جانور اور مال و دولت جو سامنے ہے، وہ تمھاری ملکیت ہے۔ (بخاری)

۵۔ حدیث قدسی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ تین طرح کے اشخاص سے میں قیامت کے دن جھگڑا کروں گا اور انھیں ذلیل کر کے چھوڑوں گا۔ ایک وہ جس نے میرا نام لے کر وعدہ کیا اور توڑ ڈالا۔ دوسرا وہ جس نے کسی آزاد شخص کو غلام بنا کر بیچ ڈالا۔ تیسرا وہ شخص جس نے کسی (مزدور) سے پوری مشقت لی مگر اس کی پوری اجرت ادا نہ کی۔'' (بخاری۔ کتاب الاجارہ) اور رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد مبارک تو گویا عالمی مزدور تحریکوں کے

ماتھے کا جھومر ہے۔ اعطوا الاجیر اجرہ قبل ان یجف عرقہ (بلوغ المرام) "مزدور کی اجرت اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کر دو۔"

یہ اور اس نوع کے دوسرے ارشادات نبوی ﷺ کا تقاضا ہے کہ ہر مزدور کو کم از کم اتنی اجرت لازماً ملنی چاہیے جس سے ایک متوسط خاندان کی بنیادی ضروریات زندگی مثلاً غذا، لباس، مکان، علاج، تعلیم وغیرہ پوری ہو سکیں۔(۴۴) آجر کے منافع میں سے اجیر کو بھی بونس کی شکل میں مراعات دی جائیں۔ مصائب، مشکلات اور حادثات کے موقع پر مزدوروں کو خصوصی فنڈ اور قرض حسنہ دیا جائے۔ اس طرح ہر سال کاروبار (خصوصاً جائنٹ سٹاک کمپنیوں) کے کچھ حصص مزدوروں کو دیے جائیں اور بتدریج کاروبار میں ان کا حصہ بڑھایا جائے تو ان کی پیداواری قوت میں بھی اضافہ ہوگا۔(۴۵) اور یہ رحمۃ للعالمین ﷺ کے معاشی اسوہ حسنہ کی روح کے عین مطابق ہوگا۔

زراعت

زراعت انفرادی آمدنی اور قومی معیشت کا ایک اہم سرچشمہ ہے۔ بنابریں قرآن حکیم میں رب العالمین نے زمین کی پیداواری صلاحیت کو اہل زمین کے لیے اپنے بے پایاں انعامات و احسانات میں شمار کیا ہے۔

أَفَرَءَيْتُم مَّا تَحْرُثُونَ ○ ءَأَنتُمْ تَزْرَعُونَهُۥٓ أَمْ نَحْنُ ٱلزَّٰرِعُونَ ○ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَٰهُ حُطَٰمًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُونَ ○ إِنَّا لَمُغْرَمُونَ ○ بَلْ نَحْنُ مَحْرُومُونَ ○ (الواقعہ: ۶۳۔۶۷)

"بھلا دیکھو تو جو تم بوتے ہو، اسے تم کھیتی کرتے ہو، یا ہم کھیتی کرنے والے ہیں۔ اگر ہم چاہیں تو اسے روند کر گھاس کر ڈالیں، پھر تم سارا دن باتیں بناتے رہو کہ یقیناً ہم تو قرض دار ہی رہ گئے بلکہ ہم تو بے نصیب رہ گئے۔"

ایک مشہور حدیث پاک میں زراعت کی حوصلہ افزائی کے لیے اسے صدقہ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جو مسلمان درخت لگاتا ہے یا کھیتی

باڑی کرتا ہے اور اس میں سے پرندے، انسان یا چوپائے کچھ کھاتے ہیں تو یہ عمل اس کے حق میں صدقہ بن جاتا ہے۔" (صحیحین۔کتاب الحرث والمزارعۃ)

اسلام میں پیداواری سرگرمیوں کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اگر کوئی شخص پودا لگانے کے لیے تیار بیٹھا ہو اور قیامت کا صور پھونک دیا جائے تو اس وقت کے لیے رسول اللہ ﷺ کی ہدایت ہے۔ فان استطاع ان یقوم حتی یغرسها فلیفعل یعنی "قیامت کا صور پھونکا جانے کے بعد بھی پودا لگا کر کھڑا ہونے کی گنجایش ہو تو وہ پودا لگا دینا چاہیے۔"

زمین میں موجود اہلیت Potentiality کو فعلیت Activity میں بدلنے کے لیے ایک طرف ترغیب دی گئی ہے: "جس شخص نے ایسی زمین کو قابل کاشت بنایا جو کسی کی ملک نہیں تو وہ اس کی ملکیت کا زیادہ حق دار ہے۔" (صحیحین۔کتاب الحرث والمزارعۃ) اور دوسری طرف بے آباد زمین کی آبادکاری میں تین سال تک دلچسپی نہ لینے والے کی زمین ارشادِ نبوی ﷺ کے مطابق بحق سرکار ضبط کر لی جائے گی۔ حضرت بلال بن حارث ؓ کو حضور ﷺ نے ایک قطعۂ زمین عطا فرمایا۔ اس زمین کا بڑا حصہ یونہی بے آباد پڑا رہا۔ حضرت عمر فاروق ؓ نے اپنے دورِ خلافت میں یہ جاگیر ان سے واپس لے لی۔ (۴۶)

محولہ بالا احکامات کی روشنی میں بہت سے فقہا نے زراعت کو فرضِ کفایہ قرار دیا ہے۔

اس ضمن میں فقہا کے ہاں مزارعت کے جواز و عدمِ جواز پر ہونے والی بحث بھی نظر میں رہنی چاہیے۔ ایک رائے کے مطابق مزارعت سراسر ناجائز ہے۔ جبکہ دوسری رائے کے مطابق بٹائی اور لگان کے اصول پر زمینداری جائز ہے۔ حضرت ابوذر غفاری ؓ جیسے صحابی اور امام ابوحنیفہ ؒ جیسے فقیہ پہلا موقف رکھتے ہیں۔ مزارعت کے عدمِ جواز کے متعلق حضرت رافع بن خدیج ؓ، حضرت ابوہریرہ ؓ، حضرت ابوسعید خدری ؓ اور حضرت جابر بن عبداللہ ؓ جیسے صحابہ کرام سے تقریباً ایک جیسی روایات ملتی ہیں۔ مثلاً حضرت جابر ؓ روایت کرتے ہیں کہ لوگ زمین کا نصف یا ایک تہائی یا ایک چوتھائی کاشت کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ جس کسی کے پاس زمین ہو تو وہ اسے خود

کاشت کرے یا کسی مسلمان کو بطورِ احسان دے دے۔ اگر وہ دونوں باتوں سے انکار کرے تو پھر اپنی زمین کو یونہی روکے رکھے۔ (صحیح بخاری۔ باب الحرث والمزارعۃ)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت عمرو بن العاصؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ جیسے صحابی اور امام ابو یوسف جیسے فقیہ دوسرے گروہ کی نمایندگی کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک رسول اللہ ﷺ نے خیبر کے یہود کو زمین اس شرط پر دی کہ وہ اس میں کاشت کریں اور پیداوار میں حصہ نصف بٹائی پر ہو۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اراضیٔ خیبر کے معاملے کا تعلق اسلامی ریاست میں ذمی رعایا کے ساتھ خاص تھا۔ اسے اسلامی ریاست میں مسلمان عوام کے بارے میں عمومی پالیسی نہیں کہا جا سکتا۔ امام ابو یوسفؒ کی رائے میں زمین کا معاملہ عام کاروبار کی مانند ہے جس میں ایک شخص اپنا مال دوسرے کو نصف یا تہائی نفع پر مضاربت کے اصول پر دیتا ہے۔ (کتاب الخراج)

یہ بھی معلوم و معروف ہے کہ مزارعت کے عدمِ جواز کے بارے میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ تک حضرت رافع بن خدیجؓ سے مروی احادیث پہنچیں تو انھوں نے اپنی رائے سے رجوع کر لیا تھا۔ دراصل حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے ہاں عمر کی پختگی کے ساتھ ساتھ زہد و تقویٰ کی شدت میں بھی بہت اضافہ دیکھنے میں آیا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کبھی مدینہ منورہ سے مکۃ المکرمہ کا سفر کرتے تو بڑے التزام کے ساتھ وہی راستہ اختیار کرتے جو حضور رسالت مآب ﷺ نے اختیار کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اتباعِ رسول کے اس مبارک ذوق کی بنیاد فتویٰ پر نہیں بلکہ تقویٰ پر ہے۔ جواز مزارعت کے متعلق بھی ان کے رجوع کا باعث یہ شدتِ احتیاط تھی کہ ممکن ہے رسول اللہ ﷺ نے ایسا حکم دیا ہو جس کی انھیں خبر نہ ہوئی۔ (۴۷)

یہ ایک حقیقت ہے کہ حضرت ابو ذر غفاریؓ کی رائے پر اجماعِ صحابہ نہیں ہوا اور فقہ حنفی میں بھی امام ابو حنیفہؒ کے قول پر فتویٰ نہیں ہے۔ لیکن مزارعت کے حامی و مخالف سب صحابہ کرامؓ بعثتِ نبوی ﷺ سے قبل مزارعت کی سنگین قباحتوں سے پوری طرح آگاہ تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت جابر بن عبداللہؓ اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی تصریحات سے پتا چلتا ہے کہ لوگ اپنی

زمین کا نصف یا ایک چوتھائی کاشت کرتے۔ باقی کو بے کار چھوڑ دیتے۔ اسی طرح مالکانِ زمین، زمین کے اچھے حصہ یا قدرتی آبپاشی کے ساتھ والی زمین کی پیداوار اپنے لیے مخصوص کر لیتے اور خراب یا نہر سے دور غیر یقینی اور کم پیداوار والی بچی کھچی زمین مزارع کے لیے چھوڑ دیتے۔ اس قسم کے ظالمانہ حربے باہمی تنازعات کا باعث بنتے تھے۔ گویا مزارعت کی ابتدائی ممانعت زمینداروں کی من مانی اور فاسد شرائط کی بنیاد پر تھی۔ اگر بٹائی کا معاملہ فی الواقع برا ہوتا تو رسول اللہ ﷺ سود اور شراب کی طرح اسے سختی سے بند کر دیتے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں عہدِ رسالت میں سیدنا علیؓ، سعد بن مالکؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، صدیق اکبرؓ، عمر فاروقؓ اور بہت سے دوسرے صحابہ کرام بھی مزارعت پر اراضی دیا کرتے تھے۔ (بخاری) یہی وجہ ہے کہ حضرت ابن عباسؓ عدم جواز مزارعت کی تمام روایات میں مذکورہ نہی کو نہی تحریمی نہیں بلکہ تنزیہی قرار دیتے ہیں۔ (۴۸) (واللہ اعلم بالصواب)

مزارعین کو اس ظلم وستم سے بچانے کے لیے دورِ خلافتِ راشدہ میں عمالِ حکومت کو تاکید کی جاتی تھی کہ وہ خراج، لگان یا جزیہ وغیرہ کی وصولی میں ظلم وستم اور بے جا سختی سے کام نہ لیں۔ سیدنا حضرت علیؓ نے ایسے ہی ایک عامل سے بھرے دربار میں کہا کہ وہ اہلِ علاقہ سے واجب الادا ایک ایک درہم وصول کر کے چھوڑیں۔ پھر تخلیے میں بلا کر کہا کہ اس حکم کی اپنی ایک مصلحت تھی۔ اب اصل حکم یہ ہے کہ واجبات کی وصولی میں کسی قسم کا جبر وتشدد روا نہ رکھا جائے۔ (۴۹)

مزارعت کے جواز وعدم جواز کے فقہی مباحث سے اس قدر ضرور ثابت ہوتا ہے کہ اسلام میں بلا حد ونہایت اور اندھا دھند جاگیرداری کی کوئی گنجایش نہیں اور یہ کہ بے زمین کسانوں اور غریب کاشتکاروں کے حقوق کے تحفظ کے لیے اسلامی حکومت بہت دور تک جا سکتی ہے۔ جاگیرداری کے مفاسد کو رفع کرنے کے لیے جاگیریں ضبط بھی کی جا سکتی ہیں اور زرعی اصلاحات کے تحت حدِ ملکیت پر پابندی بھی عائد کی جا سکتی ہے۔ ظاہر ہے جو حکومت اپنے عمال کو سرکاری واجبات کی وصولی کے لیے بالکل کھلی چھٹی (Free Hand) نہیں دیتی وہ جاگیرداروں اور زمینداروں کو

غریب کسانوں اور مزارعوں پر مظالم کی اجازت کیونکر دے سکتی ہے۔ اسلامی حکومت میں کسی قسم کا ظلم وستم حکومت کی رٹ (Writ) کو چیلنج کرنے کے مترادف ہے اور کوئی حکومت بھی یہ برداشت نہیں کر سکتی۔ عام حالات میں بھی شرع پیغمبر ﷺ کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے کھلا میدان موجود ہے۔ حکومت بے زمین کسانوں کو آباد کاری کے لیے بے آباد سرکاری زمین مفت دے سکتی ہے۔ جدید کاشت کاری کے فروغ کے لیے آسان اقساط پر بلا سود قرضے جاری کیے جا سکتے ہیں۔ آفات ارضی وسماوی کی صورت میں متاثرہ اراضی کو آفت زدہ علاقہ قرار دے کر کچھ عرصہ کے لیے سرکاری واجبات بھی معاف کیے جا سکتے ہیں۔

اسلامی نظمِ معیشت کے تین ستون

اسلامی حکومت کی رٹ کا معاملہ کسانوں اور مزدوروں کے بنیادی حقوق تک محدود نہیں۔ اس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ فرضیت زکوٰۃ اور امتناعِ سود اسلامی نظمِ معیشت کے دو بنیادی ستون ہیں۔ بلکہ اسلامی نظامِ معیشت کو ایک مثلث تصور کیا جائے تو سود کی حرمت اور زکوٰۃ کی فرضیت کے علاوہ اس کا تیسرا ضلع انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب اور اُس کا ذوق وشوق ہے۔ منصفانہ تقسیم دولت کے لیے قرآن حکیم میں پہلے دو امور کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا۟ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ۝ (الروم:۳۹)

”جو سود تم دیتے ہو تاکہ لوگوں کے اموال میں شامل ہو کر وہ بڑھ جائے اللہ کے نزدیک وہ نہیں بڑھتا اور جو زکوٰۃ تم اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے ارادے سے دیتے ہو، اس کے دینے والے درحقیقت اپنے مال بڑھاتے ہیں۔“

امتناع سود

سود خواہ ذاتی ضرورت کے لیے ہو یا کاروباری اغراض کے لیے، دونوں شکلیں قبل از اسلام

جزیرۃ العرب میں مروج تھیں۔ اسلام نے سود کی ہر شکل کو کلیتاً ممنوع قرار دیا۔ سود کی مکمل حرمت کا حکم تدریجی طور پر نازل ہوا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول ہے کہ آخری آیت جو نبی ﷺ پر نازل ہوئی وہ ربا کی حرمت کی آیت ہے۔ لیکن اس تدریج میں بھی بار بار تذکیر کا پہلو نمایاں ہے اور اس سے بھی جرم کی سنگینی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اسلامی مملکت میں رہتے ہوئے کوئی بھی شخص کسی نوع کے سودی کاروبار میں ملوث ہوتا ہے تو وہ گویا ریاست و حکومت کی رٹ کو چیلنج کرتا ہے۔ اس لیے قرآن حکیم میں لوگوں پر بقایا سود چھوڑنے کا حکم نازل ہوا اور اس حکم کی خلاف ورزی کی صورت میں شر پسندوں کے خلاف اعلانِ جنگ کا پیغام دے دیا گیا۔

فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ (البقرۃ:۲۷۹)

''اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اللہ اور اُس کے رسول کی طرف سے جنگ کا اعلان قبول کرو۔''

اسلامی مملکت میں اقلیتوں کو جان، مال، آبرو اور مذہب کی آزادی دی گئی لیکن سودی معاملات میں کوئی سمجھوتہ نہ کیا گیا۔ نجران کے عیسائیوں کے ساتھ حضور ﷺ نے جو سمجھوتہ کیا، اس میں ان سے حلف لیا گیا تھا کہ وہ کسی قسم کے سودی کاروبار میں ملوث نہ ہوں گے اور یہ کہ اس قسم کی شکایات کی صورت میں معاہدۂ امن و تحفظ خود بخود کالعدم ہو جائے گا۔

سود کی حرمت کے لیے یہی بات ناطق ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے اسے حرام قرار دیا ہے۔ حدیث رسول ﷺ کے مطابق سود کا گناہ ماں کے ساتھ زنا کرنے سے ستر گنا زیادہ ہے۔ (ابن ماجہ) سود خوری کے بارے میں نازل ہونے والی وعیدوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اُمت کے صلحا و فقہا اپنے مقروض سے کوئی تحفہ تک نہ وصول کرتے تھے۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ تو موسم گرما کی کڑی دھوپ میں اپنے مقروض کے سایہ دیوار سے بھی بچتے تھے۔ لیکن یہ بات بھی ریکارڈ پر ہے کہ شائیلاک (Shylock) ذہنیت رکھنے والے افراد اور اداروں کو چھوڑ کر مذہبی اور سیکولر حضرات کی اجتماعی دانش نے بھی ہر عہد میں سود کو بنظرِ حقارت ہی دیکھا ہے۔ افلاطون، مارٹن لوتھر، لارڈ کینز

اور کارل مارکس کے نام بطورِ مثال پیش کیے جا سکتے ہیں۔ اسلام سے پہلے سود تمام الہامی مذاہب میں بھی حرام تھا۔ خود ایام جاہلیت کے عرب بھی چونکہ مذہب و معیشت کی جدائی کے قائل تھے۔ اس لیے اخلاقی طور پر برا جانتے ہوئے بھی سودی معیشت کے قائل تھے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت بعثتِ نبوی ﷺ سے قبل کعبہ کی تعمیرِ نو کا واقعہ ہے۔ مکہ مکرمہ میں ایک سیلاب کی وجہ سے بیت اللہ کو بہت نقصان پہنچا تھا۔ چنانچہ قریش نے فیصلہ کیا کہ خانہ کعبہ کی تعمیر کے لیے تین قسم کی ناجائز کمائی خرچ نہ کی جائے گی۔ (۱) ظلم سے حاصل ہونے والی دولت (۲) حرام کاری کی دولت (۳) سودی کمائی۔

ذاتی ضرورت (Consumption) کے لیے لیے جانے والے قرض پر سود کو بخل، تنگ دلی، خود غرضی اور شقاوت سمجھنے والوں کی دُنیا میں کمی نہیں۔ البتہ کاروباری و تجارتی اغراض (Production) کے لیے راس المال پر سود کی ادائیگی کو بڑی شدت کے ساتھ جائز بلکہ ناگزیر کہا جاتا ہے۔ اسلام اس معاملے میں بھی کسی مصالحت کا قائل نہیں ہے۔ اوّل تو زرِ نقد قیمتوں کے تعین کا پیمانہ اور ایک وسیلۂ تجارت ہے۔ اسے مالِ تجارت قرار دے کر اس سے منافع اُٹھانا ایک خلافِ فطرت کام ہے جسے اسلام ہرگز روا نہیں رکھتا۔ پھر اسلام میں کسی ایسی بیع و شرا اور کاروبار کی اجازت نہیں جس میں ایک فریق کا نفع اور اس کی شرح تو معلوم و متعین ہو جبکہ دوسرا فریق مارکیٹ اور اس کے اُتار چڑھاؤ سے غیر معمولی نفع حاصل کرے یا ناقابل تلافی نقصان اُٹھائے یا مکمل نفع کی صورت میں بھی دونوں فریقوں کے نفع میں تفاوت انتہائی غیر متوازن ہو۔ حدیثِ پاک میں ہے الخراج بالضمان (ابوداؤد، ترمذی، نسائی)۔ یعنی ''جس چیز کا انسان فائدہ اُٹھانا چاہتا ہے وہ اُس کے نقصان کا ذمہ دار ہے۔'' سودی معیشت کا ایک اور نقصان یہ ہے کہ افراطِ زر کا باعث بھی بنتی ہے۔ مولانا محمد تقی عثمانی لکھتے ہیں۔

> ''سودی نظام کی خرابی اتنی نہیں ہے کہ وہ ڈیپازیٹر کو کم نفع دیتا ہے اور سرمایہ دار کو زیادہ، بلکہ اس کی خرابیاں عالم گیر نوعیت کی ہیں۔ اس سودی نظام کے ذریعے وہ

نظام وجود میں آتا ہے جس میں حقیقی اثاثوں کے بغیر فرضی روپیہ کا پھیلاؤ اتنا زیادہ بڑھ گیا ہے کہ اگر انھیں نوٹ تصور کر کے اُن نوٹوں کو لمبائی میں کھڑا کیا جائے تو وہ زمین سے لے کر چاند تک تین چکر کاٹ سکتے ہیں...... (اور یہ نوٹ بھی) وہ فرضی ہندسے ہیں جو صرف کمپیوٹروں نے پیدا کیے ہیں...... یہ صورت حال اثاثوں کے بغیر سودی قرضے جاری کرنے اور وہمی اشیا کی خرید و فروخت سے پیدا ہوئی ہے۔ جس میں پوری معیشت کو ایک ہوا بھرا غبارہ بنا کر رکھ دیا ہے جو کسی وقت بھی پھٹ کر تباہی مچا دیتا ہے۔" (۵۰)

قرآن حکیم میں سود کی حرمت کے ساتھ بلکہ اس سے پہلے اس کا متبادل بتا دیا گیا۔ احل اللہ البیع وحرم الربا یعنی "اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور ربا کو حرام کیا ہے۔" احادیث مبارکہ میں بھی تجارت کرنے کی صحیح شکلیں اور ربا سے بچنے کی تدابیر بیان کی گئی ہیں۔ کم از کم چھپن ایسے کاروبار ممنوع ہیں جن میں ربا موجود ہے یا شبہ ربا پایا جاتا ہے۔ (۵۱) ان میں سے دو مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ لین دین کی ایک شکل کو ربا الفضل کہتے ہیں۔ یہ کھلا سود تو نہیں لیکن سود کا چور دروازہ ضرور ہے۔ حدیث پاک میں اس کی سخت ممانعت ہے۔ حضرت ابوسعید خدریؓ، عبادہ بن صامتؓ اور حضرت ابوہریرہؓ سے مروی روایات کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "سونا سونے کے بدلے میں، چاندی، چاندی کے بدلے میں، کھجور، کھجور کے بدلے میں، گندم، گندم کے بدلے میں، جو، جو کے بدلے میں اور نمک، نمک کے بدلے میں بیچے جا سکتے ہیں بشرطیکہ برابر برابر ہوں اور دست بدست ہوں۔ جس نے زیادہ دیا یا زیادہ لیا تو سود کا لین دین کیا۔ (صحیح مسلم۔ کتاب المساقات والمزارعۃ)

۲۔ سود کی ایک اور غیر محسوس شکل سے آنحضرت ﷺ نے نہ صرف منع فرمایا بلکہ اس سے محفوظ رہنے کی تدبیر بھی بیان فرمائی۔ آپ ﷺ کے مقرر کردہ ایک عامل خیبر سے کھجور کی ایک

خاص قسم جنیب لے کر آئے۔ آپ ﷺ نے پوچھا: ''کیا خیبر کی ساری کھجوریں ایسی ہوتی ہیں؟'' انھوں نے کہا: ''نہیں یا رسول اللہ ﷺ! ہم عام کھجوروں کے دو صاع دے کر اس کھجور کا ایک صاع، یا عام کھجوروں کے تین صاع دے کر اس کے دو صاع خریدتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (ایسا نہ کرو کیونکہ یہ سود ہے) البتہ عام کھجوروں کو دراہم سے بیچ دو۔ پھر دراہم سے جنیب کھجور خرید لو۔ (صحیح بخاری، کتاب البیوع)

قرآن وحدیث میں پیش کردہ اصولوں کی روشنی میں فقہائے کرام نے غیر سودی کاروبار کی پندرہ شکلیں تجویز کی ہیں۔ ان میں سے مشارکہ، مضاربہ، مرابحہ، اجارہ، استصناع اور سلم وغیرہ مشہور ہیں۔ مشارکہ ومضاربہ غیر سودی بینکنگ کی شکل میں مروّج بھی ہیں۔ ان تمام طریقوں میں بینک کی حیثیت ایک تجارتی ادارے کی ہوتی ہے۔ مشارکہ میں تو مشترکہ سرمائے سے کاروبار کیا جاتا ہے اور سرمایہ کی مقدار کے مطابق نفع ونقصان میں شرکت ہوتی ہے۔ مضاربہ میں ایک فریق کے مال سے دوسرا فریق کاروبار کرتا ہے۔ معاہدے کی شرائط کے مطابق نفع تقسیم ہوتا ہے اور نقصان کی صورت میں رب المال کو سرمایہ کا نقصان ہوگا۔ مضارب کا نقصان یہ ہوگا کہ اُس کی محنت ضائع جائے گی۔ نبوت سے قبل حضور ﷺ سیدہ خدیجہؓ کے سرمائے سے کاروبار کیا کرتے تھے اور بعد از نبوت بہت سے صحابہ بھی شرکت کے علاوہ مضاربت کی بنیاد پر تجارت کرتے تھے۔

یہاں یہ ذکر بے جا نہ ہوگا کہ غیر سودی کاروبار انسانیت کے لیے تاقیامت محسنِ انسانیت ﷺ کا ایک اور انمول تحفہ ہے۔ عہدِ حاضر میں سود پر مبنی معیشت کے بھیانک نتائج سامنے آرہے ہیں۔ ۲۰۰۸ء سے عالمی معیشت میں رونما ہونے والی کساد بازاری (Depression) عالمی سرمایہ دارانہ نظام کے لیے خطرہ کی گھنٹی کی حیثیت رکھتی ہے۔ امریکی کانگرس کی ایک رپورٹ کے مطابق ۱۹۷۹ء سے ۲۰۰۷ء تک ایک فیصد ایلیٹ کلاس کی اوسطاً ماہانہ اجرت میں ۲۷۵ فیصد اضافہ ہوا جبکہ اسی عرصے میں ملک کی ننانوے فیصد آبادی کی اوسطاً ماہانہ اجرت میں محض ۳۹ فیصد اضافہ ہوا۔ ایک فیصد طبقے کے ہاتھ میں دولت کے ارتکاز کی اصل وجہ یہ ہے کہ بے تحاشا قرضوں اور اندھا دھند کرنسی

نوٹوں کے اجرا کی پشت پر حقیقی اثاثہ جات (Tangible Assets) موجود نہیں ہیں۔ معاشی افراتفری کی اس فضا میں اسلامی یا غیر سودی بینک اپنی ساکھ بچانے میں نمایاں طور پر کامیاب رہے۔ قرآن و سنت کا فہم رکھنے والوں کے لیے اس میں تعجب کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ روسی اشتراکیت کی ناکامی کے بعد یورپی و امریکی سرمایہ دارانہ نظام کی ناکامی بھی نوشتۂ دیوار ہے۔ ایک نظام میں خدا کا تصور مفقود ہے اور دوسرا نظام خوف خدا سے عاری ہے۔ ''خدا'' اور ''خوفِ خدا'' کو قرآنی اصطلاح میں ''ذکر'' کے جامع لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کسی بھی اقتصادی نظام میں ترقی و خوشحالی کے مروجہ اشاریے (Indicators) کتنے بھی خوش کن کیوں نہ ہوں، ''ذکر'' کے بغیر ایسی معیشت کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ○ (طٰہٰ: ۱۲۴)

''اور جو میرے ذکر سے منہ موڑے گا اس کے لیے دنیا میں تنگ زندگی ہوگی اور قیامت کے روز ہم اسے اندھا اٹھائیں گے۔''

فرضیت زکوٰۃ

فریضہ زکوٰۃ کی اہمیت اس امر سے بھی ظاہر ہے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی میں عاقل یا غیر عاقل، بالغ یا نابالغ، عورت یا مرد کی کوئی تمیز نہیں۔ ان میں سے ہر صاحب نصاب پر زکوٰۃ واجب ہے۔ حتیٰ کہ یتیم بھی مستثنیٰ نہیں جبکہ نماز غیر عاقل اور نابالغ پر فرض نہیں۔ عرب قبائل کے قبول اسلام کی راہ میں شرک و بت پرستی کے علاوہ ایک بہت بڑی رکاوٹ فرضیت زکوٰۃ بھی تھی۔ بعض صورتوں میں وہ نماز پڑھنے کی پیشکش بھی کر سکتے تھے لیکن زکوٰۃ کے نام تک سے بدکتے تھے۔ وہ ہر اس اقدام اور پالیسی کے مخالف تھے جس کا مقصد غریب و امیر کے درمیان حائل مصنوعی حجابات کو دور کرنا ہو۔ رئیسانِ قریش نے تو یہ شرط بھی عائد کر دی تھی کہ اگر رسول اکرم ﷺ کے پاس ہمہ وقت موجود غریب اور مفلوک الحال قسم کے لوگوں کو الگ تھلگ کر دیا جائے تو دائرۂ اسلام میں داخل ہونے پر غور کیا جا

سکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس پیشکش کو ابتدا سے ہی ٹھکرا دیا تھا۔ ظاہر ہے "السابقون الاولون" کی عزت وتوقیر قبول اسلام میں سبقت لے جانے کی بنیاد پر تھی اور آنحضور ﷺ کی تعلیمات کے مطابق جس کا عمل اسے پیچھے چھوڑ دے، اس کا نسب اسے آگے نہیں بڑھا سکتا۔

بہر حال حبِ مال ہی وہ اخلاقی برائی ہے، جو زر پرستوں کے قبول اسلام کی راہ میں رکاوٹ بن کر کھڑی ہو گئی۔ "حبِ مال" کی مذمت کے لیے ہی قرآن حکیم میں بہت سے مقامات پر انتہائی تہدید آمیز انداز بیاں اختیار کیا گیا۔ ایک نہایت اہم مقام سورۃ الحاقۃ میں ملتا ہے جہاں روز قیامت غریبوں کا خون چوسنے والوں کے ہولناک انجام کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ۝ ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ۝ ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ۝ اِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ۝ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ۝ (الحاقۃ: ۳۰۔۳۴)

"(فرشتوں کو حکم ہوگا) پکڑ لو اس کو اور اس کی گردن میں طوق ڈال دو، پھر اسے دوزخ میں جھونک دو۔ پھر ستر گز لمبے زنجیر میں اس کو جکڑ دو۔ بے شک یہ (بدبخت) ایمان نہیں لاتا تھا، اللہ پر جو بزرگ (و برتر) ہے اور نہ ترغیب دیتا تھا مسکین کو کھانا کھلانے کی۔"

جو قبائل محض اسلام کی سیاسی حاکمیت سے مرعوب ہو کر اسلام میں داخل ہو گئے تھے، وصالِ نبوی ﷺ کے بعد انھوں نے بغاوت کرتے ہوئے سب سے پہلے زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کیا۔ ان کے ساتھ کسی قسم کی نرمی اور کسی وقتی سمجھوتے کو سیدنا حضرت عمر فاروق ؓ کی رائے کے باوجود درخور اعتنا نہ سمجھا گیا۔ خلیفۂ اول سیدنا حضرت ابو بکر صدیق ؓ نے مانعین زکوٰۃ کے خلاف ایسے جہاد کیا جیسے کسی بھی دوسرے باغی کافر کے خلاف کیا جاتا ہے۔ بلاشبہ اسلام دنیا کا پہلا مذہب ہے، جس نے غریبوں کے حقوق کی خاطر امیروں کے خلاف ریاستی سطح پر مسلح جنگ کی۔ (۵۲)

زکوٰۃ بالعموم اموالِ ظاہرہ یعنی نقد، سونا چاندی، مویشی اور جایدادِ منقولہ وغیر منقولہ پر عائد ہوتی

ہے اور اسلامی ریاست زکوٰۃ کی وصولی اور تقسیم کا نظام قائم کرنے کی پابند ہے۔ تاہم زکوٰۃ ایک ٹیکس نہیں بلکہ عبادت ہے۔ اس لیے مسلمانوں سے بجا طور پر توقع کی جاتی ہے کہ وہ خود اموالِ باطنہ سے بھی اصولِ خود تشخیصی (Self Assessment) کے ذریعے اس عبادت کے تقاضوں کو پورا کریں گے۔ قرآنِ حکیم کی مشہور آیت البر (البقرۃ) میں نیکی کا جو انقلابی تصور پیش کیا گیا ہے، اس کے مطابق بھی عبادت بنیادی طور پر محض کسی ظاہری رسم (Ritual) کا نام نہیں ہے۔ عقائد اور عبادات کے ساتھ حقوق العباد کے بغیر کوئی شخص بھی اسلام میں نیکی کے مطلوبہ تصور اور معیار تک نہیں پہنچ سکتا۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ جس طرح غلاموں کے بنیادی حقوق کے بارے میں قرآن و سنت کی ہدایات کا یہ مطلب بالکل نہیں کہ اسلام غلامی کے ادارے کو باقی رکھنا چاہتا ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ کی فرضیت کا بھی یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اسلام معاشرے میں ایک محتاج اور دستِ نگر طبقہ کی مستقل موجودگی کا خواہاں ہے۔ غلاموں سے متعلق اسلامی قانون سازی کا اصل مقصد ایک ترقی پذیر اور ترقی یافتہ سماج کے روئے زیبا پر موجود اس سیاہ دھبے کا بتدریج خاتمہ تھا۔ زکوٰۃ کا اصل ہدف بھی مصنوعی اونچ نیچ سے پاک ایک منصفانہ سماج کا قیام ہے۔ ایک مشہور حدیثِ پاک اس باب میں شاہدِ عادل ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

''خیرات کیا کرو۔ کیونکہ ایک ایسا زمانہ آنے والا ہے کہ آدمی خیرات لے کر چلے گا اور کوئی شخص ایسا نہ ملے گا جو اِس کو قبول کرلے۔ جس کو دینے لگے گا، وہ کہے گا۔ اگر تو کل لاتا تو میں لے لیتا۔ آج تو مجھے اِس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' (بخاری)

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ محروم طبقات کی دادرسی کے لیے اسلام نے محض ادائیگی زکوٰۃ پر اکتفا نہیں کیا۔ اگر زکوٰۃ کے ذریعے بوجوہ عمومی ضروریات پوری نہ ہوں تو صاحبِ مال کے پاس موجود مال تو پاک ہو جائے گا لیکن پاک مال سے انفاق فی سبیل اللہ کی راہیں بدستور کھلی رہیں گی۔ بعض مفسرین نے تو آیت ''العفو'' کو بھی پاک مال کے معنوں میں لیا ہے۔ ان کے نزدیک مذکورہ آیت کا منشا یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں پاک مال خرچ کرو۔ یہاں اس تاویل کی چنداں

ضرورت نہ تھی، اس لیے کہ خود حدیث پاک سے واضح ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ان فی المال حقا سوی الزکوۃ

''لوگوں کے مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی ایک حق ہے۔''

سید مودودیؒ نے اس سلسلۂ کلام میں بجا طور پر کہا ہے: ''جس طرح چند رکعت نماز فرض ادا کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ بس یہ رکعتیں پڑھتے وقت ہی اللہ کو یاد کرو اور باقی سارے وقتوں میں اس کو بھول جاؤ، اسی طرح مال کی ایک چھوٹی سی مقدار اللہ کی راہ میں صرف کرنا، جو فرض کیا گیا ہے، اس کا مطلب بھی یہ نہیں کہ جن کے پاس اتنا مال ہو، بس انھی کو راہِ خدا میں صرف کرنا چاہیے اور جو اس سے کم مال رکھتے ہوں، انھیں اپنی مٹھیاں بھینچ لینی چاہییں۔ اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ مالداروں پر جتنی زکوٰۃ فرض کی گئی ہے، بس وہ اتنا ہی اللہ کی راہ میں صرف کریں اور اس کے بعد کوئی ضرورت مند آئے تو اسے جھڑک دیں۔''(۵۳)

ویسے بھی جب قرآن میں زکوٰۃ کے چند مخصوص مصارف بیان کر دیے گئے ہیں تو اس سے خود بخود یہ مفہوم نکلتا ہے کہ ان مصارف سے ہٹ کر ریاست وحکومت یا عوام کی دوسری ضروریات کے لیے حکومت لوگوں پر مختلف قسم کے ٹیکس عائد کر سکتی ہے۔ زکوٰۃ کا یہ نظام معاشی اور پیداواری سرگرمیوں کے لیے ایک زبردست محرک کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہر صاحبِ مال کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مال اگر بے کار پڑا رہا تو ہر سال زکوٰۃ ادا کرتے کرتے یہ مال ختم ہو جائے گا۔ یقیناً ایسا مالدار شخص اپنے مال کو سرمایہ کاری میں لگائے گا۔ حضور ﷺ نے تو یتیم کے مال کے ولی کو بھی ہدایت فرمائی ہے: ''خبردار جو شخص کسی ایسے یتیم کا ولی ہو جو مال رکھتا ہے، اسے چاہیے کہ اس کے مال سے کوئی کاروبار کرے اور اسے یونھی نہ رکھ چھوڑے کہ اس کا سارا مال زکوٰۃ کھا جائے۔'' (ترمذی۔ بیہقی) زکوٰۃ اور مصارفِ زکوٰۃ کی اس بحث سے ظاہر ہے کہ زکوٰۃ نکالنے سے اشیا کی طلب ورسد میں بھی اضافہ ہوگا اور بالآخر قومی آمدنی میں اضافہ سے عمومی خوشحالی کا دور دورہ ہوگا۔ چنانچہ زکوٰۃ کے لفظی معانی ''نمو'' کے ہیں اور زکوٰۃ کو زکوٰۃ اسی لیے کہتے ہیں کہ زکوٰۃ کی ادائیگی سے مال گھٹتا نہیں بلکہ بڑھتا ہے۔

ترغیب انفاق

حضور ﷺ کے معاشی دستور العمل کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ غربت کے خاتمہ (Alleviation of Poverty) کے لیے نہ تو محض نصیحت اور فہمائش سے کام لیا گیا ہے اور نہ صرف قانونی اقدامات کا سہارا لیا گیا ہے ۔ اسلام میں فلاحی معاشرہ کے قیام کے لیے امداد باہمی اور کفالتِ عامہ کا ایک وسیع نیٹ ورک موجود ہے ۔ اگر اخلاقی ہدایات اور قانونی تدابیر کے باوجود بھی کسی معاشرے میں لوگ غربت کی لکیر (Poverty Line) سے نیچے زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوں تو امرا کی بے حسی کا نوحہ پڑھتے رہنے کی ضرورت نہیں ۔ حکومت خود بھی مداخلت کر کے غیر فطری فرق کو مٹا سکتی ہے ۔ اسلام شخصی ملکیت کا اثبات کرتا ہے لیکن ذاتی و شخصی ملکیت کو مقدس گائے نہیں سمجھتا ۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے متعلق ایک مشہور حدیث میں ہے کہ کشتی کے بالائی حصے والے لوگ نیچے والے لوگوں کو پانی لینے سے روکتے ہیں ۔ نیچے والے لوگ ردِ عمل کے طور پر کشتی میں سوراخ کر کے سمندر سے پانی حاصل کرنے کے درپے ہیں ۔ اگر اوپر والے لوگ نیچے والے لوگوں کا ہاتھ نہ پکڑیں تو سب ڈوب جائیں گے ۔ اس حدیث پاک کے بنیادی مفہوم پر بہت کم توجہ دی گئی ہے ۔ نیچے حصے والوں کو روکنے کا مطلب صرف کشتی میں سوراخ کرنے سے روکنا نہیں ۔ اصل مطلب اوپر والے لوگوں (امرا) کے پاس موجود وسائل رزق تک نیچے والے لوگوں (غربا) کو رسائی دینا ہے ۔ امام ابن حزمؒ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ امرا وسائل رزق پر قابض ہوں تو غریب لوگ اپنے حقوق ان سے زبردستی چھین سکتے ہیں ۔ اس رائے پر اس لیے اجماع نہیں ہوا کہ اس سے معاشرے میں انارکی پیدا ہو سکتی ہے ۔ یہ کام حکومت وقت کا ہے کہ وہ اس صورت حال کو بدلنے کے لیے اپنے اختیارات استعمال کرے ۔ چنانچہ علمائے کرام کی تصریحات کے مطابق عوامی استحصال کا باعث بننے والی کسی صنعت یا جایداد کو قومی ملکیت میں لیا جا سکتا ہے ۔ (۵۴) اسی طرح اسلام انسان کو ایک معاشی حیوان یا معاشی مشین سمجھنے سے انکاری ہے ۔ معاشی انصاف کے لیے اسلامی قانون کے پس منظر و پیش منظر میں اخلاقی احکامات کی کارفرمائی صاف نظر آتی ہے ۔ اس کا واضح مطلب ہے کہ

سیاسیات کی طرح حضور ﷺ نے معاشیات کو بھی ایک معیاری علم (Normative Science) بنا دیا۔ قرآن و حدیث کے واضح احکامات اسلامی معاشیات کے اسی عوام دوست مزاج کی عکاسی کرتے ہیں۔ ارشادِ ربانی ہے:

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ قُلِ الْعَفْوَ ؕ (البقرۃ:۲۱۹)

''اور پوچھتے ہیں آپ سے، کیا خرچ کریں۔ فرمائیے جو ضرورت سے زائد ہو۔''

بعض مفسرین کے نزدیک اس آیت کا حکم آیتِ زکوٰۃ سے منسوخ ہے لیکن دوسرے مفسرین کے نزدیک آیت زکوٰۃ کا تعلق فریضۂ زکوٰۃ سے ہے جبکہ آیت العفو کا تعلق صدقاتِ نافلہ سے ہے۔ آیت مبارکہ کے ساتھ اگر درج ذیل احادیث کو شامل کر لیا جائے تو حضور ﷺ کے معاشی اسوۂ حسنہ کی سچی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ اس تصویر کے مطابق انسان کا معاشی مسئلہ اخلاقی اصولوں اور روحانی قدروں سے مکمل طور پر مربوط ہے۔

۱۔ ''جس بستی میں ایک بھی شخص بھوکا رہا، اس بستی پر سے اللہ تعالیٰ نے اپنی حفاظت کا ذمہ اُٹھا لیا۔'' (مسند امام احمد بن حنبل)

۲۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں ''غریبوں اور بیواؤں کے لیے جدوجہد کرنے والا وہی درجہ رکھتا ہے جو اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کا یا رات بھر نماز پڑھنے اور دن بھر روزہ رکھنے والا کا ہے۔'' (مسلم۔ بخاری۔ ترمذی)

۳۔ ''حضرت ابوسعید خدریؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: جس کے پاس زائد سواری ہو وہ اسے دے دے جس کے پاس سواری نہ ہو اور جس کے پاس ضرورت سے زیادہ زادِ راہ ہو وہ اسے دے دے جس کے پاس زادِ راہ نہ ہو۔ حضرت ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ اس طرح مختلف انواع کے مال کا ذکر فرماتے رہے حتیٰ کہ ہم نے خیال کیا ہم میں سے کسی کو اپنے فاضل مال پر حق نہیں۔'' (مسلم۔ ابوداؤد)

۴۔ حضور ﷺ کو اشعری قبیلے کے متعلق بتایا گیا کہ جب کبھی ان کے ہاں قحط کی صورت پیدا

ہوتی ہے تو وہ اپنی اشیاے خوردنی کو ایک جگہ اکٹھی کر کے برابر برابر تقسیم کر لیتے ہیں۔
آپ ﷺ نے ان کی تحسین کی اور فرمایا: "وہ لوگ مجھ سے ہیں اور میں اُن میں سے ہوں۔"
(بخاری ومسلم)

سیرتِ طیبہ کا مطالعہ محض معاشی نقطۂ نگاہ سے کیا جائے تو بظاہر یوں محسوس ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ساری زندگی لوگوں کی معاشی فلاح و بہبود کی فکر کرنے اور اس کے لیے عملی تدابیر اختیار کرنے میں ہی گزار دی۔ یہی تاثر حیاتِ مبارکہ کے سیاسی، قانونی، عائلی اور کسی بھی دوسرے پہلو پر غور و تدبر کرنے سے اُبھر کر سامنے آتا ہے۔ظاہر ہے بذاتِ خود تجارت کرنا، ازواجِ مطہرات کے نان ونفقہ کا بندوبست کرنا، اصحابِ صفہ کی ضروریات کی فراہمی، ہر دم خطرات میں گھری ایک نئی ریاست اور اس کی انتظامی ضروریات کے لیے ذرائع آمدنی و اخراجات کی تنظیم، غزوات وسرایہ کے لیے افرادی قوت اور مال واسباب واسلحہ کی تیاری، جنگ وصلح سے حاصل ہونے والے اموالِ غنیمت اور فے کی تقسیم اور زمانۂ امن میں زکوٰۃ وعشر اور صدقاتِ نافلہ کے ذریعے عوامی خوشحالی کے ہدف کا حصول اور اس نوع کی دوسری سرگرمیاں ایک جامع معاشی منصوبہ بندی اور قابلِ عمل پالیسیوں کے تسلسل کا تقاضا کرتی ہیں۔معاشی زندگی کی ان کثیر الجہتی مصروفیات کے باوجود مجال ہے جو یہاں اپنے خالق اور اس کی مخلوق کے حقوق کی ادائیگی کرتے ہوئے زندگی کا کوئی دوسرا شعبہ نظر انداز ہوا ہو۔ بلاشبہ حضور ﷺ ہی کی ذات پوری انسانیت کے لیے واجب الاتباع ہے۔ اپنے اسوۂ حسنہ سے آپ ﷺ نے عملی درس دیا کہ معاش و معاد میں کوئی تعارض نہیں۔معاشی سرگرمی کے باوجود انسان اخلاق و روحانیت کے بلندترین مقام پر فائز ہوسکتا ہے۔
کنول کا پھول مکمل طور پر زیرِآب رہ کر بھی سطحِ آب سے بلند ہوتا ہے۔(۵۵)

اللّٰھم صل علی محمد و علی آل محمد

مراجع وحواشی

۱۔ مفتی محمد شفیعؒ ...... معارف القرآن جلد پنجم تفسیر سورۃ یوسف ...... ادارہ المعارف کراچی

۲۔ پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ ...... ضیاء القرآن، جلد دوم تفسیر سورۃ یوسف ...... ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور

۳۔ مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ ...... سیرت المصطفیٰ ﷺ جلد اول (بحوالہ ابن حجر علی بن احمد العسقلانی ...... الاصابہ) ...... مکتبہ الحسن اردو بازار لاہور

۴۔ ایضاً

۵۔ مولانا رومؒ کا فارسی شعر ہے۔(1927)

آب اندر زیر کشتی پشتی است
آب در کشتی ہلاک کشتی است

۶۔ ڈی لیسی اولیری ...... Arabia before Muhammad

London.Co& Trench Trubner,Kegan Paul.(1927)

۷۔ برنارڈ لیوس ...... The Arabs in History

New York,Oxford University Press London. (1993)

۸۔ مغربی ادب میں اس کے حوالے ولیم شیکسپیر کے المیہ ڈرامے Macbeth میں Perfumes of Arabia اور جان ملٹن کے ہاں Spicy Shores of Araby the blest کے الفاظ میں ملتے ہیں۔ پوپ اپنی مشہور نظم The Rape of the lock کی ہیروئین Belinda کے بناؤ سنگھار کے لیے موجود آرائشی اشیا کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:

This casket India's glowing gems unlocks

And all Arabia breathes from yonder box

(Canto,I - 133-134)

۹۔ ڈی لیسی اولیری ...... Arabia before Muhammad

۱۰۔ رابرٹ ایل گولیک ...... The Educator,Mohammad

Institute of Islamic Culture Lahore. (1953)

۱۱۔ محمد عالم مختار حق...... نگارشاتِ ڈاکٹر محمد حمید اللہ (حصہ دوم)...... مضمون: عہدِ نبوی ﷺ کا نظامِ تعلیم

۱۲۔ ایضاً

۱۳۔ قرآن حکیم میں اسلامی ریاست کے چار بنیادی مقاصد بیان کیے گئے ہیں۔

"یہ وہ لوگ ہیں جنھیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے منع کریں گے۔" (الحج: ۶۱)

۱۴۔ ڈاکٹر نور محمد غفاری...... نبی کریم ﷺ کی معاشی زندگی (باب ۷۔ نبی کریم ﷺ کا مالیاتی نظام) ۱۹۸۸ء دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری لاہور

۱۵۔ ڈاکٹر اسرار احمد...... اسلام کا معاشی نظام اور اسلامی ریاست کا نظام محاصل مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۱۶۔ امام شافعیؒ کے بقول وقف اسلام اور مسلمانوں کی منفرد خصوصیات میں سے ہے۔ عباسی دور اور ترکمانِ عثمان میں نظامِ اوقاف نے ایک باقاعدہ معاشی، معاشرتی اور ثقافتی ادارہ کی حیثیت اختیار کر لی جس نے علم و فن، رفاہِ عامہ، خدمتِ خلق اور امدادِ باہمی کی قابلِ رشک روایات قائم کیں۔

۱۷۔ ڈاکٹر نور محمد غفاری...... نبی کریم ﷺ کی معاشی زندگی (باب ۷۔ نبی کریم ﷺ کا مالیاتی نظام)

۱۸۔ مولانا ابوالبرکات عبدالرؤف...... اصح السیر...... مجلس نشریاتِ اسلام کراچی

۱۹۔ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ...... معاشیات اسلام (باب ۴۔ اسلامی نظمِ معیشت کے اصول و مقاصد) ادارہ معارف اسلامی کراچی / اسلامی پبلی کیشنز لمیٹڈ

۲۰۔ ابن القیمؒ...... زاد المعاد۔ جلد ۳...... موسسۃ الرسالہ بیروت

۲۱۔ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ...... معاشیات اسلام (باب ۴۔ اسلامی نظمِ معیشت کے اصول و مقاصد)

۲۲۔ ابن القیمؒ...... زاد المعاد۔ جلد ۳

۲۳۔ (الف) امام ابو یوسف...... کتاب الخراج...... منشورات مکتبہ الریاض الحدیثہ

(ب) ابو بکر جصاص...... احکام القرآن

(ج) سید مودودیؒ...... تفہیم القرآن

۲۴۔ کارل بروکلیمان...... History of Islamic People

Translated from German by Carmichool and Moshe Pelmann

Routledge and Kegan. 1949

منٹگمری ڈبلیو واٹ ...... Muhammad at Madina

۲۵۔ (الف) واقدی ...... المغازی ...... دار الکتب العلمیہ بیروت

(ب) علامہ محمد ابن سعد ...... طبقات ...... دار الاحیاء التراث بیروت

۲۶۔ جان بیگٹ گلب ...... The Great Conqests of the Arabs

Hodder and Stroughton London (1963)

۲۷۔ محمد بن اسحق ...... السیرۃ

۲۸۔ اس سلسلے میں دو جدید مصنفین کی تحقیقی کتب کا مطالعہ مفید رہے گا۔

(الف) برکات احمد ...... The Jews of Madina

(ب) ڈبلیو این عرفات ...... New Light on the story of Banu Quraiza

۲۹۔ ابن کثیر ...... البدایہ والنہایہ

۳۰۔ نعیم صدیقی ...... محسن انسانیت ﷺ

۳۱۔ ابوداؤد۔ باب المساقات

۳۲۔ ڈاکٹر یٰسین مظہر صدیقی ...... غزواتِ نبوی ﷺ کے اقتصادی پہلو ...... مشتاق بک کارنر، اردو بازار لاہور

۳۳۔ ایضاً

۳۴۔ ایضاً

۳۵۔ مولانا عبدالمتین ہاشمیؒ ...... مقالاتِ ہاشمی۔ مضمون: رسول اللہ ﷺ کی معاشی تعلیمات، دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری لاہور۔

۳۶۔ ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ ...... محاضراتِ تجارت و معیشت ...... الفیصل ناشران لاہور

۳۷۔ ایضاً

۳۸۔ مفتی محمد شفیع ...... تفسیر معارف القرآن

۳۹۔ ابن خلدون ...... مقدمہ ابن خلدون اول و دوم ...... نفیس اکیڈیمی کراچی

۴۰۔ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ ...... تفہیم القرآن جلد سوم۔ تفسیر سورۃ القصص حاشیہ ۱۹ بحوالہ تلمود ص ۱۲۹

۴۱۔ مولانا محمد ادریس کاندھلوی ...... سیرت المصطفیٰ ﷺ جلد اول

۴۲۔ حافظ ابن کثیر ...... البدایہ والنہایہ جلد سوم

۴۳۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی ...... تفہیم القرآن جلد سوم۔ تفسیر سورۃ القصص

۴۴۔ (الف) نجات اللہ صدیقی ...... Dialogue in Islamic Economics

(95#. Sr:Letter from Khurshid Ahmad to Nijatullah)

Institute of Policy Studies Islamic Foundation Islamabad

(ب) شفقت مقبول ...... مضمون: "منصفانہ اجرت کا اسلامی تصور"۔ (مجلہ تحقیق معاشرتی علوم ۲۰۱۰ء)

۴۵۔ ایضاً

۴۶۔ ابوعبید قاسم بن سلام ...... کتاب الاموال (ترجمہ) ...... علمی پرنٹنگ پریس لاہور

۴۷۔ مولانا عبدالرحمٰن کیلانی ...... احکام تجارت اور لین دین کے مسائل ...... مکتبہ السلام وسن پورہ لاہور

۴۸۔ ایضاً

۴۹۔ ابوعبید قاسم بن سلام ...... کتاب الاموال

۵۰۔ مفتی محمد تقی عثمانی ...... غیر سودی بینکاری (۲۰۰۹ء) ...... معارف القرآن کراچی

۵۱۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی ...... محاضرات تجارت و معیشت (۲۰۰۷ء) ...... الفیصل ناشران لاہور

۵۲۔ علامہ یوسف قرضاوی ...... دین میں ترجیحات ترجمہ گل زادہ شیرپاؤ (۲۰۰۸ء) ...... منشورات لاہور

۵۳۔ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ ...... معاشیاتِ اسلام

۵۴۔ مولانا مودودی اصولی طور پر قومیانے کی پالیسی (Nationalisation) کے سخت مخالف ہیں لیکن ان کا نظریہ بھی یہ ہے کہ "کسی تجارتی شعبے کے بارے میں اگر تجربے سے معلوم ہو کہ اُسے شخصی تحویل میں رکھ کر فروغ دینا ممکن ہی نہیں ہے تو ایسی صورت میں اُسے ریاست کے کنٹرول میں لیا جا سکتا ہے۔" (معاشیاتِ اسلام۔ باب نمبر ۶۔ ملکیت زمین کا مسئلہ)۔ اسی طرح مولانا گوہر رحمان لکھتے ہیں "اگر بالفرض مذکورہ تمام ذریعے سے مطلوبہ سرمایہ نہ مل سکا اور ضرورت حقیقی اور فوری ہو تو مطلوبہ قرض سرمایہ داروں اور جاگیرداروں سے زبردستی لینے کا حق بھی حکومت کو حاصل ہے۔ اس لیے کہ مصلحت عامہ کو مصلحت خاصہ پر ترجیح حاصل ہے۔" (حرمتِ سود)

۵۵۔ ممتاز حسین ...... ادب و شعور

*۔ [ص ۱۰۸] = حضرت صہیب رومی نے اپنے زادِ سفر کے ساتھ ہجرت مدینہ کا ارادہ کیا تو مشرکین مکہ نے آپ کا راستہ روک لیا اور کہا: "یہاں فقیر اور محتاج ہو کر آئے تھے اب تم غنی اور صاحب مال ہو گئے ہو۔ اس مال مطاع کے ساتھ تو ہم تمھیں مدینہ ہرگز جانے نہ دیں گے۔" جب انھوں نے اپنا سارا مال ہجرت مدینہ کے بدلے میں ان کے حوالے کر دیا تو انھیں جانے کی اجازت دے دی گئی۔

رسولِ عربی ﷺ اور علمِ نفسیات

نفسیات کے بیشتر اصولوں کو انسان ازمنۂ قدیم ہی سے روزمرہ زندگی میں استعمال کرتا چلا آ رہا ہے۔ نفسیات سے یہ تعلق کم و بیش غیر شعوری اور غیر سائنسی تھا۔ بعد ازاں اس علم کا مطالعہ، فلسفہ، عضویات اور طبیعیات کی محض ایک شاخ کے طور پر کیا گیا۔ انیسویں صدی کے آخری عشروں کے درمیان جرمنی اور یو ایس اے میں نفسیات کی تجربہ گاہیں قائم ہوئیں۔ ان تجربہ گاہوں میں آموزش، حافظہ، ذہانت اور شخصیت وغیرہ پر جو تجربات کیے گئے، اس سے نفسیات نے ایک باقاعدہ سائنس کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ آج حالت یہ ہے کہ زندگی کا شاید ہی کوئی شعبہ نفسیاتی رہنمائی سے بے نیاز ہو۔ ادب و ثقافت، صنعت و حرفت، موزوں افراد کے انتخاب اور پیچیدہ ذہنی امراض کے علاج تک میں اس علم کا سکہ چلتا ہے۔ ماہرین نفسیات کا دعویٰ ہے کہ ہم بے خیالی میں زمین پر جو الٹی سیدھی لکیریں کھینچتے ہیں، ان میں بھی اپنی کسی نفسیاتی اُلجھن کو منتقل کر رہے ہوتے ہیں۔ نفسیات کا یہ "توسیع پسندانہ" رجحان دلچسپ ہونے کے باوجود گمراہ کن بھی ہے۔ خصوصاً توحید، رسالت اور آخرت جیسے حقائق کی نفسیاتی تعبیر کرتے ہوئے بعض ماہرین نفسیات نے اپنی حدود سے بے جا تجاوز کیا ہے۔

دعویٰ کیا گیا کہ مذہب ایک بے کس و مظلوم انسان کا محض جذباتی سہارا ہے۔ ہم ایک اعلیٰ و برتر ہستی اور ایک ایسے جہانِ نو کی آرزو میں جیتے ہیں جہاں ہماری جملہ محرومیوں کا مداوا ممکن ہے۔ گویا ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ ہماری تمنائی سوچ Wishful Thinking کی پیداوار ہیں۔ مذہب کے خلاف منکرین کا یہ ایک پرانا استدلال ہے۔ مذہب انسان کا قدیم ترین مونس و دمساز ہے۔ قطع نظر اس سے کہ یہ انسان کی کن تمدنی، جذباتی اور فطری ضرورتوں کو پورا کرتا ہے اور سماجی استحکام میں اس نے کتنا فعال کردار ادا کیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ دلیل لا مذہبیت کے خلاف

بھی دی جاسکتی ہے۔ پھر غیر مذہبی رویہ یوں کر معقول سمجھا جاسکتا ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ ایک ظالم و جابر انسان مکافاتِ عمل سے فرار چاہتا ہے؟ اپنے اخلاقی جرائم کے لازمی نتائج سے خائف ایسا شخص وجود باری تعالیٰ اور حیات بعد الموت کی "منطقی" بنیاد پر مخالفت کا ڈھونگ رچاتا ہے۔ یہ بات دعوے کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اللہ اور یوم آخرت کا انکار دراصل امکانِ خدا و آخرت کے خلاف مجرم ضمیر کی مدافعتی میکانکیت Defence Mechanism کا شاخسانہ ہے۔

عقیدۂ توحید اور آخرت کی طرح رسالت کے عقیدہ پر بھی نفسیات کی آڑ میں رکیک حملے کیے گئے ہیں۔ بعض نام نہاد ماہرین نفسیات نے وحی کو ایک طرح کی داخلی کیفیت قرار دے کر اسے شاعرانہ تجربہ اور صوفیانہ واردات کے حوالے سے بیان کرنے کی جسارت کر ڈالی۔ اول تو پیغمبرانہ واردات جیسے مابعد الطبیعاتی مسئلہ کی تشریح کے لیے نفسیات کو گھسیٹ لانا علمی بددیانتی ہے۔ پھر وحی کو فنکارانہ اور صوفیانہ تجربے کی محض ارتقائی شکل قرار دینا بھی دلیل کم نظری ہے۔ یہ بات نفسیات کے مسلّمات میں داخل ہے کہ ہم کسی دوسرے انسان کی داخلی کیفیات کا حقیقی احاطہ کبھی نہیں کرسکتے۔ اس لیے کہ ذہنی کیفیت کوئی جامد چیز نہیں، ایک متحرک رو ہے۔ تجزیے کے اُصول اعادہ (Retrospection) کے ذریعے بھی ہم ذہنی کیفیات کا صرف جزوی مطالعہ ہی کرسکتے ہیں لیکن اصل سوال یہ ہے کہ ہم اُن کیفیات کا باطنی مشاہدہ کیونکر کرسکتے ہیں جن سے ہم خود کبھی دوچار نہ ہوئے ہوں۔ وحی ایک انتہائی مخصوص اور منفرد ذریعۂ علم ہے۔ وحی کی نفسیاتی توجیہ نفسیات اور وحی دونوں کے ساتھ سنگین مذاق ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص کرکٹ کے کھیل کی کمنٹری ہاکی کے لیے مخصوص زبان میں کرے یا جیسے مادر زاد اندھوں کی مجلس شوریٰ یہ طے کرنے بیٹھ جائے کہ سرخ رنگ کیسا ہوتا ہے۔

اس طرزِ فکر کے ساتھ بعض مغربی ماہرین نفسیات جب وحی محمدی ﷺ کے "نفسیاتی منابع" کی تلاش میں نکلتے ہیں تو حسبِ توقع قدم قدم پر ٹھوکر کھاتے ہیں۔ نزول وحی کے وقت حضور ﷺ پر جو کیفیت طاری ہوتی تھی، اس کو یہ لوگ خاکم بدہن مرگی (Epilepsy) کا نام دیتے ہیں۔ تاریخِ

ادیان کا ایک ادنیٰ طالب علم بھی جانتا ہے کہ گذشتہ انبیا علیہم السلام کے خلاف بھی ایسے ہی بے سروپا الزامات منکرین رسالت کی جانب سے لگائے گئے تھے۔ اُن کے فہم سے یہ بات بالا تر تھی کہ کوئی صحیح الدماغ انسان مادی طاقت کے تمام سرچشموں کے خلاف غیر مصالحانہ جنگ کیسے لڑ سکتا ہے۔ چنانچہ حضور اکرم ﷺ کے صحابہؓ کو کفار نے اپنی "نفسیاتی تحقیق" کے نتائج پیش کرتے ہوئے کہا تھا:

وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ۝ (الفرقان: ۸)

"اور ان ظالموں نے کہا کہ تم لوگ تو بس ایک سحر زدہ شخص کے پیچھے لگ گئے ہو۔"

قدیم جاہلیت کے یہ "جدید مومن" اس قدر سادہ بات نہ جان سکے کہ ذہنی مریض کبھی صحت مند انقلاب برپا نہیں کر سکتے۔ حضور اکرم ﷺ کی حیات طیبہ اور آپ ﷺ کی انقلابی تعلیمات کو جاننے والا کوئی شخص بقائمی ہوش وحواس آپ ﷺ کو مریض قرار نہیں دے سکتا۔ منٹگمری ڈبلیو واٹ نے ایسے ہی حواس باختہ مستشرقین کی خرافات پر ان الفاظ میں گرفت کی ہے:

"مرگی انسان کے جسمانی اور ذہنی افلاس کا باعث بنتی ہے۔ محمد (ﷺ) کی شخصیت میں اس قسم کے انحطاط کی کوئی علامت نہیں ملتی۔ اس کے برعکس زندگی کے آخری لمحے تک آپ (ﷺ) نے اپنے جملہ قویٰ پر حیرت انگیز حد تک غلبہ قائم رکھا۔"(۱)

سب سے اہم بات یہ ہے کہ ذہنی مریض ہی نہیں، ایک نارمل انسان کے رشحاتِ فکر میں بھی شخصی رجحانات اور جذباتی افراط وتفریط کی جھلک نمایاں ہوتی ہے۔ قرآن حکیم ایسے نقائص سے پاک اور منزہ ہے۔ قرآن نے حلال وحرام اور خیر وشر کا جو معیار پیش کیا ہے، وہ عقلِ سلیم کی بنیاد پر چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی انسان خواہ کتنا ہی عبقری ہو، اس کے وجدانی احساسات اور مشاہدات میں وہ معروضی صداقت (Objective Validity) کبھی پیدا نہیں ہو سکتی جو وحی محمدی ﷺ کا خاصہ ہے۔ اس کی وجہ بجز اس کے کیا ہے کہ قرآن سرے سے انسانی کاوش ہے ہی نہیں۔ یہ اس ربِ کائنات کا کلام ہے جو وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ہے۔ (یوسف: ۷۶)

بعض مستشرقین نے وحی محمدی ﷺ کے ایک اور ممکنہ ''ماخذ'' کے بارے میں زورِ قلم صرف کیا ہے۔ ان کی ''نادر تحقیقات'' کا خلاصہ یہ ہے کہ نبوت سے پہلے حضور اکرم ﷺ کی ملاقات سفر شام کے دوران میں بحیرا راہب سے ہو چکی تھی اور اسی وقت آپ ﷺ نے نبوت کے دعوے کا پروگرام بنا لیا تھا۔ الہامی مذاہب کے ناتے اسلام اور عیسائیت کے بعض عقائد میں جزوی مماثلت سے کسی کو بھی انکار نہیں ہے۔ اس کو بنیاد بنا کر مستشرقین اس بات کے مدعی ہیں کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے عیسائی راہب سے خوشہ چینی کی ہے۔ ولیم میور اور مارگولیتھ نے اس ملاقات کو ''عیسائیت کی فتح عظیم'' قرار دیا ہے۔

ہم حیران ہیں کہ علمی تحقیق اور نفسیاتی تجزیہ کیا اسی چیز کا نام ہے؟ اول تو یہ ''ملاقات'' مستند تاریخی روایات سے ثابت ہی نہیں۔ اس کا ذکر مرسل روایات میں آیا ہے، مرفوع روایات اس باب میں خاموش ہیں۔ پھر یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ اس ملاقات کے وقت رسول اکرم ﷺ کی عمر صرف ۱۳ سال تھی۔ اس کمسنی میں مذہبی اسرار و معارف کو محض چند گھنٹوں میں سیکھ لینے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ تھامس کارلائل کے مطابق بھی یہ رائی کا پربت بنانے والی بات ہے۔ (۲) تمام معتبر علمائے حدیث، اصولِ حدیث اور قواعد حدیث کی بنا پر اس روایت کو ساقط الاعتبار کہتے ہیں۔ ایک داخلی شہادت (Internal Evidence) کی بنا پر درایت کے اعتبار سے بھی یہ روایت غیر معتبر ہے۔ روایت کے مطابق سفر شام میں بحیرا راہب کے انتباہ کے بعد جناب ابوطالب وہیں سے اپنی اگلی منزل کو روانہ ہو گئے اور حضرت بلالؓ اور حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ حضور ﷺ کو واپس بھیج دیا۔ سیرت کا ایک مبتدی طالب علم بھی یہ بات جانتا ہے کہ حضرت بلال امیہ بن خلفؓ کے غلام تھے اور اس وقت تک غالباً پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ حضور ﷺ سے دو سال چھوٹے تھے۔ یوں یہ بات ناقابل یقین ہے کہ ایک تیرہ سالہ بچے کو گیارہ سالہ بچے کی نگرانی میں ریگستانوں کے اندر دو ہزار میل سے زائد سفر پر واپس بھیج دیا گیا ہو۔ (۳)

روایت مذکور کے بارے میں مسلمان علما اور مستشرقین دونوں عجیب مخمصے کا شکار ہیں۔ شبلی

مرحوم نے اس روایت کو ردِ مستشرقین کے ذوق کے زیر اثر قبول نہ کیا۔ جن علمائے اسلام نے اس روایت کو قبول کیا ہے، انھوں نے اس میں حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت بلالؓ کی موجودگی کو راوی کا وہم قرار دیا اور پھر اس سفر کے موقع پر آنجناب ﷺ کی عمر مبارک ۲۰ سال بتائی ہے۔ اس لحاظ سے اُس وقت حضرت ابوبکرؓ کی عمر ۱۸ برس تھی۔(۴) مستشرقین کا معاملہ کہیں زیادہ قابلِ رحم ہے۔ وہ بحیرا راہب سے اس ملاقات پر اصرار بھی کرتے ہیں اور وقت ملاقات اُس کے کہے گئے کلمات کو دیکھ کر منہ دوسری طرف پھیر لیتے ہیں۔ جامع ترمذی میں حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے آپ کے اندر نبوت کی نشانیاں پہچان لی تھیں اور رئیس قافلہ ابوطالب کو قسم دے کر کہا کہ آپ انھیں روم کی طرف نہ لے جائیں۔ رومی اگر اِن کو دیکھ لیں گے تو آپ کی صفات اور علامات سے آپ کو پہچان کر قتل کر ڈالیں گے۔(۵)

جہاں تک اسلام اور عیسائیت کے بعض بنیادی تصورات میں مشابہت کا تعلق ہے، تو یہ اس تحقیق کا سب سے کمزور پہلو ہے۔ ایسی مشابہت اسلام اور یہودیت کے بعض عقائد میں بھی دریافت کی جاسکتی ہے۔ اسلام تو نام ہی ابدی صداقتوں کے مجموعے کا ہے۔ دینِ ابراہیمی کے مجدّد کی حیثیت سے حضور اکرم ﷺ نے کسی جدت پسندی کا دعویٰ بھی نہیں کیا۔ آپ ﷺ نے خود سابقہ انبیا کرام کی بار بار تصدیق کی۔ ویسے تو خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعض تعلیمات بھی مہاتما بدھ کی تعلیمات سے حیرت انگیز مماثلت رکھتی ہیں۔ اسی بنا پر بعض ماہرین اور محققین نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ بعض روایات کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جو چالیس ایام صحرانوردی میں گزارے وہ ایام صحرا کے بجائے بدھ مذہب کے کسی معبد میں بسر ہوئے تھے۔(۶) پھر بھی عیسائی مورخین کو اگر اپنی اُپج پر اصرار ہے تو انھیں ایک نظر ان بنیادی اختلافات پر بھی ڈال لینی چاہیے جو اسلام اور عیسائیت میں وجہ نزاع ہیں۔ تثلیث (Trinity) الوہیت مسیح (Divinity) اور کفارہ (Atonement) جیسے عیسائی عقائد کو مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ مولانا شبلی نعمانی نے بجا طور پر لکھا ہے:

''اگر شارع اسلام ﷺ بالفرض ان عیسائی اساتذہ سے تعلیم یافتہ ہوتے تو ممکن نہ تھا کہ توحید خالص کا ولولہ اور تثلیث سے نفرت کا وہ جوش آپ ﷺ کے سینے میں پیدا ہوسکتا جو قرآن کے ہر صفحے پر نظر آتا ہے۔''(۷)

حاصل بحث یہ ہے کہ وحی کا نفسیاتی تجزیہ ایک غیر سائنسی رجحان ہے۔ البتہ مستشرقین کے ذہنی پس منظر کا مطالعہ ہمیں یہ شعور ضرور دیتا ہے کہ کن محرکات کے زیر اثر پیغمبرانہ منصب کو عموماً اور پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کو خصوصاً ہدفِ تنقیص بنایا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ حضور ﷺ کے ناقدین کا اپنا ذہن نفسیاتی تجزیے کا محتاج ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں علم نفسیات ہمیں قابل قدر معلومات مہیا کرسکتا ہے۔ انفرادی سطح پر ایک نمایاں مثال ڈانٹے (Dante) کی ہے۔ ڈانٹے کی کتاب طربیہ خداوندی (Divine Comedy) چودھویں صدی (۱۳۱۷ء۔ ۱۳۲۱ء) کی تصنیف ہے۔ اس کتاب میں جنت (Heaven)، برزخ (Purgatory) اور جہنم (Hell) کے تین مختلف طبقات کی نقشہ کشی کی گئی ہے۔ جہنم کے کینٹو۔ ۲۸ میں اس نے پیغمبر اسلام ﷺ اور حضرت علیؓ کو جہنم میں عذاب کی حالت میں مبتلا دکھایا ہے۔ (نقل کفر کفر نباشد)۔ خود انصاف پسند یورپی نقادوں کے نزدیک اس گستاخانہ حرکت کے دو محرکات بہت واضح ہیں۔ ایک یہ کہ ایک متعصب عیسائی کے طور پر وہ اس پروپیگنڈے سے متاثر تھا کہ محمد ﷺ کی نبوت نے دنیا بھر میں عیسائیت کے فروغ کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ دوسری وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ بعض اوقات انسان ان لوگوں کے خلاف خوب برتا ہے جن سے اپنے کچھ افکار و نظریات اخذ کرتا ہے تاکہ اس پر ادبی خوشہ چینی یا ادبی سرقہ (Plagiarism) کا الزام عائد نہ کیا جاسکے۔ (۸) ڈانٹے کی یاوہ گوئی کی وجہ یہ ہے کہ عالم بالا کی تصویر کشی کرتے ہوئے اس نے بہت سا بنیادی مواد حضور ﷺ کے سفر معراج (The Ascension of the Holy Prophet saw) سے لیا اور اپنے مآخذ کو چھپانے کے لیے آپ ﷺ پر زبانِ طعن دراز کرنے لگا۔ واضح رہے کہ حضور ﷺ کے سفر معراج کی داستانیں اسلامی اندلس کے ذریعے یورپ پہنچیں تو وہاں بہت سے اہلِ فکر کے تخیل و تصور کو اس سے زبردست تحریک

ملی تھی۔(۹)

اجتماعی سطح پر اس تجزیے کے تین پہلو بیک وقت دلچسپ اور عبرتناک منظر پیش کرتے ہیں۔

۱۔ تحلیل نفسی کے تجربات سے پتا چلتا ہے کہ ابنارمل ہی نہیں، نارمل انسان بھی ان گنت لا شعوری محرکات کے تحت عمل اور ردِعمل ظاہر کرتے ہیں۔ مقامِ نبوت کا استخفاف کرنے والے دراصل زندگی کو آسمانی ہدایت کی روشنی میں بسر کرنے سے گریزاں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ پیغمبر کو فرستادۂ الٰہی ماننے کے ساتھ ہی اخلاقی اور روحانی قدروں کی پابندی لازم ہو جاتی ہے۔ یہی بات اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے منکرین کے لیے ناقابل تصور ہے۔ ربِ ذوالجلال نے منکرین کی اس ذہنیت کا پردہ چاک کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔ وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖٓ اِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ۝ (سورۃ المطففین: ۱۲)

''اور روز جزا کو تو بس وہی شخص جھٹلاتا ہے جو حد سے گزر جانے والا گناہوں میں پڑا ہوا ہو۔''

قرآن حکیم میں اسی ذہنیت کو ایک اور انداز سے بھی بے نقاب کیا گیا ہے۔ بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ ۝ (سورۃ القیامۃ: ۵)

''مگر انسان یہ چاہتا ہے کہ آگے بھی بداعمالیاں کرتا رہے۔''

۲۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خلاف عیسائی اہلِ قلم کی مخاصمت کا ایک اہم ترین سبب ہلال و صلیب کی تاریخی کشمکش بھی ہے۔ اسلامی فتوحات کے پہلے ہی مرحلے میں مصر و شام جیسے عیسائی ممالک پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ آٹھویں صدی عیسوی کے بعد عیسائی سلطنت کی جنوبی اور جنوب مغربی سرحدیں مسلمان فاتحین کے قدموں تلے تھیں۔ اس سیاسی پس منظر میں پیغمبرِ اسلام ﷺ کی کردارکشی کے لیے منظم کوششیں شروع ہوئیں۔(۱۰) بقول فرائڈ جنگ انسان کے نسلی، قومی اور علاقائی تعصبات کو پختہ تر کر دیتی ہے۔ ایک طرف سائنس دان اپنے قومی دشمنوں کو ہلاک کرنے کے لیے مہلک ہتھیار ایجاد کرتے ہیں تو

دوسری طرف علمِ دماغ کے ماہرین (Psychiatrists) حریف قوم کے قائدین کو ذہنی طور پر بیمار ثابت کرنے کا محاذ سنبھال لیتے ہیں۔ حضور ﷺ کے خلاف صلیبی ماحول کے پروردہ بعض جدید ماہرین نفسیات کا ماخذ یہی جنگی پروپیگنڈا ہے۔ اس پروپیگنڈا کے مسموم اثرات مستشرقین کے اجتماعی لاشعور میں اب تک موجود ہیں۔ (۱۱)

۴۔ عیسائیت اور یہودیت کے نام سے آج جو کچھ موجود ہے، اس کی تاریخی حیثیت کے علاوہ عصری قدر و قیمت بھی مشتبہ ہے۔ مستشرقین کو اپنے مرّوجہ مذاہب کی ان داخلی خامیوں کا صدیوں پہلے ادراک ہو گیا تھا۔ چنانچہ اپنے ہم مذہب عوام اور عالمی رائے عامہ کی توجہ ان خامیوں سے ہٹانے کے لیے انھوں نے اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے خلاف ایک منظم قلمی محاذ کھول دیا۔ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ مغرب میں عیسائیت اور یہودیت کے حق میں اتنا کام نہیں ہوا جتنا کہ اسلام کے خلاف ہو چکا ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ کی کردارکشی کی مہم کا یہ ایک اہم نفسیاتی سبب ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ نفسیات اور مذہبی حقائق کے باہمی تعلق کی اگر کوئی صورت ہے تو وہ کیا ہے اور یہ کہ مطالعہ سیرت کی نفسیاتی منہاج کیا ہے۔ ہمارے نزدیک واحد راہِ عمل یہ ہے کہ وحی جیسے ماورائی ذریعۂ علم کی میکانکیت (Mechanics) کے بجائے اس کی حرکیات (Dynamics) کو علمی تحقیق کا موضوع بنایا جائے۔ اس اصول کی روشنی میں دیکھا جائے تو شریعت محمدی ﷺ کے تین نمایاں پہلو نظر آتے ہیں۔

۱۔ یہ بات قابل غور ہے کہ ربّ کائنات نے قرآن حکیم دفعتاً نازل نہیں کیا۔ نزول قرآن کا سلسلہ ۲۳ سال تک جاری رہا۔ قرآن حکیم نے اس باب میں منکرین کا اعتراض نقل کیا ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ

"منکرین کہتے ہیں اس شخص پر سارا قرآن ایک ہی وقت میں کیوں نہ اتار دیا گیا۔" اور پھر اس کا جواب دیا ہے۔

كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ۝ (الفرقان: ۳۲)

''ہاں ایسا اس لیے کیا گیا ہے کہ اس کو اچھی طرح ہم تمھارے ذہن نشین کرتے رہیں۔ (اور اس غرض کے لیے) ہم نے اس کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ الگ الگ اجزا کی شکل دی ہے۔''

نزول قرآن کی تدریج میں جو نفسیاتی حکمت پوشیدہ ہے۔ وہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی اس روایت سے بھی ظاہر ہے:

''اوّل اوّل قرآن میں مفصلات نازل ہوئیں، جن میں جنت و دوزخ کا ذکر تھا۔ جب بہت سے لوگ اسلام پر پختہ ہو گئے تو حلال و حرام کے احکام نازل ہوئے۔ اگر ابتدا میں یہ حکم نازل ہوتا کہ شراب نہ پیو تو لوگ کہتے ہم سے تو یہ چھوٹ ہی نہیں سکتی۔ یا آغاز ہی میں یہ حکم ہوتا کہ زنا نہ کرو تو لوگ یہی کہتے کہ ہم تو اسے چھوڑ ہی نہیں سکتے۔'' (بخاری جلد دوم)

حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے مناسب اخلاقی تربیت کے بغیر ثانوی نوعیت کے مذہبی معتقدات کو بھی نہیں چھیڑا۔ مثلاً نماز جیسے بنیادی رکن کے بارے میں کوئی سمجھوتا نہیں ہو سکتا۔ لیکن حدودِ کعبہ کا مسئلہ اتنا بنیادی نہ تھا کہ فوری طور پر عوام کے معتقدات سے ٹکراؤ کی ضرورت ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ نے حطیم کو حدودِ کعبہ میں شامل کرنے کی غرض سے خانہ کعبہ کی از سر نو تعمیر کا پروگرام نہیں بنایا۔ اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کے سوال کے جواب میں آپ ﷺ نے اس کی حکمت خود بیان فرمائی۔

لولا حدثان قومك بالكفر لنقضت الكعبة و بنيها على اساس ابراهيم (صحیح بخاری)

''اے عائشہ! اگر تیری قوم نئی نئی کفر سے اسلام میں داخل نہ ہوئی ہوتی تو میں کعبہ کو منہدم کر کے اسے اساس ابراہیم پر تعمیر کرتا۔''

مولانا سید سلیمان ندویؒ اس حدیث سے استشہاد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کسی مصلحت کی بنا پر اگر کسی شرعی کام کی تعمیل میں تاخیر کی جائے تو قابل ملامت نہیں بشرطیکہ شریعت نے اس کام کی فوری تعمیل کا علی الاعلان مطالبہ نہ کیا ہو۔''(۱۲)

۲۔ شریعت اسلامی میں ممنوعات کی محض ایک فہرست ہی جاری نہیں کر دی گئی۔ یہ بات نفسیاتی اعتبار سے خلاف مصلحت ہوتی۔ ممنوعات کے ساتھ جائز اور مباح متبادلات کا ذکر بھی واضح انداز میں کر دیا گیا۔ آج بھی جب ہم بچوں اور نوجوانوں میں مجرمانہ رجحان (Juvenile Delinquency) اور اس کی اصلاح کی بات کرتے ہیں تو ان سے کلاشنکوف چھین کر خالی ہاتھ میں قلم تھما دینے کا ذکر بھی ہوتا ہے۔ شریعت کا مزاج اس لحاظ سے بھی عین فطری ہے۔ ذی نعمت لوگوں پر حسد کرنا بلاشبہ ایک مذموم حرکت ہے۔ سورۃ الفلق میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ حسد سے اس کی پناہ چاہیں۔ وَمِنۡ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ۝ غصہ، محبت اور نفرت وغیرہ کی طرح حسد بھی فطری جذبات میں شامل ہے۔ حدیث نبوی ﷺ کے مطابق حسد دو ہی چیزوں کے بارے میں جائز ہے۔ ایک وہ شخص جسے اللہ نے مال دیا اور وہ اسے راہ حق میں بے تحاشا خرچ کرے۔ دوسرا وہ شخص جسے اللہ نے علم وحکمت سے نوازا جس کے ذریعہ وہ فیصلہ کرتا اور تعلیم دیتا ہو (بخاری۔ مسلم۔ ترمذی) امام حافظ ابن قیمؒ نے فرمایا۔'' اسلام نے سود کی حرمت بیان کرنے پر اکتفا نہیں کیا، تجارت کی حلت بھی بیان کر دی۔ جوئے اور پانسوں وغیرہ کے ذریعے قسمت کا حال معلوم کرنے کی ممانعت کی۔ لیکن استخارہ کی اجازت دی۔ زنا اور ہم جنسی وغیرہ کو حرام کیا، لیکن نکاح کی اجازت دی۔''(۱۳)

۳۔ انسان کے اندر انتہا پسندی کا عمومی رجحان پایا جاتا ہے۔ وہ کبھی روحانیت کی قیمت پر مادیت پسند ہوتا ہے اور کبھی مادیت کی قیمت پر روحانیت پسند ہوتا ہے۔ بعض انسان حد سے زیادہ دروں بین (Introvert) اور بعض دوسرے غیر معمولی حد تک بیروں بین (Exrovert)

ہوتے ہیں۔اسی طرح انسان بہت زیادہ احساس کمتری میں مبتلا ہوتا ہے یا بعض صورتوں میں غیر ضروری حد تک احساس برتری کا شکار۔یہ انتہائیں بالآخر اسے ذہنی مریض (Neurotic) بنا کر چھوڑتی ہیں۔علم نفسیات کا طے شدہ ہدف انسان کو ایک نارمل زندگی بسر کرنے کے قابل بنانا ہے۔وحی الٰہی میں اعتدال پسندی کی تلقین کی گئی ہے۔مسلمانوں کو ''امتِ وسط''یعنی Evenly Balanced Nation کہا گیا ہے۔شدت پسندوں کے متعلق حضور ﷺ نے فرمایا: ھلك المتنطعون ۔ قالھا ثلاثا۔یعنی ''شدت کرنے والے ہلاک ہو گئے۔'' یہ بات آپ ﷺ نے تین مرتبہ فرمائی۔قرآن پاک میں ارشاد ہے۔ وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ (سورۃ لقمان:۱۹) اور ''درمیانی چال چلو۔'' اہل ایمان کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا وَالَّذِيْنَ إِذَآ أَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا (الفرقان:۶۷)''اور یہ وہ لوگ ہیں کہ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں نہ بخل، بلکہ ان کا خرچ دونوں انتہاؤں کے درمیان اعتدال پر قائم رہتا ہے۔'' یہ گویا بخل اور اسراف کے درمیان کفایت شعاری کا حکم ہے۔

قرآن حکیم میں فطرت اور مظاہر فطرت کو اللہ تعالیٰ کی نشانیاں قرار دے کر انفس و آفاق میں غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے۔ چنانچہ طبیعاتی علوم، تاریخ اور فلسفہ کی طرح علم نفسیات بھی مسلمانوں کے ہاں علمی تحقیق کا شروع سے ہی ایک محبوب موضوع قرار پایا۔اس موضوع پر کام کرنے والوں میں ابن سینا، رازی، ابن طفیل، الکندی، ابن باجہ، ابن مسکویہ، غزالی اور شاہ ولی اللہ جیسے مفکرین کے ساتھ ساتھ رومی، سہروردی، عبدالکریم الجیلی، ابن عربی اور بہت سے صوفیا شامل ہیں۔مسلم نفسیات دانوں نے قرآن وسنت کے اشارات کو سامنے رکھتے ہوئے بہت سے موضوعات پر قلم اُٹھایا ہے۔ ان کے ہاں نفاق، خوف، حسد، غیبت، منافقت اور ہوا و ہوس وغیرہ بہت سی قلبی اور نفسی بیماریوں کا نہ صرف تجزیہ کیا گیا ہے بلکہ علاج کے لیے تزکیۂ نفس کے بہت سے طریقے بشمول عبادات، ذکر، شکر، توبہ، توکل، استغنا اور صبر بھی تجویز کیے گئے ہیں۔صوفیائے کرام نے جدید نفسیات والوں سے بہت

پہلے مشاہدۂ باطنی (Introspection) کے طریقہ کار کو استعمال کیا اور انسان کے وقوفی کردار کو اپنا موضوع بنایا۔(۱۴) البتہ تین موضوعات...... نفس، فطرتِ انسانی اور خواب...... ایسے ہیں جن پر مسلمان نفسیات دانوں نے خاصا قابل قدر کام کیا ہے۔ان تینوں کے بارے میں قرآن و حدیث میں ماہرین نفسیات کے لیے بنیادی رہنمائی فراہم کی گئی ہے۔

۱۔ قرآن حکیم نے نفس انسانی کی تین جہتوں کا ذکر کیا ہے۔ایک نفس امّارہ ہے جو انسان کو برائیوں پر اکساتا ہے۔دوسرا نفس لوّامہ ہے جو غلط سوچ یا غلط کاری پر انسان کو ملامت کرتا ہے۔تیسرا نفس مطمئنہ ہے جو غلط راہ ترک کرنے اور راہ راست پر چلنے میں اطمینانِ قلب محسوس کرتا ہے۔خصوصاً نفس لوامہ یا ضمیر کو اللہ تعالیٰ نے سورۃ القیامۃ میں زندگی بعد موت کے ایک ناقابل انکار ثبوت کے طور پر پیش کیا ہے۔یہی نفس لوامہ ترقی کر کے نفس مطمئنہ بن جاتا ہے۔فرائد کا Super Ego بھی انسان کے اخلاقی کردار کا ذمہ دار ہے اور اس کی اپنی جگہ معاشرتی اہمیت بھی ہے لیکن وہ نفس لوامہ اور نفس مطمئنہ کی نزاکتوں سے کوسوں دور ہے۔مولانا امین احسن اصلاحیؒ کے نزدیک نفس لوامہ کا ماخذ وہ نورِ یزدانی (Divine Spark) ہے جس سے مشرف ہونے کے بعد انسان مسجودِ ملائک بنا۔اسے خیر و شر کی معرفت حاصل ہوئی اور اس میں اعلیٰ اقدار کے احترام کا جذبہ پیدا ہوا۔ان کے نزدیک

> ”جو لوگ ڈارون کے مادہ پرستانہ نظریۂ ارتقا کے اندھے بہرے معتقد ہیں وہ انسان کے اس باطنی نور سے بالکل بے خبر ہیں اور یہی بے خبری ہے جس کی وجہ سے وہ انسان کے بہت سے میلانات کی یا تو سرے سے کوئی توجیہ کر ہی نہیں پاتے یا کرتے ہیں تو بالکل غلط کرتے ہیں۔یہ لوگ ارتقا کی بعض گمشدہ کڑیوں کی تلاش میں حیران و سرگرداں ہیں۔حالانکہ کہ اصل کڑی جس کی انھیں جستجو کرنی چاہیے یہ ہے جس کی نشاندہی قرآن حکیم کر رہا ہے۔“(۱۵)

۲۔ فطرتِ انسانی کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر بیک وقت رجائیت انگیز اور حقیقت پسندانہ

ہے۔ اسلام گناہِ اوّل Original Sin کے تصور کو قبول نہیں کرتا۔ اسی طرح اسلام کے نزدیک انسانی ذہن محض ایک صاف تختی (Tabula Raza) بھی نہیں ہے۔ ابن طفیل نے حی بن یقظان کے نام سے جو مشہور تمثیلی داستان لکھی، اس کے مطابق انسانی ذہن میں حقیقتِ مطلقہ یا اللہ کا تصور مخفی اور امکانی صورت میں موجود ہوتا ہے۔ (۱۶) رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے۔ ''ہر بچہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔ پھر اُس کے والدین اُسے یہودی، نصرانی یا مجوسی بنالیتے ہیں۔'' (بخاری۔ ابوداؤد) اس ارشاد کی روشنی میں اسلام میں بچے کی ابتدائی تعلیم و تربیت پر بہت زور دیا گیا ہے۔ سنتِ نبوی کے مطابق پیدائش کے بعد جو کام سب سے پہلے کیے جاتے ہیں اُن میں بچے کے کان میں اذان دینا بھی شامل ہے۔ یہ وہ علامتی عمل ہے جس کے ذریعے بچے کے ذہن میں ودیعت شدہ الٰہیاتی حقائق کو تقویت دی جاتی ہے۔ اسلامی روایت کے مطابق بچے کو دودھ پلاتے وقت ماں بسم اللہ سے آغاز کرتی ہے اور اِس دوران گاہے گاہے قرآن کی تلاوت بھی جاری رہتی ہے۔ اسلام میں والدین کی ذمہ داری ہے کہ وہ بچے کی پرورش رزقِ حلال سے کریں۔ نام بھی نفسیاتی طور پر بچے کے مستقبل پر بہت اثر انداز ہوتے ہیں۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں۔ کہ رسول اللہ ﷺ قبیح ناموں کو بدل دیا کرتے تھے۔ (ترمذی) حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں ایک خاتون جس کا نام عاصیہ (گنہ گار) تھا وہ نام آپ ﷺ نے بدل کر جمیلہ تجویز فرمایا۔ (ترمذی) مسلم کی روایت ہے کہ حضرت زینب بنت ابی سلمہؓ کا نام اُن کے والدین نے برہ یعنی نیکو کار رکھا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ نام بدل کر زینب رکھ دیا اور قرآنِ پاک کی تلاوت کی جس میں فرمایا گیا ہے فَلَا تُزَكُّوا أَنفُسَكُمْ (النجم:۳۲) یعنی ''اپنی پاکیزگی کے دعوے نہ کرو۔'' اسی طرح ایک نوجوان کا نام حزن (غم) تھا۔ آپ ﷺ نے یہ نام بدل کر سہل (آسانی) رکھ دیا۔ آپ ﷺ لڑکوں کے لیے عبداللہ اور عبدالرحمٰن جیسے نام پسند فرمایا کرتے۔

۳۔ جہاں تک خواب اور تعبیر خواب کا تعلق ہے رسول اللہ ﷺ نے اس باب میں ایسے بنیادی اور کارآمد اصول بیان فرمائے جو اس علم کی معقول ترقی میں رہنمائی کا کام دے سکتے ہیں۔ المیہ یہ ہے کہ جدید نفسیات نے ابھی تک ان نبوی اصولوں سے استفادہ نہیں کیا اور زیادہ تر فرائڈ اور اس کے پیروکاروں کی کورانہ تقلید کو روا جانا ہے۔ مروجہ طریق مطالعہ کا بڑا نقص یہ ہے کہ انسان کو بنیادی طور پر جبلتوں کا ایک بے بس غلام سمجھا جاتا ہے اور خواب کو بھی ایسی ہی کسی جبلت کا محض لاشعوری ردِعمل قرار دیا جاتا ہے۔

تاریخ اسلام میں علمائے اسلام نے تعلیمات نبوی ﷺ کی روشنی میں خواب پر خاصا تحقیقی کام کیا ہے۔ خصوصاً امام ابن سیرینؒ کو تعبیر خواب میں وہی مقام حاصل ہے جو تفسیر میں ابن عباسؓ، نقدِ حدیث میں امام بخاریؒ، فقہ میں امام ابوحنیفہؒ، تصوف میں جنید بغدادیؒ اور علم الکلام میں ابوالحسن اشعریؒ کو حاصل ہے۔ ابن سیرین تعبیر خواب کرتے وقت منجملہ دوسرے امور کے سائل کے زہد و تقویٰ یا فسق و فجور کو بھی پیش نظر رکھتے۔ ایک شخص نے کہا کہ اس نے خواب میں اذان کہی ہے۔ ابن سیرین نے کہا تو فریضہ حج ادا کرے گا۔ اس کے جانے کے بعد ایک اور شخص نے بھی یہی خواب بیان کیا۔ آپ نے کہا لوگ تجھ پر چوری کی تہمت لگائیں گے۔ حاضرین نے کہا آپ ایک ہی خواب کی مختلف تعبیریں کر رہے ہیں۔ آپ نے کہا۔ پہلا شخص مجھے نیک نظر آیا میں نے آیت قرآنی کے مطابق اس کی تعبیر کر دی۔ وَ اَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ (الحج: ۲۷) یعنی ''اے پیغمبر (حضرت ابراہیم) تم لوگوں میں حج کا اعلان کر دو۔'' دوسرے شخص کو میں نے فاسق و فاجر پایا۔ اس لیے میں نے ایک دوسری آیت کے مطابق اس کی تعبیر کی۔ اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ اَيَّتُهَا الْعِيْرُ اِنَّكُمْ لَسٰرِقُوْنَ ○ (یوسف: ۷۰) ''یعنی ایک منادی کرنے والے نے منادی کی: اے قافلے والو! تم ضرور چور ہو۔'' (۱۷) اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ صوفیائے کرام اور علمائے حق لوگوں کے خوابوں سے اُن کے نفس کی مختلف کیفیات ...... نفس مطمئنہ، نفس لوّامہ اور نفس امّارہ ...... کا اندازہ لگایا کرتے تھے۔ (۱۸)

علمائے اسلام کے ہاں مطالعۂ خواب کو جو اہمیت حاصل ہوئی اس کی ایک وجہ تو قرآن حکیم میں مذکور وہ تاریخ ساز خواب ہیں جن کا تعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت یوسف علیہ السلام جیسے انبیائے کرام اور خود جناب خاتم النبیین ﷺ کی حیاتِ طیبہ سے ہے۔ قرآن پاک کی آیت لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (یونس: ۶۴) میں "بشارت" سے مراد بھی بالعموم اچھے خواب ہیں جو مسلمان دیکھتا ہے۔ دوسری وجہ خود حضور ﷺ کی تصریحات ہیں۔ آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے "میرے بعد نبوت اور رسالت ختم ہو جائے گی لیکن مبشرات باقی ہیں۔" سوال ہوا۔ "مبشرات کیا ہیں۔" آپ ﷺ نے فرمایا "مسلمان کا خواب بھی نبوت کے اجزا میں سے ہے۔" (بخاری و ترمذی)۔ بخاری و مسلم کی روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "سچا خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہے۔" حضرت ابو ہریرہؓ کی مشہور روایت کے مطابق خواب تین طرح کے ہوتے ہیں: ایک حدیثِ نفس (نفسانی خیالات کے عکاس) دوسرے تخویفِ شیطان، تیسرے مبشرات خداوندی۔ تحلیل نفسی کے ماہرین کی زیادہ توجہ پہلی اور دوسری قسم کے خوابوں پر رہتی ہے۔ تیسری قسم کے خواب ان کے مطالعہ سے عام طور پر خارج ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے ہاں نہ صرف پہلی اور دوسری قسم کے خوابوں کے بارے میں ہدایات ملتی ہیں بلکہ تیسری قسم کے خوابوں کے بارے میں بھی آپ کی واضح تصریح ملتی ہے۔ آپ ﷺ نے ہجرتِ مدینہ سے پہلے خواب میں کھجوروں والی وادی دیکھی اور تعبیر فرمائی کہ آپ ﷺ کھجوروں کی سرزمین یعنی یثرب کی جانب ہجرت فرمائیں گے۔ اُم فضل نے آپ ﷺ کو اپنا ایک خوفناک خواب سنایا۔ اُنھوں نے خواب میں دیکھا کہ حضور ﷺ کے جسدِ اطہر کا ایک حصہ الگ ہو کر اُن کی گود میں آ گرا۔ آپ ﷺ نے اُس کی تعبیر یہ فرمائی کہ میری بیٹی فاطمہؓ کے گھر ایک بیٹا (حسین) پیدا ہوگا جس کی تو رضائی ماں بنے گی اور پھر ایسا ہی ہوا۔ حضرت بلالؓ نماز کے اوقات میں بلند آواز سے الصلوۃ جامعۃ کہا کرتے یعنی لوگو جماعت کھڑی ہونے والی ہے۔ بعد میں حضرت عبداللہ بن زیدؓ نے اذان کے مروجہ الفاظ خواب میں کسی سے سنے اور جناب رسالت مآب ﷺ نے انھی الفاظ کے ساتھ اذان دینے کا حکم دیا۔ وحی الٰہی سے اس

کی تائید بھی ہوگئی۔ پہلی اور دوسری قسم کے بعض خواب قرآنی اصطلاح میں اضغاثِ احلام (۱۹) یعنی پریشان خوابوں کی باتیں اور بدخوابی اور پراگندہ خیالات کہلاتے ہیں۔ اس قسم کے خوابوں کو آپ ﷺ موقع پر رد فرما دیتے۔ ایک شخص نے حضور ﷺ کو اپنا خواب سنایا کہ اس کا سر کٹ گیا ہے اور وہ اس کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "یہ بیہودہ خواب کسی کو نہ سنانا۔ خواب میں اس طرح شیطان تم سے شرارت کرتا ہے۔"

احادیثِ نبوی ﷺ میں خواب کے بارے میں چند ضروری ہدایات ملتی ہیں۔

اولاً بعض اوقات کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ کر انسان پریشان ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ "جب کوئی شخص مکروہ خواب دیکھے تو تین مرتبہ بائیں طرف تف کرے۔ شیطان سے اللہ کی پناہ چاہے اور کروٹ بدل لے۔" ثانیاً برے خواب سے بچنے اور اچھے خواب کے لیے اکل حلال اور صدقِ مقال کو شعار بنانا ضروری ہے۔ ایک مرفوع حدیث ہے۔ "جو شخص سب سے زیادہ سچا ہے اس کا خواب بھی سب سے زیادہ سچا ہوتا ہے۔" ثالثاً خواب اپنے مخلص دوست اور صائب الرائے شخص کے علاوہ کسی سے بیان نہیں کرنا چاہیے۔ رابعاً خالی معدہ یا زیادہ کھانا کھانے کے بعد نیند کی حالت میں جو خواب آتے ہیں وہ بھی عموماً خواب پریشان ہوتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے: ایک اعرابی نے آنحضرت ﷺ سے ایک منتشر قسم کے خواب کا ذکر کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا تو نے کیا کھایا تھا۔" اس نے عرض کیا۔ "میں نے بہت سی پختہ کھجوریں کھائی تھیں۔" آپ ﷺ نے فرمایا۔ "اس خواب کی تعبیر درست نہ آئے گی۔"

سیرت اور نفسیات کے تناظر میں تین مزید پہلوؤں کا مطالعہ مفید رہے گا۔

۱۔ تعلیمی نفسیات ۲۔ جنگی نفسیات ۳۔ جنسی نفسیات

تعلیمی نفسیات

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا انقلاب بنیادی طور پر ایک تعلیمی انقلاب ہے۔ اس تعلیمی عمل کا باقاعدہ اور منظم آغاز مکہ معظمہ میں دارِ ارقم سے ہوا اور مدینہ منورہ کی اقامتی درس گاہ یعنی صفہ کے

چبوترے پر بھی ہمہ وقت یہ عمل جاری رہا۔ مختلف اوقات میں صفہ سے فارغ التحصیل ہونے والے خوش قسمت طلبہ کی تعداد تقریباً چار سو (۴۰۰) ہے۔ ان میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت ابوذر غفاریؓ، حضرت بلالؓ، حضرت سلمان فارسیؓ، حضرت حذیفہ بن یمانؓ، حضرت عمار بن یاسرؓ، حضرت سالم مولیٰ ابی حذیفہؓ جیسے اکابر صحابہؓ بھی شامل ہیں۔ جو قبیلہ بھی آپ ﷺ کا اُمتی ہو جاتا، آپ کو سب سے پہلے اُن لوگوں کی تعلیم اور تربیت کی فکر دامن گیر رہتی اور تعلیم قرآن و سنت کے لیے ترجیحی طور پر آپ ﷺ وہاں زیادہ تر صفہ سے فارغ التحصیل معلمین بھیجنے کا بندوبست فرماتے۔ اس انقلاب کے نتیجے میں عرب کے گلہ بان اقوام عالم کی قیادت کے منصب پر فائز ہو گئے۔ رنگ و نسل اور ذات پات پر مر مٹنے والے تقویٰ و احسان کو معیار فضیلت جاننے لگے۔ معمولی باتوں پر خون کی ندیاں بہانے والے صبر و تحمل کے پیکر بن گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے خیر و شر کے پیمانے بدلے۔ زندگی کی قدریں الٹ گئیں۔ پہلے زندگی محبوب تھی، اب موت عزیز ہوگئی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ خلافتِ صدیقی میں طلیحہ بھی وہ شخص تھا جس نے جھوٹی نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ اس کے جانباز بھی کثرت تعداد کے باوجود اسلامی لشکر کے مقابلے میں عبرت ناک شکست سے دو چار ہوئے۔ بعد میں وہ تائب ہوا۔ بہت سے اسلامی معرکوں میں شریک ہوا اور رتبہ شہادت سے سرفراز ہوا۔ صحابہ کرامؓ کے سامنے اپنے گمراہ پیروکاروں کے ساتھ ماضی کے ایک مکالمے کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتا ہے۔ میں نے ان سے پوچھا۔ ''تم لوگ کثرت تعداد کے باوجود مسلمانوں کے مقابلے میں بھاگ کیوں آتے ہو؟'' اس کے ایک پیروکار نے کہا۔ ''صاف بات یہ ہے کہ ہم میں سے ہر ایک چاہتا ہے کہ اس کا ساتھی پہلے مرے۔ جن لوگوں سے ہمارا مقابلہ ہے، ان میں سے ہر ایک کی شدید خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے ساتھی سے پہلے جان دے دے۔'' (۲۰)

قلب و نگاہ کی یہ بنیادی تبدیلی حضور ﷺ کی موثر انقلابی تعلیمی پالیسی سے رونما ہوئی۔ آپ ﷺ نے الکتاب کی تلاوت ہی نہیں کی، عملی زندگی میں ان آیات کی تشریح و توضیح اور عملی انطباق کے لیے موثر طریق تدریس بھی وضع فرمایا۔ آپ ﷺ کو الکتاب کے ساتھ حکمت بھی عطا فرمائی گئی۔ الکتاب گویا نصاب تعلیم ہے اور حکمت طریق تدریس۔ (۲۱)

رسول اکرم ﷺ کی حکمت تدریس کے اصول تعلیمی نفسیات کی بنیاد ہیں:

۱۔ کامیاب معلم مردم شناسی کے فن سے بہرہ ور ہوتا ہے۔ طالب علم کی خصوصی استعداد کا انکشاف، نکھار اور اس کا بخوبی استعمال اس کی اولین ذمہ داری ہے۔ متعلم کو اس کے ذوق وطبیعت (Aptitude) کے منافی کام (Assignment) دیا جائے تو وہ عدم مطابقت (Maladjustment) کا شکار ہو سکتا ہے۔ معلم انسانیت ﷺ ذمہ داریاں تفویض فرماتے وقت صحابہ کرامؓ کی افتادِ طبع کا خاص خیال رکھتے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے مدینہ منورہ میں تبلیغ اسلام کے لیے حضرت مصعب بن عمیرؓ کو، مہاجرین حبشہ کی قیادت کے لیے حضرت جعفر طیارؓ کو، خیبر کی فتح کے لیے حضرت علیؓ کو اور جنگ احزاب کے دوران میں دشمن کی صفوں میں پھوٹ ڈالنے کے لیے نومسلم صحابی حضرت نعیم بن مسعودؓ کو مامور فرمایا۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر ایسی شخصیت کی ضرورت تھی جو ایک طرف حلیم الطبع اور وسیع القلب ہو اور دوسری طرف قریش اور بنو امیہ کی نگاہوں میں بھی محترم ہو۔ آپ ﷺ کی نگاہِ انتخاب حضرت عثمان ذوالنورینؓ پر پڑی۔ مختلف صحابہ کرامؓ کے خصوصی رجحان اور استعداد کے مطابق آپ ﷺ نے انھیں موزوں خطابات سے نوازا۔ حضرت خالد بن ولیدؓ کو سیف اللہ، حضرت ابوذرؓ کو مسیح الاسلام اور حضرت عبیدہ بن الجراحؓ کو امین الامت کا لقب عطا فرمایا۔ اسیرانِ جنگِ بدر کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے لیے آپ ﷺ نے صحابہ کرام کا جو مشاورتی اجلاس طلب کیا، اُس میں حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ نے مختلف بلکہ متضاد آرا پیش کیں۔ اُن کے مزاج کا تقابلی جائزہ لیتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے ابوبکرؓ! تمھاری مثال حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ہے جنھوں نے بارگاہ ایزدی میں کہا تھا: ''اگر تو ان کو عذاب دینا چاہے گا (تو ایسا کرنے پر قادر ہے۔) یہ تیرے ناچیز بندے ہیں اور اگر تو ان کو معاف کر دے گا (تو تجھ سے یہ بھی بعید نہیں) تو غالب اور حکیم ہے۔'' اور اے عمر! تمھاری مثال نوح علیہ السلام جیسی ہے جنھوں نے فرمایا تھا ''اے پروردگار! کافروں میں سے کوئی متنفس بھی روئے زمین پر زندہ نہ چھوڑ۔'' (مسند احمد، المستدرک حاکم)

۲۔ تعلیمی نفسیات کا تقاضا ہے کہ مختصر اور برمحل گفتگو کی جائے۔صاحب جوامع الکلم ﷺ ہمیشہ مختصر خطاب فرماتے تھے۔آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے ان طول الصلوۃ الرجل و قصر خطبۃ علامۃ من فقھہ۔''آدمی کی نماز کا طویل ہونا اور خطبہ کا مختصر ہونا اس کی سوجھ بوجھ کی علامت ہے۔''آپ ﷺ بے موقع پندونصائح سے گریز فرماتے۔کسی ہدایت یا نصیحت کی ضرورت محسوس ہوتی تو پہلے مناسب فضا تیار فرماتے۔پہلے سے زیر بحث موضوع پر گفتگو فرماتے۔حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہر جمعرات وعظ کیا کرتے تھے۔کسی نے روزانہ خطاب کی فرمائش کی تو فرمایا۔''میں بھی اسی طرح تمھیں وعظ سناتا ہوں جس طرح آنحضرت ﷺ ہمیں ناغہ کر کے نصیحت فرماتے،مبادا کہ ہم بیزار ہو جائیں۔(بخاری۔ترمذی)

۳۔ ہم زبان لوگوں کے مابین زمان و مکان کے اختلاف سے لہجوں (Dialects) کا اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔موثر ابلاغ کے لیے اس حقیقت کا لحاظ بھی ضروری ہے۔بحیثیت داعی الی الحق حضور ﷺ زبان و بیان کی نزاکتوں کا خاص خیال رکھتے۔گفتگو کا جو انداز یمن اور حضر موت کے سرداروں کے ساتھ ہوتا،قریش،انصار اور اہل حجاز و نجد کے زعما سے مختلف ہوتا۔ عطیہ سعدیؒ کہتے ہیں:رسول اللہ ﷺ نے ہمارے لہجے میں بات کی۔خطیب بغدادی نے اپنی سند سے عاصم اشعری کا یہ قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا الیس من امر امصام فی امسفر۔''سفر میں روزہ رکھنا نیکی نہیں ہے۔''واضح رہے کہ اشعریوں کی لغت میں ل کو م سے بدل دیا جاتا ہے۔اس لیے آپ ﷺ نے عام اور معروف انداز کے بجائے اس لہجے میں بات کی جس سے مخاطب مانوس تھے۔

۴۔ تعلیمی نفسیات کا یہ بھی مسلمہ اصول ہے کہ تعلیم کو حتی المقدور ایک جاذب توجہ اور خوشگوار عمل بنا دیا جائے۔داعیان دین کے لیے ایک اہم حدیث پاک امام سرخسیؒ نے مبسوط میں نقل کی ہے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لا تبغضوا عباد اللہ عبادۃ اللہ۔''ایسا ڈھنگ اختیار نہ کرو جس کی وجہ سے لوگ اللہ تعالیٰ کی بندگی سے نفرت کرنے لگیں۔''اس حکم کی وضاحت

آپ ﷺ کے دوسرے ارشادات سے بھی ہوتی ہے۔ بخاری شریف کی روایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ یسروا ولا تعسروا بشروا ولا تنفروا۔ ''لوگوں کے لیے آسانیاں پیدا کرو، دشواریاں پیدا نہ کرو۔ بشارت دو، متنفر نہ کرو۔'' (صحیح بخاری۔ کتاب العلم) حضرت ابوموسیٰؓ اور حضرت معاذؓ کو یمن میں تبلیغ کے لیے روانہ کرتے وقت بھی آپ ﷺ نے ایسی ہی ہدایات دیں۔ یہ ہدایات تعلیمی نفسیات کے ایک مشہور اصول کی بنیاد ہیں۔ یعنی ''معروف سے مجہول کی طرف، محسوس سے مجرد کی طرف اور آسان سے مشکل کی طرف۔''

۵۔ عام حالات میں ایک شدید مہیج (Stimulus) نسبتاً کم تر مہیج کے مقابلے میں زیادہ قابل توجہ ہوتا ہے۔ مثلاً بادل کی گرج، بجلی کی چمک اور کوئی دھماکا وغیرہ فوری توجہ کا باعث بنتے ہیں۔ تعلیم و تعلم اور خطابت کے دوران میں مشاق اساتذہ اس اصول سے کام لے کر سامعین کو متوجہ رکھتے ہیں۔ حضور ﷺ ایک بار نماز ادا کرتے ہی نمازیوں کی صفوں پر سے گزرتے ہوئے حجرہ مبارک میں تشریف لے گئے۔ صحابہ کرامؓ متحیر ہوئے۔ نماز سے عاجلانہ واپسی آپ ﷺ کا معمول نہ تھا۔ صحابہؓ کے پوچھنے پر آپ ﷺ نے فرمایا: ''میرے گھر میں سونے کا ایک ٹکڑا تھا جس کا مجھے خیال آ گیا۔'' آپ ﷺ کو اس وقت تک بے چینی رہی جب تک اسے فی سبیل اللہ خرچ نہ کر دیا۔ یوں نبی اکرم ﷺ نے العفو کے قرآنی حکم پر عمل کا اعلیٰ نمونہ پیش کر کے دکھایا۔ ایک ماہر تعلیم کی حیثیت سے آپ ﷺ بعض اوقات چونکا دینے والا انداز اختیار فرماتے۔ جس سے آپ ﷺ کے تلامذہ ہمہ تن گوش ہو جاتے۔ ایک ایسی ہی صحبت میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ذلیل ہوا۔ ذلیل ہوا۔ ذلیل ہوا۔'' لوگوں نے پوچھا، ''کون یارسول اللہ ﷺ۔'' فرمایا۔ ''وہ شخص جس نے اپنے ماں باپ کو یا ان میں سے کسی ایک کو بڑھاپے کی حالت میں پایا اور ان کی خدمت نہ کر کے داخل بہشت ہونے کا موقع کھو دیا۔''

۶۔ معلم کا اپنا عمل طلبہ کے لیے اس کے لیکچر سے بھی زیادہ سبق آموز ہوتا ہے۔ نظریاتی ممالک میں استاد کو اسی لیے مملکت کے بنیادی نظریے کا سچا ترجمان سمجھا جاتا ہے۔ تعلیمی نظام کی اصلاح معلم کی اصلاح کے ساتھ مشروط ہے۔ ماں کی گود تعلیم و تربیت کا اولین مدرسہ ہے۔ اس لیے حضور ﷺ نے بچوں کو بہلانے کی غرض سے بھی کذب بیانی سے منع فرمایا۔ حضرت عبداللہ بن عامرؓ اپنی نوعمری کے زمانے کا ذکر کرتے ہیں۔ حضور ﷺ ہمارے گھر میں تشریف فرما تھے۔ میری والدہ نے مجھے فرمایا۔ آؤ میں تمھیں ایک چیز دوں گی۔ حضور ﷺ نے پوچھا۔ تم اسے کیا دینا چاہتی ہو؟ والدہ نے کہا: میں اسے کھجور دینا چاہتی ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا "اگر تو دینے کے لیے بلاتی اور نہ دیتی تو تیرے نامۂ اعمال میں جھوٹ لکھ دیا جاتا۔" (ابوداؤد)

معلمِ انسانیت ﷺ کے ہاں قول و عمل میں مکمل مطابقت موجود ہے۔ خطبہ حجۃ الوداع کے موقع پر جب آپ ﷺ نے جاہلیت کے انتقامی خون معاف کرنے کا اعلان کیا تو سب سے پہلے اپنے خاندانی بھتیجے ربیعہ بن حارث کے بیٹے کا خون معاف کیا۔ سودی لین دین کے خاتمے کا فرمان جاری ہوا تو سب سے پہلے چچا عباس بن عبدالمطلب کا سود معاف کیا۔ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے۔ "مجھے دنیا سے اس قدر نسبت ہے جس قدر اس سوار کو جو راستہ چلتے تھوڑی دیر کے لیے کہیں سایے میں آرام کرتا ہے اور آگے بڑھ جاتا ہے۔" نبی اکرم ﷺ کا عمل یہ ہے کہ ۹ ھ میں آپ ﷺ کا اقتدار یمن سے شام تک پھیل چکا تھا۔ اس وقت آپ ﷺ کا کل اثاثہ یہ تھا: ایک تہبند، ایک تکیہ، ایک چارپائی، معمولی مقدار میں جو، جانور کی کھال اور پانی کے مشکیزے۔ (۲۲)

۷۔ تعلیم بذریعہ سوال بھی تلقین و ترغیب کا ایک بہت کارآمد طریقہ ہے۔ اس کی روح یہ ہے کہ معلم پہلے کسی موضوع پر ایک بیان دیتا ہے۔ اس کے کچھ پہلوؤں کو دانستہ تشنہ چھوڑ دیتا ہے۔ سوال در سوال کے مرحلے سے گزرتے ہوئے طلبہ کو اصل نفس مضمون مستحضر ہو جاتا

ہے۔ حضور ﷺ صحابہ کی کلاس میں جہاد فی سبیل اللہ کی دعوت ایک نئے اسلوب سے پیش فرما رہے تھے۔ فرمایا! "ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ دنیا کی دوسری اقوام امتِ مسلمہ پر ایسے ٹوٹ پڑیں گی جیسے کھانے کے برتن میں ترنوالہ کے لیے بھوکوں کے ہاتھ پڑتے ہیں۔" ایک طالب علم (صحابی) نے سوال کیا۔ یارسول اللہ ﷺ! کیا ہم لوگ اس وقت تعداد میں تھوڑے ہوں گے؟ آپ ﷺ نے جواب دیا "نہیں تم لوگ بہت زیادہ ہو گے لیکن جھاگ کی طرح بے وزن ہو جاؤ گے۔" ایک اور طالب علم نے پوچھا۔ ہماری یہ حالت کیوں ہو جائے گی؟ ارشاد ہوا۔ "تم میں وھن پیدا ہو جائے گا۔" اب باقی طلبہ (صحابہ) بھی متجسس ہوئے۔ سوال ہوا، وھن کیا چیز ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ حب الدنیا وکراھیۃ الموت۔ دنیا سے محبت اور موت سے ناگواری۔" (ابوداؤد۔ بیہقی)

۸۔ کسی بات کی تکرار و اعادے سے اس کو ذہن نشین کرانے میں مدد ملتی ہے۔ قرآن حکیم تصریف آیات کے ذریعے اس ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ حضور ﷺ کے خطبات میں بعض باتوں کو دو بلکہ تین بار دہرایا گیا ہے۔ ایک بار اس جملے کو آپ ﷺ دیر تک دہراتے رہے۔ "بڑے گناہوں میں سب سے بڑا گناہ اللہ کے ساتھ شرک کرنا اور جھوٹی گواہی دینا ہے۔" حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ مسجدِ نبوی کے گردوپیش میں کچھ جگہ خالی ہوئی تو بنوسلمہ نے مسجد کے نزدیک منتقل ہونے کا ارادہ کیا۔ رسول اللہ ﷺ کو خبر ہوئی تو آپ ﷺ نے فرمایا "اپنے گھروں کو چمٹے رہو۔ تمہارے قدموں کے نشانات لکھے جاتے ہیں۔ اپنے گھروں کو چمٹے رہو۔ تمہارے قدموں کے نشانات لکھے جاتے ہیں۔" (مسلم) ارشادِ مبارک دیارکم تکتب اثارکم کو دہرانے سے مقصد یہ تھا کہ جب تم دور سے چل کر مسجد کی طرف آؤ گے تو تمہارے لیے اجر بھی زیادہ ہوگا اور حدیث پاک میں ہے۔ "جو لوگوں کو ہنسانے کے لیے جھوٹ بولتا ہے، اُس کے لیے ویل ہے، اُس کے لیے ویل ہے، اُس کے لیے ویل ہے۔"

یہ حکیمانہ طریق اثر پذیری کی استعداد میں اضافے کا موجب بنتا ہے۔

۹۔ تعلیم وتدریس میں سمعی وبصری معاونات کا استعمال ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ یہ معاونات زمان ومکان کے اختلاف سے بدلتے رہتے ہیں۔ تاہم سب سے بڑا معاون خود معلم ہوتا ہے جو عام فطری مظاہر کی مدد سے بھی غیر معمولی حقائق کا تصور ذہن نشین کر دیتا ہے۔ حضرت حنظلہؓ کہتے ہیں۔ ”جب حضور ﷺ جنت اور دوزخ کا بیان فرماتے تو ہمارا حال یہ ہوتا گویا ہم جنت اور دوزخ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔“ حضور ﷺ نے عام اشیا کو اور نظام فطرت کو سمعی وبصری معاونات کے طور پر حسب ضرورت استعمال کیا۔ ایک مرتبہ نبی اکرم ﷺ صحابہؓ کے ساتھ حالتِ سفر میں تھے۔ آپ ﷺ کی نظر بکری کے ایک بچے پر پڑی۔ آپ ﷺ نے صحابہؓ سے پوچھا۔ ”تم میں سے کوئی اس مرے ہوئے بچے کو صرف ایک درہم میں خریدنا پسند کرے گا“؟ انھوں نے نفی میں جواب دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ ”قسم ہے اللہ کی! دنیا (آخرت کے مقابلے میں) اللہ کے نزدیک اس سے زیادہ بے وقعت اور ذلیل ہے جتنا ذلیل اور بے وقعت تمھارے خیال میں یہ مردہ بچہ ہے۔“ حضرت ابوذرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ موسم سرما میں باہر نکلے جبکہ درختوں کے پتے جھڑ رہے تھے۔ آپ ﷺ نے ایک درخت کی دو شاخیں پکڑ کر اسے ہلایا۔ جب بہت سے پتے جھڑ گئے تو آپ ﷺ مخاطب ہوئے۔ ”اے ابوذرؓ! بندہ جب نماز پڑھتا ہے اور اللہ کو راضی کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے گناہ ایسے جھڑتے ہیں جیسے اس درخت کے پتے۔“ (مسند احمد بن حنبل)

۱۰۔ تعلیم وتربیت میں قصوں اور واقعات کا استعمال قدیم وجدید طریقۂ تعلیم کا خاصہ ہے۔ قرآن حکیم میں امم سابقہ کے عروج وزوال کو مختصر واقعات وقصص کے ذریعے بیان کیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی صحابہ کرامؓ کی نفسیاتی تربیت کے لیے قصوں سے کام لیا۔ آپ ﷺ صحابہؓ کو بتا رہے تھے کہ شراب تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ پہلی امتوں میں سے ایک شخص کا

حال آپ ﷺ نے بیان فرمایا، جسے ایک بدکار باندی نے قابو کر کے کہا۔ مجھ سے بدکاری کرو یا اس شراب میں سے ایک پیالہ نوش کرو یا اس بچہ کو قتل کر دو۔ اس نے کہا۔ مجھے شراب کا پیالہ پلا دو۔ چنانچہ عورت نے اسے شراب پلا دی۔ اس شخص نے کہا مجھے اور شراب پلاؤ۔ پھر وہ شراب پیتا رہا یہاں تک کہ اس نے بدکاری بھی کی اور بچہ کو بھی قتل کر دیا۔ (نسائی) ایک اور حدیث پاک میں ایک غار میں بند ہونے والے تین مسافروں کی کہانی بیان کی گئی ہے جس کے ذریعے والدین کے ساتھ حسنِ سلوک، اللہ کے خوف سے گناہوں سے پرہیز اور امانت کی ادائیگی کا بہت دل نشین انداز میں سبق ملتا ہے۔

جنگی نفسیات

جنگ سرد ہو یا گرم، بہت حد تک نفسیاتی حربوں سے لڑی جاتی ہے۔ مکی زندگی میں کفار نے قرآن اور صاحب قرآن ﷺ کے خلاف ایک طرف تشدد و تعذیب کے تمام ذرائع آزمائے تو دوسری طرف موجود ذرائع ابلاغ کے ذریعے آپ ﷺ کی کردارکشی کے لیے بھی تمام وسائل جھونک دیے۔ آپ ﷺ نے کمال فراست اور حکمت سے نہ صرف مخالفانہ پروپیگنڈے کا توڑ کیا، بلکہ غنیم کو بھی ہر بار دفاعی پوزیشن پر دھکیل دیا۔ رسول اکرم ﷺ کے اسم گرامی کو بگاڑ کر خاکم بدھن مذمم تک کہا گیا۔ صحابہ کرامؓ آزردہ ہوئے تو فرمایا! "یہ لوگ تو کسی مذمّم کو برا کہتے ہیں۔ میرا نام محمد (ﷺ) ہے اور یوں اللہ تعالیٰ نے مجھے ان کے شر سے بچالیا ہے۔"

جب نبی اکرم ﷺ کو نعوذ باللہ "ابتر" کہہ کر ایذا دی گئی، تو اللہ تعالیٰ نے سورۃ الکوثر نازل فرمائی۔ یہ مختصر مگر جامع سورۃ خانہ کعبہ پر آویزاں کر دی گئی۔ "ابتر" کے مقابلے میں لفظ "کوثر" اپنے صوتی حسن کی وجہ سے بھی زبان زد عام و خاص ہوگیا۔ دشمن کی صفوں میں موجود فن بلاغت کے ماہرین بھی پکار اٹھے۔ "یہ کلام کسی بشر کا نہیں ہوسکتا۔" کفار نے رسول اللہ ﷺ کو مجنوں کہا تو قرآن پاک نے نہ صرف پرزور تردید کی بلکہ اللہ تعالیٰ نے خُلق عظیم کا تاج آپ ﷺ کے سرِ اقدس پر سجا دیا۔ ایسا الزام لگانے والوں کے ایک نہیں پورے دس بدترین اخلاقی عیوب بھی اللہ تعالیٰ نے

ایک ایک کر کے گنوا دیے۔ (القلم: ۸۔ ۱۳) ایام فترت میں وحی کا سلسلہ وقتی طور پر رک گیا تو کفار مکہ نے پروپیگنڈے کا طوفان برپا کر دیا۔ کہا گیا: ''محمد (ﷺ) کو ان کے اللہ نے چھوڑ دیا ہے۔'' اس موقع پر سورۃ الضحیٰ نازل ہوئی۔ آپ ﷺ نے صحن کعبہ میں کفار کے سامنے اس سورۃ کی آیات سنا دیں۔ جب آپ ﷺ اس آیہ مبارکہ پر پہنچے۔ ''کیا ہم نے آپ ﷺ کو یتیم نہیں پایا اور پناہ دی'' تو ایک معترض نے بقیہ آیات کا انتظار کیے بغیر اعتراض داغ دیا۔ ''یہ کیسا اللہ ہے جو احسان کر کے جتا رہا ہے۔''

اس ''نکتہ آفرینی'' پر معترض کو خوب داد ملی اور اسے کندھوں پر اٹھا لیا گیا۔ حضور ﷺ فوراً بارگاہ الٰہی میں سجدہ ریز ہو گئے۔ سامعین حیران تھے کہ اظہار تشکر کا یہ محل کیا ہے۔ آپ ﷺ نے ایک بار پھر مرکزِ توجہ بن جانے پر فرمایا: ''میرے اللہ کو پہلے سے علم تھا کہ تم یہ اعتراض کرو گے۔ اس لیے اس نے پہلے ہی سے بعد کی آیات میں جواب بھی دے دیا ہے۔'' ''پس یتیم کو نہ جھڑک اور سائل کو انکار نہ کر۔'' اہلِ زبان جان گئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے احسانات کا ذکر جتلانے کے لیے نہیں ، اس لیے کیا ہے کہ آپ ﷺ کا رویہ بھی اللہ کی مخلوق کے ساتھ مہربانہ ہونا چاہیے۔ سرد جنگ کے اس اہم راؤنڈ میں بھی دشمن اپنے زخم چاٹتے رہ گئے۔

مدینہ منورہ میں اسلام، داعی اسلام ﷺ اور اہل اسلام کے خلاف زہریلے پروپیگنڈے کی جنگ میں یہود بھی شامل ہو گئے۔

ہجرتِ نبوی ﷺ سے پانچ سال قبل انصار کے دو قبیلوں اوس وخزرج کے درمیان ایک خونریز جنگ مدینہ منورہ سے دو میل کے فاصلے پر بعاث کے مقام پر ہوئی تھی۔ مسلمانوں میں افتراق و انتشار پیدا کرنے کے لیے یہ لوگ جنگِ بعاث کا تذکرہ چھیڑتے رہتے تا کہ اوس و خزرج ایک دوسرے پر چڑھ دوڑیں۔ حضور ﷺ کی مسلسل تعلیم و تربیت سے انصار کے یہ دو بڑے قبائل ہی نہیں، مدینہ کے انصار اور مکہ کے مہاجرین بھی شیر و شکر ہو گئے۔ قرآنِ حکیم میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ پر اپنے کرم کا ذکر کرتے ہوئے آپ ﷺ کی شانِ اقدس میں فرمایا۔''

اگر آپ ﷺ تند مزاج اور سخت دل ہوتے تو آپ ﷺ کے ساتھی منتشر ہو جاتے۔" (آلِ عمران: ۱۵۹)

بنونضیر کی بدعہدی اور سازش کے بعد جب اُن پر چڑھائی کی گئی تو جنگی ضرورت کے لیے اُن کے باغات میں موجود بعض درخت کاٹنے پڑے۔ اس پر یہود اور اُن کے حامی منافقین کی پروپیگنڈا مشینری فوراً حرکت میں آ گئی۔ کہا گیا کہ مسلمان اصلاحِ فی الارض کے مدعی ہیں اور فساد فی الارض پھیلا رہے ہیں۔ مقصد عوام الناس کو باور کرانا تھا کہ بظاہر دعوتِ دین کی آڑ میں ہر قیمت پر حصولِ اقتدار کی ہوس موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کے بجائے مسلمانوں کی تسلی کے لیے فرمایا۔
"کھجوروں کے جو درخت تم نے کاٹ ڈالے یا جو سلامت چھوڑ دیے تو یہ اللہ کے حکم سے ہوا تاکہ وہ نافرمانوں کو رسوا کرے۔" (الحشر: ۵)

ہجرت کے بعد بھی حضور اکرم ﷺ کفارِ مکہ کے بارے میں کسی خوش فہمی میں مبتلا نہ تھے۔ اس لیے آپ ﷺ نے اُن کے تجارتی راستوں کو مختلف کارروائیوں کے ذریعے اُن کے لیے غیر محفوظ بنا دیا۔ اس سلسلہ میں آپ نے ایک سر بمہر خط دے کر حضرت عبداللہ بن جحشؓ کو بارہ افراد پر مشتمل ایک مختصر دستے کے ساتھ کفار کے اُس تجارتی راستے کی طرف روانہ کیا جو مکہ اور طائف کے درمیان واقع تھا۔ خط کے مندرجات کے مطابق یہ لوگ بطن نخلہ کے مقام پر فروکش ہوئے جہاں انھیں کفار کی تجارتی نقل و حرکت کو محض مانیٹر کرنے کا ٹاسک دیا گیا تھا۔ ظاہر ہے مدینہ سے سینکڑوں میل دور اور مکہ کے بالکل قریب محض بارہ افراد اور ابن ہشام کے مطابق کل آٹھ افراد کو کسی باقاعدہ حملے کے لیے نہ بھیجا گیا تھا۔ اتفاق سے قریش کا ایک تجارتی قافلہ واپسی پر اسی مقام پر رکا۔ وہاں پر یہ مسلمان مکہ میں اِن لوگوں کے ہاتھوں ہونے والے مظالم کو یاد کر کے مشتعل ہو گئے اور قافلے کو اپنی زد میں دیکھ کر اہلِ قافلہ پر جھپٹ پڑے۔ اس حملے میں رئیس قافلہ عمرو بن حضرمی مارا گیا۔ دو افراد گرفتار ہوئے اور باقی اپنا ساز و سامان چھوڑ کر مکہ کی جانب فرار ہو گئے۔ اتفاق سے اُس روز رجب کی آخری تاریخ تھی اور عرب کے قدیم دستور کے مطابق رجب حرمت کے چار مہینوں میں سے ایک

ہے۔قریش مکہ نے اس واقعہ کو بنیاد بنا کر مسلمانوں کے خلاف پورے عرب میں سرد جنگ کا ایک نیا محاذ کھول دیا۔ٹیپ کا بند مصرع یہ تھا کہ اصلاح کے مدعی ماہ حرام میں بھی فساد کرنے سے باز نہیں آتے۔حضور ﷺ کو خود اس حادثے کا بہت رنج ہوا اور آپ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن جحش ؓ اور اُن کے ساتھیوں کو سخت سست کہا۔مالِ غنیمت بھی قبول نہ کیا اور قیدیوں کے معاملے کو بھی تا اطلاع ثانی موخر کر دیا۔تاہم مچھروں کو چھان کر پینے اور اُونٹوں کو نگل جانے والے حرم کعبہ کے مجاوروں کا منہ اُس وقت بند ہو گیا جب اس موقع پر قرآنی آیات نازل ہوئیں اور اللہ تعالیٰ نے اشہر حرام کی حرمت کو برقرار رکھتے ہوئے بھی مجاہدین کے اس اقدام کی توثیق کر دی۔(۲۳) قرآنی آیات کا جاہ و جلال ملاحظہ ہو:

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ۭ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ۭ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۤ وَاِخْرَاجُ اَھْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ (البقرہ:۲۱۷)

”اے نبی تجھ سے حرمت والے مہینے کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ان سے کہہ دو کہ اس میں لڑائی کرنا گناہ ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی راہ میں روکنا،کفر کرنا،مسجد حرام میں جانے نہ دینا اور اس میں عبادت کرنے والوں کو وہاں سے نکال دینا،اللہ کے نزدیک اس سے بھی بڑا جرم ہے اور فتنہ وفساد پھیلانا قتل سے کہیں بڑھ کر ہے۔“

عملی جنگ کا دائرہ مدنی دور کے دس برسوں پر محیط ہے۔اس عرصے میں رسول اللہ ﷺ نے ۲۷ غزوات میں بنفس نفیس حصہ لیا اور بہت سے سرایا آپ ﷺ کی فکری رہنمائی اور مشاورت سے انجام پائے۔آپ ﷺ نے ہر بار اپنی بہترین جنگی سکیم سے دشمن کو بے بس کر دیا۔جنگِ بدر میں نبی محترم ﷺ نے دشمن کی صحیح تعداد معلوم کرنے کے لیے دو دستے روانہ فرمائے۔پہلے دستے کے لوگ بدر کے گھاٹ سے قریش کے دو غلام گرفتار کر لائے۔وہ لشکر کفار کی صحیح تعداد بتانے سے قاصر رہے۔آپ ﷺ نے پوچھا۔”وہ لوگ کتنے اونٹ روزانہ ذبح کرتے ہیں۔“ انھوں نے

جواب دیا۔ "ایک دن نو اور دوسرے دن دس۔" اس سے آپ ﷺ نے اندازہ لگایا کہ دشمن کی تعداد نو سو اور ایک ہزار کے درمیان ہے۔ اس جنگ میں صف بندی کے وقت رسول اللہ ﷺ نے تنومند اور مشاق مجاہدوں کو صفِ اوّل میں کھڑا کیا تاکہ پچھلی صفوں کے لوگ ان کے جذبہ شہادت کی تقلید کریں۔

غزوہ بنی لحیان میں رسول اللہ ﷺ ان لوگوں کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوئے جنھوں نے مقام رجیع پر مسلمان مبلغین کو دھوکے سے شہید کر دیا تھا۔ بظاہر یہ سمجھا گیا کہ آپ ﷺ شام پر حملہ کرنے والے ہیں۔ جب آپ ﷺ کو یقین ہو گیا کہ دشمن ﷺ کو آپ کے عزائم کی خبر تک نہیں ہے تو آپ ﷺ نے اچانک لشکر کا رخ شام سے موڑ کر مکہ مکرمہ کی طرف کر لیا۔ بنی لحیان کو سنبھلنے کا موقع تک نہ مل سکا۔ غزوہ خیبر میں رسول اللہ ﷺ کی حکمت عملی یہ رہی کہ اصل ہدف تو کوئی ایک قلعہ ہوتا اور دوسرے قلعوں پر بھی آپ ﷺ فوجی دستے متعین کرتے رہتے۔ آپ ﷺ نے فوج کو مختلف قبائل میں تقسیم کر کے ان کے سردار بھی مقرر کر دیے۔ اس سے تین عسکری فوائد حاصل ہوئے۔ اوّل۔ فوج کے مختلف حصوں میں جذبہ مسابقت پیدا ہوا۔ دوم۔ محاذِ جنگ پر ہنگامی صورت حال کے لیے تازہ دم دستے ہر وقت تیار تھے۔ سوم۔ یہود کی فوجی طاقت مختلف محاذوں پر بکھر گئی۔ ان کے قلعے یکے بعد دیگرے مسلمانوں کے قبضے میں آ گئے۔

اُم المومنین حضرت اُم حبیبہؓ ابوسفیان کی بیٹی تھیں۔ قیامِ حبشہ کے دوران اُن کا شوہر عبیداللہ بن جحش مرتد ہو گیا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسلام پر اُم حبیبہؓ کی استقامت سے خوش ہو کر انھیں حرمِ نبوی میں داخل کر لیا۔ ابوسفیان کے لیے یہ ایک بالکل نئی آزمائش تھی۔ عربی روایات کے مطابق اپنے داماد کے خلاف ہتھیار اُٹھانا خاندانی نجابت کے خلاف سمجھا جاتا تھا۔ اُس موقع پر ابوسفیان نے بے ساختہ کہا۔ ھو الفحل لا یقدع انفہ" وہ (محمد ﷺ) جواں مرد ہیں۔ اُن کی ناک نہیں کاٹی جا سکتی۔" یعنی وہ معزز انسان ہیں۔ ان کو ذلیل کرنا آسان نہیں۔ ہم انھیں رسوا کرنے کے درپے ہیں اور خود ہماری بیٹی اُن کے نکاح میں چلی گئی۔

جنگ احزاب میں خندق کی کھدائی کے ساتھ رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ شہر سے باہر موجود ہر قسم کی زرعی پیداوار فوراً شہر کے اندر لائی جائے تاکہ لشکرِ قریش اپنے مرکز سے دور اس پیداوار سے فائدہ نہ اُٹھا سکے۔ چنانچہ مدینہ کے محاصرہ کے دوران کفارِ مکہ اور ان کے اتحادیوں کو خوراک اور چارے کی شدید قلت کا بھی سامنا تھا۔ دوسری جنگ عظیم میں حکومتِ روس نے جرمنی کی جارح افواج کے خلاف یہی تدبیر اختیار کی تھی اور جرمن فوجوں کے راستے میں موجود تمام کھیتوں اور باغوں کی پیداوار اپنے عقب میں پہنچا دی یا تباہ کر دی تھی۔

بنی مصطلق میں عین فتح کے بعد حضرت عمرؓ کے اجیر کا بنو خزرج کے ایک آدمی سے پانی پر جھگڑا ہو گیا۔ دونوں نے تلواریں نکال کر مہاجرین و انصار کو اپنی اپنی مدد کے لیے پکارا۔ عبداللہ بن ابی نے فتنے کو ہوا دینے کے لیے ریشہ دوانیاں شروع کر دیں۔ حضور ﷺ نے اسلامی لشکر کو فوراً کوچ کا حکم دے دیا۔ یہ سفر جو سرِ شام شروع ہوا، رات بھر اور پھر اگلے روز بھی جاری رہا۔ بعد دوپہر رسول اکرم ﷺ نے پڑاؤ کا حکم دیا۔ مسلسل سفر اور شدید گرمی کے باعث لوگ نماز پڑھتے ہی لمبی تان کر سو گئے۔ آپ ﷺ کی فراست سے مسلمانوں میں خانہ جنگی کرانے کی سازش اپنی موت آپ مر گئی۔ (۲۴)

حدیبیہ میں آپ ﷺ نے خلافِ معمول معتمد ترین صحابہؓ تک سے مشاورت نہ کی۔ آپ ﷺ اہل مکہ سے صلح کر کے خیبر کو فتح کرنا چاہتے تھے۔ اصل ہدف کو صیغۂ راز میں رکھ کر آپ ﷺ نے مصالحت کے لیے دشمن کی بظاہر نامنصفانہ شرائط بھی تسلیم کر لیں۔ قریش کے سیاسی پنڈتوں کو ہلکا سا شبہ بھی ہوتا تو وہ عمرے کی اجازت دے دیتے لیکن جنگ بندی پر کبھی آمادہ نہ ہوتے۔ آپ ﷺ کی بروقت تدابیر سے خیبر کے یہود اور مکہ کے مشرکین مدینہ کی اسلامی ریاست کے خلاف مشترکہ محاذ قائم نہ کر سکے۔

عمرۃ القضاء کے لیے رسول اللہ ﷺ ذی قعدہ ۷ ھ میں دو ہزار مسلمانوں کے ہمراہ مکہ مکرمہ تشریف لائے۔ قریش حسب معاہدہ مکہ سے نکل کر مضافات میں جمع ہو گئے۔ انھوں نے مشہور کر دیا

کہ مدینہ کی آب وہوا مسلمانوں کو راس نہیں آئی۔ مسلمان عام طور پر بیمار ہیں اور طوافِ کعبہ کے قابل بھی نہیں ہیں۔ حضور ﷺ نے اس موقع پر فرمایا۔''اللہ تعالیٰ اس مسلمان پر رحم کرے گا جو آج اپنی قوت اور جرأت کا مظاہرہ کرے گا۔''اس کے ساتھ ہی آپ ﷺ طواف کعبہ کے لیے درمیانی رفتار سے دوڑنے لگے۔ آپ ﷺ کی تقلید میں صحابہؓ بھی اسی جوش وخروش سے طواف کرنے لگے۔ مسلمانوں کی مبینہ کمزوری کا تاثر زائل ہوگیا۔ حضور ﷺ کا یہ عمل شرعی اصطلاح میں رمل کہلاتا ہے اور مناسکِ حج میں یادگار کے طور پر شامل ہے۔

فتح مکہ کے موقع پر یکے بعد دیگرے رسول اللہ ﷺ کی اقدامی پالیسیوں نے کفار اور ان کی قیادت کے دل و دماغ کو ماؤف کر کے رکھ دیا۔ مکہ میں فاتحانہ داخلہ سے ایک رات قبل آپ ﷺ کے حکم سے مسلمانوں نے دس ہزار مقامات پر آگ روشن کی۔ اس سے مخالفین مسلمانوں کی حتمی تعداد کے بارے میں مغالطہ کا شکار ہو گئے۔ آپ ﷺ نے حضرت عباسؓ کو ہدایت کی کہ عساکرِ اسلامی کی پیش قدمی کے وقت ابوسفیان کو کسی بلند مگر تنگ مقام پر یہ منظر دکھایا جائے۔ ابوسفیان کے سامنے مہاجرین و انصار کے مختلف لشکر اپنے اپنے پرچم لہراتے ہوئے گزرے تو اس کی رہی سہی قوتِ مدافعت بھی ختم ہوگئی۔ اس نے مکہ جا کر خود اعلان کیا:

''اے قریش! محمد (ﷺ) ایک ایسا لشکر لے کر آئے ہیں جس کے مقابلے کی طاقت تم میں نہیں۔''

اس اثنا میں ابوسفیانؓ کی تالیفِ قلب اور عام معافی کے لیے رسول اللہ ﷺ نے یہ اعلان بھی کروادیا۔''جو کوئی ابوسفیانؓ کے گھر میں پناہ لے یا دروازہ بند کر کے بیٹھ جائے یا خانہ کعبہ میں داخل ہو جائے، اس کو امان ہے۔'' نفسیاتی طور پر شکست خوردہ ہونے کے بعد اہل مکہ آپ ﷺ کے رحم وکرم پر تھے۔

مکہ میں فاتحانہ داخلہ کے وقت یہ طے تھا کہ کسی اشتعال انگیزی کے بغیر پرامن فتح کو یقینی بنایا جائے گا۔ اس فیصلہ کن مہم کے موقع پر اسلامی فوج کے ایک دستے کے سربراہ قبیلہ خزرج کے

سربراہ حضرت سعد بن عبادہؓ تھے۔ انھوں نے جوش میں آ کر یہ کہہ دیا ''آج جنگ کا دن ہے اور آج ساری حرمتیں ختم ہو جائیں گی۔'' کسی نے حضور ﷺ کو اطلاع کر دی۔ خطرہ تھا کہ اس ارادے اور مزاج کے ساتھ کچھ لوگ مکہ میں داخل ہوئے تو طے شدہ جنگی منصوبہ بھی درہم برہم ہو جائے گا اور مکہ کی حرمت بھی پامال ہو گی۔ سعد بن عبادہؓ جیسے حساس آدمی کو اس موقع پر یک قلم برطرف کرنا بھی ان کو آزمائش میں ڈالنے کے مترادف تھا۔ ویسے بھی حالتِ جنگ میں گھوڑے تبدیل نہیں کیے جاتے۔ اس نازک صورتِ حال میں حضور ﷺ نے سعد بن عبادہؓ سے علم لے کر ان کے بیٹے قیس بن سعد بن عبادہؓ کے حوالے کر دیا۔ یوں غیر ضروری خونریزی کا خطرہ بھی ٹل گیا۔ بیٹے کے ہاتھ میں کمان جانے سے باپ کی اشک شوئی بھی ہو گئی۔ قبیلہ بھی مطمئن تھا کہ کمان سردار کے بیٹے کے ہاتھ میں ہی ہے۔ (۲۵)

الغرض رسول اللہ ﷺ نے جانثار صحابہؓ کے مورال کو مسلسل بلند رکھا اور حدیبیہ، عمرۃ القضا اور تبوک کے معرکے بلند مورال کی بنا پر جیت لیے۔ یہ جنگیں جنگی تدبیروں (Tactics) سے زیادہ حوصلے (Morale) کی لڑائیاں تھیں۔ آپ ﷺ نے ہر جنگ میں دشمن کی طاقت اور صلاحیت کو پرکھا اور دشمن قیادت کو پے در پے غلطیوں پر مجبور کر کے اُس کی خود اعتمادی اور مورال کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ (۲۶)

جنسی نفسیات

انسانی زندگی میں جنس ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے بارے میں افراط و تفریط کی بنا پر انسان نے اکثر ٹھوکر کھائی ہے۔ افراد و اقوام اس باب میں انتہا پسندی کے ہاتھوں ہلاک ہو گئے۔ ایک طرف لذت پرستی کے (Hedonism) کے قائل ہیں جنھوں نے جنسی تسکین کو ہی مقصدِ حیات بنا لیا۔ دوسری طرف رہبانیت (Asceticism) کے مؤید ہیں جو جنسی تسکین کے جائز طریقوں کو بھی رد کر دیتے ہیں۔ بعض مذہبی لوگوں نے جنسی داعیے کو ختم کرنے کے لیے جنسی اعضا قطع کروا ڈالے۔ کچھ دوسرے مذاہب کے پیروکاروں نے ان اعضا کی پرستش کو اپنے مذہب میں شامل کر لیا۔ قرآن

وسنت کی تعلیمات اس مسئلے میں بھی اعتدال وتوازن پر مبنی ہیں۔قرآن حکیم میں جہاں جنسی جرائم کے بارے میں حدود کا ذکر ہے، وہاں آخرت کے انعامات کا ذکر کرنے سے پہلے دنیاوی زندگی میں نفسانی ضروریات کو بھی تسلیم کیا گیا ہے۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ○

(آل عمران: ۱۴)

"لوگوں کے لیے مرغوباتِ نفس، عورتیں، اولاد، سونے چاندی کے ڈھیر، چیدہ گھوڑے، مویشی اور زرعی زمینیں بڑی خوش آئند بنا دی گئی ہیں مگر یہ سب دنیا کی چند روزہ زندگی کے سامان ہیں۔حقیقت میں جو بہتر ٹھکانا ہے وہ تو اللہ کے پاس ہے۔"

اس امرِ واقع کو بیان کرنے کے بعد جائز نفسانی ضروریات کو پورا کرنے کی نہ صرف اجازت بلکہ ترغیب دی گئی ہے تاکہ ان کو فی نفسہٖ گناہ سمجھنے کی غلط فہمی رفع کر دی جائے۔

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ؕ قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ

(الاعراف: ۳۲)

"(اے محمد ﷺ) ان سے کہو کس نے اللہ کی اس زینت کو حرام کر دیا جسے اللہ نے اپنے بندوں کے لیے نکالا تھا اور کس نے اللہ کی بخشی ہوئی پاک چیزیں ممنوع کر دیں۔کہو یہ ساری چیزیں دنیا کی زندگی میں بھی ایمان لانے والوں کے لیے ہیں اور قیامت کے روز تو خالصتاً انھی کے لیے ہوں گی۔"

قرآنِ حکیم نے انسان کی دوسری حیاتیاتی ضروریات کے ساتھ ساتھ جنسی داعیے کو برملا تسلیم

کیا۔ جنسی جرائم اور ان کی سزا کے بارے میں واضح انداز اختیار کیا گیا ہے کیونکہ ان کا تعلق قانونی معاملات سے ہے۔ تاہم احکام کے بیان میں جہاں جنسی پہلو کا ذکر کرنا گزیر ہوا، وہاں رمز و کنایہ اور تمثیل سے کام لے کر آرٹ کے جمالیاتی تقاضوں کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔

حیض کی حالت ختم ہونے پر تعلقات زن و شو بحال کرنے کے لیے ارشاد ہوا:

فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللَّهُ (البقرۃ:۲۲۲)

''پھر جب وہ پاک ہو جائیں تو ان کے پاس اس طرح جاؤ جیسے اللہ تعالیٰ نے تم کو حکم دیا ہے۔''

اس سلسلہ بیان میں مزید فرمایا:

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ وَقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُمْ (البقرۃ:۲۲۳)

''تمھاری عورتیں تمھاری کھیتیاں ہیں۔ تمھیں اختیار ہے جس طرح چاہو اپنی کھیتیوں میں جاؤ مگر اپنے مستقبل کی فکر کرو۔''

تاریخی واقعات کے بیان میں جنس سے متعلق امور بیان کرتے وقت بھی ملفوف اور لطیف پیرایہ اظہار اختیار کیا گیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام جیسے متقی جوانِ رعنا کو بہکانے کی کوشش کرتے وقت زلیخا نے جو کچھ کیا اور کہا، قرآن نے اس کی تصویر احسن القصص میں بڑے محتاط اور لطیف انداز میں پیش کی ہے۔ (سورۃ یوسف: ۲۳) اسی طرح حضرت مریم علیہا السلام جب اللہ تعالیٰ کے اذن سے حاملہ ہوئیں تو ان کے رشتہ داروں اور اہل علاقہ نے کیا کچھ نہ کہا ہوگا۔ لیکن قرآن پاک میں چند الفاظ میں ایمائیت کے ساتھ اس واقعہ کو بیان کر دیا گیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے حیا کو ایمان کا شعبہ قرار دیا۔ حضرت ابوسعید خدری ؓ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ اس دلہن سے بھی زیادہ حیادار تھے جو اپنے پردے میں چھپی ہوئی ہو۔ جب آپ ﷺ ایسی کوئی چیز دیکھتے جو آپ کو ناپسند ہوتی تو ہم لوگ آپ ﷺ کے چہرے سے ناپسندیدگی سمجھ

لیتے (بخاری۔مسلم) بہ ایں ہمہ جناب سرور عالم ﷺ نے جنس کے بارے میں ایسا جرأت مندانہ (Bold) نقطۂ نظر اور انقلابی (Radical) طرزِ عمل پیش کیا جس کی مثال کسی دوسرے مذہب میں ڈھونڈے سے نہ ملے گی۔حضور ﷺ نے فرمایا "تمھاری دنیا میں مجھے تین چیزیں پسند ہیں۔ عورت، خوشبو اور نماز میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔" (نسائی۔مسند احمد۔مستدرک حاکم)۔ایک اور موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا: "جو شخص اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے اپنی بیوی سے تمتع کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر اس کو اجر سے نوازتا ہے۔صحابہؓ نے پوچھا: یارسول اللہ ﷺ! اپنی بیوی سے مقاربت پر بھی اجر ملے گا؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔"کیوں نہیں؟ ایسا شخص اگر ناجائز طریقے سے اپنی خواہش پوری کرتا تو کیا مواخذہ نہ ہوتا؟" (مسلم۔ابوداؤد۔مسند احمد)۔اس ضمن میں ایک مشہور حدیث پاک آپ ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی سچی تصویر پیش کرتی ہے۔

صحیح بخاری و مسلم میں روایت ہے۔تین اصحاب نے مدینہ منورہ میں حاضری دی اور ازواجِ مطہرات سے حضور ﷺ کی عبادت کے بارے میں سوال کیا۔انھیں بتایا گیا کہ حضور ﷺ نمازِ پنجگانہ اور تہجد کا اہتمام کرتے ہیں اور بعض اوقات نفلی روزے رکھتے ہیں۔وہ سمجھے کہ حضور ﷺ تو اللہ کے محبوب پیغمبر اور گناہوں سے معصوم ہیں۔آپ ﷺ کو زیادہ عبادت کی ضرورت بھی نہیں۔ البتہ ہمارے لیے اس قدر عبادت ناکافی ہے۔ان میں سے ایک نے کہا: میں آیندہ رات بھر عبادت کروں گا۔دوسرے نے عہد کیا۔میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا۔تیسرے نے عزم کیا۔میں کبھی شادی نہیں کروں گا۔حضور ﷺ تک یہ بات پہنچی تو آپ نے صحابہ کے اجتماعِ عام میں انھیں بلا کر سرزنش کی۔فرمایا:

اما واللہ انی لا خشا کم اللہ واتقا کم لہ ولکنی اصوم وافطر واصلی و ارقد و اتزوج النسا ،فمن رغب عن سنتی فلیس منی

"اللہ کی قسم! میں تم سے زیادہ خشیتِ الٰہی اور تقویٰ رکھتا ہوں۔لیکن مجھے دیکھو، میں

روزہ رکھتا ہوں اور چھوڑ بھی دیتا ہوں۔ رات کو نماز پڑھتا ہوں اور آرام بھی کرتا ہوں۔ اور شادی بھی کرتا ہوں۔ جس نے میری سنت سے اعراض کیا وہ مجھ سے نہیں۔"

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اسلام مرد ہی نہیں، عورت کے جنسی داعیات کو بھی پوری طرح تسلیم کرتا ہے۔ جس طرح عورت کو مرد کی اجازت کے بغیر نفلی روزے رکھنے کی اجازت نہیں، اسی طرح مرد کو بھی اجازت نہیں کہ عورت کے ازدواجی حقوق کی قیمت پر نفلی روزے رکھے یا ساری رات نوافل میں گزار دے۔ حضرت ابو درداءؓ کی ایسی ہی لاتعلقی کے بعد اُن کی اہلیہ نے بن سنور کر رہنا چھوڑ دیا تھا۔ حضور اکرم ﷺ کو معلوم ہوا تو آپ ﷺ نے انھیں نفلی عبادت میں ایسے استغراق سے منع فرمادیا۔ (بخاری۔ جلد ۱) سورۃ البقرۃ (۲۲۶) میں ہے کہ اگر کوئی شخص چار ماہ سے زیادہ مدت کے لیے بیوی کے پاس نہ جانے کی قسم کھالے اور پھر رجوع نہ کرے تو اُس صورت میں عورت کو طلاق ہو جائے گی اور اُسے دوسری شادی کی اجازت ہوگی۔ اس ضمن میں خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروقؓ کے عہد کا ایک مشہور واقعہ بھی پیش کیا جاتا ہے۔ آپ ایک رات گشت پر تھے کہ گھر سے کسی خاتون کے ایسے اشعار سنائی دیے جو کوئی عورت ناقابل برداشت جدائی کی صورت میں ہی کہہ سکتی ہے۔ تحقیق کرنے پر پتا چلا کہ اُس عورت کا شوہر زمانۂ دراز سے بیرونِ مدینہ مصروفِ جہاد ہے۔ حضرت عمرؓ نے اپنی صاحبزادی سیدہ حفصہؓ سے پوچھا کہ ایسی عورت مرد کے بغیر کتنے دنوں تک صبر کرسکتی ہے۔ سیدہ نے فرمایا۔ چار ماہ تک۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے تمام سپہ سالاروں کے نام ایک گشتی مراسلے میں ہدایت کی۔ "کوئی شادی شدہ شخص اپنی بیوی سے چار ماہ سے زیادہ غائب نہ رہے۔"

ازدواجی زندگی میں جنسی عمل کوئی یک طرفہ کارروائی نہیں ہے۔ فریقین کی بھرپور شرکت سے اس حیاتیاتی عمل کو بھی ایک صحت مندانہ آرٹ کی شکل دے دی گئی ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پہلے مسواک بلکہ مکمل وضو فرماتے۔ ظاہر ہے یہ بیوی کا حق ہے کہ خاوند کے منہ اور دانت صاف ہوں اور کسی قسم کی بدبو اسے ناگوار نہ گزرے۔ آپ ﷺ نے مقاربت سے پہلے ملاعبت کی

تلقین فرمائی۔ یا بایں صورت کچھ خاص ہارمونز جو کہ جنسی قوت اور لذت میں بیک وقت اضافہ کا موجب بنتے ہیں، اتنی تیزی سے تیار ہوتے ہیں کہ شاید کوئی کمپیوٹر اتنی تیزی سے کوئی چیز نہ بنا سکے۔(۲۷)

اسلام نے جنس کے بارے میں جو حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کیا ہے، حضرت عائشہ صدیقہؓ سے مروی ایک روایت سے اُس پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ ایک انصاری صحابیہ اسماء بنت یزید ابن اسکانؓ نے حضور ﷺ سے حالتِ جنابت اور حیض (Mensturation) کے بعد غسل کے مسائل پوچھے۔ حضرت عائشہؓ نے اِس پر کہا انصار کی عورتیں کس قدر اچھی ہیں۔ یہ (غیر ضروری) جھجک کی وجہ سے اپنے دین کو سمجھنے میں کوئی کوتاہی نہیں کرتیں۔ (مشکوٰۃ) مسلم شریف میں موجود ایک دوسری روایت بھی قابل توجہ ہے۔ اُم سلیمؓ (حضرت انس بن مالکؓ کی والدہ) نے حضور ﷺ سے پوچھا۔ اے اللہ کے رسول ﷺ! اللہ تعالیٰ صحیح بات کے بتانے میں نہیں شرماتا۔ پس آپ بتائیے کہ کوئی شہوت انگیز خواب دیکھنے پر کسی عورت پر بھی غسل واجب ہو جاتا ہے۔ اُس وقت حضرت عائشہؓ حضور ﷺ کے پاس بیٹھی تھیں۔ اُنھوں نے کہا اُم سلیمؓ! تم نے تو عورتوں کے راز کو کھول دیا۔ تمھارا دایاں ہاتھ خاک آلود ہو۔ (عربی محاورے کا یہ ایک پیرایۂ اظہار ہے)۔ اِس پر حضور ﷺ نے فرمایا۔ عائشہ بلکہ تمھارا ہاتھ خاک آلود ہو اور اُم سلیمؓ سے فرمایا: کہ اِس حالت میں رطوبت محسوس ہو تو عورت کو غسل کرنا چاہیے۔

جنس کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر کو سمجھنے کے لیے تین بنیادی امور کی تنقیح ضروری ہے۔

پہلی بات یہ کہ مسئلۂ جنس کا تعلق پوری انسانی زندگی اور اس کے متعلقات سے ہے۔ فرائڈ اور اس کے پیروکار معاشرتی گھٹن اور سماجی اصول وضوابط کے خلاف جو بھی کہیں، یہ حقیقت اٹل ہے کہ جنس کا تہذیب انسانی کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ جنسی جذبے کو معاشرے سے الگ کر کے دیکھا جا سکتا ہے نہ اسے معاشرے کے اندر رہتے ہوئے جانوروں کی جبلی سطح پر سمجھنا ممکن ہے۔ معاشرتی علائق کے بغیر جنس جھاڑ جھنکار اور گھاس پھوس سے بھرے جنگل کی مانند ہے۔ اس جنگل کو مناسب کانٹ چھانٹ اور ترتیب سے ہی ایک خوبصورت باغ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔(۲۸) چنانچہ بچے

کی تربیت میں ایڈلر بجا طور پر خاندان کو بنیادی اکائی سمجھتا ہے۔ بقول اس کے خاندان میں باپ کو سورج، ماں کو چاند اور بچوں کو ستاروں کا جھرمٹ قرار دیا جا سکتا ہے۔ خاندان میں والدین کی مناسب تربیت اور پیار سے بچہ جنسی بے اعتدالیوں سے بچ سکتا ہے۔ انفرادی نفسیات کے تجربات سے پتا چلتا ہے کہ چوری کرنے والے بچوں کی اکثریت والدین کے پیار سے محروم بچوں کی ہوتی ہے۔ ایسے بچے عموماً خود لذتی کی صورت میں عضوی زبان سے اپنی محرومی کا اظہار کرتے ہیں۔(۲۹)

دوسری بات یہ ہے کہ مسئلہ جنس کا تعلق اسلام کے تصورِ انسان اور تصورِ کائنات سے ہے۔ انسان دنیا میں ایک غیر ذمہ دار مخلوق کے طور پر پیدا نہیں کیا گیا اور یہ دنیا بھی کوئی الل ٹپ قسم کا کھیل نہیں ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے حیات انسانی کی تخلیق کا مقصد انسان میں اللہ اور کائنات کے ضوابط کا اعلیٰ شعور پیدا کرنا ہے۔(۳۰) انسان کو نہ صرف تسخیر انفس و آفاق کے لیے پیہم جدوجہد کرنا ہے بلکہ اُسے روزِ ازل سے جاری معرکہ خیر و شر میں بھی ایک اہم اور بھرپور کردار ادا کرنا ہے۔ ایسی صورتِ حال میں جنس جیسی تخلیقی قوت کو منضبط کرنا ضروری ہے اور اُسے فضول ضائع نہیں کیا جا سکتا۔ یہ محفوظ قوت (Conservative Energy) تعمیر تہذیب و تمدن کی خشت اوّل ہے۔ فرائڈ کے نزدیک ارتفاع (Sublimation) کے ذریعے یہ عمل غیر شعوری طور پر ہوتا رہتا ہے اور آرٹ اور مذہب کے مظاہر میں منتقل ہو جاتا ہے۔(۳۱) اسلام کے نزدیک اس کے لیے شعوری کوشش بھی کرنا پڑتی ہے۔ یہ اخفا (Repression) کی طرح کا منفی رویہ نہیں ہے۔ یہ دراصل تعلیق عمل (Suspension) ہے۔(۳۲)

تیسری اور اہم ترین بات یہ ہے کہ جس طرح جنس پر ناروا پابندیوں سے فرد ذہنی امراض میں مبتلا ہوتا ہے اسی طرح آزاد جنسی تعلق free sex بھی معاشرے کے لیے زہرِ قاتل ہے۔ مادر پدر آزادی سے بھی فرد کے نفسیاتی مسائل حل نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب میں جنسی تسکین کے لیے کھلی چھوٹ دینے کے بعد بھی جنسی جرائم کم نہیں ہوئے۔ جنسی کج روی اور جنسی انحراف کی بے

شمار صورتوں کو فروغ ملا اور پھر انھیں قانونی تحفظ دینا پڑا۔ ہم جنسیت کو قانوناً جائز کرنا افلاس نہیں تو اور کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس رویے کو ایک عالم گیر ضابطہ بنا دیا جائے تو کیا یہ خلافِ فطرت نہ ہوگا؟ کیا انسان خود ہی اپنے مستقبل اور بقا کی جنگ میں ہتھیار نہ ڈال دے گا؟ واضح رہے کہ جنسی مسائل اور امراض کو انھی معاشروں میں زیادہ فروغ حاصل ہوتا ہے جہاں جنسی بے راہروی عام ہے۔ اب یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ جنسی مریض کی مثال استسقا کے مریض کی سی ہے جو پانی کے گھڑے خالی کرنے کے بعد بھی پیاسے کا پیاسا دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔ حضور ﷺ کی ایک مشہور دُعا میں ایسی بے راہروی اور انتہا پسندی سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگی گئی ہے۔

اللھم انی اعوذ بك من علم لا ينفع ومن قلب لا يخشع و من نفس لا تشبع و من دعوة لا يستجاب لها

"اے اللہ! میں پناہ مانگتا ہوں اس علم سے جو نفع نہ دے اور اس دل سے جو نہ ڈرے اور اس نفس سے جو سیر نہ ہو اور اس دعا سے جو قبول نہ کی جائے۔" (مسلم)

مختصر یہ کہ انسان ایک حیاتیاتی وجود ہی نہیں، ایک اخلاقی وجود بھی رکھتا ہے۔ اس لحاظ سے جنس محض ایک جسمانی ضرورت نہیں، تہذیبی تقاضا بھی ہے اور وسیع تر معنوں میں ایک تخلیقی جذبہ بھی۔ اسلام نے اس جذبہ کی مذمت کرنے یا اسے مصنوعی طور پر دبانے کے بجائے اس کی صحت مندانہ تسکین پر زور دیا اور اس کے لیے مناسب قواعد و ضوابط تشکیل دیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ "ضبطِ نفس" سے بھی زیادہ اسلام کی پسندیدہ اصطلاح "تزکیۂ نفس" ہے۔

تزکیۂ نفس کا عمل عہدِ طفولیت سے شروع ہوتا ہے۔ بچہ ایک ایسے گھر میں آنکھ کھولتا ہے جہاں روزانہ تلاوت قرآن اور نماز پنجگانہ کا اہتمام ہوتا ہے۔ گویا پہلے مرحلے میں ایک اچھے گھریلو ماحول میں یہ کام آپ سے آپ شروع ہو جاتا ہے۔ دوسرے مرحلے میں انفرادی سطح پر شعوری کوشش کرنا پڑتی ہے۔ نبی محترم ﷺ نے فرمایا۔ "کوئی باپ اپنی اولاد کو جو بہترین عطیہ دیتا ہے وہ تربیت ہے۔" (ترمذی) اس تربیت کا ایک مظہر تو نماز کی تلقین و ترغیب ہے جو سات سال

کی عمر میں بچے کو مسلسل دی جاتی ہے۔ نماز سے بڑھ کر تطہیر فکر و عمل کا کوئی اور بہتر ذریعہ دستیاب نہیں۔ دس سال کی عمر تک بچے گروہ بندی کی جبلت کے زیر اثر آجاتے ہیں۔ اُن کے نوخیز جنسی جذبات ہم جنس افراد کی جانب منتقل ہو سکتے ہیں۔ بچوں میں ہم جنسی کے رُجحان کو کنٹرول کرنے کے لیے اس موقع پر حکم نبوی ﷺ ہے: فرقوا بینھم فی المضاجع (ابوداؤد) "ان کے بستر الگ کر دو۔" شعور کی آنکھیں کھولنے پر بچے کو مناسب ضروری جنسی معلومات سے آگاہ کرنا بھی باپ کی اور بچی کی حد تک ماں کی ذمہ داری ہے۔

عنفوانِ شباب میں داخل ہونے پر ایک نوجوان کو شہوانی تحریکات کے لیے وسیع میدان ملتا ہے۔ اب صنفین کے لیے قرآن پاک میں غضِ بصر کا حکم ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا "نگاہ ابلیس کے تیروں میں زہر کا بجھا ہوا ایک تیر ہے۔" ایک اور موقع پر فرمایا "آنکھیں بھی زنا کرتی ہیں اور اُن کا زنا نظر ہے۔" (بخاری۔مسلم۔داؤد) اسلامی معاشرے میں عورت کو زیب و زینت اور آرایش جمال کے ساتھ گھومنے پھرنے کی اجازت نہیں۔ اُن عورتوں پر لعنت فرمائی گئی جو لباس پہن کر بھی عریاں رہتی ہیں۔ اسلامی تعلیمات کی حساسیت کا عالم یہ ہے کہ عطر کے استعمال میں بھی کھلی چھٹی نہیں دی گئی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "مردوں کے لیے وہ عطر مناسب ہے جس کی خوشبو نمایاں اور رنگ مخفی ہو اور عورت کے لیے وہ عطر مناسب ہے جس کا رنگ نمایاں اور خوشبو مخفی ہو۔" (ترمذی۔ابوداؤد) اگر ایسی صورت ہو کہ عورتیں تبرجِ جاہلیت کے ساتھ گھومتی پھرتی ہوں تو قرآن وسنت پر ایمان رکھنے والے شخص کے اندر ایک اخلاقی محتسب بیدار رہتا ہے، جو اُسے شہوت انگیز اعضا (Erogenous Zones) کو دیکھنے سے باز رکھتا ہے۔ حسین عورت کے چہرے پر نظر پڑ جائے تو اپنی بیوی کے پاس جانے کا حکم دیا کہ اُس سے دل کے وساوس ختم ہو جائیں گے۔ (مسلم۔ابوداؤد۔ترمذی۔نسائی) جو لوگ نکاح کی استطاعت نہ رکھتے ہوں ان کو روزہ رکھنے کی ہدایت فرمائی کیونکہ روزہ جنسی خواہش کو حدِ اعتدال میں رکھتا ہے۔ (بخاری۔مسلم۔ابوداؤد۔ترمذی۔نسائی)

اسلامی اصولوں کی روح کے عین مطابق جنسی تسکین کی ناروا صورتوں پر پابندیاں عائد کرنے کے ساتھ جائز اور بہتر صورتوں کے جواز بلکہ وجوب کے احکامات دیے گئے۔ ترکِ دنیا کے بجائے ترکِ تجرّد کا حکم دیا گیا۔ قرآن حکیم میں شادی کو حصن (النساء:۲۵) یعنی قلعہ قرار دیا جس کی وجہ سے انسان اخلاقی گمراہیوں سے محفوظ رہتا ہے اور اسی لیے نکاح میں حائل ناجائز اور فضول رکاوٹیں دور کر دی گئیں۔ ضرورت محسوس ہو تو رسول اکرم ﷺ نے ہونے والی بیوی کو دیکھنے کی اجازت بھی مرحمت فرمائی۔ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے ایک جگہ نکاح کا پیغام دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ اسے دیکھ لو۔ اس طرح زیادہ توقع کی جا سکتی ہے کہ تمھارے درمیان موافقت ہو گی۔ (احمد۔ ترمذی۔ نسائی۔ ابن ماجہ۔ دارمی)۔ ایک اور موقع پر ارشاد فرمایا۔ تم میں سے جب کوئی شخص کسی عورت سے نکاح کا ارادہ کرے تو حتی الامکان اسے دیکھ کر اطمینان کر لے کہ متعلقہ عورت میں ایسی کوئی خوبی ہے جو اس طرف نکاح کرنے کی طرف رغبت دلانے والی ہو۔ (احمد۔ ابوداؤد)

عورتوں کو تلقین کی گئی کہ مہر مقرر کرتے وقت دولہا کی معاشی حالت کو مدِنظر رکھیں تاکہ معاشی تنگدستی کی وجہ سے کوئی نوجوان اس دینی حکم کی ادائیگی سے محروم نہ رہ جائے۔ قبائلی روایات کی آڑ میں حق وراثت سے محروم کرنے کی خاطر عورتوں کو شادی سے روکے رکھنا سخت مذموم ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت علیؓ کو نصیحت کی۔ "علی تین کام ہیں جن میں تاخیر نہ کرنا (۱) نماز جب اُس کا وقت ہو جائے۔ (۲) جنازہ جب تیار ہو کر آ جائے۔ (۳) بے شوہر والی عورت جب اُس کے لیے کوئی مناسب رشتہ مل جائے۔"

اِس جنسی ضابطۂ اخلاق کی خلاف ورزی سرزد ہونے کی صورت میں توبہ یا واپسی کا دروازہ بند نہیں ہوتا۔ جو شخص صدقِ دل سے پاکیزہ زندگی کا آغاز کرتا ہے، اس کا رب اُسے مایوس نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ انسانوں کو گناہ کی اُلجھن (Guilt Complex) سے نکالنے کے لیے اپنا تعارف توّاب الرّحیم کے طور پر کراتا ہے۔ قرآن مجید میں توبہ کا لفظ اپنے جملہ مشتقات کے ساتھ ۸۷ مرتبہ، مغفرت کا لفظ ۲۳۰ مرتبہ اور رحمت، رحمٰن اور رحیم کے الفاظ ۲۸۰ مرتبہ استعمال ہوئے ہیں۔ (۳۳) توبہ یا

واپسی کا عزم صمیم رکھنے والے شخص کے لیے قرآنِ حکیم میں ایک بہت حوصلہ افزا آیت ملتی ہے۔ رحمت عالم ﷺ نے فرمایا۔"اس آیت کے عوض مجھے دنیا و مافیہا کی دولت بھی دی جائے تو میں اس سودے کو پسند نہیں کروں گا۔" ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ (سورۃ الزمر: ۵۳)

"(اے نبی ﷺ) آپ کہہ دیجیے اے میرے بندو جنھوں نے اپنی جان پر ظلم کیا ہے۔ میری رحمت سے مایوس نہ ہونا"

یہ بات بھی طے شدہ ہے کہ معاشرے میں جنسی اعتدال محض ترغیب و تلقین سے قائم نہیں ہو سکتا۔ خارجی طور پر ایسا بندوبست بھی ضروری ہے کہ جو لوگ شرعی پابندیوں کو بازیچۂ اطفال بنالیں، انھیں مجرمانہ رجحان رکھنے والے دوسرے لوگوں کے لیے نشانِ عبرت بنا دیا جائے۔ ظاہر ہے جو لوگ احکامِ الٰہی سے بغاوت کریں اس طرح کہ ایک نہیں چار چار عینی شاہد انھیں فحاشی کا ارتکاب کرتے دیکھیں، وہ گنہگار ہی نہیں، بے حیا بھی ہیں۔ ایسے افراد معاشرے کا ناسور ہیں۔ ان کا علاج وہ سخت شرعی حدود و تعزیرات ہیں جن کا نفاذ اسلامی حکومت کے بنیادی فرائض میں سے ہے۔

اِس سلسلۂ کلام میں یہ بات پیشِ نظر رہے کہ یورپ میں عیسائی مذہب کی تاریخ سیاست، معیشت اور سائنس کے مقابلے میں بتدریج اور مسلسل پسپائی سے عبارت ہے۔ سائنس کے میدان میں تو چرچ کے ادارے کو مشہور سائنس دان گیلیلیو کی روح سے علی الاعلان معذرت کرنا پڑی۔ ایک اور ہزیمت چرچ کو جنس کے مقابلے میں اُٹھانا پڑی۔ ہیولاک ایلس نے وکٹورین عہد کے مذہبی نظریات کو باطل ثابت کیا اور دعویٰ کیا کہ عورتوں کو بھی جنسی لذت حاصل کرنے کا حق ہے۔ اُس کی کتاب Psychology of Sex کو ضبط کر لیا گیا تھا۔ جیسا کہ اُس نے اپنی کتاب کے پیش لفظ میں بتایا، اُس پر الزام تھا کہ "اِس کتاب کی وجہ سے ملکہ برطانیہ کی رعایا کے اخلاق متاثر ہو سکتے ہیں اور ملکہ برطانیہ کی رعایا بہت سے شہوت انگیز اعمال اور برائیوں میں مبتلا ہو سکتی ہے۔" (۴۴) ٹھیک

ایک صدی بعد یہ انقلاب رونما ہوا کہ جو چیز پہلے رعایا کے اخلاق کو تباہ کرنے والی تھی۔ اب وہ سب کچھ ملکہ برطانیہ کے حکم سے ہی تعلیمی اداروں میں ہو رہا ہے اور جنسی تعلیم کے نصاب میں ایلس کی مذکورہ کتاب کا دوسرا باب شامل ہے۔(۴۵) یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ مروجہ عیسائیت کے پاس انسان کی سیاسی، معاشی، سائنسی اور جنسی راہنمائی کے لیے یا تو سرے سے الہامی اصول موجود نہ تھے یا جو کچھ موجود تھا وہ وقت کے تقاضوں کا ساتھ نہ دے سکتا تھا اور اب ردِعمل کے طور پر یورپی معاشرہ جنسی انتشار کے اُسی راستے پر چل نکلا ہے جس پر چل کر اُس کی پیش رو قدیم مصری، رومی اور یونانی تہذیبیں اپنے اپنے انجام بد کو پہنچ چکی ہیں۔

اسلام چونکہ دین فطرت ہے اس لیے نہ صرف اب تک جدید تقاضوں سے عہدہ برآ رہا ہے بلکہ آیندہ بھی انسانیت کی راہنمائی کرتا رہے گا۔ جہاں تک مسئلہ جنس کا تعلق ہے، قرآن وسنت کی راہنمائی ہی جنسی اُلجھنوں کا واحد حل ہے۔ جنسی جذبات کی سائنٹیفک تنظیم سے ظاہر ہے کہ نبی امی ﷺ نے جنسی جبلت کو انسان کی اخلاقی آرزوؤں، روحانی اُمنگوں اور معاشرتی تقاضوں سے ہم آہنگ کر دیا۔

نفسی امراض کا نبوی علاج

ہر انسان ایک نفسیاتی اکائی Psychological Unit ہے۔ مزاج اور طبیعت میں انفرادی اختلاف علاج میں بھی اختلاف وتنوع کا متقاضی ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے صحابہؓ کو ان کے مزاج کی رعایت سے ایک ہی قسم کے سوالات کے مختلف جوابات دیے۔ کسی نے نصیحت کی فرمایش کی تو جواب دیا۔ ''غصہ نہ کیا کرو۔'' دوسرے شخص کو والدین کی خدمت کی تلقین فرمائی۔ تیسرے کو جہاد کی ترغیب دی۔ ایک شخص نے سوال کیا۔ ''اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے محبوب عمل کون سا ہے'' ! فرمایا ''نماز بروقت ادا کرنا۔'' غرض رسول اللہ ﷺ نے مخاطب کی کمزوری کو جانچ کر اس کے مناسب حال نسخہ تجویز فرمایا۔ شاہ ولی اللہؒ لکھتے ہیں۔

''رسول اللہ ﷺ کی مثال طبیب جیسی ہے۔ طبیب کی ہدایات زمانہ اور اشخاص

کے لحاظ سے مختلف ہوتی ہیں۔ جوان کے لیے جو تجویز کرتا ہے، بوڑھے کے لیے نہیں کرتا۔ موسم گرما میں کھلی فضا میں سونے کے لیے کہتا ہے۔ اور موسم سرما میں گھر کے اندر سلاتا ہے۔ موسم کے اختلاف کی بنا پر اعتدالِ مزاج کی رعایت کے لیے اپنے احکام کے اختلاف کو وہ ضروری قرار دیتا ہے۔"

عصرِ جدید میں نفسی علاج ایک سائنس کا درجہ حاصل کر گیا ہے۔ شفاخانۂ نبوی ﷺ میں بہت سے اخلاقی و جسمانی مریضوں کا نفسی علاج کیا جاتا تھا۔ چند ایسے امراض کے نبوی علاج کے مطالعہ کے بغیر یہ جائزہ نامکمل رہے گا۔

۱۔ حضرت ابو سعید خدری ؓ سے روایت ہے۔ ایک روز نبی اکرم ﷺ مسجد میں داخل ہوئے۔ مسجد میں ایک انصاری ابو امامہ ؓ کو دیکھا۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: "اے ابو امامہ! میں نماز کے وقت کے علاوہ تمھیں مسجد میں بیٹھا کیوں دیکھ رہا ہوں؟" ابو امامہ ؓ نے کہا "یا رسول اللہ ﷺ: مجھے غموں اور قرضوں نے گھیر لیا ہے۔" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "کیا میں تمھیں ایسی دعا سکھا دوں کہ اگر تم وہ دعا پڑھا کرو تو اللہ تعالیٰ تمھارا غم دور کر دے اور تمھارے قرض چکا دے؟" ابو امامہ ؓ نے عرض کیا: کیوں نہیں، اے اللہ کے رسول ﷺ، مجھے ایسی دعا سکھا دیجیے۔ حضور ﷺ نے فرمایا۔ صبح اور شام یہ دعا پڑھا کرو۔

اللھم انی اعوذ بك من الھم والحزن و اعوذبك من العجز والكسل و اعوذ بك من الجبن والبخل واعوذبك من غلبة الدين و قھر الرجال۔ (۳۶)

"اے اللہ میں غم و حزن سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں، لاچاری اور سستی سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں، بزدلی اور بخل سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں، دین (دوسروں کا مالی حق) کے غلبہ اور لوگوں کے مقہور کرنے سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں۔"

حضرت ابو امامہ ؓ فرماتے ہیں: میں صبح شام یہی دعا پڑھنے لگا تو اللہ تعالیٰ نے میرا

غم دور فرما دیا اور میرا قرضہ چکا دیا۔ (ابوداؤد)

۲۔ ڈپریشن کے مریضوں کو عام طور پر قیمتی ادویہ Antidepressants دی جاتی ہیں۔ بیش تر صورتوں میں یہ ادویہ زندگی بھر کا روگ بن جاتی ہیں۔ مشاہدہ یہ ہے کہ بہت سے ایسے مریض طبی علاج (Clinical Treatment) کے بغیر بھی صحت یاب ہو سکتے ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ماہِ رمضان میں سحر خیزی اور دیگر اذکار و عبادات کی وجہ سے مسلمانوں میں ڈپریشن کے مریضوں کی تعداد بہت کم رہ جاتی ہے۔ باقی اسلامی عبادات بھی بہت سے روحانی امراض کا موثر علاج ہیں۔ حج کے موقع پر سب لوگ یکساں لباس پہنتے ہیں۔ غریب و امیر میں طبقاتی امتیازات ختم ہو جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے حج تکبر، پندارِ نفس اور احساس برتری (Superiority Complex) کا بہترین علاج ہے۔ دعا اور قبولیت دعا کی امید بھی ذہنی اور روحانی سکون مہیا کرتی ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کے مطابق بندۂ مومن جانتا ہے کہ دعا بہر صورت خیر ہی خیر ہے۔ ذہنی و نفسانی ہی نہیں، اسلامی عبادات جسمانی امراض کا بھی علاج ہیں۔

۳۔ حضرت ابی بن کعبؓ فرماتے ہیں ایک اعرابی نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! میرے ایک بھائی کو جنون کی تکلیف ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ اسے میرے پاس بلاؤ۔ وہ اعرابی اپنے بھائی کو لے کر آیا اور حضورِ اکرم ﷺ کے سامنے بٹھا دیا۔ نبی اکرم ﷺ نے درج ذیل آیات پڑھ کر دم کیا۔

(۱) سورۃ فاتحہ (۲) سورۃ البقرہ کی ابتدائی چار آیات (۳) دو آیات الھکم الہ واحد اور آیۃ الکرسی (۴) سورۃ البقرۃ کی آخری تین آیات (۵) سورۃ آل عمران کی آیت شھد اللہ انہ لا الہ الا ھو (۶) سورۃ اعراف کی آیت ان ربکم ...... (۷) سورۃ مومنون کی آخری آیت فتعالی اللہ الملک الحق ...... (۸) سورۃ جن کی آیت و انہ تعالیٰ جد ربنا ...... (۹) سورۃ الصّٰفّٰت کی دس ابتدائی آیات (۱۰) سورۃ حشر کی آخری تین آیات (۱۱) سورۃ اخلاص

(۱۲) معوذتین

وہ شخص اس طرح اٹھ کھڑا ہوا جیسے اسے کبھی کوئی بیماری ہوئی نہ تھی۔(۴۷)

۴۔ حدیث شریف میں مشتعل مزاج اور غصیلے افراد کو غصہ پر قابو پانے کے لیے تین اقدامات پر مشتمل ایک معالجاتی تکنیک ملتی ہے۔غصہ شیطان کی صفت ہے۔اس لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔غصہ کے وقت اللہ تعالیٰ کو یاد کر کے پڑھا جائے اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم ۔دوسرا علاج یہ ہے کہ ٹھنڈا پانی پی لے اور ٹھنڈے پانی سے وضو کرے۔یہ علاج طب یونانی کے بھی موافق ہے۔حکیم علی شیرازی ''قانون'' کی شرح میں لکھتے ہیں کہ غصہ کے وقت ٹھنڈا پانی پینے اور اسے بدن پر ڈالنے سے مکمل نفع حاصل ہوتا ہے۔تیسرا علاج یہ ہے کہ غصہ کے وقت آدمی اگر کھڑا ہے تو بیٹھ جائے اور بیٹھا ہے تو لیٹ جائے۔(ابو داؤد۔مسند احمد)۔اس طریقۂ علاج کے اخلاقی اور طبی پہلو موجود ہیں۔اخلاقی پہلو یہ ہے کہ آدمی عاجزی کرنے لگے اور اپنے نفس کو سمجھائے کہ تو مٹی سے پیدا ہوا ہے، پھر آگ سے کیوں کھیلتا ہے۔زمین کو دیکھ کہ اس پر گندگی ڈالتے ہیں۔پھر بھی ہر چیز برداشت کرتی ہے۔تجھے بھی چاہیے جس مٹی سے بنا ہے اس کی حرص کر۔تجھے آگ سے کیا کام۔جدید طبی تجربات سے پتا چلتا ہے کہ جسمانی کیفیت مثلاً کھڑے ہونے اور لیٹے رہنے کی حالت میں اشتعال انگیز بات کا ردِ عمل اول الذکر صورت میں بہت زیادہ اور مؤخر الذکر حالت میں بہت کم ہوتا ہے۔(۴۸)

۵۔ حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ''جب تم بیمار کی عیادت کے لیے جاؤ تو اسے اپنے لیے دعا کے لیے کہو، کیونکہ اس کی دعا فرشتوں کی دعا جیسی ہوتی ہے (ابن ماجہ)۔اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے مریض کے لیے ایک عظیم الشان علاج تجویز کیا ہے۔بستر علالت پر پڑا ہوا شخص خود کو دوسروں کا دستِ نگر سمجھ کر احساسِ کمتری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔اگر ایسے مریض کو بتایا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے مستجاب الدعوات کا مقام دے کر

ایک ایسی سعادت بخشی ہے جس سے صحت مند لوگ بھی محروم ہیں تو اپنے اندر وہ خود اعتمادی کی زبردست قوت محسوس کرتا ہے۔ اس کے علاوہ سخت دل لوگوں کو مریض کی دعا کا محتاج قرار دے کر رسول اللہ ﷺ نے انھیں بھی نفسیاتی طور پر مریض کی تیمارداری کی ترغیب دی ہے۔"

۶۔ زبان کے تزکیہ کے لیے نبی اکرم ﷺ نے غیبت کرنے سے سخت منع فرمایا ہے۔ قرآن پاک میں غیبت کو مردہ بھائی کا گوشت کھانے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ آپ ﷺ نے دو اشخاص کو دوبارہ وضو کرنے کا حکم دیا جو غیبت کر رہے تھے۔ پھر آپ نے تلافی مافات کی صورت بھی بتادی۔ مشکوۃ شریف میں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "غیبت کا کفارہ یہ ہے کہ تو دعائے مغفرت کرے اس شخص کے لیے جس کی تو نے غیبت کی ہے اور یہ کہے اللھم اغفرلنا ولہ یعنی "اے اللہ! تو میری اور اس کی مغفرت فرما۔" اس ارشاد نبوی ﷺ کی معنویت امام غزالیؒ نے بیان کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اخلاقی امراض کا بہترین علاج یہ ہے کہ ایسے کام شروع کر دیے جائیں جو اس کام کے برعکس ہوں جن سے پیچھا چھڑانا مقصود ہے۔ یہ آفاقی اصول رسول اللہ ﷺ کی بہت سی دوسری تعلیمات میں بھی کارفرما نظر آتا ہے۔ ایک آدمی نے آپ ﷺ سے اپنی قساوتِ قلبی کا ذکر کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: اِمسح راس الیتیم واطعم المسکین۔ یعنی یتیم کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیر اور مسکینوں کو کھانا کھلا۔ (مشکوۃ)

۷۔ کوئی بھی انسان کائنات اور خالق کائنات کے ساتھ اپنے تعلق کے بارے میں جو ذہنی تصویر بناتا ہے، نفسیاتی طور پر وہ بہت اہم ہوتی ہے۔ مثبت سوچ کو اسی لیے ایک صحت مندانہ رجحان سمجھا جاتا ہے۔ کامیاب زندگی کا راز یقیناً منفی اور مریضانہ طرزِ فکر سے گریز میں مضمر ہے۔ ایک امریکی ڈاکٹر نارمن (Dr.Norman) نے دس آدمیوں پر ایک عجیب تجربہ کیا۔ اس نے ان سے کہا کہ وہ اگلے سال اپنے متعلق جس چیز کی توقع کرتے ہیں، اسے لکھ کر

الگ الگ لفافوں میں بند کر دیں۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق ٹھیک ایک سال بعد نو آدمی حاضر ہو گئے۔ لفافے کھولے گئے۔ ہر ایک نے حسبِ خواہش مطلوبہ چیز حاصل کر لی تھی۔ آخر میں غیر حاضر شخص کا لفافہ کھولا گیا۔ اس پر لکھا تھا۔ "میرا خیال ہے میں اگلے سال تک زندہ نہ رہوں گا، موروثی طور پر ہمارے مردوں کی عمریں زیادہ نہیں ہوتیں۔" تحقیق پر پتا چلا کہ وہ شخص اس وقت تک فوت ہو چکا تھا۔

مثبت سوچ کی ترغیب اور منفی سوچ سے پرہیز کے لیے حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ایک حدیث قدسی ایک بہترین دستورِ العمل ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

قال اللہ عز و جل انا عند ظن عبدی بی (بخاری و مسلم)

"اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ میں اپنے بندے کے گمان کے مطابق اس کے ساتھ معاملہ کرتا ہوں۔" ایک مشہور دُعا میں اِسی کیفیت کو بیان کیا گیا ہے۔ اللھم انك عفو کریم تحب العفو فاعف عنی۔ "اے اللہ! تو معاف کرنے والا کریم ہے۔ معاف کرنے کو پسند کرتا ہے پس مجھے بھی معاف فرما۔"

۸۔ جنسی کجروی کی طرف رجحان رکھنے والے ایک نوجوان کا نبوی ﷺ کلینک میں جو علاج ہوا وہ (Client oriented Therapy) کی بہت عمدہ مثال ہے۔

حضرت ابو امامہؓ سے منقول ہے۔ ایک نوجوان بارگاہِ رسالت ﷺ میں حاضر ہوا اور عرض کی "یارسول ﷺ! مجھے زنا کی اجازت دیجیے۔" صحابہؓ اس کی جسارت پر غضبناک ہوئے۔ لیکن طبیب کامل ﷺ نے اسے پیار سے اپنے پاس بلایا اور فرمایا۔ "کیا تم اپنی ماں کے لیے ایسا پسند کرتے ہو؟" اس نے کہا۔ واللہ ہرگز نہیں۔ میں آپ ﷺ پر قربان جاؤں۔ حضور ﷺ نے فرمایا "اللہ کی قسم! اس طرح دوسرے لوگ بھی اپنی ماؤں کے لیے یہ پسند نہیں کرتے۔" پھر فرمایا۔ "کیا تم اپنی بیٹی کے لیے پسند کرتے ہو؟" اس نے کہا۔ میں قربان جاؤں، ہرگز نہیں۔ فرمایا "ایسے ہی دوسرے لوگ بھی اپنی بیٹیوں کے لیے پسند نہیں

کرتے۔“ علی ہذا القیاس رسول اللہ ﷺ نے اس کی بہن اور خالہ تک کے لیے یہی سوال پوچھا اور اس نے ہر بار انکار کیا۔ اس عمل کی قباحت ذہن نشین کرانے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اپنا دستِ شفقت و ہدایت اس کے سر پر رکھ کر دعا فرمائی۔ اللھم اغفر ذنبه وطهر قلبه واحصن فرجه۔ ”اے اللہ اس کا گناہ بخش دے، اس کا دل پاک کر دے اور اسے بدکاری سے بچا۔“

کہتے ہیں اس نوجوان کے دل کی دنیا ہی بدل گئی۔ بعد ازاں اس گناہ کے تصور سے ہی اسے ابکائی آنے لگتی تھی۔

اسلامی و نبوی تعلیمات کی اس حیرت انگیز اثر پذیری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ماہر جنسیات ہیولاک ایلس (۱۸۵۹ء-۱۹۳۹ء) نے کہا۔

”اسلام کو مبلغوں کی ضرورت نہیں۔ یہ ایک سادہ مذہب ہے جو ہر کہیں پنپ سکتا ہے اور قابل عمل ہے۔“ (۳۹)

اللھم صل علی محمد و علی آل محمد

---❀❀❀---

مراجع وحواشی

۱۔ منٹگمری ڈبلیوواٹ ...... Muhammad-The Prophet and Statesman

۲۔ کارلائل ...... Sartor Resartus/Heroes and Hero Worship

۳۔ ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ ...... محاضراتِ سیرت ﷺ (۲۰۰۷ء) ...... الفیصل ناشران لاہور

۴۔ مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ ...... سیرت المصطفیٰ ﷺ جلد اول

۵۔ ایضاً

۶۔ رابرٹ ایل گولیک ...... The Educator,Mohammad

۷۔ شبلی نعمانی ...... سیرت النبی ﷺ۔ جلد اول ...... مکتبہ اسلامیہ اُردو بازار لاہور

۸۔ اصطلاح میں اسے (Cover Up) کہتے ہیں۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے آرنلڈ پر بارہا تنقید کی ہے۔ اس کے باوجود ناقدانِ فن اسے فرزندِ آرنلڈ (Child of Arnold) کہتے ہیں کیونکہ اس کے افکار پر آرنلڈ کی گہری چھاپ ناقابل انکار ہے۔

۹۔ (الف) ہیجٹ جیکسن ...... Dictionary of Proper Names and Notable Matters

(LLC)Kessinger Publishing. (2006)

(ب) پروفیسر میگوئیل آسین ...... Islam and Divine Comedy

((Reprint Edition 1968Routledge

میگوئیل آسین نے دعوے کے ساتھ کہا ہے کہ ڈانٹے نے اپنی کتاب کی تفصیلات معراج النبی ﷺ سے مستعار لی ہیں۔ مصنف کے مطابق ابن عربی کی تصانیف بھی ڈانٹے کے مراجع ومصادر ہیں۔ واضح رہے کہ معراجِ نبوی ﷺ کی روایات سپین میں مسلمان اہل علم کے ذریعے عیسائیوں میں بھی پھیل چکی تھیں۔ گو ڈانٹے عربی زبان سے واقف نہ تھا لیکن عام علمی ماحول اور عربی زبان سے آشنا اپنے استاد کے زیر اثر ان

روایات سے غافل نہ تھا۔

۱۰۔ منٹگمری ڈبلیوواٹ......Muhammad-The Prophet and Statesman

۱۱۔ ژنگ کے نزدیک کسی معاشرہ سے وابستہ فرد اپنے قدیم آباواجداد کے افکارومحسوسات اور تعصبات بھی وراثت میں حاصل کرتا ہے۔ یوں وہ فرائڈ کے انفرادی لاشعور کے مقابلے میں اجتماعی لاشعور کا تصور پیش کرتا ہے۔

۱۲۔ سید سلیمان ندویؒ......سیرت عائشہ رضی اللہ عنہا......کشمیر بک ہاؤس فیصل آباد

۱۳۔ حافظ ابن القیمؒ......الاعلام الموقعین......المکتبۃ العصریہ بیروت۔لبنان

۱۴۔ (الف) ڈاکٹر نصیر احمد ناصر......سرگزشتِ فلسفہ (حصہ دوم)

(ب) علی اکبر منصور......مسلم نفسیات (۱۹۹۲ء)......الحمد پبلی کیشنز لاہور

۱۵۔ مولانا امین احسن اصلاحیؒ......تزکیۂ نفس طبع سوم (۲۰۰۴ء)......فاران فاؤنڈیشن لاہور

۱۶۔ علی اکبر منصور......مسلم نفسیات

۱۷۔ ابوالفضل حسین بن ابراہیم محمد تفلیسی......کامل التعبیر (مقدمہ)......ادارہ اسلامیات لاہور

۱۸۔ امام ابن سیرینؒ کے نزدیک خواب کی تعبیر بتانا ہر کہ ومہ کا کام نہیں۔ معبّر کے لیے کچھ شرائط ضروری ہیں: (۱) کتاب اللہ کو سمجھتا ہو۔ (۲) احادیث رسول ﷺ کا علم رکھتا ہو۔ (۳) عربی زبان کی باریکیوں سے واقف ہو۔ (۴) سائل کے شخصی احوال سے واقف ہو۔ (۵) اُس کا نفس پاکیزہ، اخلاق بہترین اور زبان سچی ہو۔

۱۹۔ اضغاث گھاس کے کھلے مٹھوں کو کہتے ہیں یعنی جس طرح گھاس کے تنکے متفرق اور منتشر ہوتے ہیں اسی طرح اضغاث احلام وہ خواب ہیں جو پراگندہ اور بے معنی ہوتے ہیں۔

۲۰۔ الدکتور علی العتوم۔ حرکت الردہ۔ بحوالہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی زندگی کے سنہرے واقعات (مکتبہ دارالسلام)

۲۱۔ ''لفظ حکمت قرآن مجید میں متعدد معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ بعض مفسرین نے حکمت سے مراد قرآن حکیم، بعض نے سنت اور بعض نے حجت قطعیہ مراد لیا ہے۔ صاحب روح البیان کے مطابق حکمت سے مراد وہ بصیرت ہے جس کے ذریعہ انسان مقتضیاتِ احوال کو معلوم کرکے ان کے مطابق کلام کرے۔'' (تفسیر

معارف القرآن)

۲۲۔ سید سلیمان ندویؒ...... خطباتِ مدراس...... مکتبہ اسلامیہ لاہور

۲۳۔ قاضی عبدالدائم دائم...... سید الوریٰ ﷺ جلد اول (۱۹۹۰ء)...... برائٹ بکس اردو بازار لاہور

۲۴۔ محمود شیت خطاب...... الرسول القائد ﷺ

۲۵۔ ایضاً

۲۶۔ جنرل محمد اکبر خاں...... حدیث دفاع

۲۷۔ حکیم محمد طارق محمود...... جنسی زندگی۔اسلام اور جدید سائنس (۲۰۰۹ء)...... تخلیقات مزنگ لاہور

۲۸۔ ایڈلر۔Individual Psychology بحوالہ تین نفسیات دان از ڈاکٹر سلیم اختر

۲۹۔ ایضاً

۳۰۔ ڈاکٹر محمد اجمل...... مقالات اجمل

۳۱۔ یہ اصطلاح بھی فرائڈ نے اپنی کتاب Three Contibutions to Sexual Theory میں استعمال کی ہے اور اخفا اور جنسی عمل خود نہ کرنے میں فرق کیا ہے۔

۳۲۔ محمد قطب...... اسلام اور جدید مادی افکار...... اسلامک پبلی کیشنز لاہور

۳۳۔ ایضاً

۳۴۔ ڈاکٹر محمد آفتاب خان...... Sex and Sexuality

۳۵۔ ایضاً

۳۶۔ ڈاکٹر محمد عثمان نجاتی...... حدیث اور علم النفس (مترجم فہیم اختر ندوی)...... الفیصل ناشران لاہور

۳۷۔ ایضاً

۳۸۔ امریکی ریاست میری لینڈ کے ادارہ صحت NIMH میں دماغی تصاویر (Brain Images) پر تحقیق کرنے والے سائنس دان Peter Bendettini نے اپنے مشاہدات بیان کرتے ہوئے کہا:

"It never occurred to me that body position might influence behavioural or neuronal activity in the contex of aggression---but it makes sense I do think that this is somewhat specilized to things

like aggression or anger." (Science News: 12 August 2009)

۳۹۔ ہیولاک ایلس ...... Views and Reviews

(.A selection of uncollected essays)

Article : The Islamic Reformation (1932).

ہیولاک ایلس کے اصل الفاظ ہیں۔

"Islam as easily dispenses with missionary societies as it has always dispensed with rugular priests. It is a religion that is viable by its own nature, and so it is in no need of any adjuvant force. It is certainly a religion that allows of exteme asceticism and the heights of mystic exaltation; but on its ordinary levels, it is a religion that can be lived."

نبی اُمیّ ﷺ بحیثیتِ معلّمِ قانون وانصاف

قانون کسی بھی معاشرے کی اولین ضرورت ہوتا ہے۔قدیم ترین زمانے میں جس ریاست یا معاشرے کا سراغ ملتا ہے،اس کے ساتھ قانون کی بھی کوئی نہ کوئی شکل ضرور موجود ہے۔وہ شاہ حمورابی کا ضابطۂ قانون ہو یا جسٹینین کا مرتب کردہ قانونِ روما ہو،یہودی قوانین ہوں،ہندوؤں کا منوشاستر ہو یا پھر زمانۂ حاضر کے قانون ساز ادارے،سب فرد اور ریاست کی اس ضرورت کی نشاندہی کرتے ہیں۔تاریخ کا یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ صدیوں پر محیط قانونی مساعی کے باوجود انسان قانون پسند نہیں بن سکا۔نت نئے قوانین مسلسل وضع کیے جارہے ہیں اور جرائم کی رفتار میں بھی ہوشربا اضافہ ہورہا ہے۔اس کے ساتھ یہ بات بھی عبرت ناک ہے کہ باہمی تنازعات میں قانون سے استمداد بھی حصولِ انصاف کی لازمی ضمانت نہیں ہے۔کولٹن نے دیوانی اصولِ قانون کے متعلق جو کچھ کہا، وہ دوسرے قوانین پر بھی چسپاں ہوتا ہے یعنی ''قانون کی بھرمار میں عدل کی گنجائش نہیں رہتی اور ملزم انصاف میں گھر کر بے انصافی کا ایسے ہی شکار ہوجاتا ہے جیسے سمندر میں ملاح پیاس سے ختم ہوجاتے ہیں۔''

یہ افسوسناک صورتِ حال اس امر پر شاہد ہے کہ قانون کا صحیح تصور دنیا کے پاس نہیں ہے۔ دراصل کسی بھی معیاری قانون میں کچھ ضروری خصوصیات موجود ہونی چاہییں۔ان خصوصیات سے تہی دامن قانون معاشرے کی شیرازہ بندی نہیں کرسکتا۔اولاً قانون غیر مبہم ہونا چاہیے تاکہ اس کا اطلاق واضح طور پر ہوسکے۔ثانیاً قانون مختلف طبقات میں کسی ایک طبقے کا محافظ نہ ہو۔انسانی قوانین میں عملاً یہ بہت بڑی خامی ہے۔اس سے قانون کا احترام دلوں سے اٹھ جاتا ہے۔ثالثاً قانون کو زیادہ تر مسلمہ اقدار وروایات پر مبنی ہونا چاہیے۔اس کے ساتھ ہی ایسا بندوبست بھی ضروری ہے جس سے قانون

عہدِ نو کے تقاضوں کا ساتھ دے سکے۔ رابعاً قانون کے ساتھ ساتھ ایک ایسا نظامِ اخلاق ناگزیر ہے جو افراد کے رجحانات اور نفسانی خواہشات کی تطہیر کرتا رہے۔ قانون صرف ظاہری اعمال پر ہی لاگو ہوتا ہے۔ مجرمانہ میلانات پر گرفت اس کے دائرہ میں شامل نہیں۔ یہ مقصد تو ایک بہتر اخلاقی نظام ہی پورا کر سکتا ہے۔ ان خصوصیات کا حامل نظامِ قانون دنیا کو صرف حضور ﷺ ہی نے دیا ہے۔

بعثت نبوی ﷺ سے قبل خطۂ عرب میں سماجی طور پر ایک فرسودہ نظام قائم تھا۔ اس نظام میں عورتوں، غلاموں، یتیموں اور جنگی قیدیوں کے حقوق کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بیویوں کو ایلا وظہار کے ذریعے معلق رکھا جاتا اور ان کا کوئی پرسانِ حال نہ تھا۔(۱) شوہر بغیر کسی پابندی کے بیوی کو طلاق دینے کا مجاز تھا۔ قتل عمد اور قتل خطا میں کوئی فرق نہ تھا۔ اگر کوئی مقروض غربت کی وجہ سے قرض کی ادائیگی بروقت نہ کر پاتا تو اسے فروخت تک کر دیا جاتا۔ غلاموں اور قیدیوں کے فرائض تو بہت تھے لیکن حقوق کچھ نہ تھے۔ اس منتشر اور غیر مربوط معاشرے کو ایک مرکزی نظامِ حکومت میں بدلنے کے لیے حضور ﷺ نے فی الواقع انقلابی قانون سازی کی۔ اس قانون کی بنیاد پر عہدِ رسالت و خلافت راشدہ میں کلی طور پر اور بعد کی صدیوں میں جزوی طور پر معاشرتی نظم قائم رہا۔ مستشرقین کے ایک گروہ نے ٹھوس حقائق سے صرفِ نظر کرتے ہوئے قانون کے میدان میں بھی حضور رسالت مآب ﷺ کے کارناموں کی اہمیت کو گھٹانے کی پوری کوشش کی اور دعویٰ کیا کہ اسلامی قانون سراسر رومن لا کا چربہ ہے۔ کچھ دوسرے لوگوں مثلاً ایمل تیاں (Emil Tyan) وغیرہ نے یہاں تک کہہ ڈالا کہ رسول اللہ ﷺ نے کوئی نئے قوانین متعارف نہیں کروائے۔ آپ ﷺ صرف قبل از اسلام کی روایات اور عرف پر عمل پیرا رہے۔(۲) برنارڈ لیوس نے دعویٰ کیا کہ اسلامی قانون نے مروجہ قانون کو Supplant یعنی مکمل طور پر نہیں بدلا بلکہ جزوی امور کی حد تک محض Supplement یعنی اس میں معمولی ترمیم و اضافہ سے کام چلایا ہے۔(۳) قانون کے شعبے میں حضور ﷺ کی اولیات اور کارناموں کا ایک مختصر جائزہ مستشرقین کے ابطال کے لیے کافی ہے۔

پہلا کارنامہ...... سوسائٹی کی تشکیل نو

قانونی نقطۂ نظر سے اس بانجھ معاشرے کو حضور ﷺ نے ٹھوس قانونی بنیادیں فراہم کر

دیں۔ یہ وہ پہلا معاشرہ تھا جو سراسر قانون کی رہنمائی میں قائم ہوا۔ سید عبدالقادر عودہ شہیدؒ نے اس پہلو کی جانب انتہائی بلیغ اشارہ کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے ''قانون سوسائٹی کا بنایا ہوا ہوتا ہے، سوسائٹی قانون کی پیدا کردہ نہیں ہوتی۔ لیکن گذشتہ صدی میں پہلی جنگ عظیم کے بعد اس حقیقت میں تبدیلی ہوگئی ہے۔ کمیونسٹ روس، فاشی اٹلی اور نازی جرمنی وغیرہ حکومتوں نے اپنے مخصوص نظریات کے تحت قانون سے عوام کی رہنمائی کا بھی کام لیا۔(۴) رسول اللہ ﷺ کی لائی ہوئی شریعت کا غالب رجحان سوسائٹی کی تنظیم کے علاوہ اسے صحیح رُخ پر ڈالنا بھی ہے۔ نئے قانونی ضابطوں پر سماجی ڈھانچے کی تشکیل آپ ﷺ کا پہلا بڑا کارنامہ ہے۔ ہر طبقے اور گروہ کے حقوق مقرر فرما دیے گئے۔ عورت کے اقتصادی حقوق اور مرتبے کو برملا تسلیم کیا۔ بیوہ کو بھی وراثت میں حصہ دار ٹھہرایا۔ ملکیت جایداد کا حق مغربی عورت کو انیسویں صدی میں ملا ہے۔ عورت کو خلع کا حق دیا گیا۔ یہ حق بھی یورپی عورت کو ۱۸۵۷ء کے بعد ہی صحیح طور پر مل سکا ہے۔ غلاموں اور جنگی قیدیوں کے انسانی حقوق متعین فرما دیے۔ پبلک لا اور پرسنل لا میں فرق کا واضح شعور بھی نبی امی ﷺ نے دنیا کو دیا۔(۵) آپ ﷺ نے اہلِ ذمہ کے پرسنل لا کا پوری طرح تحفظ فرمایا۔ یہودی و عیسائی اقلیت کے معاملات اور تنازعات کا تصفیہ ان کے شخصی قوانین کی روشنی میں کیا جاتا تھا۔ اقلیتوں کو یہ قانونی اور عدالتی خود مختاری عہدِ رسالت ﷺ سے لے کر عثمانی ترکوں تک حاصل رہی۔ یہی بات آگے چل کر اسلامی قانون کے آزادانہ ارتقا کا ایک بڑا سبب بنی۔ کیونکہ غیر اسلامی تہذیبوں کی یلغار کے باوجود اسلامی قانون کی انفرادیت قائم رہی۔ قتل در قتل کی روک تھام کے لیے بھی مکمل بندوبست کیا گیا۔ چوری ڈاکہ زنی اور زنا کے بارے میں بھی سخت قوانین نافذ کیے گئے ہیں۔ غرض ایک ایک کرکے وہ سارے سوراخ بند کردیے گئے جو معاشرتی عدمِ استحکام کا باعث بنتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ ما قبل اسلام کی روایات میں سے جو کچھ اسلام کے مزاج سے مطابقت رکھتا تھا، اسلام میں اسے باقی رکھا گیا۔ لیکن یہ سمجھنا سراسر زیادتی ہوگی کہ اسلامی قانون کا مزاج علاقائی یا قبائلی نوعیت کا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عرب قبائل کے علاوہ جو دوسری اقوام اور ممالک

دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے، اسلام نے ان کے ایسے تمام مروجہ رسوم و رواج کو بھی قبول کر لیا جن میں شرعی لحاظ سے کوئی قابل اعتراض بات نہ تھی۔ جہاں کہیں اسلامی نقطۂ نگاہ سے ترمیم و اصلاح کی گنجایش تھی وہاں بھی ضروری تبدیلیوں کے ساتھ موجود روایات کو باقی رہنے دیا گیا۔ حد یہ ہے کہ قرآن و سنت کی ضروری تعلیم کے علاوہ عربی زبان کو بھی کسی علاقے پر مسلط نہیں کیا گیا۔ مختلف اقوام کے علاقائی اور قومی لباس تک سے تعرض نہ کیا گیا۔ صرف اس بات کا خیال رکھا گیا کہ لباس کو ساتر ہونا چاہیے۔ اسلامی قانون کی یہ وہ خصوصیت ہے جو معاشرے میں وحدت کے ساتھ ساتھ تکثیریت کے اصول کی ضامن ہے۔ یہ بات بھی خلافِ واقعہ ہے کہ اسلام نے سرے سے کوئی نئے قوانین متعارف نہیں کروائے۔ جنگ و صلح کے بین الاقوامی قوانین، قتل، چوری، ڈاکہ زنی، زنا، لعان کے فوجداری قوانین، نکاح و طلاق، وراثت، نفقات اور حضانت کے قوانین، زکوٰۃ، عشر، فے، جزیہ، منقولہ اور غیر منقولہ جایداد سے متعلق دیوانی اور مالیاتی قوانین نیز اسلامی اقتصادی قوانین مثلاً مزارعت، مضاربت، شراکت اور امتناعِ ربا و قوانین بیوع اور بہت سے دوسرے قواعد و ضوابط ہیں جو اسلامی قوانین کو دوسرے نظام ہائے قانون سے ممتاز کرتے ہیں۔

دوسرا کارنامہ...... قانون کی حاکمیت

رسول اللہ ﷺ کا دوسرا کارنامہ قانون کی حاکمیت (Rule of Law) سے تعلق رکھتا ہے۔ اس نظریے کا ماحصل یہ ہے کہ پورے ملک میں ایک ہی سپریم لا ہو۔ قانون کی نگاہ میں تمام افراد مساوی ہیں۔ نیز ہر شخص ایک بااختیار اور غیر جانب دار عدلیہ کے ذریعے حسبِ ضرورت اپنا حق وصول کر سکتا ہے۔ ہر آزاد ملک میں قانون کی حاکمیت کو مطلوب و مقصود سمجھا جاتا ہے۔ لیکن صدیوں تک قانون بااثر طبقے کا آلہ کار رہا ہے۔ خطۂ عرب میں حال یہ تھا کہ آزاد فرد کا قاتل غلام ہوتا تو اُس سے قصاص لینا ناکافی سمجھا جاتا۔ اس کے بدلے غلام کے مالک یا کسی اور آزاد رشتے دار کو دھر لیا جاتا۔ اسی طرح آزاد آدمی کسی غلام کو قتل کر دیتا تو قصاص دینا برداشت نہ کیا جاتا، بلکہ کوئی کم تر معاوضہ ادا کیا جاتا۔ آج کے مہذب دور میں بھی جب کہ قانون کی حاکمیت کا بہت چرچا ہے، اہم ترین

مناصب پر فائز لوگ عام عدالتوں میں جواب دہ نہیں ہیں۔ برطانیہ میں قانون کی حکمرانی مروجہ مفہوم کے ساتھ موجود ہے وہاں بھی ملکہ برطانیہ اگر قتل کر دے تو اُس پر مقدمہ نہیں چلایا جا سکتا۔ قانون کی محکومی کو دیکھ کر حکیم سولن پکار اُٹھا تھا۔ "قانون مکڑی کا جالا ہے۔ طاقت ور اس کو توڑ کر نکل جاتا ہے اور کمزور پھنس کر رہ جاتا ہے۔" مولانا ابوالکلام آزاد ایک قدم اور آگے بڑھے۔ "دنیا میں سب سے زیادہ ناانصافیاں میدان ہائے جنگ کے بعد عدالت کے ایوانوں میں ہوئی ہیں۔" کارل مارکس اس دوڑ میں سب سے آگے نکل گیا۔ "قانون جبر و استبداد کا ایک ایسا ادارہ ہے جس کی مدد سے ظالم لوگ بے سہارا اور کمزور انسانوں کو لوٹتے ہیں۔" قانون کے خلاف اس فرد جرم کی تردید آج بھی آسان نہیں ہے۔ یہ سب نظریات عدالتِ نبوی ﷺ کے باہر ہی دم توڑ دیتے ہیں۔

ظہورِ اسلام کے بعد قانون کو سچی حاکمیت نصیب ہوئی۔ حضور ﷺ نے اپنے آپ کو بھی قانون سے کبھی بالاتر نہیں سمجھا۔ حضرت عمرؓ کا بیان ہے کہ میں نے حضور ﷺ کو اپنی ذات کو بھی قصاص کے لیے پیش فرماتے دیکھا ہے۔ آپ ﷺ نے عدالتی معاملات میں ہر قسم کی طبقاتی تفریق کا مکمل خاتمہ کر دیا۔ آپ ﷺ کے عہد مبارک میں ایک یہودی اور نصرانی کی دیت ایک مسلمان کی دیت کے برابر تھی۔ چوری کے ایک مقدمے میں رسول اکرم ﷺ نے بنی ظفر کے انصاری مسلمان طعمہ کے خلاف فیصلہ صادر فرمایا اور یہودی کو باعزت طور پر بری کر دیا۔ یہ فیصلہ طعمہ کی توقعات کے اس قدر برعکس تھا کہ وہ مرتد ہو کر دشمنان اسلام سے جا ملا۔ صحیحین میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ فاطمہ نامی عورت چوری کے الزام میں پکڑی گئی۔ جرم ثابت ہو گیا تو قریش کے بااثر لوگوں نے ملزمہ کو بچانے کی کوشش کی۔ انھوں نے حضرت اسامہ بن زیدؓ کو سفارشی بنا کر آپ ﷺ کے پاس بھیجا۔ حضور ﷺ کو سخت دکھ ہوا۔ آپ ﷺ نے اُس وقت یہ تاریخی الفاظ ارشاد فرمائے:

> "تم سے پہلی اُمتیں اس لیے تباہ ہوئیں کہ ادنیٰ طبقے کا فرد جرم میں ماخوذ ہوتا تو اُسے سزا دی جاتی لیکن خوشحال طبقے کے مجرمین کو چھوڑ دیا جاتا۔ اللہ کی قسم! اگر

فاطمہ بنت محمد (ﷺ) چوری کرے تو میں اُس کے ہاتھ بھی کاٹ ڈالوں گا۔" (صحیح بخاری۔صحیح مسلم)

بے لاگ انصاف کی ایسی مثالیں دنیا میں خال خال ہی ملیں گی۔

تیسرا کارنامہ...... اجتہاد کی ترغیب و تشریح

زندگی ایک بوقلموں وحدت کا دوسرا نام ہے۔زندگی کے ہر میدان میں ایک کشمکش اور نزاع ہے جو قدامت اور جدّت یا روایت اور طباعی کے درمیان جاری ہے۔قانون بھی اس آویزش سے متاثر ہوتا ہے۔ایک مکتبِ فکر قانون کو تمام تر رسوم اور رواج کی بنیاد پر استوار کرنا چاہتا ہے۔ دوسرے گروہ کے نزدیک قانون بھی حیاتیاتی،سماجی اور عمرانی اداروں کی طرح ارتقائی مراحل سے گزرتا ہے۔اس لیے اس کو سراسر جدید تقاضوں کی روشنی میں وضع کرنا ضروری ہے۔ان دونوں انتہاپسندانہ نظریات کے درمیان کسی معتدل راہ کا انتخاب فلسفہ قانون کا ایک اہم مسئلہ ہے۔امریکہ کے ایک جج (Cardoza) نے اس مسئلے کو ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

"آج قانون کی اہم ضرریات میں سے ایک ضرورت یہ بھی ہے کہ ایک ایسا فلسفۂ قانون پیش کیا جائے جو ثبات اور تغیر کے متحارب تقاضوں کے مابین توافق و تطابق پیدا کرے اور یوں قانون کی ترقی کے لیے چند مفید اصول فراہم کرنے کا موجب ہو۔" (٦)

قرآن حکیم چونکہ ابدالآباد تک نوع انسانی کے لیے ضابطۂ حیات ہے،اس لیے اہلِ ایمان کی ایک خوبی قرآن حکیم میں یہ بھی بتائی گئی ہے کہ وہ اللہ کی آیات پر اندھے بہرے ہو کر نہیں گرتے بلکہ اُن میں غور وفکر اور تدبر کرتے رہتے ہیں۔ وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا ۝ (الفرقان: ٧٣) وہ لوگ جنھیں اگر ان کے رب کی آیات سنا کر نصیحت کی جاتی ہے تو وہ اس پر اندھے اور بہرے بن کر رہ جاتے ہیں۔قرآن پاک کی سورۃ التوبۃ آیت ۱۲۲ میں اِس غور وفکر کی ترغیب کے لیے فرمایا گیا:

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ

"تو کیوں نہ نکلے ہر قبیلے سے چند آدمی تا کہ تفقہ حاصل کریں دین میں۔"

نبی اُمی ﷺ نے اس مسئلے کو ایسے موثر طریقے سے حل کیا ہے جس کے بعد ثبات و تغیر کے متحارب تقاضوں کے درمیان آئینی مفاہمت پیدا ہوتی ہے۔ حالات و واقعات میں تبدیلی کی صورت میں قرآن و سنت کے احکام کے عملی انطباق کے لیے قیاس و اجتہاد سے کام لینے کی اجازت ایک تقریری حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ غزوہ خندق کے بعد آنحضرت ﷺ نے غداری کرنے والے یہودِ بنو قریظہ پر حملہ کرنے کا حکم دیا اور صحابہ کو تاکید کی کہ عصر کی نماز وہاں ادا کریں۔ اتفاق سے عصر کا وقت راستے میں ہی ہو گیا۔ بعض صحابہ سمجھتے تھے کہ نمازِ عصر منزل مقصود پر پہنچ کر پڑھنی لازم ہے۔ اس لیے انھوں نے نماز نہ پڑھی۔ دوسرے صحابہ کا خیال تھا کہ حضور ﷺ کے حکم کا اصل منشا وہاں جلد سے جلد پہنچنا تھا۔ اگر عصر کا وقت راستے میں ہی ہو جائے تو نماز میں تاخیر مناسب نہ ہوگی اور انھوں نے راستے میں ہی نماز ادا کر لی۔ آنحضرت ﷺ کو بعد میں دونوں گروہوں کے نقطۂ نظر کا علم ہوا اور آپ نے کسی کی بھی تغلیط و تردید نہ فرمائی۔ ظاہر ہے صحابہ کا یہ اجتہاد عقائد یا عبادات کی فرضیت کے بارے میں نہ تھا۔ ایسے معاملات میں اجتہاد کی اجازت ہے نہ ضرورت۔ ہر چیز روزِ روشن کی طرح واضح ہے۔ اس کا تعلق ہنگامی حالت میں نماز کی ادائیگی کے وقت سے تھا۔

اسلامی حکومت کی حدود میں تیز رفتار اضافے کے بعد نئی اقوام دائرہ اسلام میں داخل ہو رہی تھیں اور روزمرہ معاملات میں نئے نئے مسائل سر اُٹھا رہے تھے۔ اِس صورت میں قرآن و سنت کے محکم احکام کی روشنی میں نئے مسائل کے استنباط کے لیے اُمت کو رہنما اصول عطا کیے گئے۔ ایک مشہور روایت کے مطابق حضور ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل ؓ کو یمن کا قاضی بنا کر بھیجتے وقت دریافت فرمایا۔ معاذ ؓ! تم ان جھگڑوں کا فیصلہ کیسے کرو گے؟ عرض کیا: کتاب اللہ سے۔ ارشاد ہوا: اگر اس میں نہ ملا تو؟ وہ بولے: سنت رسول اللہ ﷺ سے۔ آپ ﷺ نے پھر پوچھا: اگر اس میں بھی نہ ملا تو؟ انھوں نے جواب دیا: پھر میں اجتہاد کروں گا۔ حضور ﷺ یہ سن کر مسرور ہوئے اور فرمایا:

الحمد للہ الذی وفق رسول رسول اللہ لما یرضی رسول اللہ

''اُس اللہ کا شکر ہے جس نے رسول اللہ ﷺ کے فرستادہ کو اس بات کی توفیق دی جس پر اللہ کا رسول راضی ہے۔'' (ترمذی)

یہ بات خاص طور پر ملحوظ رہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی حیاتِ اقدس میں صحابہ کرام کو غیر ضروری سوالات کرنے سے منع فرمایا تھا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی کے نزدیک اس کی حکمت یہ تھی کہ ممکنہ مسائل کے بارے میں متعین جوابات دے دیئے جاتے تو نئے حالات میں اُمت اجتہادی اختلاف کے ذریعے غور و فکر کی سہولت سے محروم رہ جاتی۔ (۷) یہیں سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ خلیفہ یا سربراہِ حکومت کے انتخاب کے لیے بھی آپ ﷺ نے کسی خاص طریق انتخاب پر زور کیوں نہیں دیا۔ دراصل اسلامی حکومت میں ہر وہ طریق انتخاب مستحسن ہے جس میں زیادہ سے زیادہ اصولِ شورائیت کی کارفرمائی موجود ہو۔ چنانچہ خلفائے راشدین میں سے ہر ایک کے طریق انتخاب کی نوعیت اور طریق کار الگ الگ تھا۔

اجتہاد کے سلسلے میں مندرجہ ذیل امور کو پیشِ نظر رکھنا ہوگا۔

(۱) قرآن و سنت کی بیان کردہ قانونی دفعات کے برعکس کوئی قانون نہیں بنایا جا سکتا۔ ان دفعات کو اسلامی قانون میں دوامی حیثیت حاصل رہے گی۔ قانون فطرتاً بھی قدامت پسند ہوتا ہے۔ بنابریں کسی نظام قانون کا ایک حصہ ضرور قطعی اور غیر متبدل ہونا چاہیے۔ انگلستان میں تو قانون کے الفاظ میں بھی مسلسل تبدیلی کو پسند نہیں کیا جاتا۔ آج بھی برطانوی قانون کی زبان وہی ہے جو وکٹوریہ کے زمانے میں مستعمل تھی۔ قانونی دستاویزات میں بھی پرانی تراکیب اور بندشیں استعمال کی جاتی ہیں۔ (۸) چونکہ ایک کوما (Comma) کے تبدیل ہونے سے بھی معنی میں فرق پڑ جاتا ہے۔ اس لیے بسا اوقات ایک کوما کی تبدیلی کے لیے پارلیمنٹ کو ایک قانون (Act) پاس کرنا پڑتا ہے۔ (۹)

(۲) قرآن حکیم میں نکاح، طلاق، وصیت، میراث، خرید و فروخت، کفالت اور ارتکابِ جرم جیسے

معاملات کے لیے تقریباً چند سو احکامی آیات ہیں۔ احکامی احادیث کو ملا کر یہ تعداد زیادہ سے زیادہ چند ہزار تک پہنچ سکتی ہے۔ ہر چند کہ یہ آیات و احادیث اپنی جامعیت میں بے مثال ہیں، حالات کے جدید تقاضے نو بنو مسائل کھڑے کر دیتے ہیں۔ زمان و مکان کے اس اختلاف کی قانون سازی کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس صورت میں قرآن و سنت کے احکام کی روح کو برقرار رکھتے ہوئے نئے قوانین بنائے جائیں گے۔ یوں اجتہاد کی اجازت دے کر حضور ﷺ نے اسلامی قانون کو بے پایاں تخلیقی امکانات سے مالا مال کر دیا۔ یہ قانون کسی دور میں بھی جمود کا شکار نہیں ہو سکتا۔ اس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی قانون مستقل اور تغیر پذیر اقدار کے حسین امتزاج کا نام ہے۔

ثبات و تغیر کا یہی ملاپ ہے جس کی بنا پر فقہا نے اسلامی قوانین کے نفاذ کے لیے زمان و مکاں کے اختلافات نیز عرف، معلومات اور ضروریات میں جوہری تبدیلی کے پیشِ نظر سابقہ فتوے سے رجوع کو دین کا عین تقاضا سمجھا ہے۔ دارالسلام اور دارالحرب میں حدود کے نفاذ کی مختلف صورتوں میں فرق کی یہی وجہ ہے۔ امام ابو حنیفہؒ اور ان کے شاگردوں (ابو یوسفؒ اور محمدؒ) کے درمیان دو تہائی اختلافات کو علمائے احناف نے زمانے کی تبدیلی قرار دیا ہے۔(۱۰) امام شافعیؒ بغداد سے مصر منتقل ہوئے تو وہاں کے حالات یکسر مختلف تھے۔ چنانچہ انھوں نے وہاں بہت سے فقہی مسائل میں اپنی ہی سابقہ رائے کے برعکس فتوے دیے۔(۱۱)

دین کی مبادیات کے اندر رہتے ہوئے حالات کی تبدیلی کے پیشِ نظر فتویٰ میں تبدیلی کے اس عمل کو اسوہ رسول ﷺ اور عمل صحابہؓ سے جواز حاصل ہے۔ حضور ﷺ نے ایک نوجوان کو روزے کی حالت میں اپنی بیوی کا بوسہ لینے کی اجازت نہ دی۔ اسی محفل میں یہی اجازت ایک معمر شخص کو عطا فرمائی۔ ایک ہی سوال کے دو مختلف جواب سن کر صحابہؓ کا تجسس بڑھ گیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں نے تمھاری بے چینی کو محسوس کیا ہے۔ لیکن بات یہ ہے ان الشیخ یملك نفسه (مسند احمد)۔''بوڑھا شخص اپنے آپ پر قابو رکھتا ہے۔'' زیارت قبور کے مسئلے کی نوعیت بھی ایسی ہی

ہے۔ دعوت اسلامی کے آغاز میں جب قبر پرستی کا اندیشہ تھا تو رسول اللہ ﷺ نے زیارت قبور سے منع فرمایا۔ لیکن جب مسلسل تربیت کے بعد صحابہ کرامؓ کا عقیدۂ توحید پختہ ہوگیا تو آپ ﷺ نے زیارت قبور کی اجازت دے دی۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''میں نے تمھیں زیارت قبور سے روکا تھا۔ مگر اب تم ان کی زیارت کر سکتے ہو۔'' (مسلم، ابوداوٗد، نسائی) حضرت علیؓ کے نزدیک کسی کام کو انجام دینے سے پہلے کا فتویٰ اس کام کو انجام دینے کے بعد والے فتوے سے مختلف ہوسکتا ہے۔ اس کی بہترین مثال حضرت ابن عباسؓ کے ہاں ملتی ہے۔ ان کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور پوچھا: ''اے رسول اللہ ﷺ کے ابن عم! کیا قاتل کے لیے توبہ ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے پوچھنے والے کو غور سے دیکھا اور فرمایا: ''قاتل کے لیے کوئی توبہ نہیں ہے۔'' جب یہ شخص چلا گیا تو لوگوں نے پوچھا۔ اس مسئلے میں پہلے تو آپ یہ فتویٰ نہیں دیا کرتے تھے۔ انھوں نے جواب دیا۔ ''میں نے اس شخص کے چہرے پر غصے کے آثار دیکھے جس سے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کسی مومن کا خون بہانا چاہتا ہے۔'' (۱۲) یہ حضور ﷺ کی تربیت کا ہی اثر تھا کہ صحابہؓ تابعین اور تبع تابعین کے زمانے میں قاضی اور فقہا فیصلے دیتے وقت قانون کے الفاظ (Letter) کے ساتھ روح (Spirit) کو بھی سامنے رکھتے تھے۔ اس احتیاط کا مقصد لوگوں کو بے جا مشقت سے بچانا اور ان کے لیے دین میں آسانی پیدا کرنا ہے۔ اجتہاد کی اصل روح یہی ہے۔ شرط یہ ہے کہ ایسا اجتہاد شریعت کے منصوص احکام کے مخالف نہ ہو۔

اجتہاد کے متعلق ذہنوں میں ایک سوال یہ اُٹھ سکتا ہے کہ کیا مجتہدین کی مختلف بلکہ متضاد آرا ملت میں فقہی افراتفری کا باعث نہ بن جائیں گی۔ ویسے بھی آج کے دور میں کوئی ایک مجتہد بھی علوم جدیدہ سے مکمل آگہی کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ بنابریں اُس کے ہاں غلط استنباط کی گنجائش موجود رہتی ہے۔ قرآن وسنت میں ان مسائل کا حل بھی اجتماعی اجتہاد کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ اس بارے میں سیدنا حضرت علیؓ سے روایت ہے:

''میں نے نبی کریم ﷺ سے سوال کیا۔ یارسول اللہ ﷺ! اگر ہمارے سامنے کوئی

ایسا مسئلہ پیش ہو جس کے بارے میں کتاب وسنت میں کوئی اجازت یا ممانعت موجود نہ ہو تو اس صورتِ حال میں آپ ہمیں کس بات کا حکم دیتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا۔ ایسے موقع پر تم فقہائے عابدین سے مشورہ کرو اور اس میں انفرادی رائے کو نافذ نہ کرو۔ (کنز العمال)

خلیفہ اول سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ اس اصول کے مطابق مہاجرین و انصار کے اہل رائے و اہل فقہ کے کچھ لوگوں کو اکٹھا کر کے اجتماعی مشاورت کے تقاضے پورا کرتے۔ اس حلقہ مشاورت میں حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت ابی بن کعبؓ اور حضرت زید بن ثابتؓ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ایسی ہی اجتماعی مشاورت کے ذریعے عہد خلفائے راشدین میں منکرین زکوٰۃ سے جنگ اور جمع قرآن جیسے انقلابی فیصلے کیے گئے۔ جاگیرداری کا راستہ روکنے کے لیے سوادِ عراق اور شام کی مفتوحہ زمینوں کو مجاہدین میں تقسیم کرنے کی بجائے مقامی لوگوں کو بحال کر کے اُن پر خراج عائد کر دیا گیا۔ ایک ہی قرآنی رسم الخط پر اتفاق بھی اجتماعی اجتہاد کی برکت ہے۔ اجتماعی اجتہاد کے ذریعے قرآن وحدیث کے اُن احکام پر بھی عمل ہو جاتا ہے جن میں تفرقہ سے پرہیز اور جماعت سے وابستگی کا حکم دیا گیا ہے۔ (۱۳)

اِس جائزے سے یہ بات ظاہر ہے کہ شریعت کا مقصد بلاوجہ انسانی سوچوں پر پہرے بٹھانا نہیں۔ ایک بڑا کھلا میدان ہے جس میں قرآن وسنت کی ہدایات کی روشنی میں غور وفکر سے انسانی تہذیب وتمدن کا قافلہ ترقی کی بے شمار اور ناقابل تصور منازل طے کر سکتا ہے۔

چوتھا کارنامہ...... عدیم النظیر فیصلے

رسول اللہ ﷺ مسلمانوں کے سب سے بڑے قاضی تھے۔ منصب قضا پر آپ ﷺ کو خود اللہ تعالیٰ نے متعین فرمایا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيٓ أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا۝ (سورۃ النساء:۶۵)

''پس نہیں، تیرے رب کی قسم! یہ لوگ مومن نہیں ہیں جب تک اپنے نزاعات میں تمھی کو حکم نہ مانیں اور جو کچھ فیصلہ تم کرو اس پر اپنے دلوں میں تنگی محسوس کیے بغیر اس کے آگے سر تسلیم خم نہ کر دیں۔''

اسی طرح ایک دوسرے مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ۝ (سورۃ الاحزاب:۳۶)

''کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اُس کا رسول ﷺ کسی معاملے کا فیصلہ کر دے تو پھر اُسے اپنے اِس معاملے میں خود فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل رہے اور جو کوئی اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کرے تو وہ صریح گمراہی میں پڑ گیا۔''

پس حضور ﷺ ایک قانون ساز ہی نہ تھے، اسلامی ریاست کے چیف جسٹس بھی تھے۔ تمام تصفیہ طلب مقدمات میں آپ ﷺ کی طرف رجوع کیا جاتا۔ جس طرح اعلیٰ عدالتوں کے فیصلے دوسری عدالتوں کے لیے نظیر (Precedent) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسی طرح قرآنی احکامات کے مطابق قرآن کے مجمل احکام کی جو تشریح حضور ﷺ نے کی وہ اسلامی قانون کا دوسرا حتمی ماخذ ہے۔ خالص آئینی اور قانونی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو بھی قرآن کے بعد حدیث کی حجیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ سب جانتے ہیں کہ کسی بھی زبان کے الفاظ، جملوں اور محاوروں میں مختلف معانی کا احتمال ہوتا ہے۔ اِن مختلف و متنوع بلکہ بظاہر متضاد احتمالات میں سے کسی مفہوم کو متعین کرنے کے لیے ایک بالاتر اتھارٹی کی ضرورت ہوتی ہے۔ بالکل ایسے جیسے آئین کی کسی دفعہ کی مختلف تعبیرات کی صورت میں سپریم کورٹ کی تشریح حتمی اور معتبر سمجھی جاتی ہے۔ قرآن کریم کے حوالے سے یہی اتھارٹی نبی اکرم ﷺ کو حاصل ہے۔ (۱۴)

قدرت نے رسول اللہ ﷺ کو حیرت انگیز قوت فیصلہ سے نوازا تھا۔ ۳۵ سال کی عمر میں آپ ﷺ نے حجر اسود کی تنصیب کے قضیے کو منصفانہ طریقہ سے حل کر کے قبائلی تصادم کا خطرہ ٹال دیا۔ ذیل میں آپ ﷺ کے بہت سے عدیم النظیر فیصلوں میں سے چند ایک کا ذکر کیا جاتا ہے:

ایک صحابی نے عرض کیا یا رسول اللہ! اگر مجھ سے کوئی میرا مال چھین لینے کے درپے ہو تو میں کیا کروں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تم مزاحمت کرو۔ صحابی نے عرض کیا: اگر مجھے جان سے مار دے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تمھیں رتبہ شہادت حاصل ہوگا۔ صحابی نے عرض کیا: اگر وہ میرے ہاتھ سے ہلاک ہو جائے تو؟ آپ ﷺ نے جواب دیا: وہ جہنم میں جائے گا۔ انسان کے حق مدافعت کی توثیق کے لیے حضرت یعلی بن اُمیہؓ کی یہ روایت بھی بہت اہم ہے کہ اُن کا ایک نوکر دوسرے آدمی سے لڑ پڑا۔ دونوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ کاٹ کھایا۔ ان میں سے ایک نے جب اپنا ہاتھ دوسرے کے منہ سے کھینچ کر نکالا تو اُس کے دانت گر پڑے۔ اُس نے حضور ﷺ سے فریاد کی کہ دانتوں کا معاوضہ دلایا جائے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا وہ اپنے ہاتھ کو تیرے منہ میں چھوڑ دیتا تاکہ تو اُس کو اُونٹ کی طرح چباتا رہتا۔ (۱۵)

سعد بن عبادہؓ حضور نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک شخص کو لائے جو اپاہج اور بیمار تھا۔ وہ اپنے قبیلہ کی ایک لونڈی کے ساتھ ملوث پایا گیا۔ آپ ﷺ نے حد جاری کرنے کا حکم فرمایا۔ عرض کیا گیا کہ یہ برداشت نہ کر پائے گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ایک ایسی شاخ لو جس میں ایک سو ٹہنیاں ہوں۔ پھر اُسے اس کے ساتھ ایک دفعہ مارو۔ ابن قتیبہ کی شرح میں ہے کہ اسے کوڑے لگاؤ۔ لوگوں نے عرض کیا کہ ہمیں خدشہ ہے کہ وہ مر جائے گا۔ آپ ﷺ نے حکم دیا کہ اُسے عثقال کے ساتھ مارو۔ وہ عثقال کھجور کے خوشہ کو کہتے ہیں جس کا نام اہل مدینہ کی اصطلاح میں عذق ہے۔ (۱۶)

عمر بن شعیب اپنے والد اور وہ اپنے دادا سے اور وہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ جب کوئی عورت دعویٰ کرے کہ اُس کے خاوند نے اُسے طلاق دے دی اور اُس پر ایک عادل گواہ پیش کرے تو اُس کے خاوند سے حلف لیا جائے گا۔ اگر وہ حلف اُٹھالے گا تو گواہ کی گواہی باطل ہو

جائے گی۔لیکن اگر وہ حلف سے انکار کرے تو اُس کا انکار دوسرے گواہ کے مترادف ہوگا اور طلاق قائم ہوجائے گی۔(۱۷)

موطا میں امام مالکؒ سے مروی ہے کہ براء بن عازب کی اونٹنی ایک شخص کے باغ میں داخل ہوئی اور اُس نے باغ کا نقصان کیا۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ باغ والوں کے ذمے دن کے وقت اُس کی حفاظت ہے اور چوپائے جو نقصان رات کو کریں، اُس کا ذمہ چوپائے کے مالکوں پر ہے۔

حضور نبی اکرم ﷺ نے بنی جثعم کی ایک فتنہ پرور جماعت کی سرکوبی کے لیے ایک فوجی دستہ روانہ فرمایا۔باغیوں نے سجدہ کر کے اسلام کا اظہار کیا اور پناہ مانگی لیکن اُنھیں قتل کر دیا گیا۔رسول اللہ ﷺ تک یہ بات پہنچی تو آپ ﷺ نے نصف دیت کا حکم دیا۔بعض علما کا قول ہے:ممکن ہے یہ حکم اس لیے دیا گیا ہو کہ اُن کا سجدہ اسلام کے مطابق ہو اور ممکن ہے اسلام کے مطابق نہ ہو۔اس صورت میں دیت نہ ہوگی۔(۱۸)

ایک انصاری اپنے باغ میں اپنے خاندان کے ساتھ رہتے تھے۔اُدھر ایک شخص کا کھجور کا ایک درخت تھا۔جو اس باغ میں سے گزر کر اپنے کھجور کے درخت کے پاس جاتا رہتا جس سے انصاری کو ناحق تکلیف ہوتی۔انھوں نے اس بارے میں سمجھوتہ کی کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔پھر انھوں نے یہ مقدمہ دربارِ رسالت ﷺ میں پیش کیا۔رسول اللہ ﷺ نے مدعا علیہ کو تین متبادلات (Options) پیش کیے۔(الف) اپنا کھجور کا درخت انصاری کو فروخت کر دو۔(ب) اس کا کسی دوسرے درخت سے تبادلہ کرلو۔(ج) انصاری کو تحفہ میں دے دو اور عوض میں فلاں چیز لے لو۔انھوں نے تینوں باتوں سے انکار کیا۔پھر آپ ﷺ نے اپنا فیصلہ صادر فرمایا۔"تم تکلیف پہنچانے والے ہو۔" تب آپ ﷺ انصاری سے مخاطب ہوئے اور حکم دیا۔اذھب فاخلع نخلہ۔"جاؤ اور اِس کے کھجور کے درخت کاٹ ڈالو۔"(۱۹)

صحاح ستہ میں موجود ایک حدیث کے مطابق ایک انصاری صحابی خیبر میں مقتول پائے

گئے۔ مقتول کے ورثا نے یہودِ خیبر پر قتل کا الزام عائد کیا لیکن ثبوتِ جرم کے لیے ان کے پاس کوئی شہادت نہ تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے مسلمان ورثا کو قسامہ کی تجویز پیش کی۔ ورثا کسی ٹھوس ثبوت کے بغیر قسم کھانے کے لیے آمادہ نہ تھے۔ یہود قسم دینے کے لیے آمادہ تھے۔ مگر مدعیان نے کذب و افترا پر مبنی ان کے عمومی رویہ کو دیکھتے ہوئے ان کی قسم کو ناقابل قبول قرار دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے ورثا کی اشک شوئی کے لیے معاملہ رفع دفع کرنے کے لیے اور مذہبی تصادم کو ٹالنے کے لیے دیت ادا کر کے معاملے کا تصفیہ کر دیا۔ ایک روایت کے مطابق آپ ﷺ نے مکمل دیت کا ذمہ دار یہود کو قرار دیا کیونکہ یہ قتل ناحق اُن کے علاقے میں ہوا تھا۔ دوسری روایت کے مطابق آپ ﷺ نے نصف دیت کی حد تک یہود سے تعاون کیا۔ تیسری روایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے بیت المال سے خود ہی دیت کی رقم ادا کی۔

مصنف عبدالرزاق میں عبداللہ بن عمرو بن العاص ؓ روایت کرتے ہیں۔ ایک عورت کو اس کے خاوند نے طلاق دے دی۔ خاوند نے بچے کی اس ماں سے بچہ چھین لینا چاہا۔ اُس عورت نے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا: یا رسول اللہ ﷺ! میرا پیٹ میرے بچے کے لیے برتن تھا۔ میرا سینہ اس کے لیے مشک تھا، جس سے وہ پانی پیتا تھا۔ میری گود اس کے لیے آرام کی جگہ تھی۔ مگر میرا خاوند بچے کو مجھ سے چھین لینا چاہتا ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: تو اُس بچے کی زیادہ مستحق ہے بشرطیکہ تو دوسرے نکاح سے اجتناب کرے۔ (۴۰)

رسول اللہ ﷺ کی قانونی بصیرت کا احاطہ تو انسانی بس سے باہر ہے۔ تاہم کچھ مزید گوشے یہاں پیش کیے جاتے ہیں۔ یہ وہ قوانین ہیں جن کی رفعتوں کو دنیا بہت بعد میں پہنچی۔ صحرائے عرب کے اُمی لقب قانون ساز ﷺ کے ذہن رسا نے ان تفصیلات کو سیکڑوں برس قبل ہی طے کر دیا تھا۔ ہم نے یہ معلومات سابق جسٹس شیخ عبدالحمید کے ایک مقالے سے اخذ کی ہیں:

(الف) ''کوئی مسلمان کسی ایسے شخص کے مال و متاع کا وارث نہیں بن سکتا جسے اس نے مار ڈالا ہو۔ ایسی ممانعت کے بغیر یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ وارث حقِ وراثت جلد حاصل کرنے

کے لیے کہیں اپنے اسلاف کو ہلاک نہ کر دے۔''

(ب) ''اگر کسی حاملہ عورت کو مار ڈالا جائے تو رحمِ مادر میں مرنے والے بچے کا قصاص بھی قابل ادائیگی ہوگا۔ یہ اُس رائج الوقت قانون سے بہتر ہے جس کے بموجب رحم کے اندر مرنے والے بچے کی کوئی پروا نہیں کی جاتی۔ مجھے کسی ایسے نظام قانون کا علم نہیں ہے جس کے تحت رحم کے اندر پرورش پانے والے بچے کے قاتل پر تاوان ڈالا گیا ہو۔ دنیا میں بہت کم آئین ساز ایسے ہوں گے جو اس قدر جزئیات پر نظر رکھتے ہوئے انصاف چاہیں۔''

(ج) ''احادیث نبوی ﷺ کے مطابق ہبہ (Gift) کرنے کی اجازت ہے اور سوائے اس کے کہ ایک باپ اس ہبہ نامے کی تنسیخ کر سکتا ہے، جو اس نے اپنے بیٹے کے نام میں تحریر کیا ہے، باقی تمام ہبہ نامے ناقابل تنسیخ ہیں۔ باپ کی طرف سے بیٹے کے نام ہبہ نامہ صرف اس وقت منسوخ ہو سکتا ہے جبکہ ہبہ کی ہوئی جایداد بالکل اسی صورت میں موجود ہو جو ہبہ کرنے کے وقت تھی۔ لیکن اگر اسے کسی اور صورت میں بدل دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ہبہ کی ہوئی اراضی پر عمارت تعمیر کر لی گئی ہے تو وہ ناقابل تنسیخ ہے۔ اس امتیازی صورت سے ظاہر ہوتا ہے کہ قانون وضع کرنے والے کی دماغی صلاحیت کس درجے منصفانہ تھی۔''

(د) ''حضور ﷺ حق شفعہ کے قانون (Law of Pre-emption) کے شارع ہیں، کیونکہ ان سے قبل یہ قانون کہیں نہیں تھا۔ اس قانون کے تحت کسی جایداد غیر منقولہ زمین یا مکان کے ایک حصے دار کو یہ ترجیحی حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے ساجھی کا حصہ خرید لے۔ اجنبی لوگ، صرف دوسرے حصے داروں کی رضامندی یا خریداری سے ان کے انکار پر، خرید سکتے ہیں۔ اس اصول پر آنحضرت ﷺ نے خریداری کا ترجیحی حق ان لوگوں کو دیا جنھیں بیچنے والے کے ساتھ ساتھ فروخت ہونے والی جایداد پر سے ہو کر گزرنے کا حق حاصل ہو۔ یہ قاعدے اس لیے وضع کیے گئے تاکہ اجنبی لوگوں کو حصہ داری سے الگ رکھا جائے۔ کیونکہ ناپسندیدہ لوگوں کے داخلے سے عام طور پر جھگڑے کھڑے ہو جاتے ہیں۔''

(ر) ''اگر خریدنے والے اور بیچنے والے کے درمیان کسی چیز کی فروخت پر کوئی تنازع کھڑا ہو جائے اور وہ چیز اُس وقت موجود ہو تو اُس صورت میں حضور ﷺ کے قاعدے کے مطابق بیچنے والے کے بیان پر اعتماد کیا جائے گا۔ اس صورت میں خریدار کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ اس بیان کو قبول کرے یا رد کردے۔ اگر وہ قبول کرے تو جھگڑا ختم ہو جائے گا۔ اگر رد کردے تو وہ چیز فروخت کنندہ کو واپس مل جائے گی۔ یہ ایک مشہور قانونی اصول کی عمدہ مثال ہے جس کے تحت دونوں فریق سابقہ حالت پر واپس چلے جاتے ہیں۔''(۲۱)

پانچواں کارنامہ...... قاضی کے لیے ضابطۂ اخلاق

اسلامی حکومت کی حدود میں اضافہ ہوگیا تو رسول اللہ ﷺ کی ذمہ داریاں بھی بے پناہ بڑھ گئیں۔ چنانچہ تقسیم کار کے طور پر آپ ﷺ نے مختلف صحابہؓ کو مختلف علاقوں میں حاکم اور قاضی مقرر کیا۔ اس سلسلے میں حضرت علی بن ابی طالبؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت العلائی بن حضرمی، حضرت معقل بن یسارؓ، حضرت عمرو بن العاصؓ، حضرت عقبہ بن عامرؓ، حضرت عتاب بن اسیدؓ، حضرت دحیہ کلبیؓ، حضرت عمر بن خطابؓ، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت زید بن ثابتؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے نام قابل ذکر ہیں۔ منصب قضا کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے آپ ﷺ نے ان صحابہ کرامؓ کی خصوصی تربیت فرمائی تھی۔ چند مثالیں:

سنن ابو داؤد میں امام ترمذی نے حضرت علیؓ کی روایت نقل کی کہ مجھے نبی ﷺ نے یمن کا قاضی مقرر کر کے بھیجا۔ میں نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ ﷺ! آپ ﷺ مجھے قاضی بنا رہے ہیں۔ میں نوعمر ہوں اور مجھے تجربہ بھی نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ اللہ عزوجل تمھاری رہنمائی کرے گا اور تمھاری زبان سے صحیح فیصلے کرائے گا۔ پھر آپ ﷺ نے نصیحت فرمائی کہ جب فریقین تمھارے سامنے آئیں تو یکطرفہ طور پر فیصلہ نہ کرنا بلکہ دوسرے فریق کی بات بھی اُسی طرح سننا جیسے پہلے کی سنی تھی۔

مسند امام احمد میں ہے۔ دو شخص حضور ﷺ کی خدمت میں اپنا جھگڑا لے کر آئے۔

آپ ﷺ نے حضرت عمرو بن العاصؓ سے فرمایا: عمرو ان کے درمیان فیصلہ کرو۔ انھوں نے عرض کیا۔ حضور ﷺ! آپ یہ کام مجھ سے بہتر کر سکتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ حضرت عمروؓ نے عرض کیا۔ ''اگر میں نے صحیح فیصلہ کیا تو مجھے کیا اجر ملے گا۔'' آپ ﷺ نے فرمایا۔ ''اگر تم نے ان کے درمیان صحیح فیصلہ کیا تو تمھیں دہرا اجر ملے گا اور اگر تمھارا اجتہاد غلط ہوا تو پھر ایک نیکی ملے گی۔''

منصب قضا کی نزاکت کے پیش نظر رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہؓ کو واضح ہدایات دیں۔ حضرت ابوہریرہؓ کی ایک روایت کے مطابق حضور ﷺ نے فرمایا:

من جعل قاضیاً بین الناس فقد ذبح بغیر سکین

''جو منصب قضا پر فائز کیا گیا یا جسے لوگوں کا قاضی بنا دیا گیا اسے گویا الٹی چھری سے ذبح کر دیا گیا۔''

دوسری طرف ایک اور حدیث صحیح ہے۔

سبعة یظلهم الله تحت ظل عرشه یوم لا ظل الا ظله

''سات آدمی ایسے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اُس روز اپنے عرش کے سایے میں جگہ دے گا جب اس کے سوا کوئی دوسرا سایہ نہ ہوگا۔'' اِن سات آدمیوں میں سب سے پہلے آپ ﷺ نے عادل حاکم کو شمار کیا۔ (۲۲)

اس تہدید و ترغیب کے بعد صحابہ کرامؓ اول تو منصب قضا قبول کرنے سے احتراز کرتے اور اگر رسول اللہ ﷺ کا حکم ہوتا تو صحیح فیصلے تک پہنچنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے۔ اسلامی معاشرے میں منصب قضا کی اہمیت کے پیش نظر ایک فقیہ اور قاضی کا مقام عام عالم دین سے بلند سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ فلپ۔ کے۔ ہٹی۔ واضح طور پر کہتا ہے: The jurist was always given precedence over the theologian.۔ (۲۳) رسول اللہ ﷺ منصب قضا پر تقرر سے پہلے اپنے قاضیوں کو مختلف ہدایات سے نوازتے۔ اِن ہدایات کا تعلق بعض اوقات صرف اخلاقی تلقین

سے تھا۔ مثلاً جس صحابی کو حکم یا حاکم بنا کر بھیجتے، اُس سے فرماتے: ''مظلوم کی بددُعا سے بچو کیونکہ اُس کے اور اللہ کے مابین کوئی حجاب نہیں ہوتا۔'' بعض اوقات آپ کسی خاص معاملے میں صحابہ کو خصوصی ہدایت سے نوازتے۔ نبی اکرم ﷺ نے فتح مکہ کے بعد عتاب بن اسیدؓ کو حاکم اور قاضی مقرر کیا اور فرمایا: ''عتابؓ! لوگوں کو اُس مال کی بیع سے منع کرو جو اُن کے قبضہ میں نہ ہو اور اُس چیز کا نفع لینے سے روکو جس کی ضمانت کی ذمہ داری وہ قبول نہ کریں۔'' اور بعض اوقات بحیثیت منصف کچھ عمومی اصول وقواعد سے بھی انھیں آگاہ کیا جاتا تھا۔

ایک منصف کی حیثیت سے آپ ﷺ نے وقتاً فوقتاً جو قانونی اصول بیان فرمائے وہ آج بھی قاضی یا جج کے لیے ضابطۂ اخلاق مہیا کرتے ہیں۔

☆ رسول اللہ ﷺ کا اصول تھا کہ مدعی اور مدعا علیہ دونوں کے بیانات سن کر فیصلہ دیتے۔ کسی ایک فریق کے بیان پر اعتماد کر کے یک طرفہ کارروائی نہ کرتے۔ حضرت علیؓ کو یمن بھیجتے وقت وصیت فرمائی:

فاذا جلس بين يديك الخصمان فلا تقضي حتى سمع كلام الاخر كما سمعت كلام الاول فانه احرى ان يتبين لك وجد القضاء۔

☆ قانون لوگوں کی نیتوں اور عزائم کا مواخذہ نہیں کرتا۔ حضور ﷺ بھی ہر مقدمے میں روداد کے مطابق فیصلہ دیتے تھے۔ فرمایا:

امرت ان احكم بالظاهر والله يتولى السرائر

☆ عدالتی کارروائی کے کسی مرحلے پر بھی قاضی کی جانب سے کسی ایک فریق کے حق میں غیر شعوری جھکاؤ بھی دوسرے فریق کے اعتماد کو ٹھیس پہنچا سکتا ہے۔ فقہا نے تو اس بات کو بھی مناسب نہیں سمجھا کہ قاضی عدالت میں کسی کو پہلے سلام کرے یا کسی کے سلام کا جواب تک دے۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

سوى بين الخصمين فى لحظك و نعطك

☆ مقدمے میں کسی منصفانہ فیصلے پر پہنچنے کے لیے قاضی کو ہر قسم کے ذہنی کھچاؤ یا غیظ وغضب سے آزاد ہونا چاہیے۔ایک مغلوب الغضب قاضی ذاتی جذبات سے مغلوب ہو کر مجرم کو اس کے جرم کی مقدار سے بڑھ کر سزا دے گا اور انصاف نہ کر سکے گا۔حضور ﷺ نے تنبیہ فرمائی۔

لا یقضی القاضی بین اثنین و هو غضبان

☆ بیہقی اور طبرانی نے حضرت ابو سعیدؓ سے روایت نقل کی ہے کہ قاضی صرف ایسی حالت میں فیصلے کرے جب کہ اچھی طرح سے سیر ہو یعنی شدید بھوک اور پیاس کی حالت میں فیصلے نہ کرے۔

لا یقضی القاضی الا و هو شبعان ریان

☆ مجرم کو ثبوت جرم پر ہی سزا دی جائے گی۔اگر اس کے خلاف شہادتیں کمزور ہوں جس سے اس کا جرم مشتبہ ہو جائے تو اسے شک کا فائدہ دینا ضروری ہے۔قانون کا مقصد ملزموں کو الجھا کر بلاوجہ جیل کی کوٹھریوں میں محبوس کر دینا نہیں ہے۔حضور ﷺ نے فرمایا۔

ان الامام ان یخطی فی العفو خیر من ان یخطی فی العقوبة

چھٹا کارنامہ...... نظامِ جرم وسزا

جرم کیا ہے؟ اسلام کے نزدیک پانچ بنیادی امور کا تحفظ ہر چیز پر مقدم ہے۔یعنی تحفظِ دین، تحفظِ نفس، تحفظِ عقل، تحفظِ نسل اور تحفظِ مال۔انھیں مقاصد شریعت بھی کہا جاتا ہے۔(۲۴) کوئی فعل مذکورہ مقاصد میں سے کسی ایک کو بھی مجروح کرتا ہو تو وہ جرم ہے۔مثال کے طور پر شراب پینے سے عقل وحواس ماؤف ہو جاتے ہیں اور شراب نوشی کرنے والا دوسروں کے لیے اور خود اپنے لیے بھی وبال جان بن جاتا ہے۔اس لیے اسلام کے نزدیک شراب نوشی ایک مجرمانہ فعل ہے اور مجرم سخت سزا کا مستحق ہے۔چنانچہ حنفی فقہا نے قرآن وسنت کی روشنی میں پانچ قسم کے جرائم...... زنا، قذف، سرقہ، حرابہ اور شربِ خمر...... کو قابل حد قرار دیا ہے۔امام ابن تیمیہؒ اور بہت سے دوسرے فقہا نے دورِ رسالت کے نظائر اور آثارِ صحابہ کی روشنی میں توہین رسالت (Blasphemy) کو بھی حد

میں شامل کیا ہے کیونکہ اس سے بھی حفاظتِ دین کا اصول مجروح ہوتا ہے۔ اسلامی نظام جرم وسزا کے مطابق حدود اللہ میں کمی بیشی کا اختیار کسی کو حاصل نہیں ہے۔ جنگ یا قحط جیسے اضطراری حالات میں محض وقتی طور پر نفاذِ حدود کا عمل معطل ہوسکتا ہے۔ مذکورہ پانچ جرائم کے علاوہ جو جرائم ہوتے ہیں اُن کی سزا کو تعزیر کہتے ہیں اور اُن میں حالات و واقعات کے حوالے سے قیاس و اجماع کی روشنی میں کمی بیشی ممکن ہے۔

قتل ناحق ایک ایسا جرم ہے جو ایک لحاظ سے حد ہے اور دوسرے لحاظ سے تعزیر۔ اس لحاظ سے یہ حد ہے کہ قصاص کا حکم خود اللہ تعالیٰ نے دیا ہے۔ یہ تعزیر اس بنا پر ہے کہ قصاص کے برعکس اس میں کمی بیشی ممکن ہے اور متاثرہ فریق کو دیت وصول کر لینے یا معاف تک کر دینے کا حق حاصل ہے۔ یوں قانونِ قصاص میں حدود اور تعزیر دونوں کا امتزاج موجود ہے۔(۲۵)

قتل ناحق ایک انتہائی بھیانک جرم ہے۔ اس جرم کی سنگینی کو ظاہر کرنے کے لیے خالق کائنات نے فرمایا:

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَا اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ (المائدہ: ۳۲)

”جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا اُس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جس نے کسی کی جان بچائی، اُس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخش دی۔“

جرم قتل کے نتیجے میں نسل در نسل انتقام کا ایک لا متناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور اُس سے معاشرتی امن و امان وقتاً فوقتاً درہم برہم ہو جاتا ہے۔ اس شیطانی چکر (Vicious Circle) کو ختم کرنے کے لیے اسلامی نظامِ قانون میں تین متبادل صورتیں موجود ہیں۔

(الف) ورثا (نہ کہ سربراہ ریاست) معاف کر سکتے ہیں۔

(ب) مقتول کی دیت یعنی خون بہا ادا کر کے معاملہ طے کیا جا سکتا ہے۔
(ج) دونوں صورتیں ممکن نہ ہوں تو خون کے بدلے خون کے اصول پر مبنی قصاص لیا جا سکتا ہے۔
قصاص کے بارے میں قرآن حکیم کی ایک محکم آیت یہ ہے۔

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يٰٓأُولِي الْأَلْبَابِ (البقرۃ:۱۷۹)

''عقل وخرد رکھنے والو! تمھارے لیے قصاص میں زندگی ہے۔''

صاحب روح المعانی علامہ آلوسیؒ نے اس آیت کے بارے میں کلام کرتے ہوئے خوب لکھا ہے۔ وھو کلام فی غایۃ البلاغہ یعنی یہ کلام انتہائی فصیح وبلیغ ہے۔ حق یہ ہے کہ نظامِ قصاص کی موجودگی میں کتنے ہی لوگ یہ سوچ کر بھی اقدامِ قتل سے باز رہتے ہیں کہ بالآخر اس جرم کی سزا میں وہ خود بھی قتل ہو سکتے ہیں۔ اس طرح وہ ان گنت لوگ بھی محفوظ و مامون ہو جاتے ہیں جو قاتلوں کی ہٹ لسٹ پر موجود ہوتے ہیں۔ ان وسیع معنوں میں قصاص کو ''حیات'' کے موزوں ترین لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (۲۶)

اسلام میں انسداد جرائم کے لیے ایک مربوط پالیسی موجود ہے۔ اس پالیسی کے چار نکات ہیں۔ (۱) سوسائٹی میں ایک عام اخلاقی فضا تیار کی جاتی ہے اور معاشرے میں خشیتِ الٰہی، فکرِ آخرت اور حبِ رسول ﷺ جیسی اخلاقی اقدار کو عام کیا جاتا ہے۔ (۲) ایک ایک کر کے وہ اسباب و محرکات ختم کیے جاتے ہیں جو جرائم کی افزائش کا باعث بنتے ہیں۔ (۳) فطری و جبلی ضروریات کی تسکین کے لیے متبادل ذرائع فراہم کیے گئے ہیں۔ (۴) اس انتظام کے باوجود جو لوگ جرائم سے باز نہ آئیں اُن کے لیے سخت سزائیں حدود وتعزیرات کی شکل میں موجود ہیں۔

حضور ﷺ نے سب سے پہلے وہ انفراسٹرکچر تباہ کر دیا جس سے جرائم جنم لیتے ہیں۔ زنا اور بدکاری کو روکنے کے لیے شرم وحیا جیسے اخلاقی اوصاف پر زور دیا گیا۔ غیر محرم مرد وخواتین کے عام اختلاط کی حوصلہ شکنی کی گئی۔ آزاد ہی نہیں، معاشرہ میں موجود غلام اور لونڈیوں کے نکاح میں حائل تمام رکاوٹیں بھی دور کی گئیں۔ اسلام میں زنا اور فحاشی جیسے جرائم محض کسی فرد کے خلاف نہیں بلکہ

پورے معاشرے اور ریاست کے خلاف سنگین جرائم متصور ہوتے ہیں، اس لیے زنا کے ساتھ اشاعتِ فحش کے کاروبار کو بھی قابل دست اندازی پولیس (Cognizable Offence) قرار دیا گیا۔ اس بندوبست کے ہوتے ہوئے جو لوگ کھلم کھلا مقدس قوانین پامال کرتے ہوئے پائے جائیں ان کے لیے غیر مصالحانہ طریق کار (Zero Tolerance) اختیار کیا گیا۔

یہ بات پیشِ نظر رہے کہ جن جرائم کی سزائیں سخت ہیں، ان کے ثبوت کے لیے بھی کڑی شرائط درکار ہیں۔ سب سے اہم بات گواہوں کی ثقاہت ہے۔ حضور ﷺ سے کبیرہ گناہوں کے بارے میں دریافت کیا گیا تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ کے ساتھ شرک کرنا، ماں باپ کی نافرمانی کرنا، کسی انسان کو ناحق قتل کرنا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کیا میں تمھیں ایک بہت بڑے کبیرہ گناہ کے بارے میں نہ بتاؤں؟ آپ ﷺ نے فرمایا۔ جھوٹ بولنا یا جھوٹی شہادت دینا۔ ناقص شہادتوں یا مشکوک بیانات پر حدود نافذ نہیں ہو سکتیں۔ حدِ شرعی کسی شبہ یا کسی شرط کی وجہ سے ساقط ہو جائے اور کچھ دوسرے قرائن جرم اور مجرم کے تعلق کو واضح کرتے ہوں تو مجرم کو کھلی چھوٹ نہیں مل جاتی۔ مثلاً زنا کے ثبوت پر دو عادل وثقہ گواہ موجود ہیں اور چار گواہوں کی شرط پوری نہیں ہوتی تو حدِ شرعی تو نافذ نہ ہو گی البتہ ایک یا دو ثقہ گواہوں اور قرائنی شہادت (Circumstantial Evidence) کی روشنی میں حاکم عدالت اُس کو مناسب تعزیری سزا دے گا۔ (۲۷) گواہوں پر جرح کے دوران کسی گواہ کی بدنیتی ثابت ہو جائے تو نہ صرف وہ خود جھوٹی گواہی کے جرم میں سخت سزا پاتا ہے بلکہ آیندہ کے لیے اس کی گواہی ساقط الاعتبار ٹھہرتی ہے۔ جھوٹے گواہ کے لیے دو سزاؤں کو جمع کیا گیا تاکہ قاذف کو جسمانی و روحانی دونوں اعتبار سے معاشرے میں ذلیل کیا جائے۔ اسلامی عدالت گواہوں کی ثقاہت جاننے کے لیے جو طریقہ اختیار کرتی ہے اُسے تزکیہ الشھود کہتے ہیں۔ قدیم فقہا کے ہاں اس بارے میں بہت شدت پائی جاتی ہے۔ آج کل کے لحاظ سے یہ ضروری ہے کہ گواہ کبائر سے بچتے ہوں، اسلامی احکام کی خلاف ورزی میں مشہور نہ ہوں، اُن کی راست بازی، دیانت اور امانت بھی مسلمہ ہو۔ نیز جھوٹی گواہی اور اخلاق باختگی کے کسی

جرم میں سزا یافتہ نہ ہوں۔(۲۸) شریعت کا مجموعی مزاج لوگوں کو کھینچ تان کر سزا دلوانا نہیں۔ اقراری مجرم تک کے جرم اور اس کی نوعیت کی تصدیق کے لیے جناب رسالت مآب ﷺ اپنے ذرائع سے تصدیق فرماتے کہ مذکورہ شخص نابالغ، دیوانہ یا نشے میں تو نہیں ہے۔ درج ذیل روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ لاعلمی اور شدید احتیاج بھی حدود کے نفاذ میں مانع ہو سکتی تھی۔

ابن شرجیل نامی ایک شخص نے شدید بھوک کی حالت میں مدینہ کے ایک باغ میں داخل ہو کر انگور کے کچھ خوشے کھائے اور کچھ توڑ کر اپنی چادر میں رکھ لیے۔ مالک نے اُسے پکڑ کر خوب زدوکوب کیا۔ اُس کی شکایت پر رسول اللہ ﷺ نے باغ کے مالک کو طلب کر کے زجر و توبیخ کی اور فرمایا: ''اگر وہ لاعلم تھا، تو نے اُسے نہیں سکھایا۔ اگر وہ بھوکا تھا، تو نے اُسے خوراک مہیا نہیں کی۔'' اِس کے بعد آپ ﷺ نے اُسے ایک یا آدھا وسق غلہ (اناج کا پیمانہ) دینے کا حکم دیا۔(ابن ماجہ۔ج ۲)

قانون نافذ کرنے والے ادارے بھی مادر پدر آزاد نہیں۔ ہدایات موجود ہیں کہ مجرم کو جس کوڑے سے مارا جائے وہ نہ زیادہ سخت ہو نہ زیادہ نرم۔ مار ایسی ہونی چاہیے کہ اس کا اثر ہڈی تک نہ پہنچے۔ حضرت عمرؓ نے مارنے والے کو ہدایت کی ''اس طرح مار کہ تیری بغل نہ کھلے۔'' تمام فقہا اس بات پر متفق ہیں کہ ضرب مبرح نہیں ہونی چاہیے یعنی زخم ڈالنے والی نہ ہو۔ شرم گاہ، سر اور (حنفیہ کے نزدیک) منہ پر مارنے کی اجازت نہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے قول کے مطابق اس اُمت میں ننگا کر کے اور ٹکٹکی باندھ کر مارنا حلال نہیں۔ سزا دیتے وقت بے جا سختی یا بے جا نرمی کی کوئی گنجائش نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

> ''قیامت کے دن ایسے حاکم کو پیش کیا جائے گا جس نے حد میں کمی بیشی کی ہو۔ اس سے پوچھا جائے گا تو نے ایسا کیوں کیا؟ وہ کہے گا، تیرے بندوں پر رحم و شفقت کے لیے۔ اسے کہا جائے گا انت ارحم بھم منی (کیا تو مجھ سے زیادہ ان پر رحم کرنے والا ہے)۔ اسے دوزخ میں پھینک دیا جائے گا۔ پھر ایسے حاکم کو پیش کیا

جائے گا جس نے مقررہ سزا سے ایک کوڑا زیادہ لگایا ہو گا۔ اس سے وجہ پوچھی
جائے گی۔ وہ کہے گا۔ تاکہ لوگ آپ کی نافرمانی سے باز رہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں
گے انت احکم بھم منی (کیا تو مجھ سے زیادہ ان پر حکم کرنے والا ہے)
پھر اسے بھی آگ میں پھینک دیا جائے گا۔" (تفسیر کبیر۔ ج ۶)

ان انتباہی ہدایات سے ظاہر ہے کہ اسلام میں سزا کا مقصد اولاً مجرم سے ظلم کا بدلہ لینا، ثانیاً اُسے اعادہ جرم سے باز رکھنا اور ثالثاً مجرمانہ میلان رکھنے والوں کے لیے عبرت بنانا ہے۔ (۲۹)

اہم ترین بات یہ ہے کہ حدود کے نفاذ کے لیے ایک باقاعدہ نظم حکومت بھی ضروری ہے۔ کوئی شخص اپنے طور پر قانون کو ہاتھ میں لینے کا مجاز نہیں۔ حد یہ ہے کہ زوجین میں سے کوئی فریق دوسرے پر الزام لگائے تو بھی غیرت کے نام پر قتل کی اجازت نہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت اپنی وضاحت آپ ہے۔

"حضرت سعد بن عبادہؓ نے عرض کیا۔ یارسول اللہ ﷺ! اگر میں اپنی بیوی کے ساتھ کسی مرد کو پاؤں تو کیا میں اس کو چھوڑ دوں، یہاں تک کہ چار گواہ لے کر آؤں؟ رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا۔ ہاں! سعد بن عبادہؓ نے کہا...... ہرگز نہیں۔ اس ذات کی قسم جس نے آپ ﷺ کو دین حق کے ساتھ بھیجا اگر میرے ساتھ یہ صورتِ حال پیش آئے تو میں فوری طور پر اس کا کام تمام کر دوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ سنو! تمھارے سردار کیا کہہ رہے ہیں۔ بے شک وہ غیور ہیں اور میں ان سے زیادہ غیور ہوں اور اللہ تعالیٰ مجھ سے زیادہ غیور ہیں۔" (مسلم۔ موطا امام مالک)

حضرت سعد بن عبادہؓ نے ایک بات مفروضے کے طور پر پیش کی تھی۔ لیکن کچھ عرصے بعد ایک صحابی ہلال بن اُمیہؓ نے اپنے حوالے سے اِسے ایک وقوعہ کے طور پر بیان کر دیا۔ اس مسئلے کے حل کے لیے سورۃ النور کی آیات ۶ تا ۱۰ نازل ہوئیں۔ جن میں اسلام کا قانونِ لعان بیان کیا گیا ہے۔ لعان کا طریقہ یہ ہے کہ قاضی یا حاکم کی موجودگی میں شوہر چار مرتبہ کہے کہ میں اللہ کی قسم کھا کر گواہی دیتا ہوں کہ میں اِس الزام کے بارے میں سچا ہوں اور پانچویں مرتبہ کہے کہ اگر میں جھوٹا

ہوں تو مجھ پر اللہ کی لعنت ہو۔ اس کے بعد عورت چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر کہے کہ تہمت زنا کے بارے میں اس کا خاوند ضرور جھوٹا ہے اور پانچویں مرتبہ کہے کہ مجھ پر اللہ کا غضب نازل ہو اگر مرد اپنے الزام میں سچا ہے۔ اس ملاعنت کے بعد قاضی زوجین میں تفریق کرا دے گا۔(۳۰)

ساتواں کارنامہ......قانون کی اخلاقی اساس

کسی قانون کی قدر و قیمت کا ایک بڑا معیار یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ لوگوں میں اس کی اطاعت کا جذبہ کس حد تک ہے۔ جس قانون کی پابندی عوام ایک مقدس فریضے کے طور پر کریں وہی قانون معیاری ہے۔ قانون کو یہ مقام اس وقت حاصل ہوتا ہے جب معاشرے میں اخلاقی اقدار کی حکمرانی ہو۔ یونانی مفکر ارسطو کی خواہش تھی کہ عدالتیں عبادت گاہوں کے ساتھ متصل ہوں تا کہ قانون کو اخلاقی پشت پناہی حاصل رہے۔ آج کل جہاں جہاں مذہب و اخلاق پسپا ہو رہے ہیں، وہاں قانون بھی بے آبرو ہو کر رہ گیا ہے۔ امریکہ میں جرائم کی پریشان کن رفتار پر قابو پانے کے لیے ایک تحقیقاتی کمیشن قائم کیا گیا تھا۔ اس کمیشن نے اپنی تحقیقاتی رپورٹ میں بہت سی تجاویز پیش کرنے کے بعد آخر میں یہ رائے ظاہر کی:

> ”کوئی نظام خواہ اس میں کتنا عملہ ہو اور وہ کیسا ہی منظم ہو۔ ملک میں ہر ایک کے لیے مادی سہولتیں بھی کتنی ہی فراواں ہوں، یہ چیزیں معاشرے کو اس وقت تک جرائم سے پاک نہیں کر سکتیں جب تک کہ اس معاشرے میں اخلاقی محرکات عام نہ ہوں۔“(۳۱)

مقنن اعظم ﷺ کا قانون اس پہلو سے بھی بے مثال ہے۔ اس قانون نے اہل عرب کو دنیا کی ایک آئین پرور قوم بنا کے رکھ دیا۔ قانون اور اخلاق کے امتزاج کا بہترین نمونہ حضور ﷺ کے ایک مشہور عدالتی حکم میں بھی ملتا ہے۔ آپ ﷺ نے ایک مقدمے کے فریقین کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ”میں ایک بشر ہوں۔ تم اپنے جھگڑے میرے پاس تصفیہ کے لیے لاتے ہو۔ ہو سکتا ہے تم میں سے ایک فریق دوسرے کے مقابلے میں اپنا موقف زیادہ بہتر طریقے سے پیش کرے

اور میں سن کر اُس کے مطابق فیصلہ کر دوں۔ تو جس شخص کے حق میں میں اُس کے مخالف بھائی کے مقابلے میں فیصلہ کر دوں، اُسے اپنے بھائی کا حق پھر بھی نہیں لینا چاہیے کیونکہ ایسی صورت میں درحقیقت میں اُسے جہنم کا ایک ٹکڑا دیتا ہوں جسے لے کر وہ روزِ قیامت حاضر ہوگا۔" (صحیح بخاری) ابو داوٗد (کتاب الاقضیہ) میں موجود اس روایت کے دوسرے ٹکڑے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ارشادِ پاک سن کر مقدمے کے دونوں فریق رو پڑے اور انھوں نے ایک دوسرے کے حق میں دست برداری کا اعلان کر دیا۔ اِس پر رسول اللہ ﷺ نے اِس سمجھوتے کو خوش آیند قرار دیا اور انھیں ہدایت فرمائی کہ اس مفاہمت کے بعد متنازع چیز کو برابر برابر بانٹ لیں۔ (۳۲)

قانون کا رشتہ اخلاق کے ساتھ استوار کرنے کا سب سے بڑا فائدہ بین الاقوامی دائرے میں حاصل ہوا۔ قانون کے بعض کلاسیکی ماہرین بین الاقوامی قانون کو سرے سے قانون نہیں مانتے۔ اُن کے نزدیک کسی بھی قانون کے پیچھے کسی موثر قوتِ نافذہ کا ہونا ضروری ہے اور بین الاقوامی قانون کو یہ حیثیت حاصل نہیں ہے۔ اگر یہ کوئی قانون ہے تو جس کی لاٹھی اُس کی بھینس کے اصول پر مبنی ہے۔ آج کے جدید ترین دور میں بھی بین الاقوامی قانون کے نام سے جو چیز پائی جاتی ہے، بدقسمتی سے اُس کا نفاذ الا ماشاءاللہ چند بڑی طاقتوں کی صوابدید پر منحصر ہے۔ نبی اُمی ﷺ نے صلح، جنگ اور معاہدات کے بارے میں جو ضابطہ قانون اور ضابطہ اخلاق دیا، اُس سے خود بین الاقوامی قانون کو ایک الگ تشخص اور شناخت حاصل ہوئی۔ (۳۳)

قانون اور اخلاق کی اِسی یکجائی کا اثر تھا کہ ذہنی تحفظات کے بغیر قانون کی پابندی رسول اللہ ﷺ کے صحابہؓ کا انفرادی و اجتماعی مزاج بن گئی تھی۔ انفرادی سطح پر دیکھا جائے تو بہت سی قابلِ رشک مثالوں میں سے ایک تابندہ مثال احکامِ حجاب کی ہے۔ اُم سلیطؓ نامی ایک صحابیہ نے بازار سے گزرتے ہوئے یہ احکام کسی کی زبانی سنے اور وہیں ایک دیوار کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئیں۔ لوگوں نے کہا۔ "اللہ کی بندی! گھر تو چلی جاؤ۔ پھر چادر لے لینا۔" انھوں نے جواب دیا۔ "زندگی کا کیا بھروسا۔ پہنچ نہ پائی تو نافرمانوں میں شمار ہوں گی۔" پھر انھوں نے اپنے بچے کو گھر بھیج

کر چادر منگوائی اور اُسے اوڑھ کر گھر روانہ ہوئیں۔ اسی طرح ایک جنگ میں اُم خلادؓ نامی صحابیہ کا بیٹا شہید ہو گیا۔ وہ اِس حادثے سے بے خبر میدانِ جنگ میں پہنچ گئیں۔ وہاں اُنھیں اپنے بیٹے کی شہادت کی خبر ملی۔ اِس قیامت خیز خبر کے بعد یقیناً اُن کا کلیجہ پھٹ گیا ہو گا۔ انھوں نے اِس حالت میں بھی اپنے حجاب کی حرمت پر آنچ نہ آنے دی۔ لوگوں نے اس مثالی صبر و تحمل پر حیرت کا اظہار کیا۔ اُم خلادؓ نے اِس موقع پر یہ تاریخی الفاظ کہے: ''میں نے بیٹا کھویا ہے، حیا نہیں کھوئی۔''

اجتماعی منظر یہ تھا کہ حضور ﷺ نے حرمت شراب کا حکم دیا تو لبوں کو چھوتے ہوئے جام رُک گئے۔ لوگوں نے خود ہی شراب کے برتن تک توڑ ڈالے۔ تحویل قبلہ کا حکم سنایا گیا تو حالتِ نماز میں منہ قبلہ کی جانب پھر گئے۔ چار سے زیادہ بیویاں رکھنے کی ممانعت کا قانون نازل ہوا تو فوراً اپنی عزیز بیویوں تک کو رخصت کرنے پر تیار ہو گئے۔ ایک دوسرے کا مال باطل طریقوں سے کھانے پر وعید سنائی گئی تو لوگوں نے دوستوں اور اعزہ کے ہاں کھانے کی دعوت میں شریک ہونا چھوڑ دیا تاکہ ناجائز طریقے سے کسی کا مال کھانے کا اطلاق اس فعل پر بھی نہ ہو جائے۔ آخر قرآن میں ہی اطمینان دلایا گیا کہ اس طرح کھانے میں کوئی قباحت نہیں۔

اسلامی قانون کی یہ اور اسی قسم کی دوسری خوبیاں ہیں جو اسے دوسرے قانونی نظاموں سے ممتاز کرتی ہیں۔ پروفیسر پیپرل نے بجا طور پر کہا تھا:

> ''پوری نسل انسانی کو اسلام کے پیغمبر ﷺ پر فخر کرنا چاہیے کیونکہ آپ ﷺ نے عالم انسانیت کے لیے وہ قانون چھوڑا جس کے اعلیٰ معیار پر انسانیت اگر آیندہ دو ہزار سال میں بھی آجائے تو یہ باعثِ مسرت کامیابی ہوگی۔'' (۳۴)

اللھم صل علی محمد و علی آل محمد

مراجع وحواشی

۱۔ اہلِ عرب بعض اوقات غصہ کی حالت میں بیوی کو کہتے تھے۔"تو میرے اوپر ایسی ہے جیسے میری ماں کی پیٹھ۔" ان کلمات کی ادائیگی کو ان کی زبان میں ظہار کہا جاتا تھا۔ زمانہ جاہلیت میں یہ لفظ طلاق کے مقابلے میں شدید تر تھا۔ طلاق کے بعد تو رجوع کی صورت باقی رہتی، مگر ظہار کے بعد رجوع بالکل خارج از امکان تھا۔ اللہ تعالیٰ نے جاہلیت کے اس قانون کو منسوخ کر دیا۔

۲۔ ایمل تیاں ...... Historie De L'organization Judicaine
بحوالہ نقوش رسول نمبر ۱۱ مضمون عہد نبوی ﷺ میں عدلیہ اور انتظامیہ از ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ

۳۔ برنارڈ لیوس ...... The Arabs in History

۴۔ عبدالقادر شہید ...... التشریع الجنائی

۵۔ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ ...... اسلامی ریاست۔ باب۔ اسلامی قانون

۶۔ مجلہ چراغِ راہ۔ اسلامی قانون نمبر ...... مدیر پروفیسر خورشید احمد

۷۔ مولانا مناظر احسن گیلانی ...... تدوین فقہ واصولِ فقہ ...... مکتبہ الصدف کراچی

۸۔ مجلہ چراغِ راہ۔ اسلامی قانون نمبر ...... مدیر پروفیسر خورشید احمد

۹۔ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ ...... تفہیمات سوم

۱۰۔ ڈاکٹر یوسف قرضاوی ...... فتویٰ میں تبدیلی۔ عصر حاضر کی ضرورت، اسباب ووسائل ...... مترجم قاری فتح اللہ (۲۰۱۰ء) ...... ادارہ اسلامیات لاہور

۱۱۔ ایضاً

۱۲۔ ایضاً

۱۳۔ محمد طاہر منصوری (مرتب) ...... اجتماعی اجتہاد (۲۰۰۷ء) ...... ادارہ تحقیقاتِ اسلامی۔ بین الاقوامی اسلامی تصور، ارتقاء اور عملی صورتیں، یونیورسٹی اسلام آباد

عہد جدید میں اجتماعی اجتہاد کا تصور کوئی خواب وخیال کی بات نہیں۔علامہ محمد اقبالؒ نے آج کے دور میں ایک ایسی پارلیمنٹ کے ذریعے اجتماعی اجتہاد پر زور دیا تھا۔جس میں رہنمائی کے لیے علما کو ایک مؤثر حیثیت حاصل ہو۔شام کے ڈاکٹر مصطفےٰ احمد زرقا نے اجتماعی اجتہاد کے بین الاقوامی اداروں میں یک جہتی کے لیے ایک عالمی فقہ اکیڈیمی کے قیام کی بہت مفید تجویز پیش کی ہے۔واضح رہے کہ اس وقت بھی عملی طور پر دنیا بھر میں اجتماعی اجتہاد کے مختلف ادارے کام کر رہے ہیں۔مثلاً

اسلامک فقہ اکیڈیمی انڈیا	اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان
مجمع البحوث الاسلامیہ قاہرہ	المجمع الفقہی الاسلامی مکہ مکرمہ

یورپی مجلس برائے افتاء وتحقیق وغیرہ

۱۴۔ ڈاکٹر محمد اکرم وِرک.....متونِ حدیث پر جدید ذہن کے اشکالات (۲۰۱۲ء).....الشریعہ آکادمی گوجرانوالہ

۱۵۔ محمد بن الفرج المالکی ابن الطلاع ۔اقضیہ الرسول ﷺ ۔تحقیق وترجمہ ڈاکٹر محمد ضیاء الرحمٰن اعظمی دوسرا ایڈیشن (۱۹۹۱ء).....ادارہ معارفِ اسلامی لاہور

۱۶۔ ایضاً

۱۷۔ ایضاً

۱۸۔ ایضاً

۱۹۔ تفسیر ابن کثیر ج ۱

۲۰۔ محمد بن الفرج المالکی ابن الطلاع ۔اقضیہ الرسول ﷺ

۲۱۔ حکیم محمد سعید.....تذکارِ محمد ﷺ ۔مضمون آنحضرت ﷺ بحیثیت منصف اور قانون ساز ۔از سابق جسٹس (۱۹۷۲ء) ہمدرد فاؤنڈیشن کراچی

۲۲۔ بخاری ومسلم میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی حدیث کے مطابق روزِ قیامت اللہ تعالیٰ کی رحمت خاص کے سایے میں جگہ پانے والے سات خوش نصیب مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔عدل وانصاف کرنے والے حاکم۔ ۲۔وہ جوان جو اللہ کی عبادت میں پھلا پھولا ہو۔ ۳۔وہ آدمی جس کا دل مسجد میں اٹکا رہے۔ ۴۔وہ آدمی جو اللہ کے لیے ایک دوسرے سے محبت کریں اسی پر وہ اکٹھے ہوں اور اس پر وہ جدا ہوں۔ ۵۔وہ آدمی جسے حسب ونسب اور حسن وجمال والی عورت بُرے کام کی دعوت دے اور وہ کہے کہ بے شک میں اللہ سے ڈرتا ہوں۔ ۶۔وہ آدمی جو صدقہ کرے اور اُسے یوں مخفی رکھے کہ بائیں

ہاتھ کو خبر نہ ہو کہ دایاں ہاتھ کیا خرچ کر رہا ہے۔ ۷۔ وہ آدمی جو تنہائی میں اللہ کو یاد کرے پھر اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جائیں۔

۲۳۔ فلپ کے ہٹی ..... Islam A way of Life

University of Minnesota Press. (1970)

۲۴۔ ابو اسحاق الشاطبی ..... الموافقات فی اصول الشریعۃ ج ۲ ..... مصر مکتبہ التجاریۃ

۲۵۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی ..... محاضرات فقہ (۲۰۰۵ء) ..... الفیصل ناشران لاہور

۲۶۔ مولانا سید محمد متین ہاشمی ..... اسلام کا قانونِ شہادت جلد اول (۱۹۸۱ء) ..... مرکز تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری

۲۷۔ اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان (اسلام آباد) ..... سالانہ رپورٹ ۹۱۔ ۱۹۹۲ء

۲۸۔ اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان (اسلام آباد) ..... سالانہ رپورٹ ۹۲۔ ۱۹۹۳ء

۲۹۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ ..... تفہیم القرآن جلد سوم، تفسیر سورۃ النور

۳۰۔ لعان کے مابعد صورتِ حال کے لیے قانونی دفعات درج ذیل ہیں۔

(۱) عورت اور مرد دونوں کسی سزا کے مستحق نہیں رہتے۔ (۲) بچہ باپ کے بجائے ماں سے منسوب ہو گا۔ (۳) ماں اُس کی وارث ہو گی اور وہ ماں کا وارث ہو گا۔ (۴) جو کوئی عورت کو زانیہ اور اس کے بچے کو ولد الزنا کہے گا وہ حد کا مستحق ہو گا۔ (۵) عورت کا مہر ساقط نہ ہو گا۔ (۶) عورت دورانِ عدت میں نفقہ اور مسکن پانے کی حقدار نہ ہو گی کیونکہ وہ طلاق اور وفات کے بغیر اپنے خاوند سے الگ کی گئی۔

(الف) اقضیۃ الرسول (ب) تفہیم القرآن تفسیر سورۃ النور (ج) معارف القرآن تفسیر سورۃ النور

۳۱۔ The Challenge of Crime in a Free Society

۳۲۔ مجلہ نقوش رسول نمبر ۱۱ مضمون عہد نبوی ﷺ میں عدلیہ اور انتظامیہ از ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ

۳۳۔ بین الاقوامی قانون اسلامی نظام قانون کے وجود کا ایک لازمی حصہ ہے۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی تحقیق کے مطابق امام زید بن علیؓ (وفات ۱۲۰ ہجری) نے پہلی مرتبہ "سیر" کی اصطلاح انٹرنیشنل لا کے معنی میں استعمال کی تھی۔ ڈاکٹر صاحب شمس الائمہ امام سرخسیؒ کے حوالے سے لکھتے ہیں۔ "سیرت سے مراد حکمران کا وہ طرزِ عمل ہے جو اجنبیوں سے حالتِ جنگ اور حالتِ امن میں ملحوظ رکھا جائے۔" اس میں وہ مرتدین اور باغیوں کے

حالات بھی شامل کرتے ہیں۔ فقہ کے ہر مسلک کی کتب میں کتاب السیر کا باب موجود ہے۔ امام ابو حنیفہؒ (۱۵۰ ہجری) کی "کتاب السیر" اور امام شیبانی کی السیر الکبیر بھی اس موضوع پر گراں قدر تصانیف ہیں۔ (خطباتِ بہاولپور)

۳۴۔ مجلہ چراغ راہ۔ اسلامی قانون نمبر...... مدیر پروفیسر خورشید احمد

---❀❀❀---

محسن انسانیت ﷺ اور حفظانِ صحت کے اصول

حضور ﷺ کی تعلیمات عالمگیر اور آفاقی ہیں۔ یہ ایک سدابہار گلستان ہے، جہاں خزاں کا گزر نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور تمام تر علمی وفکری ترقی کے باوجود نبی اُمی ﷺ کی تعلیمات کا خوشہ چیں نظر آتا ہے۔ یوں تو حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا ہر پہلو، ہر مقام پر، ہر دور میں، ہر انسان کے لیے فلاح وسعادت کے بے شمار عنوان رکھتا ہے، لیکن یہ حقیقت بھی کچھ کم اہم نہیں کہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی پسند وناپسند کے طبعی رجحانات کی افادیت دیکھ کر بھی اہلِ علم اور اہلِ تجربہ ورطۂ حیرت میں ڈوب جاتے ہیں۔

انسانی صحت کا استحکام معاشرے کا بنیادی مسئلہ ہے۔کوئی معاشرہ صحت عامہ کے بغیر ذہنی و عملی لحاظ سے ترقی نہیں کرسکتا۔ظاہر ہے کہ ایک صحت مند دماغ ایک صحت مند جسم کے اندر ہی پرورش پاسکتا ہے۔ذہنی توازن کے بغیر اگر ایک پہلوان مفلوج سا ہوجاتا ہے،تو یہ بھی حقیقت ہے کہ جسمانی صحت وتندرستی کے بغیر ایک مدبّر بھی اپاہج ہوتا ہے۔حضور رسالت مآب ﷺ نے صحتِ انسانی کی اس اہمیت کو واضح کرنے کے لیے ایک موقع پر ارشاد فرمایا:

المومن القوی خیر واحب الی اللہ من المومن الضعیف وفی کل خیر

”طاقت ور مومن بہتر ہے اور اللہ تعالیٰ کو کمزور مومن سے زیادہ محبوب ہے اور ہر ایک میں خیر ہے۔“ (صحیح مسلم)

ماہرین فن جمالیات کے نزدیک جسمانی حسن کے تین درجے ہیں۔ایک وہ چہرہ جو دیکھنے میں حسین نظر آتا ہے۔دوسرا وہ جو مسکراتے وقت حسین نظر آتا ہے۔تیسرا وہ جو اظہارِ ناراضگی کے وقت

بھی حسین رہتا ہے۔ ان تینوں حیثیتوں سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام حُسن و جمال کا پیکر تھے۔ جب کبھی ناراضگی کا موقع ہوتا تو چہرۂ انور ایسے متغیر ہو جاتا جیسے سرخ انار کا رس آپ ﷺ کے رخساروں اور پیشانی پر نچوڑ دیا گیا ہے۔ جب آپ مسکرات تو حسنِ مستور کی تمام کرنیں چہرہ انور پر بکھر جاتیں انگریزی زبان میں اس امر کے لیے Every limb synchronized with the call of beauty کا پیرایۂ اظہار استعمال ہوتا ہے۔ جہاں تک معمول کا تعلق ہے، حضرت عبداللہ بن سلامؓ کی شہادت ہی کافی ہے۔ حضرت عبداللہ بن سلامؓ، اسلام لانے سے قبل یہود کے ایک بہت بڑے عالم تھے۔ حضور ﷺ کے رُخ روشن کو دیکھتے ہی حضرت عبداللہ بن سلامؓ اپنا ذاتی مشاہدہ بیان کرتے ہیں:

فلما تبينت وجه رسول الله ﷺ عرفت انه ليس بوجه كذاب

''جب رسول اللہ ﷺ کا چہرہ ظاہر ہو گیا تو میں پہچان گیا کہ آپ ﷺ کا چہرہ جھوٹا چہرہ نہیں ہو سکتا۔''

اس تصویر کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی شخصیت شجاعت و بسالت میں بھی اعلیٰ ترین عربی روایات کا بے مثال نمونہ تھی۔ مکہ کے مشہور پہلوان رُکانہ نے قبولِ اسلام کے لیے شرط رکھی کہ اگر اُسے آپ کشتی میں پچھاڑ دیں تو وہ دعوتِ اسلام قبول کر لے گا۔ آپ ﷺ نے یہ چیلنج بھی قبول کیا اور مقابلے میں اُسے پچھاڑ بھی دیا۔ بعض روایات کے مطابق شکست کے بعد رُکانہ موقع پر ہی مسلمان ہو گیا تھا اور کچھ دوسری روایات کے مطابق وہ فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوا تھا۔ (۱) اسی طرح یہ بھی مشہور واقع ہے کہ آپ ﷺ نے ایک مرتبہ عمرہ کیا تو سفر میں سو اونٹ آپ ﷺ کے ساتھ تھے، جن کی حضور ﷺ نے نگرانی فرمائی۔ پھر اُن کی قربانی کی اور غربا و مساکین میں گوشت تقسیم فرمایا۔ اونٹوں کی اتنی بڑی تعداد کو بیک وقت قابو میں رکھنا اور پھر اُن کو نحر کیے چلے جانا صرف اسی شخصیت کے لیے ممکن ہے جس میں غیر معمولی قوت اور توانائی پائی جاتی ہو۔ (۲) حقیقت یہ ہے کہ آنحضور ﷺ کے روز و شب کے معمولات اور آداب و اطوار میں جو اعتدال اور توانائی ہے وہی توانائی نہ صرف عباوات کی مستعدی اور جہاد کی سرگرمیوں میں نظر آتی ہے بلکہ آپ ﷺ کے

دوٹوک فیصلوں اور ان کے نفاذ میں بھی موجود ہے۔ یہاں تک کہ آپ ﷺ کے خطبوں، فرامین اور لکھوائے ہوئے خطوط میں جو شگی اور بے ساختگی پائی جاتی ہے وہ بھی اسی وہبی توانائی کا خاصہ ہے۔ عربوں کا گذشتہ اور معاصر ادب اس طرزِ خاص سے یکسر خالی ہے۔

تنگ نظر اور متعصب مستشرقین نے اندھادھند مخالفت کے جوش میں نبی اکرم ﷺ کو ذہنی و جسمانی مریض تک کہنے کی جسارت کر ڈالی۔ مخالفت برائے مخالفت نے یہ دن دکھائے کہ سالارِ اعظم ﷺ کی سپاہیانہ مہارت اور بے مثل عسکری قیادت تک کو مشکوک بنانے کی بچگانہ کوشش کی گئی۔ جنرل جان بیگٹ گلب (۱۸۹۷ء۔۱۹۸۶ء) John Bagot Glubb پہلے تو اس بات پر تعجب کا اظہار کرتا ہے کہ محض جوش و جذبہ اور حوصلہ کے بل پر نسبتاً غیر تربیت یافتہ اور غیر منظم بدوی فوجوں نے غیر معمولی فتوحات کیسے حاصل کرلیں۔(۳) سیدھی سی بات ہے کہ ارکان اسلام میں اجتماعیت کی جوشان موجود ہے۔ مسلسل جہادی مہمات میں کم تعداد کے باوجود مثالی نظم وضبط کی وجہ سے دشمن کی کثیر مگر غیر منظم افواج کو بار بار جس طرح زیر کیا گیا، نیز اطاعت امر کے بے مثل جذبہ کی وجہ سے قیادت کی مرکزیت (Unity of Command) کا جو منظر دُنیا نے دیکھا، اس کے بعد مسلمان مجاہدین کو نہ غیر منظم کہا جاسکتا ہے اور نہ غیر تربیت یافتہ۔ یہاں تک گلب کو لاعلمی کے شبہ کا فائدہ دیا جاسکتا ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر وہ یہ کہتا ہے۔

> ”محمد (ﷺ) سپاہی ہرگز نہ تھے اور ان کے اندر بہت کم سپاہیانہ خصوصیات تھیں۔ لڑائی میں وہ ہمیشہ اگلی صف کے پیچھے رہا کرتے اور اگر ممکن ہوتا تو دست بدست لڑائی میں شرکت نہ کرتے تھے۔“(۴)

یہاں پہنچ کر گلب عقلِ عامہ (Common Sensc) اور پیشہ وارانہ اہلیت (Professional Capability) سے بھی محروم نظر آتا ہے۔ فنِ حرب کی ابجد سے واقف ہر شخص جانتا ہے کہ جدید جنگ میں تو سپہ سالار بہت پیچھے رہ کر اپنی اور دشمن افواج کی نقل وحرکت کو مانیٹر کرتا ہے۔ ویسے بھی سپہ سالار اگلی صفوں میں موجود رہے تو دشمن کا سارا دباؤ اسی محاذ پر مرکوز ہو جاتا ہے۔

جس کا نقصان بالآخر پوری فوج کو اُٹھانا پڑتا ہے۔ یہ بات البتہ طے ہے کہ آگے پیچھے یا درمیان کہیں بھی ہو، سپہ سالار میں اگر کسی قسم کی بزدلی کا شائبہ بھی نظر آئے تو دُنیا کی کوئی فوج کوئی سا معرکہ بھی سر انجام نہیں دے سکتی۔

سیرتِ طیبہ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کی ذاتی جرأت و شجاعت صحابہ کرامؓ کے لیے قوت و حشمت کا لازوال سرچشمہ تھی۔ حضرت علیؓ اشجع الناس ہیں۔ مگر وہ یہ کہتے ہیں: ہم میں سب سے زیادہ بہادر وہ آدمی سمجھا جاتا تھا جو محاذِ جنگ پر آپ ﷺ کے ساتھ ساتھ رہتا تھا۔ حضرت براء بن عازبؓ کا قول ہے ''اللہ کی قسم! جب لڑائی میں شدت آتی تو ہم نبی ﷺ کی پناہ ڈھونڈا کرتے تھے۔ غزوۂ احزاب کے موقع پر جب خندق کھودتے ہوئے ایک سخت ترین چٹان کسی سے نہ ہٹائی جاسکی تو آپ ﷺ نے کدال کی تین ہی ضربوں سے اُسے پاش پاش کر کے رکھ دیا۔ (۵) جنگِ اُحد میں تیراندازوں کی غلطی سے مسلمان سپاہ پر جو افتاد پڑی تو یہ رسول اکرم ﷺ کی استقامت اور بہادری ہی تھی جس نے شکستہ صف مجاہدین کو ایک نیا عزم اور حوصلہ بخشا۔ جنگ حنین میں جب ایسی ہی صورت حال پیدا ہوئی تو آپ ﷺ نازک ترین حالات میں بھی میدانِ جنگ میں ثابت قدم رہے۔ پھر جب آپ ﷺ کی صدا...... انا النبی لا کذب۔ انا ابن عبد المطلب...... فضا میں گونجی تو مسلمان مجاہدین نے پلٹ کر ایسا زوردار حملہ کیا کہ جنگ کا پانسہ پلٹ گیا۔

جن بدباطن مستشرقین نے حضور ﷺ پر نعوذ باللہ مرگی کے مرض کا الزام لگایا تھا، فرانسیسی مستشرق ایمیلی ڈرمنگھم (۱۸۹۲ء۔ ۱۹۷۱ء) Emile Dermenghem نے یہ کہہ کر انھیں دفاعی پوزیشن میں دھکیل دیا ہے۔

> ''ہر جنگ میں جس فراست، شجاعت، جنگی حکمتِ عملی اور مہارت کا محمد (ﷺ) نے جو ثبوت دیا، کیا وہ کسی ایسے شخص کے لیے ممکن ہے جو کسی نوع کی بیماری میں مبتلا ہو؟'' (۶)

چونکہ حضور ﷺ کی ذاتِ گرامی اعلیٰ سے اعلیٰ تصورِ انسانیت کا کامل ترین نمونہ تھی، اس لیے

حضور ﷺ کی شخصیت، آپ ﷺ کی تعلیمات، آپ ﷺ کا قائم کردہ معاشرہ اور آپ ﷺ کے غذائی معمولات تک ہمہ پہلو صحت مندانہ توازن کے حامل نظر آتے ہیں۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اگر سیرت کے اس پہلو کا قدرے تفصیل سے مطالعہ کیا جائے تو اس کی مدد سے حفظانِ صحت کے رہنما اصول مرتب کیے جاسکتے ہیں۔

حفظانِ صحت کا ایک اصول یہ ہے کہ انسان جذباتی لحاظ سے نارمل زندگی گزارے۔ ایک مضبوط اعصاب کا شخص کبھی مغلوب الغضب نہیں ہوسکتا۔ ویسے بھی مشتعل جذبات لازماً جسم پر مضر اثرات ڈالتے ہیں۔ علم طب کے حقائق سے پتا چلا ہے کہ غصے کا شدید دورہ شروع ہونے سے جگر، قلب اور دماغ میں سوزش بلکہ بعض اوقات دیوانگی کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ غصے کا ایک اور طبی نقصان یہ ہے اس سے لعاب دہن زہریلا ہوجاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر حیوانات کو جب چھیڑ کر غصہ دلایا جاتا ہے تو وہ کاٹ کر ایسا شدید زخم پہنچاتے ہیں جو بہت دنوں میں مندمل ہوتا ہے۔ حالانکہ اگر وہ عام حالت میں کاٹیں تو وہ زخم بہت جلد ٹھیک ہوجاتا ہے۔ غیظ وغضب کے سلبی جذبات حضور ﷺ پر کبھی غلبہ نہ پاسکے۔ حضور ﷺ کی حیرت انگیز قوتِ برداشت واقعہ افک کی تفصیلات کا مطالعہ کرنے سے سامنے آتی ہے۔ یہ وہ موقع تھا جب مدینہ منورہ کے اشرار ومنافقین (جن کی سازشوں کا شکار بعض اہل ایمان بھی ہوئے) نے آپ ﷺ کی زوجہ محترمہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے دامن اقدس پر بہتان باندھا تھا۔ آپ ﷺ نے حکمِ الٰہی کے انتظار میں کسی شخص کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔ حالانکہ آپ ﷺ کے ایک اشارے پر جاں نثار صحابہؓ منافقین کی گردنیں اڑا دیتے۔ ضبط نفس کی یہ کیفیت غیر معمولی جسمانی صحت کی علامت ہے۔ حضرت انسؓ قریباً نو سال (اور بعض روایات کے مطابق دس سال) رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر رہے۔ ان کا بیان ہے کہ میں نے آپ ﷺ کی زبان سے کوئی درشت کلمہ نہیں سنا۔ نہ کبھی آپ ﷺ نے یہ کہا کہ تم نے یہ کام کیوں کیا اور نہ یہ کہ فلاں کام کیوں نہیں کیا؟ آپ ﷺ کا یہ قول مبارک کتنی حکمتوں کا حامل ہے۔

ليس الشديد بالصرعة انما الشديد الذى يملك نفسه عند

الغضب

”پہلوان وہ نہیں جو کہ مقابل کو پچھاڑ دے۔ حقیقی پہلوان وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے آپ کو قابو میں رکھے۔“ (بخاری و مسلم)

تجربہ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ جسمانی قوتوں کو آخری دم تک برسرِ عمل رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ نو بنو معلومات اور حقائق سیکھنے کا شوق کبھی سرد نہ پڑنے دیا جائے۔ نئے نئے علوم سے آگہی انسانی شعور و ادراک کو تازگی بخشتی ہے۔ اگر غم انسانی صحت و حسن کو یوں کھا جاتا ہے جیسے لکڑی کو گھن، تو اس کے برعکس مسرت و انبساط (خصوصاً روحانی یا ذہنی جسے رسل Intellectual Delight کہتا ہے) انسان کے قوائے عمل کو تعمیری خطوط پر تادیر متحرک رکھتے ہیں۔ انسان کے اندر عزم زندگی (Will to live) جواں رہتا ہے۔ مظاہر فطرت اور کائنات کی وسعتوں میں غور و فکر مسرت کا ایک اہم سرچشمہ ہے۔ حضور ﷺ کی مشہور دعا کے یہ الفاظ رب ارنی حقائق الاشیاء (اے رب! مجھ پر حقائق اشیا ظاہر فرما دے) اسی علمی مسرت و انبساط کا مظہر ہیں۔ روایت ہے مسجدِ نبوی میں حضور ﷺ داخل ہوئے تو ایک طرف محفل ذکر اور دوسری طرف محفل فکر برپا تھی۔ دونوں اطراف سے آپ ﷺ کو پکارا گیا۔ لیکن آپ ﷺ پہلے محفلِ فکر میں شریک ہوئے اور فرمایا کہ ”میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔“ قرآنِ حکیم سے معلوم ہوتا ہے کہ جب وحی الٰہی اترتی تو رسول اللہ ﷺ ہمہ تن گوش طالب علم کی طرح اس کو سیکھنے میں جلدی فرماتے۔ قرآنِ حکیم میں اس پر گرفت فرمائی گئی کہ وحی کی تکمیل کے لیے جو وقت مقرر ہے، اس سے پہلے ہی اُسے مکمل طور پر پیش کرنے کے لیے تعجیل سے کام نہ لیجیے۔

وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا۝ (سورۃ طٰہٰ: ۱۱۴)

اور دیکھو، قرآن پڑھنے میں جلدی نہ کیا کرو جب تک کہ تمہاری طرف اس کی وحی تکمیل کو نہ پہنچ پائے، اور دعا کرو کہ اے پروردگار مجھے مزید علم عطا کر۔

بعض اوقات ہماری ناک میں فاسد مواد اٹک جاتا ہے۔ جس سے جسم کے اس حصہ کو اپنے قدرتی وظیفہ کی بجا آوری میں رکاوٹ محسوس ہوتی ہے۔ اس گندے مواد کے اخراج اور نکاس کے لیے چھینک بہت ضروری ہے۔ چھینک سے جسم کو ایسا خوشگوار دھچکا لگتا ہے جس سے طبیعت کو بڑا انشراح ہوتا ہے۔ حضور ﷺ نے اس کی تحسین فرماتے ہوئے چھینکنے والے شخص کو "الحمد للہ" کہنے کی تاکید فرمائی۔ لیکن خیال رہے کہ چھینک آنے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس سے کم و بیش ایک لاکھ جراثیم سے لدے ہوئے ذرات سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ خارج ہو کر منتشر ہو جاتے ہیں۔ حضور ﷺ کا عمل یہ تھا کہ چھینکتے وقت ناک پر رومال یا ہاتھ رکھ لیتے تھے۔ (مشکوۃ المصابیح، باب کتاب الآداب)

اچھی صحت اچھی غذا کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ غذا سادہ اور مقوی ہو۔ پیٹ بھر کر نہ کھائی جائے تو لازماً قوت پہنچاتی ہے۔ آج بھی اکثر امراض غذائی بے اعتدالیوں کی وجہ سے لاحق ہوتے ہیں۔ اطبا مختلف امراض کے علاج میں بعض غذاؤں کو تجویز کرنے کے ساتھ بعض دوسری غذاؤں کو ترک کرنے کا مشورہ بھی دیا کرتے ہیں۔ طب یونانی میں تو خاص طور پر غذائی علاج کو ترجیح دی جاتی ہے۔

حضور ﷺ کی غذا میں جو چیزیں شامل تھیں، فن تغذیہ (Dietetics) میں ان کی طبی افادیت مسلّم ہے۔ ایسی چیزوں میں کدو، شہد، بکری کا دودھ، کھجور، گوشت، تربوز اور انجیر وغیرہ اشیائے خورد و نوش شامل ہیں۔ ان میں سے چند ایک کے طبی خواص ملاحظہ ہوں:

کدو: حضور ﷺ بہت رغبت سے تناول فرمایا کرتے تھے۔ حضرت انس بن مالک ؓ راوی ہیں کہ ایک درزی نے حضور ﷺ کی دعوت کے موقع پر جو کی روٹی اور کدو گوشت سے آپ ﷺ کی تواضع کی۔ حضور ﷺ بڑے شوق کے ساتھ سالن سے کدو کے ٹکڑے تلاش کر کے تناول فرماتے رہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا "کدو دماغ کو طاقت دیتا ہے اور عقل میں اضافہ کرتا ہے۔" اطبائے یونانی اور اطبائے ایلوپیتھی اس بات پر متفق ہیں کہ سبزیوں میں کدو معتدبہ

افادات کا حامل ہے۔ یہ قبض کشا ہے۔ جگر کی گرمی کو دور کرتا ہے اور پیشاب کے ذریعے بدن کے فاسد مادوں کو خارج کرتا ہے۔(۷)

شہد: رسول اللہ ﷺ صبح نہار منہ پانی میں شہد گھول کر اس کا پیالہ پیا کرتے تھے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں۔ پینے والی چیزوں میں شہد رسول اللہ ﷺ کو سب سے زیادہ پسند تھا۔ (بخاری)۔ شہد قدرت کا بہترین عطیہ ہے اور اس لحاظ سے خالص ترین خوراک ہے کہ اس پر کسی قسم کے جراثیم یا بیکٹیریا کا اثر نہیں ہوتا۔ مصر میں فراعنہ کی لاشیں تہ خانوں میں رکھی جاتیں تو اُن کے ساتھ دیگر سامان کے علاوہ شہد بھی رکھا جاتا تھا۔ چنانچہ اس زمانے کا رکھا ہوا شہد آج بھی بالکل محفوظ حالت میں ملا ہے۔ صرف اس کا رنگ تبدیل ہوا ہے ورنہ اس کی مٹھاس بدستور قائم ہے اور اس میں کسی قسم کے زہریلے اثرات پیدا نہیں ہوئے۔ یورپ کی ترقی سے پہلے مسلمان حکما ادویات کو موسمی اثرات سے بچانے کے لیے جو معجونیں وغیرہ تیار کرتے، اُن میں شہد سے بھی کام لیا جاتا تھا۔(۸) جسمانی کمزوری، بلغم اور جوڑوں کا درد بڑھاپے کے تین عمومی مسائل ہیں۔ شہد کے استعمال سے تینوں مسائل بخوبی حل ہو جاتے ہیں۔(۹)

دودھ: اونٹ، گائے اور بکری کا دودھ بھی رسول اللہ ﷺ رغبت کے ساتھ نوش فرماتے۔ ایک موقع پر فرمایا "دودھ کے سوا اور کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ جو کھانے اور پینے دونوں میں کام دیتی ہو۔" مذکورہ جانوروں کے بارے میں آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ یہ ہر قسم کے درختوں پر چرتے ہیں۔" بکری کے دودھ کی غذائیت اور افادیت کے اطبا بھی معترف ہیں۔ بکری چونکہ آک اور تھوہر جیسے زہریلے پودوں کو بلا تکلف کھا لیتی ہے، اس لیے اس کے دودھ میں ایک تریاقی اثر پیدا ہو جاتا ہے۔ طب یونانی کی مشہور غذائی دوا ...... "ماء الجبن" ...... عموماً بکری کے دودھ سے تیار کی جاتی ہے۔

انجیر: قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے انجیر اور زیتون کی قسم کھائی ہے۔ حضرت ابوالدرداءؓ سے روایت ہے۔ حضور ﷺ کی خدمت میں، انجیر سے بھرا ہوا تھال پیش کیا گیا۔ آپ ﷺ نے

فرمایا! کھاؤ۔ ہم نے اس میں سے کھایا۔ پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا'' اگر کوئی کہے کہ کوئی پھل جنت سے زمین پر آ سکتا ہے تو میں کہوں گا کہ یہی وہ ہے، کیونکہ بلاشبہ یہ جنت کا میوہ ہے۔ اس میں سے کھاؤ کہ یہ بواسیر کو ختم کرتا ہے اور گنٹھیا میں مفید ہے۔'' طبی مشاہدات وتجربات سے پتا چلتا ہے کہ انجیر قبض کشا ہے۔ انجیر کھانے سے حیض کے خون میں اضافہ ہوتا ہے اور یہ گردوں اور پتہ سے پتھری کو حل کر کے نکالنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ (۱۰)

کھجور: حضور ﷺ کو کھجور بھی بہت پسند تھی۔ ابو داؤد کی روایت میں ہے کھجور تناول فرماتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا''میں کھجور کی گرمی کو تربوز کی ٹھنڈک سے برابر کر لیتا ہوں۔'' حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں۔ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا:''جس گھر میں کھجور ہو، اس گھر والے کبھی بھوکے نہ رہیں گے۔'' ابن ماجہ کی روایت میں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:''رات کا کھانا ہرگز نہ چھوڑو خواہ مٹھی بھر کھجور ہی کھاؤ، کیونکہ رات کا کھانا ترک کرنے سے بڑھاپا طاری ہو جاتا ہے۔'' حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:'' میرے نزدیک عورتوں کے حیض کی کثرت کے لیے کھجور سے بہتر کوئی دوا نہیں۔'' ایک اور روایت کے مطابق آپ ﷺ نے پیٹ کے کیڑوں کے علاج کے لیے بھی کھجور کو تجویز فرمایا۔ اطبا کے نزدیک کھجور میں تمام وٹامن معقول مقدار میں پائے جاتے ہیں۔

قرآن حکیم اور احادیثِ نبوی میں جن ماکولات اور مشروبات کی حرمت بیان کی گئی ہے۔ اُن میں خون، سوٴر کا گوشت اور شراب بھی شامل ہیں۔

بعثتِ نبوی ﷺ کے وقت لوگ خون کی علتِ تحریم سے آگاہ نہ تھے۔ بعد کے ادوار میں سائنسی تحقیقات سے حقائق سامنے آئے اور یوں مضطرب دماغوں کو شرحِ صدر حاصل ہوا۔ خون میں یورک ایسڈ موجود ہے جو تیزابی سادہ ہونے کی وجہ سے خطرناک زہریلی تاثیر اپنے اندر رکھتا ہے۔ نیز خون بہت سی اقسام کے جراثیم، بیکٹیریا اور زہروں کو منتقل کرنے کا ذریعہ ہے۔ اسلامی ذبیحہ کا طریقہ اس لیے زیادہ محفوظ اور مفید صحت ہے۔ اس طریقے سے خون نالیوں میں جم نہیں پاتا اور زیادہ

سے زیادہ خون جسم سے خارج ہو جاتا ہے۔(۱۱)

سؤر کا گوشت مختلف نوعیت کی کم از کم ستر بیماریوں کا موجب بنتا ہے۔ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ سؤر کے گوشت میں موجود جراثیم زیادہ درجہ حرارت پر بھی نہیں مرتے۔ یہ دنیا کا غلیظ ترین جانور ہے جو گوبر، فضلہ اور گندگی پر پرورش پاتا ہے۔ یہ دنیا میں پایا جانے والا سب سے زیادہ بے شرم جانور ہے اور یہ واحد جانور ہے جو دوسرے ساتھیوں کو اپنی مادہ کے ساتھ جنسی فعل کی دعوت دیتا ہے۔ اب یہ بات بعید از قیاس نہیں رہی کہ غذاؤں کا انسانی اخلاق پر بھی اثر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اپنے بچے کو احمق اور فاحشہ عورتوں سے دودھ نہ پلواؤ کیونکہ دودھ بچے کے جسم اور اخلاق دونوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔'' (تفسیر زاہدی) اس اصول کو سامنے رکھتے ہوئے علما اُمت نے متنبہ کیا ہے کہ جیسے منشیات کے عادی اور ایڈز کے مریض کا خون قبول نہیں کیا جاتا۔ ایسے ہی انتقالِ خون کے وقت حتیٰ المقدور فاسق و فاجر شخص کے خون سے بھی پرہیز لازم ہے۔

اسلام میں شراب کو بھی حرام قرار دیا گیا ہے۔ سفرِ معراج میں رسول اللہ ﷺ کے پینے کے لیے تین پیالے پیش کیے گئے۔ ایک میں پانی، دوسرے میں دودھ اور تیسرے میں شراب تھی۔ آپ ﷺ نے دودھ کا پیالہ اٹھا لیا۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے آپ ﷺ کو مبارکباد دی کہ آپ ﷺ فطرت کی راہ پا گئے۔ جدید طبی تحقیق کے مطابق شراب نوشی کی وجہ سے انسان کا دل سکڑنے لگتا ہے اور شراب پینے والے لوگ اپنی عمر سے پہلے ہی دماغی طور پر بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ امریکن میڈیکل ایسوسی ایشن کے جریدے (Orchives of Neorology) میں شائع ہونے والی تحقیق کے مطابق ہر آدمی کا دماغ بڑھتی عمر کے ساتھ سکڑنے لگتا ہے۔ ہر دس سال بعد دو فیصد سکڑنے کا عمل تمام انسانوں میں جاری رہتا ہے۔ مگر جب انسان باقاعدگی سے شراب پینے لگتا ہے تو دماغ سکڑنے کی شرح ۵ سے ۷ فیصد تک بڑھ جاتی ہے۔ شراب پینے والی خواتین میں یہ شرح ۶ سے ۸ فیصد تک نوٹ کی گئی ہے۔ اس تحقیق کی رو سے شراب دماغ کے اندر سفید رنگ کے مادے کو بڑھنے سے روکتی ہے جس سے دماغ کی ساخت برقرار رکھنے کے عمل میں تبدیلیاں آ جاتی ہیں۔

اس سلسلے میں MRI کے ذریعے ۱۸۳۹ افراد کی دماغ کی ساخت کا مطالعہ کیا گیا اور نتیجہ اخذ کیا گیا کہ دماغ کی متعدد بیماریاں دماغ کے سکڑنے کی وجہ سے لاحق ہو سکتی ہیں۔

کھانے کے متعلق چند مزید اصول بھی حضور ﷺ سے ثابت ہیں۔ اوّل یہ کہ کم خوری بہترین حکمت عملی ہے۔ حضور ﷺ نے شاذ ہی پیٹ بھر کر کھانا کھایا ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا ''اپنے معدہ کو تین حصوں میں تقسیم کرو۔ ایک کو ٹھوس غذا سے بھرو، ایک حصہ کو پانی اور ایک حصہ نور کے لیے خالی چھوڑ دو۔'' رسول اللہ ﷺ کی زندگی كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا (الاعراف:۳۱) (کھاؤ پیو لیکن زیادہ نہ کھاؤ) کی عملی تفسیر تھی۔ یہاں پر اس بات کا تذکرہ بے جا نہ ہو گا کہ ایک بار خلیفہ بغداد کے پاس ایک رومی فاضل آیا۔ اس نے قرآن کریم کے متعلق اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا۔ ''تمھاری کتاب میں سب کچھ موجود ہے لیکن طب کے متعلق کچھ نہیں۔'' اس پر وہاں موجود ایک جید عالم دین حضرت اسمٰعیل حقیؒ نے یہی آیت پڑھی۔ تو وہ بولا۔ ''اللہ کی قسم! یہ کلیہ جالینوس کی پوری طب کا خلاصہ ہے۔''

دوسری بات یہ کہ فرداً فرداً کھانا کھانے کے بجائے مل کر کھایا جائے۔ ایک مرتبہ صحابہؓ نے عرض کیا: ہم کھاتے ہیں مگر سیری نہیں ہوتی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''شاید تم الگ الگ کھاتے ہو۔'' صحابہؓ نے عرض کیا۔ جی ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا: ''سب مل کر کھانا کھایا کرو اور اللہ کے نام کا ذکر بھی کرو۔ تمھارے کھانے میں برکت ہو گی۔'' اس سلسلے کی تیسری احتیاط یہ ہے کہ غذا میں چٹ پٹی اور روغنی غذاؤں کا استعمال کم سے کم ہونا چاہیے۔ حضور ﷺ کی خوراک انتہائی سادہ تھی۔ کھانوں میں ثرید آپ ﷺ کو بہت مرغوب تھا۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے۔ ''عائشہؓ کو دوسری عورتوں پر ایسی فضیلت حاصل ہے جیسے ثرید کو دوسرے کھانوں پر حاصل ہے۔'' آپ ﷺ کی پیروی میں صحابہ کرامؓ غذا میں تعیّش کو پسند نہ کرتے تھے۔ موجودہ دور میں عوارض قلب میں اضافہ کی بڑی وجہ سادہ اور حیاتین سے بھرپور غذاؤں سے بے اعتنائی ہی ہے۔ جو مرغن غذائیں ہم کھاتے ہیں اُن سے ایک چکنا مادہ کولیسٹرول پیدا ہوتا ہے۔ جب اس مادے کی مقدار خون میں بڑھ جاتی ہے تو اس

سے دورانِ خون میں رکاوٹ پیدا ہونے لگتی ہے اور دل تک تازہ خون کی رسائی نہیں ہو پاتی۔ چوتھی احتیاط یہ ہے کہ ارشادِ نبوی ﷺ کے مطابق مشروبات میں پھونک مارنے سے گریز کرنا چاہیے۔ آج ہمیں معلوم ہے کہ ایسا کرنے سے کاربانک ایسڈ گیس منہ سے خارج ہو کر پانی، دودھ، چھاچھ اور شربت وغیرہ میں شامل ہو جاتی ہے۔

حضور ﷺ کی حیاتِ مبارکہ میں طہارت کے عنوان سے حفظانِ صحت کا ایک اور زریں اصول بھی ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آغازِ تبلیغ میں ہی آپ ﷺ کو جو ہدایات عطا فرمائیں، اُن میں یہ بھی تاکید فرمائی۔ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۝۔ (المدثر: ۵۔ ۴) ''اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھو۔ (اور ہر قسم) کی گندگی سے دور رہو۔'' گویا ابتدا سے یہ بات واضح کر دی گئی کہ اسلام دین فطرت ہے اور تقربِ الٰہی کے لیے روح، جسم اور لباس سب کی صفائی چاہتا ہے۔ احادیث میں طہارت پر آپ ﷺ کے ارشادات پر مشتمل پورے ابواب ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کو طہارت کا محض احساس ہی نہ تھا بلکہ آپ ﷺ اس معاملے میں انتہائی حساس تھے۔ اس باب میں آپ ﷺ کی حساسیت کا عالم یہ تھا کہ بظاہر بہت معمولی معاملات سے بھی صرفِ نظر نہیں فرمایا۔ آپ ﷺ کی ہدایت ہے۔ ''رفع حاجت کے بعد متعلقہ حصوں کی صفائی ہڈی و گوبر سے ہرگز نہ کرو کیونکہ اُن میں جن ہوتے ہیں۔'' واضح رہے جن سے مراد ایک تو وہ غیر مرئی مخلوق ہے جس کا ذکر قرآن میں موجود ہے یعنی ''ہم نے جنوں اور انسانوں کو اللہ کی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔'' اس کے علاوہ عربی میں جن کے لفظ کا اطلاق ہر مخفی چیز موذی یا غیر موذی نیز مہلک جراثیم پر بھی ہوتا ہے۔ (۱۲) ایک اور روایت کے مطابق آپ ﷺ نے دیکھا کہ ایک صاحبِ قبر، عذاب الٰہی میں مبتلا ہے۔ آپ ﷺ نے صحابہؓ کو اِس سے مطلع فرمایا اور وجہ یہ بتائی کہ متوفی پیشاب کے قطروں سے پرہیز نہ کرتا تھا۔ ویسے تو جسم کے ہر حصے ناک، کان، منہ، زبان، بال، دانت وغیرہ کی صفائی آپ ﷺ کے پیش نظر تھی اور ان اعضاء سے ہر ایک کے متعلق آپ کی ہدایات ملتی ہیں۔ لیکن ہم اس وقت صرف دو تین امور تک موجودہ تحقیق کو محدود رکھیں گے۔

۱۔ رسول اللہ ﷺ غسل کی تاکید فرماتے تھے۔ ایک بار آپ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو وضو کی اہمیت ذہن نشین کرانے کے لیے استعارے کے اسلوب میں پوچھا: ''کیا کسی ایسے شخص کے جسم پر کچھ بھی میل باقی رہ سکتا ہے جو دن میں پانچ مرتبہ نہاتا ہو؟ اس کے علاوہ جمعة المبارک اور عیدین کے موقع پر غسل کو واجب قرار دیا۔ غسل بجائے خود بہت سی بیماریوں کا شافی علاج ہے۔ لیکن اس کی اہمیت بعض وجوہ سے اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ انسانی جسم میں صرف روپیہ بھر جگہ میں دو ہزار کے قریب مسامات ہوتے ہیں۔ دن بھر میں ایک شخص کے مسامات سے اس قدر پانی اور رطوبات نکلتے ہیں کہ اس سے ایک بوتل بھری جا سکتی ہے۔ یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ بہت سے زہر (مثلاً آرسینک، آیوڈین، پارہ اور سیسہ وغیرہ) جو جسم جذب کرتا ہے وہ پسینے میں حل شدہ ملتے ہیں۔ چنانچہ اگر تجربہ کے طور پر پسینہ انجکشن کے ذریعے کسی جانور کے جسم میں داخل کر دیا جائے تو وہ زہر خورنی کی علامت پیدا کر دیتا ہے۔ پسینہ کے ذریعے چونکہ ان زہروں کا اخراج ہوتا ہے، اس لیے غسل کے بعد ہم ان سے چھٹکارا پا سکتے ہیں۔

۲۔ حضور ﷺ کے دندانِ مبارک سے روشنی نکلتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ مسواک آپ ﷺ کی عادتِ ثانیہ تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا میری اُمت پر بڑا بوجھ ہوگا، ورنہ میں نماز کی طرح پانچوں وقت مسواک کرنا فرض قرار دیتا۔ (مشکوٰۃ) حالتِ سفر میں جو سات اشیا اپنے ساتھ رکھتے، اُن میں مسواک بھی شامل تھی۔ یہاں تک کہ عالمِ نزع میں بھی مسواک کی خواہش ظاہر کی اور اُم المومنین حضرت عائشہؓ نے اپنے دانتوں سے نرم کر کے آپ ﷺ کو پیش کی۔ آپ ﷺ صبح اُٹھنے کے بعد اور رات کو سوتے وقت مسواک استعمال فرماتے۔ بالخصوص سونے سے قبل مسواک کی عادت قابلِ توجہ ہے کیونکہ غذا کے ذرات دانتوں میں اٹک جاتے ہیں۔ نیند کی حالت میں منہ کی گرمی اور رطوبت ان ذرات کو پگھلا کر اُن میں خمیر پیدا کر سکتی ہے جس سے دانتوں کی چمک زائل ہو جاتی ہے۔ رات کو مسواک اور خلال کرنے

سے دانتوں کی چمک دمک کو باقی رکھا جا سکتا ہے۔

۳۔ لباس وغیرہ کے لیے رنگوں کے انتخاب میں بھی رسول اللہ ﷺ کا منفرد ذوق آپ ﷺ کے احساس طہارت کا آئینہ دار ہے۔ رنگ ایک طرف تو ہمارے اخلاق و کردار کی ترجمانی کرتے ہیں۔ دوسرے یہ ہماری صحت و مرض پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ مثلاً سُرخ رنگ شہوانی جذبات میں ہیجان پیدا کر دیتا ہے۔ اس کے برعکس سبز رنگ قوتِ بینائی کے لیے فائدہ رساں ہوتا ہے۔ آنحضور ﷺ لباس میں سادگی کے لیے سفید رنگ پسند فرماتے۔ سبز رنگ بھی پسند تھا، لیکن مردوں کے لیے سُرخ رنگ پسندِ خاطر نہ تھا۔ ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سرخ لباس پہنے حاضر ہوئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ یہ کیا لباس ہے؟ انھوں نے جا کر آگ میں ڈال دیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جلانے کی کیا ضرورت تھی۔ کسی خاتون کو دے دیا ہوتا۔'' (ابوداؤد)

مستند روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ سونے سے قبل ایک آنکھ میں تین مرتبہ اثمد کا سرمہ ڈالا کرتے تھے۔ اس مقصد کے لیے آپ ﷺ نے ایک سرمہ دانی بھی رکھی ہوئی تھی۔ ایک عطر دان بھی گھر میں موجود ہوتا تھا۔ اس سے آپ ﷺ خوشبو استعمال کیا کرتے تھے۔ صحابہ کرام فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہمیں گھر نہ ملتے تو ہمیں آپ کی تلاش میں مطلق دقت نہ ہوتی تھی۔ جس راہ سے آپ ﷺ گزرے تھے وہ راہ مہک جاتی۔ ہم اس خوشبو کی طرف ہو لیتے اور تھوڑی ہی دیر میں آپ ﷺ کو تلاش کر لیتے تھے۔ پروفیسر اظہار الحق نے ان معلومات کی روشنی میں آپ ﷺ کی پرکشش شخصیت کی جو جمالیاتی تصویر پیش کی ہے، ہلکے سے تصرّف کے ساتھ وہ کچھ یوں ہے۔

''ایک بارعب شخصیت، تیل لگائے، کنگھا کیے، لمبے گھنگریالے بال لیے، آنکھوں میں سرمہ اور حیا کی زینت سجائے، مسکراتے ہوئے، موتیوں جیسے چمکدار دانتوں سمیت رضائے الٰہی کی طلب میں زندگی کی سنگلاخ راہوں پر عازم سفر ہے۔ سفید لباس کے اوپر کبھی سبز، کبھی سیاہ رنگ کا عمامہ

زیب تن فرما کر آپ ﷺ پورے وقار اور حسن و جمال کے ایسے پیکر نظر آتے ہیں جس کے آگے نگاہیں اور دل بچھے جاتے ہیں۔" (۱۳)

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ طہارت کے لیے آپ ﷺ کے نازک ولطیف احساسات نے ملت اسلامیہ کی تمدنی زندگی پر گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔ طہارت و نظافت شروع ہی سے اسلامی تہذیب وثقافت کا طرۂ امتیاز رہی ہے۔ ہمارے دورِ زوال میں تصوف کے ایک عجمی ایڈیشن کی آڑ میں بعض غیر اسلامی طریقوں کو دین کا حصہ قرار دیا گیا لیکن نجاست اور گندگی کو کبھی فروغ نہیں مل سکا۔ آج بھی اہل مدینہ کسی کو بددعا دینا چاہیں تو کہتے ہیں "اللہ تجھے غسل جمعہ نصیب نہ کرے۔" یہاں تقابلی طور پر اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ عیسائیت میں جب رہبانیت کے اثر سے بگاڑ پیدا ہوا تو وہاں طہارت کو نہیں بلکہ نجاست کو اخلاقی زندگی کی معراج قرار دیا گیا۔ سینٹ پال کہتا ہے۔ "جسم اور لباس کی صفائی کا مطلب روح کی گندگی ہے۔" جوؤں کو "خدا کے موتیوں" کا نام دیا گیا اور جوؤں سے لدے شخص کو مقدس انسان سمجھا گیا۔ (۱۴) پاپائے روم نے سسلی اور جرمنی کے شہنشاہ فریڈرک ثانی (۱۲۱۲ء ۔ ۱۲۵۰ء) پر ارتداد کا فتویٰ لگایا تو ایک اہم الزام یہ بھی تھا کہ وہ ہر روز مسلمانوں کی طرح غسل کرتا ہے۔ سینٹ اتھانا سیلوس بڑے فخر سے سینٹ اینتھونی (St. Anthony) کی یہ خوبی بیان کرتا ہے کہ اُس نے مرتے دم تک اپنے پاؤں نہیں دھوئے۔ (۱۵)

طہارت کے بارے میں تعلیماتِ نبوی ﷺ کا جادو دورِ حاضر میں سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ آج کل عالمی ادارہ صحت WHO کے زیر اہتمام دنیا بھر میں ہاتھ دھونے کی ترغیب دینے کے لیے سالانہ دن منایا جاتا ہے۔ ادارے کی جانب سے ایک سروے کے مطابق بیس سیکنڈ صابن سے ہاتھ دھونے سے اسہال اور نمونیہ کی پچاس فیصد اموات کم ہو جاتی ہیں۔

عہدِ نبوت ﷺ میں صحت و صفائی کے فطری تقاضوں کا پوری طرح خیال رکھا جاتا تھا۔ آپ ﷺ کی ہدایات تھیں کہ کوئی شخص دریاؤں کے گھاٹ، پبلک مقامات اور سایہ دار جگہوں پر رفع

حاجت کے لیے نہ جائے۔ خود قرآن حکیم نے صحابہؓ کی پاکیزگی کو ان الفاظ میں سراہا۔ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ط (سورۃ التوبۃ: ۱۰۸) ''اس میں ایسے لوگ ہیں جو پاک رہنا پسند کرتے ہیں'' اس کے ساتھ ہی عطائی حکیموں اور ڈاکٹروں کو لوگوں کی صحت اور جان سے کھیلنے کی اجازت نہ تھی۔ آپ ﷺ کا واضح فرمان ہے:

من تطبب ولم يعلم منه طب فهو ضامن (ابوداؤد، نسائی، مشکوٰۃ)

یعنی ''جو شخص طبیب بن کے بیٹھا رہا حالانکہ اسے علاج و معالجہ کا تجربہ نہ تھا تو وہ (مریض کی موت یا مرض کے بڑھنے کا) ذمہ دار ہے۔''

دین و مذہب سے وابستہ بعض لوگ بڑے اخلاص کے ساتھ علاج معالجہ کو توکل علی اللہ کے خلاف سمجھتے آئے ہیں۔ سیرت النبی ﷺ سے اِس طرزِ فکر و عمل کی تائید نہیں ہوتی۔ یہی نہیں بلکہ مرض کے علاج کی بہت سی تاکیدی روایات ملتی ہیں:

۱۔ اُسامہ بن شریکؓ فرماتے ہیں: ''میں نبی ﷺ کے پاس گیا۔ آپ ﷺ کے اصحاب اس طرح خاموش بیٹھے تھے گویا ان کے سروں پر چڑیاں بیٹھی ہوں۔ میں نے سلام کیا اور بیٹھ گیا، اتنے میں کچھ اعرابی آ گئے۔ انھوں نے پوچھا: ''یا رسول اللہ ﷺ! کیا ہم علاج کریں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''ضرور علاج کرو۔ اللہ نے کوئی بیماری نہیں بنائی جس کی دوا نہ پیدا کی ہو، سوائے ایک بیماری کے اور وہ بڑھاپا ہے۔''

۲۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ احد کے دن زخمی ہونے والے ایک انصاری کے زخم کے علاج کے لیے حضور ﷺ نے مدینہ کے دو طبیب بلوائے۔ ان دونوں نے حاضر ہونے کے بعد عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول ﷺ ہم ایام جاہلیت میں لوگوں کا علاج کرتے تھے۔ اب اسلام کی نعمت حاصل ہونے کے بعد صرف توکل کافی ہے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: اس کا علاج کرو، اس لیے کہ جس نے اس کے لیے بیماری پیدا کی ہے، اس نے اس کے لیے شفا بھی رکھی ہے۔'' (بخاری۔ کتاب الطب / ابن ماجہ۔ ابواب الطب)

خلیفۂ دوم سیدنا حضرت عمر فاروقؓ نے سنتِ رسول ﷺ سے ایسی ہی آگہی بلکہ وابستگی کا ثبوت دیا تھا۔ فاروق اعظمؓ شام میں جاری جہادی مہم کے لیے اگلے مورچوں کا دورہ کرنے کے لیے روانہ ہوئے۔ سرغ کے علاقے میں پہنچے تو شام اور قرب و جوار میں طاعون کی وبا پھیلنے کی اطلاع موصول ہوئی۔ بعض صحابہؓ کا موقف تھا کہ موت کا ایک وقت معین ہے اور کسی قسم کی وبا کو مقصد کے راستے میں حائل نہ ہونا چاہیے۔ انھوں نے دوسرے گروہ کے نقطۂ نظر کو پذیرائی بخشی جس کے مطابق صحابہ کرام کی بہت بڑی جمعیت کے ساتھ جان بوجھ کر موت کے منہ میں جانا دانش مندی نہ تھی۔ حضرت عمرؓ واپس جانے لگے تو بعض صحابہؓ نے عرض کیا: ''اے عمر! کیا آپ تقدیرِ الٰہی سے فرار چاہتے ہیں؟'' انھوں نے فرمایا: ''بالکل نہیں میں تو تقدیرِ الٰہی سے تقدیرِ الٰہی کی طرف ہی پلٹ رہا ہوں۔'' روایت کے مطابق اِس موقع پر حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ بھی تشریف لے آئے جو اپنی کسی ضرورت کے لیے کہیں گئے ہوئے تھے۔ انھوں نے یہ گفتگو سن کر فرمایا: اس بارے میں میرے پاس واضح حکم ہے۔ میں نے پیغمبر ﷺ کو کہتے سنا: ''جب کسی علاقے میں طاعون پھیل رہا ہو اور تم وہاں موجود ہو تو وہاں سے بھاگ کر نہ نکلو اور اگر سنو کہ وبا پھیلی ہوئی ہے اور تم کسی دوسرے مقام پر ہو تو پھر اُس علاقے میں نہ جاؤ۔'' (۱۶)

حضور نبی کریم ﷺ نے خود بھی گاہے بگاہے مختلف جسمانی امراض کے شافی علاج بیان فرمائے۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا اصل منصب بحیثیت خاتم النبیین ﷺ انسانیت کے جملہ اخلاقی و روحانی مسائل اور ان کا علاج ہے۔ جسمانی صحت اور امراض کا علاج اس جامع منصب کا محض ایک پرتو ہے۔ بہ ایں ہمہ یہ حقیقت اٹل ہے کہ زبان وحی ترجمان سے جسمانی عوارض کے علاج کے بارے میں جو کچھ ارشاد ہوا، وہ تاابد تیر بہدف نسخہ ٹھہرا۔ چند مثالیں:

۱۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ فرماتے ہیں: میں بیمار ہوا تو میری عیادت کے لیے رسول پاک ﷺ تشریف لائے۔ میری تکلیف دیکھ کر فرمایا کہ اسے دل کا دورہ پڑا ہے۔ میری

چھاتی پر ہاتھ پھیرا اور درد جاتا رہا۔ ارشاد فرمایا: ''اسے حکیم حارث بن کلدہ کے پاس لے جاؤ۔ حکیم کو چاہیے کہ وہ اس کو مدینہ کی عجوہ کھجوروں کے سات دانے گٹھلی سمیت کوٹ کر کھلائے۔'' چنانچہ اس پر عمل کیا گیا۔ علاج کے بعد حضرت سعد بن ابی وقاصؓ ایسے صحت یاب ہوئے کہ شام اور کئی جنگوں میں لڑے۔ خود کمانڈ کر کے فاتح ایران بنے۔ انھوں نے گھوڑے کی پیٹھ پر ایک لاکھ میل کا سفر کیا۔ (۱۷)

۲۔ رسول اللہ ﷺ کے کچھ صحابہؓ نے عرض کیا کہ کھمبی زمین کی چیچک ہے۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا۔ کھمبی تو ''من'' سے ہے۔ (وہ غذا جو بنی اسرائیل کو صحرائے سینا میں عطا ہوئی)۔ اور اس کا پانی آنکھوں کے لیے شفا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں ''میری ایک خادمہ کی آنکھ میں تکلیف رہتی تھی۔ میں نے پانچ سات کھمبیاں لیں۔ ان کا پانی نچوڑ کر اس کی آنکھوں میں ڈالا تو وہ ٹھیک ہوگئی۔'' کھمبی کا نظری کمزوری اور آنکھ کی سوزش کے لیے مفید ہونا بوعلی سینا نے بھی بیان کیا ہے۔ کھمبی کا تعلق Fungus خاندان سے ہے۔ اس میں جراثیم کش ادویہ کی موجودگی ثابت ہو چکی ہے۔

۳۔ نبی کریم ﷺ اُم المومنین سیدہ عائشہ صدیقہؓ کے گھر داخل ہوئے تو ان کے پاس ایک بچہ تھا جس کے منہ اور ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ حضور ﷺ نے پوچھا۔ یہ کیا ہے؟ جواب ملا کہ بچے کو عذرہ (گلے میں سوزش) کا مرض لاحق ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: اے خاتون تم پر افسوس ہے کہ اپنے بچوں کو یوں قتل کرتی ہو۔ اگر آیندہ کسی بچے کو حلق میں عذرہ کی تکلیف یا اس کے سر میں درد ہو تو قسط ھندی کو رگڑ کر اسے چٹا دو۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ نے اس پر عمل کروایا اور بچہ تندرست ہوگیا۔ (مسلم)۔ قسط بنیادی طور پر جراثیم کش ہے۔ یہ جراثیم کے علاوہ کیڑوں اور امیبا کو بھی مار سکتی ہے۔ ابن القیمؒ کہتے ہیں کہ یہ بلغم کو خارج کرتی ہے اور زہروں کا تریاق ہے۔ جالینوس نے اسے کزاز اور پیٹ کے کیڑوں میں مفید بتایا ہے۔

۴۔ نماز نہ صرف روحانی و قلبی عوارض کا علاج ہے جیسا کہ قرآنِ حکیم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

الا بذکر اللہ تطمئن القلوب۔" آگاہ رہو دلوں کا اطمینان تو ذکرِ الٰہی سے ہی حاصل ہوتا ہے۔" بلکہ امراضِ جسمانی بالخصوص پیٹ کی بیماریوں کے علاج کے لیے بھی طبیب اعظم ﷺ نے نماز کی ادائیگی پر زور دیا۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے مجھے رسول اللہ ﷺ نے دیکھا۔ میں لیٹا ہوا اور دردِ شکم سے بے چین تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ اے ابوہریرہ! کیا تمھیں دردِ شکم ہے؟ میں نے کہا۔ جی ہاں اللہ کے رسول! آپ ﷺ نے فرمایا۔ اُٹھو نماز ادا کرو۔ اس لیے کہ نماز میں شفا ہے۔ (ابن ماجہ)

۵۔ پھوڑے پھنسی کے لیے علاج بذریعہ جراحی بھی آنحضرت ﷺ سے ثابت ہے۔ روایت ہے کہ ایک شخص کی عیادت کے لیے حضور نبی اکرم ﷺ حضرت علیؓ کے ہمراہ تشریف لائے۔ اُس شخص کی کمر میں پھوڑے کا ورم تھا۔ لوگوں نے بتایا کہ اس میں پیپ پڑ چکی ہے۔ آپ ﷺ نے اُس میں شگاف (آپریشن) کرنے کا حکم دیا۔ حضرت علیؓ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں اس وقت شگاف دے دیا۔ ظاہر ہے حضرت علیؓ کو اس کام میں مہارت حاصل تھی۔ ورنہ اس قسم کے فنی کام کے لیے آپ ﷺ انھیں مامور نہ فرماتے۔

۶۔ حضور ﷺ کے طریقۂ علاج میں دوا اور دُعا دونوں کو اہمیت حاصل ہے۔ صرف دوا پر بھروسا کر کے مسبب الاسباب کی ذاتِ والا صفات کو بھول جانا ایسے ہی ناروا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کی یاد کے ساتھ اسباب کو فراموش کر دینا۔ حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز ادا فرما رہے تھے۔ آپ ﷺ نے (سجدہ کی حالت میں) زمین پر دستِ مبارک رکھے تو ایک بچھو نے ڈس لیا۔ آپ ﷺ نے اُس بچھو کو نعلین مبارک سے مار ڈالا اور فرمایا: اس بچھو پر اللہ کی پھٹکار ہو۔ یہ نبی اور غیر نبی کسی کو بھی نہیں چھوڑتا۔ پھر آپ ﷺ نے ایک برتن میں پانی کے ساتھ نمک ملایا۔ آپ ﷺ متاثرہ جگہ پر مسح کرتے جاتے اور معوذتین (قرآنِ پاک کی آخری دو سورتیں) پڑھتے جاتے تھے۔

۷۔ حضرت ابوسعید خدریؓ روایت فرماتے ہیں۔ایک آدمی آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور بیان کیا کہ اس کے بھائی کو اسہال آتے ہیں۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔اسے شہد پلاؤ۔وہ پھر آ کر کہنے لگا۔شہد پینے سے اسہال میں اضافہ ہوا۔رسول اللہ ﷺ نے پھر فرمایا کہ شہد پلاؤ۔اسی طرح وہ تیسری مرتبہ بھی آیا۔آپ ﷺ نے چوتھی مرتبہ بھی فرمایا۔''اسے شہد پلاؤ۔کیونکہ اللہ تعالیٰ کا کلام سچا ہے اور تیرے بھائی کا پیٹ جھوٹا ہے۔''اس نے پھر شہد پلایا تو مریض تندرست ہوگیا۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں۔''حضور ﷺ کے ارشادِ گرامی کذب بطن اخیک میں اس طرف اشارہ فرمایا گیا تھا کہ دوائی تو فائدہ مند ہے۔بیماری کا ابھی باقی رہنا اور شفانہ ہونا دوائی میں نقص کے باعث نہیں بلکہ فاسد مادہ کی زیادتی کے باعث ہے۔لہٰذا اخراجِ مادہ کے لیے بار بار شہد پلانے کا حکم ہوتا رہا۔''(۱۸) ڈاکٹر خالد غزنوی جنھوں نے طب نبوی ﷺ پر قابل قدر کام کیا ہے۔اس حدیث کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> ''آج تک اطبا کا طریقہ کار یہ رہا ہے کہ اسہال کے مریضوں کا علاج ایسی ادویہ سے کرتے ہیں جو قابض ہوتی ہیں اور مریض بھی یہی چاہتا ہے کہ بار بار کی حاجت سے نجات پائے۔مگر یہ عمل مریض کی اپنی صحت کے لیے خطرناک ہے کیونکہ آنتوں کی حرکات کو روک کر دل کو مفلوج کیا جا سکتا ہے۔دوسری صورت میں جراثیم وہاں مقیم رہ کر مستقل طور پر سوزش پیدا کرتے رہیں گے اور ان کی زہریں اعصابی نظام کے لیے مستقل خطرہ بنی رہیں گی۔اس علاج سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نبی ﷺ کو وحی الٰہی سے علم طب پر مکمل عبور حاصل تھا اور انھوں نے وہی کچھ کیا جو ایک حاذق اور معاملہ فہم معالج کو کرنا چاہیے۔''(۱۹)

اللھم صل علی محمد و علی آل محمد

مراجع وحواشی

(الف) امام بخاری ...... تاریخ الکبیر
(ب) محمد بن اسحق ...... السیرہ

۲۔ نعیم صدیقی ...... محسن انسانیت ﷺ

۳۔ جان بیگٹ گلب ...... The Great Conquests of Arabs

۴۔ ایضاً

۵۔ نعیم صدیقی ...... محسن انسانیت ﷺ

۶۔ ایملی ڈرمنگھم ...... The life of Muhammad

(Vie De Mahomet)

Translated from French by Araballa Yorke (1930) Gorge Routledge & Sons London

۷۔ ڈاکٹر خالد غزنوی ...... طب نبوی ﷺ اور جدید سائنس ...... الفیصل ناشران لاہور

۸۔ حفیظ الرحمٰن احسن ...... ۵۔اے ذیلدار پارک (جلد سوم)

۹۔ ڈاکٹر خالد غزنوی ...... طب نبوی ﷺ اور جدید سائنس

۱۰۔ ایضاً

۱۱۔ (الف) حفیظ الرحمٰن احسن ...... ۵۔اے ذیلدار پارک
(ب) خطبات ڈاکٹر ذاکر نائیک۔ (ج) وحید الدین خان ...... مذہب اور جدید چیلنج

۱۲۔ فضل کریم فارانی ...... اسلامی اصول صحت (۲۰۰۳ء) ...... ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور

۱۳۔ پروفیسر اظہار الحق ...... ماہنامہ افکار معلم۔ لاہور مضمون ”سیرت النبی کا جمالیاتی پہلو“ (جون ۲۰۰۵ء)

۱۴۔ برٹرنیڈ رسل ...... Marriage and Morals

Liverright. (1970)

۱۵۔ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ ...... تفہیم القرآن جلد پنجم تفسیر سورۃ الحدید

۱۶۔ ابن قیمؒ ..... طب النبی ﷺ ..... مکتبہ رحمانیہ لاہور

۱۷۔ حکیم محمد ادریس لدھیانوی ..... رسول اکرم ﷺ کے آزمودہ طبی نسخے اور جدید سائنس (۲۰۰۷ء) ..... مکی دار الکتب مزنگ روڈ لاہور

۱۸۔ شیخ عبد الحق محدث دہلوی۔ معارج النبوت جلد اول ترجمہ عبد المصطفیٰ محمد اشرف (۱۹۹۰ء) مکتبہ اسلامیہ اُردو بازار لاہور

۱۹۔ ڈاکٹر خالد غزنوی ..... طب نبوی ﷺ اور جدید سائنس

سیدِ انسانیت ﷺ اور حقوقِ نسواں

''اللہ تعالیٰ نے پھولوں کا حسن، پرندوں کے نغمے، قوسِ قزح کے رنگ، ٹھنڈی ہوا کے جھونکے، لہروں کے قہقہے اور میمنے کی شرافت سب کو اکٹھا کر کے ایک مرکب بنایا اور یوں عورت معرضِ وجود میں آ گئی۔''

عورت کے لیے یہ بہترین خراجِ تحسین ہے۔ لیکن صد افسوس کہ تاریخی حقائق کسی اور جانب اشارہ کرتے ہیں۔ عورت کو بحیثیت انسان بہت کم عزت و توقیر بخشی گئی ہے۔ آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی تیسری دنیا کے ممالک میں اس کی حیثیت ایک بے زبان جانور سے زیادہ نہیں۔ ترقی یافتہ ممالک میں بھی تحریک آزادیِ نسواں نے جہاں خواتین کو بہت سے حقوق عطا کیے ہیں۔ وہاں معاشرے کے لیے اس بے محابا آزادی کے نقصانات کچھ کم ہولناک نہیں۔ اجڑے ہوئے گھر، بکھرے ہوئے خاندان، مہلک مرض ایڈز کی ستم رانیاں، آبروریزی کا کلچر، بچوں میں جرائم کا رجحان (Juvenile Delinquency) اور بہت سے دوسرے سماجی مسائل اس تحریک کے منطقی نتائج ہیں۔

سوال یہ ہے کہ معاشرے میں عورت کا اصل مقام کیا ہے؟

اس سلسلے میں علم و دانش کے تین بڑے سرچشموں ...... فلسفہ و ادب، سائنس اور مذہب ...... سے ممکن حد تک رہنمائی کے لیے رجوع کیا جا سکتا ہے۔ ستم یہ ہے کہ انسان نے ان تینوں ذرائع کو اپنی خود غرضی کی بنا پر صنفِ نازک کی عالمی سطح پر کم و بیش تذلیل و تحقیر کے لیے ہی استعمال کیا ہے۔

عورت اور فلسفہ و ادب

افلاطون اپنی ''جمہوریہ'' میں عورت کو مرد کے مساوی درجہ دیتا ہے۔ پھر بھی اپنے معاشرے

میں عورت کی ذلت کو دیکھ کر اپنے آپ کو تین وجوہات کی بنا پر وہ خوش قسمت خیال کرتا تھا۔ ایک یہ کہ وہ سقراط کے دور میں پیدا ہوا۔ دوسرا یہ کہ وہ آزاد انسان کے طور پر پیدا ہوا نہ کہ بحیثیت غلام۔ تیسرا یہ کہ وہ مرد پیدا ہوا عورت کے طور پر پیدا نہیں ہوا۔ ارسطو نے کہا "فطرت جب کسی کو مرد بنانے میں ناکام ہو جاتی ہے۔ تو اُسے عورت بنا ڈالتی ہے۔" روسو نے کہا۔ "عورت صرف مرد کی تفریح طبع کے لیے تخلیق کی گئی۔" ہربرٹ سپینسر (Herbert Spenser) اس بات کا مدعی ہے کہ سیاسی حقوق چنداں اہم نہیں ہیں۔ پھر بھی عورت ان حقوق کی ہرگز مستحق نہیں ہے۔ شوپن ہار (Shaupenheur) نے کہا: "جب کسی شخص کی عقل اس کے جنسی جذبے کے آگے بے بس ہو جاتی ہے تو وہ ایک منحنی اور بدنما سے وجود کو صنفِ نازک کا نام دے دیتا ہے۔" وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے کہ "موسیقی، شاعری اور دوسرے فنونِ لطیفہ کے بارے میں عورت کے اندر کوئی فطری ذوق نہیں پایا جاتا۔" نیٹشے (Nietzche) کا کہنا ہے: "مرد جنگ کرنے کے لیے پیدا ہوا ہے اور عورت اس جنگجو کی ضیافت طبع کے لیے تخلیق کی گئی ہے۔ باقی سب حماقت ہے۔" وہ یہاں تک کہتا ہے: "اعلیٰ فلسفیانہ تفکر کسی عورت کے بس کی بات نہیں۔" لیبنیز (Leibnitz) نے کہا: "یہ بات کہ شادی کرنی چاہیے یا نہیں، اس کا فیصلہ کرنے کے لیے پوری عمر درکار ہے۔" قابل ذکر بات یہ ہے کہ اپنی ستر سالہ "مختصر" زندگی (۱۶۴۶ء تا ۱۷۱۶ء) میں وہ شادی کرنے کا حتمی فیصلہ نہ کر سکا۔ یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ افلاطون، نیٹشے، شوپن ہار، کانٹ، ڈیکارٹ، جان لاک، سپائی نوزا اور ہربرٹ سپینسر وغیرہ جیسے عظیم فلسفی حضرات سب کے سب عمر بھر کنوارے (chronic bachelors) رہے۔ جو چند ایک اہلِ نظر شادی شدہ تھے، وہ بھی ازدواجی زندگی میں ہمیشہ پریشان رہے۔

یہاں اس بات کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا کہ ان فلسفی حضرات کی منفی آرا اُن کے ذاتی طور پر تلخ تجربات کی آئینہ دار ہیں۔ یہ بات عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے کہ اپنے مخصوص شخصی تجربات کو کسی آفاقی تجربے کی بنیاد نہیں بنایا جا سکتا۔ بدقسمتی سے ان دانشوروں اور فلسفیوں نے عورت کے باب میں اسی

غلطی کا بار بار ارتکاب کیا۔ مثلاً شیکسپیئر کے ایک نامور کردار ہملٹ کی طرح شوپن ہار بھی اپنے محبوب باپ کے انتقال کے بعد اپنی ماں کی دوسری شادی کو ذہنی طور پر قبول نہ کرسکا اور وہ صنفِ نازک کا ہی جانی دشمن بن گیا۔ ول ڈیوراں (Will Durant) نے بجا طور پر کہا: ''شوپن ہار کے ہاں عورتوں سے جو نفرت ملتی ہے، اس کے پیچھے عورت، شادی، بچے، غرض نارمل زندگی کی مکمل تردید کا جذبہ کارفرما ہے۔'' وہ مزید حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے: ''صرف ایک حادثے نے اُس کے دل و دماغ میں عورتوں کے بارے میں شدید نفرت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا۔'' جہاں تک نیٹشے کا تعلق ہے وہ دعوے تو بہت کرتا ہے، لیکن ان کی تائید میں مناسب دلائل فراہم نہیں کر پاتا۔ ول ڈیوراں نے اسی پہلو کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''محبت میں ناکامی کے بعد وہ طبقہ نسواں کی مخالفت میں اس قدر دور چلا گیا جو کسی بھی فلسفی کے شایانِ شان نہیں ہے۔''(۱)

عورت اور مذہب

مذہب نے بلا شبہ بنی نوع انسان کو ہمیشہ آزادی کا راستہ دکھایا۔ مظلوم لوگوں کے لیے سماجی انقلاب کا آوازہ سب سے پہلے اور سب سے بڑھ کر انبیا کرام اور ان کے سچے پیروکاروں نے بلند کیا تھا۔ المیہ یہ ہے کہ استحصالی قوتوں نے عورت کی تذلیل کے لیے بھی مذہب ہی کو استعمال کیا۔ انبیا کرام (Prophets) نے تو عورت کی تحسین کی تھی، لیکن نام نہاد مذہبی پیشواؤں (Priests) نے عورت کی مذمت کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ بدھ مت کے روحانی پیشوا عموماً مجرد رہے ہیں۔ ان کے بقول عورت اور بچوں کو ترک کیے بغیر تحصیل علم نامکمل ہے۔ عبرانی قانون کے تحت بیوی کے لیے Bheululo کا لفظ استعمال ہوتا تھا جس کے معنی مملوکہ یعنی زرخرید غلام کے ہیں۔ عبرانی عورت اپنے باپ کے گھر میں بھی ایک غلام کے درجے پر فائز رہی ہے۔ اپنے مخصوص ایام میں عورت پہلے ہی جسمانی کمزوری کے زیرِ اثر ہوتی ہے۔ بنا بریں کسی قسم کا سماجی بائیکاٹ اُسے شدید احساسِ کمتری سے دوچار کرسکتا ہے۔ بعض یہودی روایات کی رو سے حائضہ عورت معاشرے سے بالکل الگ تھلگ ہو کر رہ جاتی ہے۔ ان مذہبی روایات کے مطابق حائضہ عورت کو جو کوئی چھوئے،

وہ بھی ناپاک ہو جاتا ہے۔ یہودیوں کا ایک فرقہ عورت کے معاملے میں بہت متشدد تھا۔ بازار میں چلتے ہوئے بھی یہ لوگ آنکھیں بند کر کے چلتے تھے تاکہ کسی عورت پر نظر نہ پڑ جائے۔ اِس کوشش میں وہ دیواروں سے یوں ٹکرا کر زخمی ہو جاتے تھے کہ ان کی پیشانی یا ناک سے خون بہنے لگتا۔ تاریخ میں اِن لوگوں کا نام ہی Bleeding Phraisises پڑ گیا۔ (۲) عیسائی روایت کے مطابق عورت ہی ہبوطِ آدم (Fall of Adam) کی اصل ذمہ دار ہے۔ موجودہ بائبل کے بیان کے مطابق بھی حضرت داؤد علیہ السلام انتہائی خدارسیدہ اور برگزیدہ شخصیت تھے۔ ایک بادشاہ کے طور پر ان کو بہت عظیم اور جج کے طور پر انتہائی منصف مزاج قرار دیا گیا۔ پھر بھی اُن پر الزام ہے کہ وہ اپنے ایک پیروکار اوریاہ حتی (Uriah Hittite) کی بیوی کے حسن پر فریفتہ ہو گئے۔ اسے کفار کے خلاف ایک جہادی مہم میں بھیج کر مروا دیا اور پروگرام کے مطابق اس کی بیوہ سے شادی کر لی۔ (۳) حضرت سلیمان علیہ السلام پر بھی عیسائی روایت کے مطابق الزام ہے کہ عورت نے اس عظیم اور دانشور ہستی کو ورغلایا۔ کہا جاتا ہے کہ اپنی ایک مشرکہ بیوی کو خوش کرنے کے لیے العیاذ باللہ وہ بتوں کی پوجا بھی کیا کرتے تھے۔ (۴) ایسی روایات نے بہت سے عیسائی علما اور مفکرین کی آرا کو بھی بری طرح متاثر کیا۔ ایک ممتاز عیسائی عالم کہتا ہے: ''میں کسی ایک عفت مآب خاتون کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہا۔ مجھے کوئی ایک بھی ایسی عورت نہ مل سکی۔'' ٹرٹولین (Tertulian) نے عورت کو شیطان کا دروازہ کہا۔ کرائی سوسٹم (Chrysostom) نے عورتوں کو ''ایک ناگزیر برائی۔'' ''ایک قدرتی ہوس۔'' ''ایک پسندیدہ مصیبت۔'' ''ایک گھریلو آفت۔'' ''ایک ہولناک جاذبیت'' اور ''ایک پرکشش بیماری'' جیسے منفی القابات سے نوازا۔ (۵)

بعض مسلم مفسرین بھی عورتوں کے بارے میں قرآنی احکامات کی روح کو سمجھنے سے قاصر رہے۔ سورۃ یوسف کی ایک آیت میں عورتوں کے بارے میں کہا گیا ہے۔ اِنَّ کَیۡدَکُنَّ عَظِیۡمٌ۔ یعنی ''بے شک عورتوں کا مکر بہت بڑا ہوتا ہے۔'' ایک ایسے ہی مفسر قرآن نے کہا کہ عورتیں شیطان سے بھی زیادہ عیار ہیں، کیونکہ قرآن نے شیطان کے بارے میں کہا ہے۔ اِنَّ کَیۡدَ الشَّیۡطٰنِ کَانَ

ضَعِیفًا۔" بے شک شیطانی مکر یعنی چال بہت کمزور ہے۔" یہ مفسر سلسلۂ کلام میں آیت کی معنویت کو نہ سمجھ سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ شیطان کے مکر والی آیت اللہ تعالیٰ کا قول ہے، جبکہ اوّل الذکر آیت میں ایک ایسے خاوند کا جذباتی ردِّعمل پیش کیا گیا ہے جو اپنی بیوی کی بے وفائی کے بارے میں اچانک آگاہ ہو گیا ہے۔(۶) ایک اور فاضل مفسر یہ تو مانتے ہیں کہ مذکورہ قول اللہ تعالیٰ کا نہیں، زلیخا کے خاوند کا ہے۔ تاہم بقول ان کے اللہ تعالیٰ نے اس قول کی تردید نہیں کی، اس لیے اسے اللہ تعالیٰ کی تائید حاصل ہے۔

عورت اور سائنس

جدید سائنس کی دریافتوں سے واضح ہوتا ہے کہ مرد نے آج تک معاشرے میں جو برتر Dominant کردار ادا کیا ہے، اس کی وجہ محض روایتی تربیت Nurture نہیں بلکہ فطرت Nature ہے۔ یہ الگ بات کہ اس حقیقت کو کسی ایک صنف کی کمتری اور دوسری کی برتری کے بغیر نوعی اختلاف کے حوالے سے دیکھنا چاہیے۔ ایچ۔ جے۔ آئی سینک H.j.Eysank کا کہنا ہے کہ آغاز سے ہی ایک بچی گڑیا کے ساتھ کھیلنا پسند کرتی ہے جبکہ اس کا ہم عمر بھائی سپاہی کھلونوں سے کھیلنے کو ترجیح دیتا ہے۔ ایک دورانِ تجربہ چھوٹی عمر کے بچوں اور بچیوں کو ایک کمرے میں بند کر کے مصنوعی طریقے سے خوفزدہ کیا گیا۔ یہ دلچسپ نتیجہ سامنے آیا کہ بچیوں نے بھاگ کر اپنی ماؤں کی گود میں پناہ لے لی جبکہ بچوں نے عموماً مدافعتی یا قدرے جارحانہ ردِّعمل ظاہر کیا۔ اس طرح ایک کھیل کے دوران میں بچوں کو مختلف ٹکڑوں سے گھر بنانے کو کہا گیا تو بچوں نے اس گھر کے بیرونی مظاہر یعنی Elevation پر توجہ دی جبکہ بچیوں نے گھر کے اندرونی ماحول کو پرکشش بنانے کے لیے اپنی صلاحیتیں صرف کر دیں۔(۷) یہ مشاہدہ اس روایتی موقف کا ایک اور اظہار ہے کہ مرد مکان (House) بناتے ہیں جبکہ خواتین گھر (Home) بناتی ہیں۔ اس نوع کے مزید مشاہدات بھی ہمارے سامنے آتے رہتے ہیں مثلاً یہ کہ مرد قوانین (Laws) وضع کرتے اور خواتین اخلاق و آداب (Manners) کی تشکیل کرتی ہیں۔ ایک اور مشاہدہ یہ ہے کہ مرد فطری طور پر ایذا کوش (Sadist)

ہوتا ہے اور عورت فطری طور پر ایذا طلب (Masochist) ہوتی ہے۔ میکبتھ (Macbeth) اور لیڈی میکبتھ (Lady Macbeth) کی کہانی اسی نفسیاتی حقیقت کی گواہی دیتی ہے۔ اس طرح کے مشاہدات صنفین کی عدم مساوات نہیں، خالق کائنات کی خلاقیت کے متنوع مظاہر ہیں۔ چاہیے تو یہ تھا کہ صنفِ نازک کی مخصوص حیاتیاتی ساخت اور جذباتی کیفیات کو سامنے رکھتے ہوئے ان سے معاشرتی ارتقا کا عمدہ کام لیا جاتا۔ اس کے برعکس عورت کی صنفی انفرادیت کو بنظرِ حقارت دیکھا گیا۔ ایک مشہور روسی سائنسدان Anton Namilov کی کتاب کا عنوان ہی "عورت کا حیاتیاتی المیہ" The Biological Tragedy of Women ہے۔ ایک اور کتاب Women in workplace کے مصنف کا قول ہے کہ صنفین میں عدم مساوات کی بنیادی وجہ عمل پیدائش میں عورت کا انفعالی کردار ہے۔ تحریکِ نسواں Feminism کی حامی عورتیں اسی وجہ سے مرد سے ہر نوع کی آزادی کو اپنی معراج سمجھنے لگی ہیں۔ جنسی معاملات میں بھی ایسی خواتین خودکفالت کی علمبردار ہیں۔ اس تحریک کی بہت سی قائد خواتین بھی ہم جنس پرست (Lesbian) پائی گئی ہیں۔ (۸) اس غلط فکری کا نقطۂ عروج یہ ہے کہ عورت کو مرد بنانے کے لیے اس کا Genetic Code تبدیل کرنے کی آوازیں آنے لگی ہیں۔ متوقع حیاتیاتی تبدیلی کی صورت میں دعوٰی ہے کہ خواتین، مرد کے لیے مخصوص سمجھے جانے والے تمام امور بخوبی سرانجام دینے لگیں گی۔

O, Science! What crimes are committed in thy name!

"اے سائنس! تیرے نام پر کیسے کیسے بھیانک جرائم کا ارتکاب کیا جاتا ہے؟"

اسلام اور عورت

اسلام عورت اور مرد کے مابین بعض حیاتیاتی اور عضوی اختلافات کو امرِ واقعہ کے طور پر تسلیم کرتا ہے۔ تاہم اسلام ان اختلافات کی بنیاد پر عورت کو بنظرِ حقارت نہیں دیکھتا۔ یہ اختلافات معاشرے میں صنفین کے لیے تقسیمِ کار سے متعلق ہیں۔ بنا بریں عورت اور مرد کے حقوق بحیثیت

انسان مساوی تو ہو سکتے ہیں، مشابہ نہیں۔ قرآن حکیم کی تعلیمات کے مطابق عورت ہر حیثیت سے قابل احترام ہے اور اس کی نسوانیت کو قانونی یا سائنٹفک طریقے سے ختم کرنا نہ صرف غیر ضروری ہے بلکہ بہت بڑا تہذیبی خسارہ ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِیْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِیْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِیْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِیْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِیْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِیْنَ اللّٰهَ كَثِیْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ ۙ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِیْمًا۝ (الاحزاب: ۳۵)

”بے شک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں اور ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں اور فرمانبردار مرد اور فرمانبردار عورتیں اور سچے مرد اور سچی عورتیں اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں اور عاجزی کرنے والے مرد اور عاجزی کرنے والی عورتیں اور خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں اور روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں اور اللہ کو بہت یاد کرنے والے مرد اور بہت یاد کرنے والی عورتیں، ان سب کے لیے اللہ نے بخشش اور بڑا اجر تیار کر رکھا ہے۔“

ایک اور آیت میں واضح طور پر ارشاد ہوتا ہے:

وَمَنْ یَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا یُظْلَمُوْنَ نَقِیْرًا۝ (سورۃ النساء: ۱۲۴)

”اور جو کوئی نیک عمل کرے گا، وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ مومن ہو، تو ایسے لوگ

جنت میں داخل ہوں گے اور ان کی ذرا بھی حق تلفی نہ کی جائے گی۔"

بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ تاریخی طور پر عورت کو گھٹیا یا کم تر سمجھنے کی ایک بڑی وجہ مسخ شدہ مذہبی تعلیمات ہیں اور خوش قسمتی کی بات ہے کہ قرآن حکیم نے ایسی تمام روایات کی تردید کرتے ہوئے عورت کو ایک انتہائی باعزت مقام بخشا۔ ایک ایسی ہی مسخ شدہ روایت کے مطابق ہبوطِ آدم (Fall of Adam) کی ساری ذمہ داری تنہا عورت یعنی حضرت حوا پر ڈال دی گئی۔ قرآنِ حکیم اس قصہ کی روداد بیان کرتے ہوئے دو اور دو چار کی طرح واضح پیرایہ بیان اختیار کرتا ہے۔

فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ (البقرۃ:۳۶)"اور شیطان نے ان دونوں (آدم وحوا) کو ورغلایا اور انھیں وہاں سے نکلوا دیا جہاں وہ متمکن تھے۔"

قرآن کی پیش کردہ تصویر کے مطابق دونوں نے خطا کی۔ دونوں اس خطا پر نادم وشرمسار ہوئے اور دونوں کو اللہ تعالیٰ نے معاف فرمایا۔ اس طرح قرآن نے وہ جڑ ہی کاٹ دی جس پر تحقیرِ نسواں کے شجرِ خبیثہ کی بنیاد رکھی گئی تھی۔

قرآنِ حکیم مخصوص تمثیلات اور استعارات کے ذریعے عورت کی ایسی تصویر پیش کرتا ہے جس کے مطابق وہ کائنات کی ایک نفیس ترین اور سب سے قابل احترام ہستی ہے۔ ایک مقام پر میاں بیوی کو ایک دوسرے کا لباس کہا گیا ہے۔ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ (البقرۃ: ۱۸۷)۔"یعنی وہ تمھارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو۔"

مولانا سید جلال الدین عمری اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس تعبیر میں بڑی ہی معنویت ہے۔ لباس کی بعض خصوصیات ہیں۔ قرآن مجید یہی خصوصیات میاں بیوی کے درمیان دیکھنا چاہتا ہے۔ لباس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ جسم سے چپکا رہتا ہے۔ اس کے اور جسم کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں ہوتی۔ یہی کیفیت میاں بیوی کے تعلق کی ہے۔ مادی تعلق کی اس دنیا میں بعض پہلوؤں سے جو قربت اس تعلق میں ہے وہ کسی دوسرے تعلق میں نہیں پائی جاتی۔

لباس کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ آدمی کو موسم کی سختیوں اور گرمی سردی سے بچاتا ہے۔ میاں بیوی کا رشتہ بھی یہ چاہتا ہے کہ ان میں سے ایک کسی مشکل اور دشواری سے دوچار ہو تو اس سے نکلنے میں دوسرا مدد کرے، زندگی کو کسی بھی مرحلے میں ناگوار نہ ہونے دے، جہاں تک ممکن ہو اسے سکون اور راحت فراہم کرے۔ لباس کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ پردہ پوش ہے۔ انسان کے جسم میں جو حصے قابل ستر ہیں اور جن کے عریاں ہونے سے وہ عار اور شرم محسوس کرتا ہے وہ لباس سے ڈھکے رہتے ہیں۔ یہی کیفیت خاوند اور بیوی کی ہونی چاہیے۔ وہ کبھی اس بات کو گوارا نہ کریں کہ اپنے رفیق حیات کے عیوب دنیا کے سامنے کھل جائیں اور وہ نادم و شرمسار ہو۔ لباس کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ وہ وجہ زینت ہے۔ اسی طرح عورت کی زینت مرد سے اور مرد کی زینت عورت سے ہے۔ ازدواجی تعلقات کی بہتری ہی سے دنیا کی رونق قائم ہے۔ اس کے بغیر یہ رونق ماند پڑ جاتی اور زندگی بے کیف ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس طرح کی نہ جانے کتنی ہی لطیف حقیقتوں کی طرف یہ تعبیر اشارہ کر رہی ہے۔" (۹)

قرآن پاک کی طرح احادیثِ رسول ﷺ میں بھی عورت کے ساتھ غیر معمولی حسنِ سلوک کا حکم دیا گیا ہے اور اس مقصد کے لیے خوبصورت اور معنی خیز تشبیہات استعمال کی گئی ہیں۔ ایک حدیث پاک میں عورتوں کو شیشے کے برتنوں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ ایک سفر میں رسول اللہ ﷺ نے کچھ خواتین کو اونٹوں پر سوار کروایا اور حضرت انجشہؓ کو ان کے قافلے کا نگران مقرر کیا۔ انھوں نے تیز رفتاری کے لیے اونٹوں کو مہمیز دی تو خواتین پریشان ہو گئیں۔ آپ ﷺ نے حضرت انجشہؓ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: "اے انجشہ! ان آبگینوں کو آہستہ آہستہ لے چلو۔"

ایک دوسری تشبیہ عورت اور پسلی کے بارے میں ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ "عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی میری نصیحت قبول کرو

کیونکہ وہ پسلی سے پیدا کی گئی ہیں۔" یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ بہت سے جید مفسرین نے بھی اسے استعارہ کے بجائے امرِ واقعہ کے طور پر لیا ہے اور اس سے عورت کے فروتر مقام پر استناد کیا ہے۔ درحقیقت اس حدیث میں آدم علیہ السلام وحوا علیہا السلام کی تخلیق کا کوئی ذکر نہیں۔ (جیسا کہ بہت سے دوسرے مفسرین نے بھی وضاحت کی ہے)۔ حدیث پاک کا مال یہ ہے کہ عورت اپنی فطری ساخت کی وجہ سے خصوصی طور پر حسنِ سلوک کی مستحق ہے۔ ایک دوسری حدیث پاک سے بھی اس تفسیر کی تائید ہو جاتی ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "عورت پسلی کی مانند ہے۔ اگر تم اس کو سیدھا کرو تو تم اسے توڑ دو گے۔" واضح رہے کہ امام بخاری اس حدیث کو کتاب النکاح باب المداراۃ مع النساء (باب عورتوں کے ساتھ حسنِ سلوک کا بیان) میں لائے ہیں۔

بالغ اور منکوحہ عورتیں تو ایک طرف رہیں، قرآن وحدیث میں نوزائیدہ اور نابالغ بچیوں کے ساتھ ظلم وتشدد کے خلاف بھی شدید وعید بیان کی گئی ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اہلِ عرب بالعموم بچیوں کو بوجوہ زندہ درگور کر دیتے تھے۔ قرآن پاک میں اس مذموم فعل کا ذکر کرتے ہوئے مختصر الفاظ میں روزِ محشر کا عبرت ناک نقشہ کھینچ دیا گیا ہے:

وَإِذَا الْمَوْءُدَةُ سُئِلَتْ ۝ بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ ۝ (التکویر: ۸-۹)

(اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس قصور میں ماری گئی)

اس آیت کی تفسیر میں مولانا مودودیؒ لکھتے ہیں:

"اس آیت کے اندازِ بیاں میں ایسی شدید غضب ناکی پائی جاتی ہے جس سے زیادہ غضب ناکی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ بیٹی کو زندہ گاڑنے والے ماں باپ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ایسے قابل نفرت ہوں گے کہ ان کو مخاطب کر کے یہ نہ پوچھا جائے گا کہ تم نے اس معصوم کو کیوں قتل کیا؟ بلکہ ان سے نگاہ پھیر کر معصوم بچی سے پوچھا جائے گا کہ تو بیچاری آخر کس قصور میں ماری گئی اور وہ اپنی داستان سنائے گی کہ ظالم ماں باپ نے اس کے ساتھ کیا ظلم کیا اور کس طرح اسے زندہ درگور کر دیا۔" (۱۰)

معصوم اور مظلوم بچیوں کے قتل کے بارے میں یہ قرآن پاک کا فیصلہ ہے۔ رسول اکرم ﷺ ماضی میں زندہ درگور کر دی جانے والی ایسی بچیوں کے بارے میں کس قدر بے چین رہتے، اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے جب ایک ایسی مظلوم بچی کے بارے میں اعترافِ گناہ سن کر آپ ﷺ اس قدر روئے کہ خود صحابہؓ آپ ﷺ کے بارے میں پریشان ہو گئے۔ روایت ہے کہ:

''ایک شخص نے حضور ﷺ سے اپنے عہدِ جاہلیت کا واقعہ بیان کیا کہ میری ایک بیٹی تھی جو مجھ سے بہت مانوس تھی۔ جب میں اس کو پکارتا تو دوڑی دوڑی میرے پاس آتی تھی۔ ایک روز میں نے اس کو بلایا اور اپنے ساتھ لے کر چل پڑا۔ راستے میں ایک کنواں آیا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کنوئیں میں دھکا دے دیا۔ آخری آواز جو اس کی میرے کان میں آئی وہ یہ تھی۔ ہائے ابا ہائے ابا۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ رو دیے اور آپ ﷺ کے آنسو بہنے لگے۔ حاضرین میں سے ایک نے کہا۔ اے شخص تو نے حضور ﷺ کو غمگین کر دیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: اسے مت روکو۔ جس چیز کا اسے سخت احساس ہے اس کے بارے میں اسے سوال کرنے دو اور پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ اپنا قصہ پھر بیان کرو۔ اس نے دوبارہ سے بیان کیا اور آپ ﷺ اس قدر روئے کہ آپ ﷺ کی ڈاڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی۔'' (سنن دارمی)

حیات طیبہ کا ایک اور تاریخی ورق بیٹیوں سے متعلق آپ ﷺ کے انتہائی نازک جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔

حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں۔ بدر کے قیدیوں کو چھڑانے کے لیے اہلِ مکہ نے فدیہ کی رقم بھجوانا شروع کی تو رسول اللہ ﷺ کی بیٹی حضرت زینبؓ نے اپنے خاوند ابوالعاص بن ربیع کی رہائی کے لیے ایک ہار بھیج دیا۔ ابوالعاص اس وقت تک مسلمان نہ ہوئے تھے۔ یہ وہ ہار تھا جو حضرت خدیجہؓ نے بیٹی کی رخصتی کے وقت ان کے گلے میں ڈالا تھا۔ ہار کو دیکھتے ہی رسول اللہ ﷺ کو ماضی کا یہ منظر یاد آ گیا۔ چشم مبارک سے آنسو چھلک پڑے۔ آپ ﷺ صحابہ سے

مخاطب ہوئے ۔''تمھارا کیا خیال ہے اگر تم زینبؓ کا قیدی واپس کر دو اور زینبؓ کا ہار اسے واپس لوٹا دو۔'' صحابہ کرامؓ نے بارگاہِ رسالت ﷺ کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا۔

اسلام نے ماں کی شکل میں عورت کو وہ تقدس بخشا ہے جس پر صنف نازک تاقیامت فخر کر سکتی ہے۔ سورۃ بنی اسرائیل میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کے حکم کے فوراً بعد والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم دیا۔ بحیثیت ماں عورت کے عظیم کردار کو بیان کرنے کے لیے بہت دل نشیں پیرایہ بیان اختیار کیا گیا ہے۔

حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ وَّفِصٰلُهُ فِيْ عَامَيْنِ اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ۭ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ ○ (سورۃ لقمان: ۱۴)

''اُس کی ماں نے ضعف پر ضعف اُٹھا کر اُسے پیٹ میں رکھا اور دو سال اُس کا دودھ چھوٹنے میں لگے۔ (اسی لیے ہم نے اُس کو نصیحت کی کہ) میرا شکر کر اور اپنے والدین کا شکر بجالا۔ میری ہی طرف تجھے پلٹنا ہے۔''

حضور ﷺ کی تعلیمات میں ماں کے احترام اور خدمت کے معاملے میں کسی کوتاہی یا سمجھوتے کی کوئی گنجایش نہیں ہے۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا مجھے جہاد میں حصہ لینے کا بہت شوق ہے لیکن میں اِس سے عاجز ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا تمھارے والدین میں سے کوئی زندہ ہے۔ اُس نے جواب دیا۔ میری ماں زندہ ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا۔ اُس کے ساتھ حسنِ سلوک کر کے اللہ سے ملو۔ اُس کی خدمت کرو۔ اس لیے کہ ماں کے قدموں کے نیچے جنت ہے۔ (نسائی کتاب الجہاد)

جدید تہذیب اور تحریکِ آزادیِ نسواں نے جہاں عورت کے مقام اور حقوق کے بارے میں توہم پرست اور تنگ نظر لوگوں کے بے بنیاد مفروضات کو بجا طور پر چیلنج کیا ہے، وہیں بدقسمتی سے عورت سے ہر وہ اعزاز بھی چھینا جا رہا ہے جس کی وجہ سے وہ ہر درجے میں قابلِ احترام ہے۔ تحریکِ آزادیِ نسواں کی پرجوش حامی خواتین کا شادی نہ کرنا یا ماں بننے کے تصور سے بدکنا اسی

ذہنیت کی غمازی کرتا ہے۔ بلا مبالغہ تہذیب کی تعمیر میں ماں کا بنیادی کردار ہے اور خود عورت کی معراج بھی ماں بننا ہے۔ایک ماں کی حیثیت سے کسی بھی عورت کو اپنی بہترین تخلیقی صلاحیتوں کے اظہار کا سنہری موقع ملتا ہے۔جدید تحقیق نے اس حقیقت کو واشگاف کر دیا ہے۔اس تحقیق کے مطابق نومولود بچہ صرف خاندان کو خوشیاں ہی فراہم نہیں کرتا بلکہ اپنی ماں کو ذہین بنانے میں بھی مددگار ثابت ہوتا ہے۔ماں بننے سے پہلے کی تخلیقی صلاحیتوں میں ماں بننے کے بعد ۳۵ فیصد اضافہ دیکھنے میں آیا ہے۔ماہرین کے مطابق بچہ پالنے کا عمل مکمل تخلیقی قوت کا متقاضی ہے۔ماں اس چیلنج کو جب قبول کرتی ہے تو اس کی خفتہ صلاحیتیں بیدار ہو جاتی ہیں۔ بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ بچے کے رویوں میں، قد کاٹھ میں اور ضروریات میں تبدیلیاں ماں کے لیے روزانہ نئے چیلنج لے کر آتی ہیں جن سے نبرد آزما ہونے کے لیے وہ مکمل طور پر ان صلاحیتوں سے کام لیتی ہے۔بعض اوقات وہ بے زبان بچے کی اس ضرورت کو بھی سمجھ لیتی ہے جو ڈاکٹر یا نرس سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں۔

آیندہ صفحات میں ہم عورت کے بارے میں اسلامی قانون کے بعض ایسے پہلوؤں کا مختصر ذکر کر رہے ہیں جو مستشرقین اور مستغربین کا خصوصی ہدف ہیں۔

مرد کی قوامیت

قرآن حکیم نے جہاں اس بات پر زور دیا ہے کہ جیسے حقوق مردوں کے عورتوں پر ہیں، ویسے ہی عورتوں کے حقوق مردوں پر ہیں وہاں ساتھ ہی یہ بھی اضافہ کر دیا کہ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ۔"اور مردوں کو اُن پر ایک درجہ فضیلت حاصل ہے۔" اسی طرح فرمایا گیا الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ۔"مرد عورتوں پر قوام ہیں۔"عورتوں کو اخلاقی اور روحانی لحاظ سے یکساں مرتبہ دینے کے بعد بھی انتظامی نقطۂ نظر سے صنفین کو خاندان میں جو مقام حاصل ہونا چاہیے، اُس کی تین ہی صورتیں ممکن ہیں۔(۱) مرد کو سربراہ بنا دیا جائے۔(۲) عورت کو قیادت سونپ دی جائے۔(۳) بیک وقت دونوں اپنی اپنی جگہ سربراہ ہوں۔عملی نقطۂ نظر سے پہلی صورت ہی موثر ترین ہے اور اسلام نے اسی کو اختیار بھی دیا ہے۔مشہور ماہر جنسیات ہیولاک ایلس نے صنفین کی درجہ بندی

کرتے ہوئے عورت کے لیے انفعالی (Receptive) اور مرد کے لیے جارح (Propulsive) کی اصطلاحات استعمال کی ہیں۔(۱۱) یہ نفسیاتی تفریق عورت کی حیاتیاتی ساخت کو سامنے رکھ کر کی گئی ہے۔اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مرد عورت پر مطلق حکمران ہے۔مرد کی قوامیت بھی اللہ کی حتمی حاکمیت کو تسلیم کرنے سے مشروط ہے۔رسول اللہ ﷺ نے اپنے آخری خطبے میں بھی عورتوں کے بارے میں اللہ سے ڈرنے کا حکم دیا۔مفسرین کے نزدیک مرد کو قوام بنانے کے بعد اُس کی ذمہ داریوں میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔اس حیثیت سے وہ عورت کے ساتھ حسنِ خلق اور رحمت و مودت کا رویہ رکھنے کا پابند ہے۔قدیم ترین مفسرِ قرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی رائے بھی یہی ہے۔(۱۲) مرد کی قوامیت کی اصل روح مسئلہ زکوٰۃ سے بھی سمجھی جا سکتی ہے۔کوئی شخص اپنی بیوی کو زکوٰۃ نہیں دے سکتا کیونکہ وہ بطور شوہر اُس کی جملہ ضروریات کا کفیل قرار دیا گیا ہے۔اس کے برعکس اگر خاوند تنگ دست ہو تو بیوی اپنے خاوند کو زکوٰۃ دے سکتی ہے۔کیونکہ وہ خاوند کی کفیل نہیں ہوتی۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی بیوی حضرت زینبؓ نے رسول اللہ ﷺ سے اپنے خاوند کو زکوٰۃ دینے کی شرعی حیثیت کے بارے میں پوچھا تو آپ ﷺ نے یہی جواب دیا تھا۔(بخاری کتاب الزکوٰۃ)

اسلام نے پے در پے مختلف احکامات اور اقدامات کے ذریعے عورت کو وہ بلند مقام بخشا جس کو قبول کرنے کے لیے دورِ جاہلیت کا ذہن بآسانی تیار نہ ہو سکتا تھا۔حضرت قتادہؓ سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا: جاہلیت میں ایک شخص تیرہ تیرہ بار بلکہ اس سے بھی زیادہ طلاقیں دیتا تھا اور عدت کے دوران میں رجوع کر لیتا تھا۔اسی طرح روایت ہے کہ عہدِ رسالت میں ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا: نہ میں تجھے اپنے پاس رکھوں گا، نہ دوسرے کے پاس جانے دوں گا۔بیوی نے پوچھا۔وہ کس طرح؟ اس نے کہا تجھے طلاق دوں گا اور جب عدت کا وقت ختم ہونے کو آئے گا تو رجوع کر لوں گا۔پھر تو دوسرے کے لیے کیوں کر حلال ہوگی؟ وہ عورت رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور پھر اللہ تعالیٰ نے طلاق کے اسلامی احکام نازل کیے۔اسی طرح اہلِ عرب معمولی شبہات پر اپنی بیویوں پر نہ صرف سنگین اخلاقی الزامات عائد کرتے بلکہ فیصلے بھی خود ہی صادر کر دیتے

اور اِن یک طرفہ فیصلوں پر عمل درآمد بھی کر گزرتے۔ مردوں کی حاکمیت کے ایسے ہی جاہلانہ تصورات کے علی الرغم پیغمبر اسلام ﷺ نے مردوں کو ایک ایسے قوام کا درجہ دیا جس کو محض شبہات کی بنا پر ہی نہیں بلکہ کسی بھی صورت میں قانون کو خود ہاتھ میں لینے کی اجازت نہیں ہے۔ اس بارے میں اسلام نے قانونِ لعان پیش کیا۔ قانون کی اس حاکمیت کو یقینی بنانے کے لیے بھی آپ ﷺ نے تلقین، ترغیب اور تفہیم کے جملہ ارتقائی مراحل سے اپنے اصحاب کو گزارا۔ اس باب میں آپ ﷺ کے اچھوتے انداز کی ایک جھلک ملاحظہ ہو۔

ایک اعرابی نے دربارِ رسالت میں عرض کیا۔ میری بیوی نے ایک کالے لڑکے کو جنم دیا ہے اور میں واضح طور پر اس کا انکار کرتا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے اس سے فرمایا: کیا تمھارے پاس اونٹ ہیں؟ اُس نے عرض کیا۔ جی ہاں۔ آپ ﷺ نے پوچھا: اُن کے رنگ کیا ہیں؟ اُس نے عرض کیا۔ سرخ۔ آپ ﷺ نے دریافت فرمایا۔ کیا اُن میں کوئی خاکی بھی ہے؟ اُس نے عرض کیا۔ اُن میں خاکی رنگ کے اونٹ بھی ہیں۔ آپ ﷺ نے پوچھا۔ تمھارے خیال میں یہ رنگ کس طرح اُن کے پاس آگیا۔ اُس نے جواب دیا۔ یارسول اللہ! کسی رگ نے اس (رنگ) کو کھینچ لیا ہوگا۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ شاید اِس (بچے کے رنگ) کو (بھی) کسی رگ نے کھینچ لیا ہو گا۔ یوں آپ ﷺ نے اُس کو بچے کے نسب سے انکار کی اجازت نہ دی۔ (صحیح بخاری۔ کتاب الاعتصام)

نکاح وطلاق کے ساتھ ساتھ تعدادِ ازواج کی تحدید اور وراثت کے معاملات میں بھی اسلام نے مرد کی غیر مشروط حاکمیت کے روایتی تصور پر پیہم ضربات لگائیں۔ اہل عرب کے لیے یہ بات بھی معمولی نہ تھی کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بعض ضروری معاملات میں ازواجِ مطہراتؓ سے مشاورت بھی فرماتے اور ان مشوروں کو شرفِ قبولیت سے بھی نوازتے تھے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر شروع میں بہت سے صحابہ کرامؓ کو شرائطِ صلح کے بارے میں تردد تھا۔ یہ اُم سلمہؓ تھیں جن کی تجویز پر آپ ﷺ نے سب سے پہلے خود حلق کرایا اور پھر اپنے جانوروں کو ذبح کیا اور آپ کی تقلید میں باقی صحابہؓ بھی دیوانہ وار اپنے اپنے جانور ذبح کرنے لگے۔ عرب کے جاہلی معاشرے کی

صدیوں پرانی روایات کے وارث معاشرے میں عورت کی تقدیس ایک بہت بڑی زقند تھی۔ اس معاملے میں قطرے کو گہر ہونے تک نہ جانے کن مراحل سے گزرنا پڑا ہوگا۔ حضرت عمر فاروقؓ جیسی بلند مرتبہ شخصیت کا بیان کردہ ایک واقعہ اس امر پر روشنی ڈالتا ہے، جسے امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

حضرت عمرؓ کا بیان ہے۔ واللہ زمانہ جاہلیت میں ہم عورتوں کو پرِ کاہ کے برابر وقعت نہ دیتے تھے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے جو چاہا ان کے متعلق نازل کیا اور جو چاہا انھیں حصہ دیا۔ ایک دن میری بیوی نے مجھے کسی مسئلے کے بارے میں پریشان دیکھا تو کہا: آپ یوں کیوں نہیں کر لیتے۔ میں نے اُسے کہا۔ تمھیں میرے معاملے میں دخل دینے کی جرأت کیسے ہوئی؟ وہ کہنے لگی۔ ابن خطاب! تعجب ہے تمھیں اپنے معاملے میں میرا معمولی دخل دینا گوارا نہیں اور اُدھر تمھاری اپنی بیٹی رسول اللہ ﷺ کو اِس طرح جواب دیتی ہے کہ آپ ﷺ دن بھر ناراض رہتے ہیں۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں: میں سیدھا حفصہؓ کے پاس پہنچا اور کہا بیٹی! کیا یہ سچ ہے کہ تم رسول اللہ ﷺ کو اِس طرح جواب دیتی ہو؟ حفصہؓ نے جواب دیا۔ ہاں! واللہ ہم آپ کو جواب دیتے ہیں۔ میں نے کہا۔ دیکھو میں تمھیں اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے عتاب سے ڈراتا ہوں۔ بیٹی! کسی دھوکا میں نہ رہنا کیونکہ تمھاری ساتھی عائشہ تم سے زیادہ خوبصورت اور رسول اللہ ﷺ کی چہیتی ہے۔ اِس کے بعد میں اُم سلمہؓ کے پاس گیا اور یہی بات کی۔ اُم سلمہؓ نے کہا۔ حیرت ہے ابنِ خطاب! تم ہر بات میں دخل دیتے دیتے اب رسول اللہ ﷺ اور آپ کی ازواج کے معاملے میں بھی دخل دینے لگے۔ یہ بات میرے دل میں بیٹھ گئی۔ میں مزید کچھ کہے بغیر وہاں سے چلا آیا۔ (ترمذی۔ کتاب التفسیر)

شادی کے لیے عورت کی رضامندی

عورت اپنی آزاد مرضی سے جہاں چاہے نکاح کر سکتی ہے یا اس کے لیے ولی کی رضامندی ضروری ہے؟ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس میں شرعی نقطۂ نظر سے مختلف آرا کا اظہار کیا گیا ہے۔ اختلافِ رائے کا تعلق نکاح کی نوعیت سے ہے۔ یعنی نکاح دو افراد کا محض ذاتی معاملہ ہے یا ایک سماجی معاہدہ بھی۔ اسی طرح اگر نکاح ولی کی رضامندی سے مشروط ہے تو ولی کا مفہوم کیا ہے۔ عملاً صورت

حال یہ ہے کہ ولی کے لفظ کے ساتھ غیر ضروری طور پر جبر، اکراہ اور تحکم کے جارحانہ تصورات وابستہ کر دیے گئے ہیں۔ جبکہ قرآن حکیم میں ولی کا لفظ بمعنی "پہچاننے والا" (الانعام: ۵۷) بمعنی حلیف (النساء: ۵۹) ، بمعنی کارساز (الشوریٰ:۹)، بمعنی سرپرست (البقرہ:۲۸۲)، بمعنی دوست (التوبۃ:۵)، بمعنی وارث (النمل:۴۹)، بمعنی مددگار (بنی اسرائیل :۱۱۱) استعمال ہوا ہے۔ گویا تقریباً ہر مقام پر ولی ایک حقیقی خیر خواہ کا درجہ رکھتا ہے۔ بظاہر اس مسئلے میں بنیادی طور پر کوئی خاص اُلجھن نہیں ہے۔ اگر معاملہ صرف سمجھنے سمجھانے کا ہو تو ترکی کے اُس باشندے کا موقف مسئلے کے دونوں رُخ واضح کر کے رکھ دیتا ہے جس نے اپنی بیٹی سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا تھا۔ "تم اگر دلی سمجھتے ہوئے میری خواہش اور ترجیح کے مطابق (جو درحقیقت تمھارے بھی مفاد میں ہے) شادی پر رضامند ہو جاؤ تو خاوند کے ساتھ ناچاقی یا طلاق کی صورت میں اس گھر کے دروازے تمھارے لیے کھلے رہیں گے۔ تاہم اگر تم اپنی مرضی پر اصرار کرنا چاہو، تو تمھیں اس کا حق ہے۔ لیکن کسی ناخوشگوار واقعہ کی صورت میں اصولی طور پر اس گھر پر تمھارا استحقاق باقی نہیں رہے گا۔" (۱۳)

مذکورہ صورتِ حال میں بھی اسلامی نقطۂ نظر سے اشکالات موجود ہیں۔ حدیث پاک میں ایک باپ کو تو یہ نصیحت بھی کی گئی ہے۔ "کیا میں تمھیں سب سے بہترین نیکی کے بارے میں نہ بتاؤں؟ (وہ یہ ہے کہ) تو اپنی اُس بیٹی کے بارے میں شفقت کے ساتھ پیش آئے جو اپنے خاوند سے طلاق کے بعد تیرے پاس واپس آجائے۔" چنانچہ فقہ حنفی کے مطابق لڑکی کو اگر طلاق ہو جائے تو عدت پوری ہونے کے بعد اُس کا نان ونفقہ باپ پر دوبارہ واجب ہو جائے گا۔ اس قدر حسنِ سلوک کی مستحق بیٹی کو بھی شادی کے بارے میں من مانی کرنے سے قبل یہ ضرور سوچنا چاہیے کہ باپ یا ولی کی رائے کو ٹھکرا کر کورٹ میرج کر لینا کس قدر نامناسب حرکت ہے۔

یہاں اس مسئلے سے متعلق دونوں مکاتبِ فکر کے دلائل کا مختصر جائزہ لینا ضروری ہے۔

جو لوگ نکاح کے لیے ولی کی رضامندی کو ناگزیر جانتے ہیں ان کا مدار منجملہ دوسری بعض آیات کے اس آیت پر بھی ہے۔

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ۔۔۔۔ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا (البقرۃ:۲۲۱)

''تم مشرک عورتوں سے اس وقت تک نکاح مت کرو جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں ۔۔۔۔۔اور (اپنی عورتوں کو) مشرک مردوں کے نکاح میں مت دو یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمان مردوں کو حکم دیا کہ تم مشرک عورتوں سے نکاح مت کرو۔ ہاں اگر وہ ایمان قبول کرلیں تو اور بات ہے۔ اس وقت تمھارا ان سے نکاح کر لینا صحیح ہوگا۔ لیکن جب مسلمان عورت کو یہ حکم دینے کی ضرورت محسوس کی گئی کہ وہ بھی مشرک مردوں کے ساتھ نکاح نہ کریں تو پھر اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے بجائے ان کے اولیاء کو خطاب فرمایا۔ اور انھیں حکم دیا کہ وہ مسلمان عورتوں کا نکاح مشرک مردوں سے نہ کریں۔

علامہ رشید رضا مصری لکھتے ہیں:

''پہلے تَنكحوا (تا کے زبر کے ساتھ) اور پھر تُنكحوا (تا کے پیش کے ساتھ) تعبیر کرنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ مرد ہی اپنا اور ان عورتوں کا نکاح کرنے کا اختیار رکھتے ہیں جن کے معاملات کے وہ ذمہ دار ہیں۔''(۱۴)

دوسرے نقطۂ نظر کے مطابق نکاح کے لیے ولی کی رضامندی ضروری نہیں۔ اس کے لیے سورۃ البقرۃ:۲۳۰ کا حوالہ دیا جاتا ہے:

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ۔

''پھر اگر (دو بار طلاق دینے کے بعد شوہر نے عورت کو تیسری بار) طلاق دے دی تو وہ عورت پھر اس کے لیے حلال نہ ہوگی۔ الا یہ کہ اس کا نکاح کسی دوسرے شخص سے ہو۔''

ایک دوسری آیت البقرۃ:۲۳۲ کے الفاظ ہیں:

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ط

"جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دے چکو اور وہ اپنی عدت پوری کر لیں تو پھر اس میں مانع نہ ہو کہ اپنے زیرِ تجویز شوہروں سے نکاح کر لیں جبکہ وہ معروف طریقے سے باہم مناکحت پر راضی ہوں۔"

اسی طرح بعض احادیث میں ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کو باطل قرار دیا گیا ہے جیسے لا نکاح الا بولی (ابوداود، جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ) اور بعض دوسری روایات میں حضور ﷺ نے عورت کی رضامندی کے بغیر نکاح کو مسترد کر دیا اور لڑکی کو نکاح فسخ کرنے کا اختیار عنایت فرمایا۔ موطا امام مالک، صحیح بخاری، صحیح مسلم، نسائی اور مصنف عبدالرزاق میں خنسا بنت حزامؓ سے روایت ہے کہ ان کے والد نے ان کا نکاح ان کی مرضی کے بغیر ایک ایسے آدمی سے کر دیا جسے وہ پہلے سے جانتی تھیں نہ پسند کرتی تھیں۔ وہ حضور نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا۔ یارسول اللہ! میرا نکاح فسخ فرمائیں۔ حضور ﷺ نے اُن کی عرضداشت سن کر ان کا نکاح فسخ فرمایا۔ اسی طرح ایک اور کنواری عورت حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا کہ میرے باپ نے اپنی ادنیٰ حالت کو سنوارنے کے لیے میرا نکاح میری مرضی کے بغیر اپنے ایک بھتیجے کے ساتھ کر دیا ہے۔ کیا اس بارے میں مجھے کچھ عرض کرنے کا اختیار ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا۔ ہاں۔ اس نے عرض کیا۔ میں یہ تو نہیں چاہتی کہ اپنے باپ کے کیے کام کو نامنظور کر دوں۔ البتہ میں یہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ عورتوں کو اس بارے میں کوئی اختیار ہے یا نہیں۔

بظاہر دونوں قسم کی احادیث اور روایات متعارض ہیں۔ تاہم ان کے متعلق بھی وہی اصول اختیار کیا جائے گا جو کسی دوسری چیز سے متعلق قرآن کی مختلف آیات کے بارے میں مستعمل ہے۔ یعنی تعارض کے بجائے تطابق کو تلاش کیا جاتا ہے۔ علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے اس کو ایک مثال سے واضح کیا ہے:

''شارع کا طریقہ یہ ہے کہ اجتماعی معاملات میں وہ طرفین کی رعایت کرتا ہے اور احادیث بھی جانبین کے بارے میں وارد ہوئی ہیں اور اقامتِ نظم کے لیے یہی طریقہ سب سے زیادہ مناسب ہے......زکوٰۃ میں ایک زکوٰۃ دینے والا اور دوسرا لینے والا (سرکاری اہلکار) ہے۔ ایک طرف نبی ﷺ نے مالداروں کو یہ فرمایا کہ تمھارے پاس زکوٰۃ وصول کرنے والے آئیں گے جنھیں تم ناپسند کرو گے کیونکہ وہ تم سے زکوٰۃ وصول کریں گے۔ پس اگر وہ تمھارے پاس آئیں تو انھیں خوش آمدید کہو اور وہ تم سے جو طلب کریں وہ انھیں دے دو۔ اگر وہ انصاف سے کام لیں گے تو ان کا فائدہ اور اگر ظلم کریں گے تو اس کا وبال انھی پر ہوگا۔ لیکن جب نبی ﷺ نے زکوٰۃ وصول کرنے والے سرکاری کارندوں سے خطاب فرمایا تو انھیں تاکید فرمائی کہ تم لوگوں سے ان کا نفیس قیمتی مال لینے سے گریز کرو اور مظلوم کی بددُعا سے بچو۔ اس لیے کہ اس کی پکار اور اللہ کے درمیان کوئی حجاب نہیں۔ نیز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ صدقہ وصول کرنے میں زیادتی کرنے والا ایسے ہے جیسے زکوٰۃ کا انکار کرنے والا ......گویا دونوں طرف سخت احکام دیے گئے تا کہ اللہ تعالیٰ کی حدوں کی صحیح طریقے سے حفاظت ہو سکے اور ہر فریق اپنے اپنے دائرہ میں رہے اور اس سے تجاوز نہ کرے۔ تمام احادیث میں جمع و تدوین کا یہی طریقہ ہے۔''(۱۵)

مسئلہ زیرِ بحث میں دونوں روایات کے مجموعے سے شاہ صاحب ؒ یہ حکم اخذ کرتے ہیں:

''لڑکی کے لیے ضروری ہے کہ وہ ولی کی اجازت اور رضامندی کے بغیر از خود کہیں نکاح نہ کرے اور ولی کے لیے ضروری ہے کہ وہ جہاں رشتہ کرنا چاہے اس کے لیے لڑکی کی رضامندی بلا اکراہ حاصل کرے۔ نہ لڑکی کے لیے جائز ہے کہ وہ ولی کو نظر انداز کرے اور نہ ولی کو لڑکی پر جبر کرنے کی اجازت ہے۔''(۱۶)

عورت اور قانونِ طلاق وخلع

شادی کے بعد فریقین میں شدید اختلاف کی صورت میں طلاق وخلع کی صورت میں علیحدگی کے راستے بھی کھلے رکھے گئے ہیں۔ اسلامی معاشرے میں بیوی کوئی بے جان مورتی نہیں جسے خاوند جب چاہے کسی کوڑے دان میں پھینک سکتا ہے۔ اوّل تو طلاق کے متعلق نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

ابغض الحلال الی اللہ عزوجل الطلاق۔

''اللہ عزوجل کے قریب حلال چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز طلاق ہے۔''

شرعی نقطۂ نظر سے طلاق اتنا آسان کام بھی نہیں۔ مرد کے لیے اس میں بے پناہ مالی نقصان ہے۔ بیوی کو دیا گیا مہر وزیورات وہ واپس نہیں لے سکتا۔ دوسری شادی کی صورت میں ازسرِنو مہر بھی دینا ہوگا اور نئی شادی کے اخراجات بھی برداشت کرنا ہوں گے۔ پھر طلاق کے عمل کو اصولاً تین مہینے کی مدت میں مکمل ہونا چاہیے۔ طلاق کا اصل طریقہ یہ ہے کہ حالتِ طہر میں بغیر مجامعت کے صرف ایک طلاق دی جائے۔ حالتِ حیض میں عورت عموماً اپنی روایتی کشش اور جاذبیت سے محروم ہو سکتی ہے۔ اس کے اندر ایک چڑچڑا پن پیدا ہو جاتا ہے۔ قوی امکان ہے کہ مرد وقتی ردِعمل سے طلاق کا فیصلہ کر بیٹھے اور بعد میں کفِ افسوس ملتا رہے۔ طُہر اس بات کی علامت ہے کہ عورت حاملہ نہیں۔ ظاہر ہے ماہوار تین بار حالتِ طہر میں جنسی تعلق رکھے بغیر طلاق دینا ایک امرِ محال ہے۔ یہ اُس وقت ممکن ہے جب مرد نے طلاق دینے کا قطعی فیصلہ خوب سوچ سمجھ کر کیا ہو۔ قرآنِ حکیم میں طلاق دہندہ کے لیے صاحبِ عزیمت کا لفظ استعمال کرتے ہوئے اس صورتِ حال کو یوں واضح کیا گیا ہے۔ وَإِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَإِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ○ (البقرۃ: ۲۲۷) ''اور اگر وہ (شوہر حضرات) طلاق (ہی) دینے کا عزم کرلیں تو بھی اللہ تعالیٰ سمیع ہے، علیم ہے۔'' محتاط فقہا تو یہاں تک کہتے ہیں کہ سارے عرصے میں مرد عورت کو گھر سے نہ نکالے۔ عورت بھی مشتعل جذبات کی

رو میں بہہ کر گھر سے نکل جانے میں جلدی نہ کرے اور اس عرصے میں اپنی زیب و زینت کا خاص خیال رکھے۔(۱۷) اس طریقہ طلاق میں کراہت کا کوئی پہلو نہیں اور فقہا کے درمیان بھی اس پر عمومی اتفاق ہے۔فقہا کی ان تمام تصریحات کا مآخذ بھی قرآن وسنت کی واضح تعلیمات ہیں۔طلاق کو حالتِ طہر سے مشروط کرنے کے لیے صحاح کی سب کتابوں میں یہ واقعہ صراحت کے ساتھ موجود ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اپنی بیوی کو حالتِ حیض میں طلاق دے دی۔حضرت عمرؓ نے رسول اللہ ﷺ سے اس کے متعلق دریافت کیا تو آپ ﷺ نے عورت کی حق تلفی کو ناپسند کرتے ہوئے فرمایا:"عبداللہ سے کہو کہ وہ اس سے رجوع کرے اور بیوی کے ساتھ رہے یہاں تک کہ وہ حیض سے پاک ہو جائے۔پھر اس کے بعد دوبارہ حیض آئے اور اس سے بھی پاک ہو جائے تو چاہے تو اسے ساتھ رکھے یا طلاق دے تو مجامعت سے پہلے دے دے۔" آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ قرآن مجید کے الفاظ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ (الطلاق:۱)"ان کی عدت میں طلاق دے دو سے یہی مراد ہے۔"

عملی زندگی میں بعض اوقات ایسی صورتیں پیش آسکتی ہیں جب فریقین میں نباہ ممکن نہ ہو۔ ایسی صورت میں مرد اپنی بیوی کو حق طلاق استعمال کرتے ہوئے الگ کرسکتا ہے۔یہی صورت عورت کو بھی پیش آسکتی ہے۔اسلام عورت کو بھی ایسی صورت میں کسی اخلاقی آزمایش میں ڈالنے کا روادار نہیں ہے۔یعنی یہ کہیں نہیں لکھا کہ وہ بھی ہر صورت میں گلے میں پڑا ہوا ڈھول بجاتی رہیں۔ ایسی صورت میں خلع (Dissolution of Marriage) کا طریقہ موجود ہے۔خلع کا طریقہ اس لیے ہے کہ اگر مرد کی طرف سے زیادتی ہو یا عورت اسے ناپسند کرتی ہو تو وہ اسے معاوضہ دے کر قیدِ نکاح سے الگ ہوسکتی ہے۔اسلام اس باب میں عورت کے حقوق کا اس حد تک محافظ ہے کہ مرد سے اس کی فطری ناپسندیدگی بھی بعض حالات میں خلع کے حصول کے لیے ایک معقول وجہ بن جاتی ہے۔

مصنف عبدالرزاق کی روایت کے مطابق ثابت بن قیسؓ کی بیوی بہت حسین و

جمیل تھی لیکن ثابت خود اتنے حسین نہ تھے۔ ان کی بیوی نے رسول ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا۔ یا رسول اللہ ﷺ میں اپنے خاوند کے دین و اخلاق کو ناپسند نہیں کرتی مگر مجھے یہ بات سخت ناپسند ہے کہ دین اسلام کے دائرے میں رہتے ہوئے مجھ سے کوئی کافرانہ حرکت سرزد ہو جائے۔ حضور ﷺ نے فرمایا۔ کیا تو ثابتؓ کا باغ اسے واپس کر دے گی؟ اس نے کہا جی ہاں۔ رسول اللہ ﷺ نے ثابت سے فرمایا: "اپنی بیوی کی طرف سے باغ قبول کر لو اور اسے طلاق دے دو۔"

خلع کے شرعی قوانین میں اِس کی بھی گنجایش ہے کہ اگر عورت فسخ نکاح کا مطالبہ کرے اور عدالت کی رائے میں خاوند دانستہ طور پر عورت کے لیے خلع کے حالات پیدا کر رہا ہے تو طلاق حاصل کرتے ہوئے شوہر کو نہ مہر واپس دلوایا جائے اور نہ دوسری چیزیں جو خاوند اُسے دے چکا ہو۔ (۱۸) بہرحال طلاق مرد کی طرف سے ہو یا عورت کی خواہش پر، کوئی کھیل نہیں۔ اس سے فریقین ہی نہیں دو خاندانوں کے لیے بھی ناقابل بیان مسائل ہوتے ہیں۔ جنسی تلذّذ کے لیے اسے معمول بنا لینے کو شریعت میں سخت ناپسند کیا گیا ہے۔ حدیث پاک کے مطابق اللہ تعالیٰ ذواقین (مزہ لینے والے مرد) اور ذواقات (مزہ لینے والی عورتوں) سے محبت نہیں رکھتا۔

یہودی مذہب کے مطابق طلاق بہت آسان ہے۔ عیسایت کی رو سے ناممکن الوقوع ہے۔ اس کے لیے تقریباً ایک ہی صورت ہے کہ مرد اپنی بیوی پر بدکاری کا الزام لگا دے۔ گویا علیحدگی کے بعد مطلقہ عورت کا مستقبل تاریک ہو جاتا ہے۔ اسلام میں طلاق سے آخری حد تک بچنے کی کوشش کی جاتی ہے اور اگر معاملہ بندگلی تک پہنچ ہی جائے تو فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ (البقرہ: ۲۲۹) عورت کو معروف کے مطابق روک لینے یا تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ (البقرۃ: ۲۲۹) اچھے طریقے سے رخصت کر دینے کا حکم ہے۔

اسلام اور تعدد ازواج

قرآن و سنت سے تعدد ازواج کا جواز بھی ثابت ہے اور حضور ﷺ کا اس پر تعامل بھی۔

اس باب میں چند امور کی وضاحت ضروری ہے۔

اخلاقی اور روحانی نقطہ نظر سے دنیا میں تعدد ازواج کو کبھی قابل اعتراض نہیں سمجھا گیا۔ توریت (کتابِ پیدائش) کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تین، حضرت یعقوب علیہ السلام کی چار اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی چار بیویاں تھیں۔ سیدنا داؤد علیہ السلام کی نو اور سیدنا سلیمان علیہ السلام کی متعدد بیویاں توریت سے ثابت ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے صرف آخری تین سالوں کے حالات کا ہمیں علم حاصل ہے۔ روایات کے مطابق انھوں نے اپنی حیات مستعار میں شادی نہیں کی۔ عیسائی اہل قلم کو اس معاملے میں پیغمبر اسلام ﷺ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں موازنہ کا شوق تو بہت ہے مگر خود اُن کے عقیدے کی رو سے اس قسم کا موازنہ قیاس مع الفارق کے زمرے میں آنا چاہیے۔ اگر بقول اُن کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام خود خدا یا خدا کے بیٹے ہیں تو پھر انھیں ہر قسم کے انسانی داعیات اور بنیادی جبلتوں سے مبرا ہونا چاہیے۔ اس لیے شادی اور جنس کے بارے میں اُن کی زندگی دوسرے انسانوں کے لیے نمونہ نہیں بن سکتی۔ تاہم کثرت ازواج کی مخالفت بائبل سے بھی ثابت نہیں۔ یہ چھٹی صدی عیسوی کی بات ہے کہ عیسائی پادریوں کی ایک کونسل نے تعدد ازواج کے خلاف مضمون پاس کیا اور ایک بیوی کے علاوہ متعدد داشتائیں رکھنے کا دروازہ کھول دیا۔ یک زوجگی کے حامی تصوراتی دنیا میں رہتے ہوئے جس قدر دلائل وضع کر لیں، ان کے پاس اس سوال کا بہرحال جواب نہیں ہے کہ یک زوجگی پر اصرار کے بعد لامحدود حرام کاری کے تدارک کی کیا صورت ہے۔

اسلام نے تعدد ازواج کا حکم نہیں دیا۔ یہ روایت پہلے سے ہی چلی آ رہی تھی۔ اسلام نے صرف اس کی اجازت دی ہے اور اس اجازت کو بھی زیادہ سے زیادہ چار اور عدل کی شرائط کے ساتھ مشروط کر دیا۔ تعدد ازواج کی مخالفت کرنے والے متنوع سماجی حالات و واقعات سے آگاہ نہیں، نہ نفس انسانی کے بوقلموں تقاضوں کا ادراک رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں سورۃ النساء کی آیت نمبر ۳ کے پس منظر کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے جس میں تعدد ازواج کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ آیت غزوۂ اُحد یعنی ۳ ہجری کے بعد نازل ہوئی۔ غزوۂ احد میں ستر (۷۰) مسلمان شہید ہوئے۔ بہت سی عورتیں

بیوہ اور بہت سے بچے یتیم ہو گئے۔ اس معاشرتی مسئلے کو حل کرنے کے لیے قرآن نے یہ طریقہ بتایا کہ صاحب توفیق لوگ بیوہ عورتوں سے نکاح کر کے یتیم بچوں کو اپنی کفالت میں لے لیں۔ تاہم یہ کوئی وقتی حکم نہیں۔ انفرادی طور پر ایسے حالات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ مثلاً ایک بیوی مریض یا عقیم ہو اور خاوند ایک سے زیادہ عورتوں کی کفالت کر سکتا ہو تو تعدد ازواج کا جواز موجود ہے۔ اجتماعی طور پر بھی یہ بات ناقابل قیاس نہیں ہے کہ متعدد وجوہ سے معاشرے میں مردوں کی تعداد عورتوں سے تشویشناک حد تک کم رہ جاتی ہے۔ اس کا واحد علاج، تعدد ازواج ہی رہ جاتا ہے۔ اس صورتِ حال کی ایک تاریخی مثال کا ذکر مشہور مسلم قانون دان مصطفی السباعی نے بھی کیا ہے۔ جنگِ عظیم دوم کی تباہ کاریوں کے بعد عورتوں کی غیر معمولی کثرت اور مردوں کی زبردست کمی کا مسئلہ پیش آ گیا۔ چنانچہ ۱۹۴۹ء میں جرمنی کے شہر بون (Bonn) کے باشندوں نے اہلِ حکومت سے مطالبہ کیا کہ ملکی آئین میں ایک سے زائد بیویاں رکھنے کی اجازت کی دفعہ شامل کی جائے۔ اس پر جرمنی کی حکومت نے شیخ الازہر کے پاس تعدد ازواج کے اسلامی دستورِ العمل کی تفصیلات معلوم کرنے کے لیے رابطہ کیا تھا۔ (۱۹)

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے چار سے زیادہ ازواج کی اجازت حاصل تھی۔ تمام اہلِ اُمت کے مقابلے میں آپ کے فرائض بھی زیادہ تھے۔ مثلاً عامۃ المسلمین کے لیے نماز تہجد نفل ہے اور آپ ﷺ کے لیے فرض۔ جو مستشرقین آپ ﷺ کی کثیر الازواجی کو خاکم بدہن ہوائے نفس سے منسوب کرتے ہیں وہ بعض ضروری اور بنیادی حقائق سے ناواقف ہیں یا دانستہ ان حقائق سے اعراض کرتے ہیں۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ۲۵ سال کی عمر میں رسول اللہ ﷺ نے سیدہ خدیجہؓ سے نکاح کیا جو آپ ﷺ سے پندرہ سال بڑی تھیں۔ پہلے دو شوہروں کی بیوی رہ چکی تھیں اور صاحب اولاد تھیں۔ پچاس سال کی عمر تک یعنی پورے پچیس سال تک آپ ﷺ نے کوئی دوسری شادی نہیں کی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی کثیر الازواجی پر زبان طعن دراز کرنے والوں میں جرمن مصنف سپرنگر بھی پیش پیش ہے۔ اس کے نزدیک سیدہ خدیجہؓ سے آپ ﷺ کی شادی اور ان

کی موجودگی میں کسی دوسری شادی سے احتراز میں کسی قسم کے قلبی لگاؤ کو دخل نہ تھا۔ اصل وجہ یہ تھی کہ آپ ﷺ معاشی طور پر سیدہ خدیجہؓ کے دست نگر تھے۔ ڈیون پورٹ نے اس اعتراض کا دندان شکن جواب دیتے ہوئے بہت معقول نکات اُٹھائے ہیں۔ یعنی:

''پھر حضرت خدیجہؓ کے سانحہ ارتحال کے بعد بھی اتنے لمبے عرصے تک شادی نہ کرنے کی وجہ کیا ہے؟ مزید برآں ایسا کیوں ہے کہ سالہا سال بعد آپ ﷺ نے حضرت خدیجہؓ کے ساتھ گزرے ہوئے یادگار لمحات کا ذکر اُس وقت بھی بڑی اپنائیت کے ساتھ کیا جب سیدہ عائشہ صدیقہؓ نے اپنی جوانی اور حسن کا موزانہ اُن کی بڑی عمر سے کیا۔''(۲۰)

یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ جس ذاتِ باری تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو چار سے زیادہ ازواج کی اجازت دی، اُسی ذاتِ پاک نے ازواج کے انتخاب میں آپ ﷺ پر وہ پابندیاں بھی عائد کر دیں جس سے عام مسلمان مستثنیٰ ہیں۔ ہر مسلمان اپنے چچا، پھوپھی، ماموں اور خالہ کی بیٹیوں سے نکاح کے لیے آزاد ہے۔ حضور ﷺ کے لیے اُن سے اُسی صورت نکاح جائز ہے جبکہ ان عورتوں نے ہجرت کی ہو۔

وَبَنٰتِ عَمِّكَ وَبَنٰتِ عَمّٰتِكَ وَبَنٰتِ خَالِكَ وَبَنٰتِ خٰلٰتِكَ الّٰتِيْ هَاجَرْنَ مَعَكَ (الاحزاب:۵۰)

اور تمھارے وہ چچا زاد اور پھوپھی زاد اور ماموں زاد اور خالہ زاد بہنیں جنھوں نے تمھارے ساتھ ہجرت کی ہے۔

اِسی طرح ہر اُمتی عدل کی شرط کے ساتھ ضرورت کے تحت چار بیویاں رکھ سکتا ہے اور قانونی طور پر وہ ان سب کو یا بعض کو طلاق دے کر دوسری عورتوں کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوسکتا ہے۔ اگرچہ بلا عذرِ شرعی اس طرح کی طلاق کے معاملے میں وہ عنداللہ ماخوذ ہوگا لیکن رسول اللہ ﷺ کے لیے یہ دروازہ بھی بند ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنۢ بَعْدُ وَلَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ (الاحزاب:۵۲)

”اے رسول اب ان موجود ازواج کے بعد آپ کے لیے دوسری عورتیں حلال نہیں اور نہ اُن کو الگ کر کے دوسری ازواج کرنا حلال ہے۔ اگرچہ ان دوسری عورتوں کا حسن بھی آپ کو بھاتا ہو۔“

امر واقعہ یہ ہے کہ عام مسلمانوں کے مقابلے میں چار سے زیادہ بیویوں کے معاملے میں آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو خصوصی استحقاق حاصل تھا، اُس کی بہت سی معاشرتی وجوہ اور سیاسی مصالح ہیں۔ مثلاً ایک طرف اپنی بیوی کو ماں کہہ کر اپنے اوپر حرام کر لیا جاتا اور بعد میں لوگ کف افسوس ملتے رہ جاتے۔ دوسری طرف منہ بولے بیٹے کو نسبی بیٹے کے حقوق تک حاصل ہو جاتے حتیٰ کہ اُس کی مطلقہ بیوی تک سے نکاح ممکن نہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے احکام الٰہی کے مطابق نہ صرف رسم ظہار کا خاتمہ کر دیا بلکہ حضرت زیدؓ کی مطلقہ حضرت زینبؓ سے نکاح کر کے دوسری رسم باطل کا بھی ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَا جَعَلَ اَزْوَاجَكُمُ الّٰٓئِیْ تُظٰهِرُوْنَ مِنْهُنَّ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِی السَّبِيْلَ ۝ (سورۃ الاحزاب:۴)

”نہ اُس (اللہ تعالیٰ) نے تم لوگوں کی اُن بیویوں کو جن سے تم ظہار کرتے ہو تمھاری ماں بنا دیا ہے اور نہ اُس نے تمھارے منہ بولے بیٹوں کو تمھارا حقیقی بیٹا بنایا ہے۔ یہ تو وہ باتیں ہیں جو تم لوگ اپنے منہ سے نکال دیتے ہو مگر اللہ وہ بات کہتا ہے جو مبنی بر حقیقت ہے۔“

اس سے آگے اسی سورۃ کی آیت ۳۷ میں لفظ زوجنٰکھا استعمال کر کے اللہ تعالیٰ نے صراحت کر دی کہ ہم نے (مطلقہ خاتون) کا تم سے نکاح کر دیا۔ یہ آپ ﷺ کی ازواج ہی ہیں جن

کے ذریعے اُمت کی خواتین کو اپنے مخصوص مسائل کے بارے میں مستند معلومات و ہدایات حاصل ہوئیں۔ اس لحاظ سے اُمہات المومنین کو بجا طور پر معلمات المومنین بھی کہا جاتا ہے۔ سیاسی سطح پر آپ ﷺ نے تعدد ازواج کے ذریعے عرب کے متصادم قبائل کو اسلام کے جھنڈے تلے شیر و شکر کر دیا۔

تعدد ازواج کی اِس اجازت کے باوجود عدل کی شرط کا آپ ﷺ بھی پورا اہتمام فرماتے۔ واضح رہے کہ عدل و انصاف کا رویہ اختیاری امور یعنی نان و نفقہ و ازدواجی حقوق وغیرہ میں واجب ہے۔ غیر اختیاری امور مثلاً قلبی تعلق میں انسان اس کا مکلف نہیں۔ قرآن حکیم میں ہے: مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ (الاحزاب: ۴) "اللہ تعالیٰ نے کسی انسان کے اندر دو دل نہیں رکھے۔" اس لیے جناب رسالت مآب ﷺ ازواج مطہرات کے مابین تمام تر عدل کے باوجود بارگاہِ الٰہی میں دعا گو رہتے:

اللهم هذا قسمي فيما املك فلا تلمني فيما تملك ولا املك۔

"اے اللہ! میری یہ برابری اختیاری چیزوں میں ہے۔ اس لیے جو چیز آپ کے قبضۂ قدرت میں ہے اور میرے بس میں نہیں، اس پر مواخذہ نہ فرمانا۔" (ابو داؤد)

عورت اور حق وراثت

پیغمبر انسانیت ﷺ کا عورت پر ایک اور احسان یہ ہے کہ آپ ﷺ نے اس مظلوم ہستی کو وراثت میں حصہ دار بنایا۔ ظہورِ اسلام سے پہلے عورت وراثت میں بالعموم کسی قابل قدر حصہ سے محروم رہتی تھی۔ اکثر حالات میں تو عورت خود مالِ میراث سمجھی جاتی تھی۔ مغربی ممالک میں جہاں اولاد میں سب سے بڑا بیٹا ہی قانونی طور پر سب کچھ ہڑپ کر جاتا تھا، وہاں عورتیں میراث میں اپنے لیے کیا توقع کر سکتی تھیں۔ اسلام کا نظامِ میراث اس قدر فطری، منطقی اور مفصل ہے کہ اسے سمجھنے کے لیے اختصاصی مہارت درکار ہے۔ فقہ میں اسے علم الفرائض کہا جاتا ہے اور حضور علیہ الصلوٰۃ

والسلام نے اس علم کی تحصیل کی خصوصی ترغیب دی۔

اسلام کے قانونِ وراثت پر سب سے بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ مرد کا حصہ عورت سے دوگنا قرار دیا گیا ہے۔ معترض حضرات اس بات کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ قوام ہونے کے ناتے مرد ہی عورت کا کفیل بھی ہے۔ گویا مرد اپنا حصہ بھی عورت پر خرچ کرنے کا پابند ہے۔ عورت پر اس ضمن میں ذمہ داری عائد نہیں کی گئی ہے۔ معترضین اس بات سے بھی بے خبر معلوم ہوتے ہیں کہ میراث کی بعض صورتوں میں مردوں سے زیادہ عورتیں مستفیض ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر از روئے شریعت وارثین کی تین درجہ بندیاں...... ذوی الفروض، عصبات اور ذوی الارحام...... ہیں۔ صرف ذوی الفروض کو لیجیے۔ یہ بارہ قسم کے رشتہ دار ہیں جن کے حصے شریعت نے مقرر کر دیے ہیں۔ ان میں چار قسم کے مرد اور آٹھ قسم کی عورتیں شامل ہیں۔ مردوں میں میت کا باپ، دادا، ماں شریک بھائی اور خاوند شامل ہیں جبکہ عورتوں میں بیوی، ماں، بیٹی، پوتی، سگی بہن، سوتیلی بہن (باپ شریک)، ماں شریک بہن، جدہ (دادی، نانی) شامل ہیں۔ چند صورتوں میں عورت کو مرد کی نسبت دوگنا حصہ بھی مل سکتا ہے۔ مثلاً اگر مرحوم عورت ہو اور اس کی اولاد اور بھائی بہن نہ ہوں جبکہ خاوند اور ماں باپ زندہ ہوں تو خاوند کو نصف حصہ، ماں کو تیسرا اور باپ کو چھٹا حصہ ملے گا۔ اس صورت میں واضح طور پر ماں کا حصہ باپ سے دوگنا ہے۔ (۲۱) اور سو باتوں کی ایک بات! مفتی محمد شفیعؒ نے لکھا ہے۔

”قرآن پاک نے لڑکیوں کو حصہ دلانے کا اس قدر اہتمام کیا ہے کہ لڑکیوں کے حصے کو اصل قرار دے کر اس کے اعتبار سے لڑکوں کا حصہ مقرر کیا ہے۔ حصہ نہ دینا سخت گناہ ہے اور بیٹی یا بہن نابالغ ہوں تو گناہ بھی دوگنا ہو جاتا ہے، ایک میراث نہ دینے کا اور دوسرے یتیم کے مال کو کھانے کا۔“ (۲۲) یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ حضور ﷺ دور افتادہ مقامات میں مقیم لڑکیوں کے شرعی حقوق کی ادائیگی کے لیے بھی بہت فکر مند رہتے۔ کتابِ سیرت کا ایک اور ورق ملاحظہ ہو:

کسی قبیلے کا ایک سردار قتل ہو گیا۔ اسلامی قانون کے مطابق قاتل نے دیت ادا کر دی اور اس کی اطلاع حضور ﷺ کو بھی دے دی۔ کچھ دنوں کے بعد حضور ﷺ کو خیال آیا۔ ممکن ہے

مقتول کی بیوہ کو دیت میں سے اُس کا حصہ نہ دیا گیا ہو۔ آپ ﷺ نے اُس علاقے کے گورنر کے نام مکتوبِ گرامی میں گورنر کو حکم دیا کہ نہ صرف دیت بلکہ میراث میں بھی بیوہ کے حصہ کی ادائیگی کو یقینی بنایا جائے اور یہ کہ حکم نامے پر فوری عمل درآمد کی اطلاع واپس بھیجی جائے۔ (۲۳)

اسلام کی مثبت قانون سازی پر مستشرقین کی منفی تنقید

بعض مستشرقین نے عورت کے بارے میں اسلام کے انقلابی کردار کو بھی نہ صرف کم کرنے کی کوشش کی ہے بلکہ عورت کے بارے میں اسلام کی مثبت قانون سازی کو بھی دور از کار محرکات سے منسوب کرنے کی جسارت کی ہے۔ جس مقام پر اسلامی تعلیمات کی تحسین کیے بغیر چارہ نہ تھا، وہاں بھی اسلامی قانونی سازی کو یا تو وقتی سیاسی مصلحتوں کا تقاضا کہا گیا یا پھر جاہلی معاشرہ کی بعض باقیات سے منسوب کیا گیا۔ خاوند سے علیحدگی کا حق اور حق وراثت دو امور ایسے ہیں جنھیں عالم انسانیت پر پیغمبر اسلام ﷺ کے بڑے بڑے احسانات میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ بدقسمتی سے عورتوں کے حق میں اِس تاریخ ساز قانون سازی کو بھی خصوصی طور پر تختۂ مشق بنایا گیا۔ اس طرز فکر کی ایک نمایاں مثال مشہور مستشرق روبن لیوی (Reuban Levy) کے ہاں ملتی ہے۔ اسے یہ اعتراف ہے کہ اسلامی معاشرے میں ایسی عورتیں موجود تھیں جو اپنی عزت و ناموس کو داؤ پر لگائے بغیر اپنے خاوندوں سے علیحدگی اختیار کر سکتی تھیں۔ اس اعتراف کے معاً بعد اسے اصرار ہے:

''ان مثالوں سے زیادہ سے زیادہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ محمد (ﷺ) کے عہد میں بھی نظام کہن کے کچھ ایسے اثرات باقی تھے جن کی رو سے شادی کا مطلب خاوند کی بیوی پر مکمل حاکمیت نہ تھا۔'' (۲۴)

اسی طرح عورت کے حق وراثت پر حاشیہ آرائی کرتے ہوئے موصوف کا تبصرہ یہ ہے:

''اپنے قانونِ وراثت کے لیے تو محمد (ﷺ) بلاشبہ وقتی تقاضوں کے ہاتھوں مجبور تھے۔ جب مردان کے آدرش کے لیے میدان جنگ میں جانیں قربان کر رہے تھے تو آپ (ﷺ) قدیم نظام کو کیونکر برقرار رکھ سکتے تھے جبکہ اس صورت میں مومنین کی بیویاں اور بچے تو محروم رہ جاتے اور وہ لوگ اس (جایداد) سے

مستفید ہوتے جو آپ (ﷺ) کے کٹر مخالفین تھے۔" (۲۵)

صاحبِ تصنیف کو شاید اندازہ نہیں کہ ٹھوس اور ناقابل تردید حقائق کو چٹکیوں میں نہیں اڑایا جا سکتا۔ دورِ جاہلیت کا معاشرہ مرد کی مکمل اور غیر مشروط حاکمیت کا معاشرہ تھا۔ اِس معاشرے میں عورت کے لیے حق وارثت، حق جایداد، حق نکاح، حق خلع حق نان ونفقہ، سنگین اخلاقی الزامات کی صورت میں حق لعان نیز ماں، بیٹی، بہن، بیوی غرض ہر حیثیت سے عورت کے لیے عزت واحترام کوئی معمولی اقدامات نہیں ہیں۔ اسلام نے عورت کو جملہ حقوق اس زمانے میں دیے جب حقوقِ نسواں کے نام سے کوئی تحریک خطہ عرب یا بیرونِ دنیا کہیں نہیں چل رہی تھی۔ عرب میں تو بیٹی کی پیدایش ہی سرے سے باعث شرم وندامت سمجھی جاتی تھی اور ذہنی اذیت سے نجات کی واحد اور آئیڈیل صورت یہ تھی کہ بیٹیوں کو پیدا ہوتے ہی زندہ درگور کر دیا جائے۔ قرآن حکیم نے جاہلی معاشرے کی اس شرمناک ذہنیت کا نقشہ بایں الفاظ کھینچا ہے:

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمۡ بِالۡاُنۡثٰى ظَلَّ وَجۡهُهٗ مُسۡوَدًّا وَّهُوَ كَظِيۡمٌ ۝ يَتَوَارٰى مِنَ الۡقَوۡمِ مِنۡ سُوۡۤءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ؕ اَيُمۡسِكُهٗ عَلٰى هُوۡنٍ اَمۡ يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ ؕ (النحل: ۵۸۔۵۹)

"جب ان میں سے کسی کو بیٹی کے پیدا ہونے کی خوشخبری سنائی جاتی ہے تو اس کے چہرے پر کلونس چھا جاتی ہے اور وہ بس خون کا سا گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے۔ لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے کہ اس بری خبر کے بعد کیا کسی کو منہ دکھائے اور سوچتا ہے کہ ذلت کے ساتھ بیٹی کو لیے رہے یا مٹی میں دبا دے۔"

ویسے آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی عورت کو زندہ درگور کرنے کی مختلف صورتیں ایجاد ہو چکی ہیں۔ ۱۹۷۹ء کے اوائل سے چین میں ایک بچہ فی گھرانہ کی پالیسی پر زور دیا گیا۔ چین میں الٹرا ساؤنڈ ٹیکنالوجی کا فروغ بھی اسی دور میں ہوا۔ چینی حکام اور ماہرین اقتصادیات کے مطابق مذکورہ پالیسی کی بدولت آج چین دنیا کی دوسری بڑی معیشت بن چکا ہے۔ تاہم اس صورت کا المناک پہلو

یہ ہے کہ اس دوران اسقاطِ حمل کے ۹۰ فیصد کیسز صرف بیٹی کی وجہ سے کرائے گئے۔ نیز سالانہ ۳۹ ہزار بیٹیاں بیٹوں کے مقابلے میں عدمِ توجہ کے باعث اپنی عمر کے پہلے سال ہی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہیں۔ اس شدید صنفی عدمِ توازن کی وجہ سے ۶۰ ملین یعنی چھ کروڑ لڑکے لڑکیوں سے زیادہ ہیں۔ یوں اس تہذیبی تاریکی میں بھی لڑکیوں کے بارے میں اسلامی تعلیمات مینارہ نور کی حیثیت رکھتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ خواتین کے بارے میں جب بھی قرآن وسنت میں ذکر آتا ہے، رحمت و مودت اور رافت وشفقت کا ایک دریا بہنے لگتا ہے۔

اولاً : رسول اللہ ﷺ کے بہت سے فرمودات ہیں جن میں عورت کی مختلف حیثیتوں سے تقدیس و تحریم کا ذکر ہے۔ آپ ﷺ نے ماں کے قدموں میں جنت کی بشارت دی ہے۔ ماں اور باپ کے حقوق کا معاملہ درپیش ہوا تو آپ ﷺ نے پہلے، دوسرے اور تیسرے درجے میں ماں کے حق کو فائق قرار دیا اور چوتھے درجے پر باپ کو رکھا۔ بیٹیوں کے متعلق فرمایا: ''جس شخص کے ہاں لڑکی ہو۔ پھر وہ نہ اس کو زمین میں گاڑے اور نہ اس کی تحقیر کرے اور نہ اس پر اپنے لڑکے کو ترجیح دے تو اللہ اس کو جنت میں داخل کرے گا۔ (ابوداؤد)۔ پاک دامن عورتوں کی عفت وعصمت کے بارے میں زبان درازی یا الزام تراشی آپ ﷺ کو کسی صورت گوارا نہ تھی۔ قرآن پاک کی سورۃ النور ام المومنین سیدہ عائشہؓ کے پاکیزہ کردار کی گواہی کے طور پر نازل ہوئی۔ اِسی سورۃ میں عورتوں کی عصمت اور توقیر کے بارے میں انتباہ کرتے ہوئے فرمایا گیا: ''جو لوگ پاک دامن (بُرے کاموں سے) بے خبر ایمان والی عورتوں پر بدکاری کی تہمت لگاتے ہیں، اُن پر دُنیا و آخرت میں اللہ کی لعنت ہوگی اور اُن کے لیے سخت عذاب ہے۔ (وہ اُس دن کو نہ بھول جائیں) جس دن اُن کی اپنی زبانیں اور اُن کے اپنے ہاتھ اُن کے خلاف گواہی دیں گے اُن کاموں کی جو یہ کیا کرتے تھے۔'' (النور: ۲۳۔ ۲۴) نبی محترم ﷺ کا ارشاد ہے: پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانا ان سات

کبیرہ گناہوں میں سے ہے جو موبقات یعنی تباہ کن ہیں۔ الغرض ہر حیثیت سے عورت کے احترام کا سبق دیا اور فرمایا: ''تم میں سب سے اچھا وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے ساتھ اچھا ہو اور میں اپنے گھر والوں کے لیے تم میں سب سے اچھا ہوں۔''

ثانیاً: عورت کے تقدس و احترام سے متعلق قرآن حکیم کے احکامات اور فرمودات رسول ﷺ ہمارے لیے نشاناتِ منزل ہیں۔ ایک مرتبہ خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروقؓ کچھ احباب کے ساتھ کہیں تشریف لے جا رہے تھے۔ راستے میں ایک عورت نے ان کو روک کر نصیحت کرنا شروع کر دی۔ حضرت عمرؓ اُس وقت تک وہاں کھڑے رہے جب تک اُس نے اپنی بات مکمل نہ کر لی۔ ایک صاحب نے عرض کیا۔ امیر المومنین! آپؓ نے ایک بڑھیا کی خاطر قریش کے معزز لوگوں کو تا دیر منتظر رکھا۔ آپؓ نے فرمایا: شاید تمھیں معلوم نہیں کہ یہ کون ہے؟ یہ وہ عورت ہے جس کی بات آسمانوں تک سنی گئی۔ عمرؓ کو تو بدرجہ اولیٰ اس کی بات سننی چاہیے۔ اللہ کی قسم! اگر مجھے یہ رات بھر کھڑا رکھتی تو میں کھڑا رہتا۔ سورۃ المجادلۃ کی ابتدائی آیات کے شانِ نزول میں اِس عورت کا ذکر آتا ہے۔ یہ حضرت خولہ بنت ثعلبہؓ تھیں جنھیں ان کے خاوند نے حالتِ غضب میں کہا تھا۔ ''آیندہ سے تیری پیٹھ میرے لیے میری ماں کی پیٹھ کی مانند ہے۔'' اس زمانے میں اس اندازِ کلام کو طلاق کا ہم معنی سمجھا جاتا تھا۔ وہ پریشان ہو کر دربارِ رسالت ﷺ میں آئیں اور اپنی عائلی زندگی کی بقا کے لیے آہ وزاری کرنے لگیں۔ ابھی اس باب میں وحی الٰہی نازل نہ ہوئی تھی۔ جب حضور ﷺ نے ان کے حسب خواہش جواب دینے سے معذوری ظاہر کی تو وہ دربارِ الٰہی میں فریاد کناں ہو گئیں۔ سورۃ المجادلۃ کی آیات کے نزول سے ہمیشہ کے لیے طلاق کا یہ طریقہ (ظہار) کالعدم قرار پایا۔

رسول اللہ ﷺ حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد بھی ان کی سہیلیوں تک کا احترام کرتے تھے۔ حضرت خدیجہؓ کی خدماتِ عالیہ کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس نے اپنا مال مجھ پر قربان کر دیا۔ خدیجہؓ نے اس وقت مجھے سچا کہا جب سب نے مجھے

جھوٹا کہا۔ جب سب لوگ کافر تھے خدیجہؓ اس وقت ایمان لا چکی تھیں۔" اُم المومنین حضرت صفیہؓ جب ایک سفر میں آپ ﷺ کے ساتھ اونٹ کی پچھلی نشست پر سوار ہونے لگیں تو آپ ﷺ نے اپنا گھٹنا آگے بڑھایا تاکہ وہ آپ ﷺ کے گھٹنے پر پاؤں رکھ کر اونٹ پر سوار ہو جائیں۔ اس موقع پر ناقہ بدکنے لگی۔ حضرت ابوطلحہؓ دوڑتے ہوئے آئے اور رسول اللہ ﷺ کی طرف متوجہ ہوئے۔ آپؐ نے فرمایا۔ علیکم بالمرأة۔ "تم پہلے عورت کی خبر لو۔" (صحیح بخاری)۔ پہلی ہجرتِ حبشہ کے موقع پر بارہ (۱۲) مرد اور چار (۴) عورتوں نے ہجرت کی جبکہ دوسری بار تراسی (۸۳) مردوں اور اٹھارہ (۱۸) عورتوں نے بھی ہجرتِ حبشہ کی سعادت حاصل کی۔ خواتین میں حضرت اُم حبیبہؓ بھی تھیں۔ بعد میں ان کے خاوند عبید اللہ بن جحش نے مرتد ہو کر عیسائی مذہب اختیار کر لیا۔ ایک اجنبی سرزمین میں رہتے ہوئے اس حالت میں بھی حضرت اُم حبیبہؓ کے پائے ثبات میں لغزش نہ آئی اور وہ دامن اسلام سے وابستہ رہیں۔ حضور ﷺ نے انھیں ازواج مطہرات میں شامل کر لیا اور تاقیامت انھیں اُم المومنینؓ کا اعزاز بخشا۔

ثالثاً: بہت سی روایات اور احکامِ شریعت ہیں جن میں عورتوں کے لیے گھر سے باہر بھی وسیع تر کردار کا ذکر ملتا ہے۔ عہدِ رسالت ﷺ میں عورتیں نمازِ باجماعت میں شرعی حدود و قیود کا لحاظ رکھتے ہوئے شریک ہوتی تھیں۔ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: "میں مسجد میں نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہوں، چاہتا ہوں کہ میں اس کو لمبا کروں، پھر میں کسی بچے کے رونے کی آواز سنتا ہوں تو میں نماز کو مختصر کر دیتا ہوں۔ اس اندیشہ کی بنیاد پر کہ اس کی ماں کو تکلیف دوں گا۔" (بخاری۔ کتاب الصلوۃ) عہدِ رسالت میں خواتین نہ صرف مسجد میں نماز کے لیے حاضر ہوتیں بلکہ میدانِ جنگ میں بھی اہم خدمات انجام دیتی تھیں۔ جنگ اُحد میں عقب سے اچانک حملہ کے بعد جب مجاہدین کی صفیں درہم برہم ہو گئیں تو کفار کا سارا عسکری دباؤ ذاتِ رسالت مآب ﷺ پر پڑنے لگا۔ اس انتشار کی حالت میں بھی جو صحابہ کرام آپ ﷺ کے

دفاع کے لیے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن گئے، اُن میں ایک صحابیہ اُم عمارہؓ بھی تھیں۔ ان کی جانفروشی کی مدح وتوصیف کرتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا۔ ''میں نے دائیں بائیں جس طرف بھی نگاہ اُٹھائی، دیکھا کہ اُم عمارہ میرے دفاع میں لڑ رہی ہے۔'' (۲۶) عہدِ خلافتِ راشدہ میں بھی عورتوں کا الگ تشخص برقرار رہا۔ جمعۃ المبارک اور عیدین کے اجتماعات تو گویا پارلیمنٹ کے اجلاس ہوتے تھے، جن میں مرد اور عورت براہِ راست اپنے مسائل بیان کر کے ان کا اسلامی حل دریافت کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروقؓ کچھ احباب کے ساتھ کہیں تشریف لے جا رہے تھے۔ راستے میں ایک عورت نے ان کو روک کر نصیحت کرنا شروع کر دی۔ حضرت عمرؓ اُس وقت تک وہاں کھڑے رہے جب تک اُس نے اپنی بات مکمل نہ کر لی۔ ایک صاحب نے عرض کیا۔ امیر المومنین! آپؓ نے ایک بڑھیا کی خاطر قریش کے معزز لوگوں کو تادیر منتظر رکھا۔ آپؓ نے فرمایا۔ شاید تمھیں معلوم نہیں کہ یہ کون ہے؟ یہ وہ عورت ہے جس کی بات آسمانوں تک سنی گئی۔ عمرؓ کو تو بدرجہ اولیٰ اس کی بات سننی چاہیے۔ اللہ کی قسم! اگر مجھے یہ رات بھر کھڑا رکھتی تو میں کھڑا رہتا۔ سورۃ المجادلۃ کی ابتدائی آیات کے شانِ نزول میں اِس عورت کا ذکر آتا ہے۔ یہ حضرت خولہ بنت ثعلبہؓ تھیں جنھیں ان کے خاوند نے حالتِ غضب میں کہا تھا۔ ''آیندہ سے تیری پیٹھ میرے لیے میری ماں کی پیٹھ کے مانند ہے۔'' اس زمانے میں اس اندازِ کلام کو طلاق کا ہم معنیٰ سمجھا جاتا تھا۔ وہ پریشان ہو کر دربارِ رسالت ﷺ میں آئیں اور اپنی عائلی زندگی کی بقا کے لیے آہ وزاری کرنے لگیں۔ ابھی اس باب میں وحی الٰہی نازل نہ ہوئی تھی۔ جب حضور ﷺ نے ان کے حسب خواہش جواب دینے سے معذوری ظاہر کی تو وہ دربارِ الٰہی میں فریاد کناں ہو گئیں۔ سورۃ المجادلۃ کی آیات کے نزول سے ہمیشہ کے لیے طلاق کا یہ طریقہ (ظہار) کالعدم قرار پایا۔ خلافتِ فاروقی میں بعض لوگ عورتوں کے مہر کی رقم بے تحاشا طے کرنے لگے جس سے معاشی حیثیت سے کم تر لوگ پریشان ہو رہے تھے۔ حضرت عمرؓ نے مہر کی کم سے کم مقدار طے

کرنے کے ارادے کا اعلان کیا تو مجمع میں سے ایک عورت نے قرآن کی آیت کا حوالہ دے کر انھیں اس ارادے سے باز رکھا۔ مذکورہ آیت میں فرمایا گیا ہے وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا (النساء:۲۰) ''تو خواہ تم نے اُسے ڈھیر سارا مال ہی کیوں نہ دیا ہو، اس میں سے کچھ واپس نہ لینا۔'' حضرت عمرؓ نے برملا تسلیم کیا کہ عورت نے سچ کہا اور عمر غلطی پر ہے۔ اگر یہ عورت نہ ہوتی تو آج عمر ہلاک ہو جاتا۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے یہ وضاحت بھی کر دی کہ مہر اگر آخرت میں فلاح اور عظمت کی چیز ہوتی تو یقیناً رسول اللہ ﷺ کی صاجزادیاں اس کی زیادہ مستحق تھیں۔

ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ تاریخِ انسانی میں عورت بالعموم دو انتہاؤں کے مابین پستی رہی ہے۔ ایک انتہا یہ تھی کہ قدیم جاہلیت اور پھر دورِ ملوکیت کی قبائلی روایات نے اِس مظلوم مخلوق سے بنیادی حقوقِ نسواں چھین لیے تھے۔ دوسری انتہا یہ ہے کہ جدید جاہلیت کے خوش کن تصورات نے عورت سے اُس کی نسوانیت ہی چھین لی ہے۔ صنفین کی مساوات (Gender Equality) کے نام پر اس خاندانی نظام کو برباد کر دیا گیا جو تمدن کی بنیادی اکائی ہے۔ محسن انسانیت ﷺ کی تعلیمات اور قانون سازی کے صدقے عورت کو عزت و احترام بھی ملا، بنیادی انسانی حقوق بھی حاصل ہوئے نیز اپنی نسوانیت کو برقرار رکھتے ہوئے زندگی کے مختلف دائروں میں وہ اپنی صلاحیتوں کا بہترین مظاہرہ کر سکتی ہے۔ اسلام مستقبل میں بھی عورت کے بھرپور کردار کا مؤید ہے اور اس کے لیے ایک ایسے مثالی معاشرے کا قیام چاہتا ہے جس میں امن وامان کی حالت مثالی ہو۔

حضرت عدیؓ سے روایت ہے کہ میں خدمتِ نبوی ﷺ میں بیٹھا تھا۔ ایک آدمی نے آ کر فاقہ کشی کی شکایت کی۔ دوسرے نے آ کر راہزنی کا شکوہ کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عدی تم نے حیرہ دیکھا ہے؟ اگر تمھاری زندگی دراز ہوئی تو تم دیکھ لوگے کہ ہودج نشین عورت حیرہ سے چل کر آئے گی، خانہ کعبہ کا طواف کرے گی اور اسے اللہ کے سوا کسی کا خوف نہ ہوگا۔ (صحیح بخاری)

اللھم صل علی محمد و علی آل محمد

---❀❀❀---

مراجع وحواشی

۱۔ ول ڈیوراں......Story of Philosophy

۲۔ ڈاکٹر محمد آفتاب خان......Sex and Sexuality

۳۔ بائبل......سلاطین باب II ۱۔۱۰

۴۔ ایضاً

ہمارے نزدیک متعلقہ مقامات بائبل کے الحاقی مقامات ہیں۔اسی لیے قرآن نے آ کر سابقہ انبیا کرام کے مقدس دامن پر لگے جعلی دھبوں کو ہمیشہ کے لیے دھوڈالا اور اسی لیے کتاب اللہ کا ایک نام المھیمن (نگران) بھی ہے۔دراصل مختلف اقوام جب اخلاقی پستی کے گہرے اندھیروں میں ڈوب جاتی ہیں تو اپنی اخلاقی بے راہ روی کو سند جواز بخشنے کے لیے بزعم خویش اپنے اکابر کا دامن بھی آلودہ کر دیتی ہیں۔حضور ﷺ فتح مکہ کے بعد جب خانہ کعبہ میں داخل ہوئے تو خانہ کعبہ کی اندرونی دیواروں پر آپ ﷺ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کچھ تصاویر نظر آئیں جن میں ابوالانبیا علیہ السلام کو جوا اور پانسے کھیلتے دکھایا گیا تھا۔آپ ﷺ نے یہ تصاویر صاف کرائیں اور فرمایا:"اللہ مشرکین کو غارت کرے۔بھلا حضرت ابراہیم علیہ السلام کا جوئے اور پانسے سے کیا تعلق؟"

۵۔ سید امیر علی......The Spirit of Islam......سنگ میل پبلی کیشنز لاہور

۶۔ قاضی سلیمان منصور پوریؒ......الجمال والکمال......مکتبہ اسلامیہ اردو بازار لاہور

۷۔ وحید الدین خان......خاتونِ اسلام (بحوالہ ٹائم میگزین ۲۰ رمارچ ۱۹۷۲ء)......دارالتذکیر لاہور

۸۔ علی عباس جلال پوری......جنسیاتی مطالعے (۱۹۹۱ء) خرد افروز جہلم

۹۔ جلال الدین عمری......مسلمان عورت کے حقوق اور ان پر اعتراضات کا جائزہ (۲۰۰۵ء)......اسلامی ریسرچ اکیڈیمی کراچی

۱۰۔ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ......تفہیم القرآن۔جلد ششم۔تفسیر سورۃ التکویر

۱۱۔ ہیولاک ایلس......The Psychology of Sex

۱۲۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادی......مطالعہ قرآن، بیسویں صدی میں......دارالتذکیر لاہور

۱۳۔ محمد مارماڈیوک پکھتالؒ......Cultural Side of Islam (۱۹۹۱ء)......شیخ محمد اشرف لاہور

۱۴۔ علامہ رشید رضا مصریؒ...... تفسیر المنار

۱۵۔ مولانا انور شاہ کشمیریؒ...... فیض الباری...... قدیم کتب خانہ کراچی

۱۶۔ ایضاً

۱۷۔ اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان (اسلام آباد) نے بھی اپنی سفارشات میں کہا ہے کہ مطلقہ رجعیہ کے لیے دورانِ عدت شوہر کے گھر رہائش کو ضروری قرار دیا جائے۔ (سالانہ رپورٹ ۹۲۔ ۱۹۹۳ء)

۱۸۔ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ...... تفہیمات حصہ سوم۔ (عائلی قوانین کے کمیشن کا سوالنامہ اور اُس کا جواب)

۱۹۔ ڈاکٹر مصطفےٰ السباعیؒ...... المرأۃ بین الفقہ والقانون

۲۰۔ پروفیسر ظفر علی قریشی...... Prophet Muhammad's Wives and Orientalists

Lahore.Feroz Sons Ltd. (2005)

۲۱۔ خطبات ڈاکٹر ذاکر نائیک...... ترتیب وتالیف محمد عمران انجم...... روبی پبلی کیشنز لاہور

۲۲۔ مفتی محمد شفیعؒ...... معارف القرآن جلد دوم تفسیر سورۃ النساء

۲۳۔ محمود احمد غازیؒ...... محاضرات سیرت

۲۴۔ روبن لیوی...... The Social Structure of Islam

Cambridga University Press London. (1957)

مصنف کا اندازِ تنقیص اصل انگریزی زبان میں ملاحظہ ہوں۔

"These instances may at most be taken to indicate that in Muhammad's time, there remained traces of an old system in which the marriage did not necessarily mean the husband's definite control over his wife".

۲۵۔ ایضاً

"To his law of Inheritance, Muhammad was undoubtedly compelled by the exigencies of the moment. When men fell in battle fighting for his cause, he could not have allowed the old custom to prevail and so leave the wives and children of believers destitute in order to benefit kinsmen who were probably hostile to him".

۲۶۔ قاضی عبدالدائم دائم...... سید الوریٰ ﷺ جلد اول

---✿✿✿---

حصہ سوم

آفتابِ رسالت ﷺ ۔۔۔۔ مستشرقین کی مغالطہ آفرینیاں

وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ۔ (المائدہ: ٦٧)

''اور اللہ تعالیٰ بچائے گا آپ کو لوگوں (کے شر) سے۔''

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ

"اور ہم نے آپ ﷺ کا ذکر بلند کر دیا" (القرآن)

منکرینِ رسالت کی تاریخ کے مختلف ادوار

انبیائے کرام اپنے شفاف کردار اور اجلی شخصیات کے ساتھ معاشرے کی معتبر ترین شخصیت کے طور پر پہچانے جاتے رہے ہیں۔ تاہم جونہی انھوں نے ربِ کائنات کا پیغام بندوں کے نام پیش کیا، وہ راتوں رات محبوب کے بجائے معتوب قرار پائے۔ ظاہر ہے اس پیغام کی زد معاشرے میں طاقت کے تمام سرچشموں پر براہِ راست پڑتی تھی۔ استبداد اور ابلاغ کے سارے ذرائع پیغامِ الٰہی، پیغمبر کی شخصیت اور اس کے پیروکاروں کے خلاف بے دریغ استعمال ہونے لگے۔ پیغمبر چونکہ حاکمِ حقیقی کا نمایندہ ہوتا ہے اور نمایندے کی توہین دراصل حاکم کی توہین ہوتی ہے، اس لیے پیغمبر کے خلاف گستاخی یا دریدہ دہنی کا جواب یا تو اللہ تعالیٰ خود دیتا ہے یا اس کی تخلیق کردہ کائناتی قوتیں پیغمبر کی معاون و مددگار ہو جاتی ہیں۔ پیغمبر اسلام ﷺ کی نبوت کا آغاز تاریخ انسانی کی واضح روشنی میں ہوا اور یہ نبوت بھی ابدالاباد تک قائم و دائم رہنے والی ہے، اس لیے آپ ﷺ کی کردار کشی کے لیے منکرین کی بے سود کوششوں کا دائرہ بھی صدیوں پر محیط ہے۔

پہلے دور کا تعلق براہ راست حیاتِ طیبہ ﷺ سے ہے۔ اس دور کو ردِ عمل کا دور (Age of Reaction) کہتے ہیں۔

اس دور کا آغاز ٹھیک اس دن اور اس وقت ہو گیا تھا جب رسول اللہ ﷺ نے حکم ربی کی تعمیل میں کوہِ صفا پر اہلِ مکہ کے سامنے کلمۂ توحید بلند کیا تھا۔ ابولہب وہ پہلا شخص ہے جس نے اس پیغام کی نوعیت و ماہیت پر کوئی بات کرنے کے بجائے آپ ﷺ کے خلاف بدزبانی کا ارتکاب

کیا۔ یہ وہ واحد بد بخت شخص ہے جس کا باقاعدہ نام لے کر قرآنِ حکیم میں مذمت کی گئی۔ دراصل مکی زندگی کا پورا دور رسول اللہ ﷺ کے خلاف دشنام طرازی، الزام تراشی اور کردارکشی کی مذموم کوششوں سے عبارت ہے۔ آپ ﷺ تمام مخالفتوں اور ایذا رسانیوں کی پروانہ کرتے ہوئے جادۂ حق پر صبر و استقامت کے ساتھ گامزن رہے۔ حق تعالیٰ نے خود جہاں مناسب سمجھا، مخالفین کو دندان شکن جواب دیا۔

ایسا ہی ایک جواب نضر بن حارث کو بھی دیا گیا تھا۔

نضر بن حارث وہ شخص تھا جس نے آنے والے خطرے اور اپنے کافر ساتھی رہنماؤں کی پریشانی کو بھانپ لیا تھا۔ اُس کا کہنا تھا کہ محض طرح طرح کے الزامات کی تکرار اور طعن وتشنیع سے کام نہ چلے گا۔ یہ شخص بغرضِ تجارت شام، عراق اور ایران جاتا رہتا تھا۔ خصوصی طور پر وہ وہاں سے رستم و اسفندیار کے قصے، بادشاہوں کی کہانیاں اور جنگی واقعات پر مشتمل داستانیں لے کر آیا۔ جب رسول اللہ ﷺ لوگوں کو قرآن سناتے اور مخاطبین کلامِ الٰہی کے سحر میں گرفتار ہونے لگتے تو یہ دوسری طرف مذکورہ قصے کہانیوں کے لیے مجالس جما کر بیٹھ جاتا۔ چونکہ فرق اصل اور نقل کا یا حقیقت و افسانے کا تھا، اس لیے قرآن اور حامل قرآن ﷺ سے برگشتہ کرنے کی یہ جعل سازی تو جلد ہی اپنی موت آپ مرگئی۔ البتہ اس بدنصیب کے لیے قرآن کے یہ الفاظ امر ہو گئے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّشۡتَرِىۡ لَهۡوَ الۡحَدِيۡثِ لِيُضِلَّ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ بِغَيۡرِ عِلۡمٍ‌ۖ وَّيَتَّخِذَهَا هُزُوًا‌ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمۡ عَذَابٌ مُّهِيۡنٌ ۞ وَاِذَا تُتۡلٰى عَلَيۡهِ اٰيٰتُنَا وَلّٰى مُسۡتَكۡبِرًا كَاَنۡ لَّمۡ يَسۡمَعۡهَا كَاَنَّ فِىۡۤ اُذُنَيۡهِ وَقۡرًا‌ ۚ فَبَشِّرۡهُ بِعَذَابٍ اَلِيۡمٍ ۞ (سورۃ لقمان: ۶۔۷)

''اور انسانوں میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو کلامِ دلفریب خرید کر لاتا ہے تا کہ لوگوں کو اللہ کے راستے سے علم کے بغیر بھٹکا دے اور اِس راستے کی دعوت کو مذاق میں اڑا دے۔ ایسے لوگوں کے لیے سخت ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔ اُسے جب

ہماری آیات سنائی جاتی ہیں تو وہ بڑے گھمنڈ کے ساتھ اس طرح رُخ پھیر لیتا ہے گویا کہ اس نے سنا ہی نہیں، گویا کہ اس کے کان بہرے ہیں۔ اچھا مژدہ سنادو اُسے ایک دردناک عذاب کا۔"

مدینہ منورہ میں منافقین و شرپسند یہود نے اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے خلاف ایسی ہی قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا اور منہ کی کھائی۔ جب قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فی سبیل اللہ قرضِ حسنہ کی بات کی تو یہود نے کہا۔" محمد (ﷺ) کے خدا (نعوذ باللہ) قلاش ہو گئے ہیں اور ادھار مانگ رہے ہیں۔" اللہ تعالیٰ کی طرف سے انھیں وعید سنائی گئی۔" بے شک اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کا قول سن لیا جو کہتے ہیں اللہ تعالیٰ محتاج ہو گیا اور ہم غنی لوگ ہیں۔ ان کی یہ باتیں ہم لکھ لیں گے اور اس سے پہلے جو وہ پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے رہے ہیں وہ بھی ان کے نامۂ اعمال میں ثبت ہے۔" (آل عمران: ۱۸۰۔ ۱۸۱) مدینہ منورہ میں ہی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ایذا پہنچانے کے لیے سیدہ عائشہؓ کی عفت و عصمت کے خلاف منافقین نے طوفانِ بدتمیزی برپا کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے خود قرآنِ حکیم میں سیدہ طاہرہؓ کی بریت ظاہر و ثابت کر دی۔ سیدہ مریمؑ کے بعد آپؓ پہلی اور آخری خاتون ہیں جن کی عظمتِ کردار کی گواہی ربِ کائنات نے خود دی اور اس سورۃ کا نام بھی سورۃ النور قرار پایا۔ رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی نے اِس ناپاک مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ اس کے متعلق اسی سورۃ میں فرمایا گیا:

وَالَّذِيْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ○ (سورۃ النور: ۱۱)

"اور جس شخص نے اس الزام کی ذمہ داری کا بڑا حصہ اپنے سر لیا، اُس کے لیے عذابِ عظیم ہے۔"

دوسرا دور اُس پورے عرصے پر پھیلا ہوا ہے، جب مجاہدین اسلام نے عرب کے قرب و جوار میں پیش قدمی کر کے عیسائی اثرات کا خاتمہ کر دیا اور پھر بالآخر وقت کی دونوں بڑی طاقتوں...... بازنطینی و ساسانی سلطنت ......کا غرور خاک میں مل گیا۔ اِس دور میں اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ

کے متعلق جو کچھ کہا اور لکھا گیا اُس میں سراسر لاعلمی اور جہالت کے علاوہ شدید بغض و عداوت کے جذبات غالب تھے۔ اسلام اور دوسرے الہامی مذاہب کے بعض مشترک نکات کو بنیاد بنا کر بہت سے عیسائی اہلِ قلم اسلام کو عیسائیت کا ایک انتہائی گمراہ قسم کا فرقہ باور کرواتے رہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ کی تصویر دنیائے عیسائیت کے سامنے ایک ایسے باغی شخص کے طور پر سامنے لائی گئی جس نے عیسائی وحدت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا تھا۔ پہلا شخص جس نے اِس تصور کو وسیع پیمانے پر پھیلایا وہ John of Damascus تھا۔ یہ شخص مشرقی کلیسا کا ایک بہت اہم ستون تھا۔ مسلمانوں کے سامنے اسلام کو ایک غلط مذہب کے طور پر پیش کرنا اس کا محض ثانوی مقصد تھا۔ بنیادی طور پر اُسے یہ فکر دامن گیر تھی کہ عیسائیوں کو اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے بارے میں کس طرح بدظن کیا جا سکتا ہے۔ جان آف دمشق کے کام کی اہمیت اس قدر ضرور ہے کہ اُس نے مستقبل کے مستشرقین کے لیے کچھ بنیادی خطوط متعین کر دیے۔ آٹھویں صدی میں مسلمانوں کی فتح اندلس اور بعد ازاں عیسائیوں کی واپسی Reconquita کے بعد جان آف دمشق کے اٹھائے ہوئے بے تکے مصرعِ طرح پر کئی مبتذل غزلیں کہہ ڈالی گئیں۔ اِس عرصے میں قرآن کو بائبل کا چربہ ہی نہیں، مسخ شدہ ایڈیشن تک قرار دیا گیا۔ رسول اللہ ﷺ کی سیاسی زندگی، ازدواجی زندگی، عسکری مصروفیات اور مخالف عیسائیت عقائد کے حوالے سے بدترین مغلظات کو روا رکھا گیا۔ اس سارے لٹریچر کی قدر و قیمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک ممتاز مغربی دانشور Southern. R.W نے اسلام کے حوالے سے اس پورے دور کو دورِ جہالت (Age of Ignorance) کا نام دیا ہے۔(۱)

تیسرے دور کا تعلق صلیبی جنگوں سے ہے۔ فرانس میں پوپ اربن ثانی (Pope Urban-II) نے ۲۷ نومبر ۱۰۹۵ء کو کلیر ماؤنٹ کے تاریخی اجتماع میں دہائی دی کہ مشرق میں عیسائیت شدید خطرہ سے دوچار ہے۔ پچاس ہزار صلیبی جنگ بازوں کے سامنے اپنی انتہائی اشتعال انگیز تقریر میں اس نے مشرق میں عیسائیوں پر ہونے والے ''مظالم'' کا رقت آمیز انداز میں ذکر کیا۔ بقول اس کے: ''دشمنانِ خدا نے شام، آرمینیا اور دوسرے عیسائی ممالک میں مقدس مقامات پر

غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے۔ یورپ میں بھی عیسائیوں کے وجود کو شدید خطرہ لاحق ہے۔" پوپ اربن ثانی نے صلیبیوں کو مقدس جنگ میں شرکت کی صورت میں تمام گناہوں اور جرائم سے بریت کا مژدہ سنایا۔ اس کے بقول "عیسائی مجاہدین اپنی تمام بہادری وشجاعت اور دانش مندی وفراست اب تک باہمی جنگ وجدال اور اندرونی جھگڑوں میں ضائع کرتے رہے ہیں۔ وقت آ گیا ہے کہ اس کا رُخ بیرونی محاذِ جنگ کی طرف موڑ دیا جائے۔ یعنی ایک ایسے خطے کی طرف جو یورپ کی گنجان آباد عیسائیت کے مقابلے میں کہیں زیادہ دولت منداور ثمر آور ہے۔" اس نے یہ بھی اعلان کیا کہ "کسی بھی عیسائی کے لیے اس سے بڑھ کر مسرت کیا ہوگی کہ وہ اپنی آنکھوں سے اپنی چند روزہ زندگی میں ان عظیم مقامات کی زیارت کا شرف حاصل کرے جہاں آسمانوں کا خدا بھی انسان کے روپ میں ظاہر ہوا تھا۔" (۲)

یوں ۱۰۹۹ء میں صلیبی یورپ نے عالم اسلام پر دھاوا بول دیا۔ اسلامی مشرقِ وسطیٰ کے اولوالعزم بادشاہ ملک شاہ سلجوقی کے انتقال کے بعد عالم اسلام پر نکبت وادبار کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ چنانچہ بے جان لاشوں پر یہ لوگ گِدھوں کی طرح ٹوٹ پڑے۔ تاریخ کا یہ بھی ایک المناک باب ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نام پر لڑی جانے والی ان جارحانہ جنگوں میں صلیبیوں نے ہر اس ضابطے اور اصول کو بھی بے دردی سے تہ تیغ کیا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے افعال و اعمال سے منسوب تھا۔ (۳) پہلی ہی جنگ میں ستر ہزار مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا۔ جنگوں کا یہ سلسلہ تقریباً دو سو سال سے زیادہ عرصے تک جاری رہا۔ پہلے مرحلے میں عماد الدین زنگی اور اس کا بیٹا نور الدین زنگی صلیبیوں کے راستے میں دیوار بن کر حائل ہو گئے۔ آخری ادوار میں مملوک سلاطین...... ظلظر، ظاہر بیبرس اور قلادون ...... نے ارضِ مقدس سے صلیبیوں کا تقریباً صفایا کر دیا لیکن صلاح الدین ایوبی (۱۱۳۸ء۔ ۱۱۹۲ء) وہ زعیمِ ملت تھا جو اس سیلاب بلاخیز کے سامنے چٹان بن کر کھڑا ہو گیا۔ صدیوں پر محیط اس جنگی صورتِ حال میں اصل ہدف ذاتِ رسالت مآب ﷺ ہی رہی ہے۔ صلیبی جنگ بازوں کو یک طرفہ طور پر حضور ﷺ کے بارے میں جھوٹی داستانیں سنائی گئی تھیں۔

مثلاً یہ کہ آپ ﷺ ہی ہیں جن کی وجہ سے دنیائے عیسائیت فرقوں میں بٹ گئی اور اس کے وسیع تر اتحاد کو سخت نقصان پہنچا اور یہ کہ "پیغمبر اسلام ﷺ ایسا خدا بن بیٹھا جس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے اُس کے پیرو انسان کی قربانی پیش کرتے ہیں۔"(۴) یا یہ کہ پیغمبر اسلام ﷺ کا جسدِ خاکی مدینہ میں ایک آہنی تابوت (Iron Coffin) میں رکھا ہے اور مسلمان اس کی پوجا کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ آپ ﷺ کو نعوذ باللہ ایک بت پرست (Pagan) اور نیچ ذات سے متعلق (Low Born) (نعوذ باللہ) ثابت کرنے کی کوشش بھی کی گئی۔ کفارِ مکہ کی پیروی میں آپ ﷺ کے مقدس نام تک کو مسخ کیا گیا۔ کبھی آپ کو نعوذ باللہ (Mohamat) کہا گیا۔ جس کا بنیادی مفہوم ہے ایک "جھوٹا خدا" اور کبھی (Mahaund) لکھا گیا جس کا مطلب ہے "شہزادہ تاریکی"۔ جنگ میں سب سے پہلا اور سب سے زیادہ قتل عام سچائی کا ہوتا ہے۔ اس لیے اہلِ نظر کے نزدیک پیغمبر اسلام ﷺ کے خلاف اس دفترِ بے معنی کی حیثیت ایک مذموم میڈیا وار سے زیادہ نہیں ہے۔ ویسے بھی جس ماحول میں جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز کا نظریہ پروان چڑھا ہو، وہاں اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے ساتھ اس جنگی فضا میں کیا انصاف ہو سکتا تھا۔ بدقسمتی سے اس منفی پروپیگنڈے کی صدائے بازگشت بعد کے ادوار میں بھی بار بار سنی گئی۔ یہ الگ بات ہے کہ اس شر سے ایک خیر بھی برآمد ہوا۔ مسلمانوں سے براہِ راست آمنا سامنا (Encounter) ہونے کے بعد بے علم صلیبیوں کو معلوم ہو گیا کہ مسلمان بت پرست نہیں، ایک اہلِ کتاب قوم ہے جو منفرد تمدن کے وارث ہیں اور جن کے ہاں پیغمبر کی عبادت کا نہیں، اطاعت کا تصور پایا جاتا ہے۔(۵)

یہاں سے ہم چوتھے دور میں داخل ہوتے ہیں۔ یورپ تحریک نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کے دور میں داخل ہو رہا تھا۔ صلیبی جنگوں کا گرم محاذ خاموش ہو چکا تھا۔ اس کے بعد سرد جنگ کا دور شروع ہوا۔ ریمنڈ لل (Raymond Lull) نے واضح طور پر کہا تھا کہ عالم اسلام کے خلاف علمی جنگ (Crusade of the Pen) جاری رکھی جائے گی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ تاریخ میں کوئی دور کسی خاص وقت پر ختم ہوتا ہے نہ کسی مخصوص وقت پر دفعتاً شروع ہوتا

ہے۔قرونِ وسطیٰ یعنی (Middle Ages) سے نشاۃ ثانیہ کا سفر بھی اچانک شروع نہیں ہوا۔ کچھ قوتیں اور کچھ شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جو دونوں ادوار کے درمیان پل کا کام دیتی ہیں۔ یورپ میں ڈانٹے (۱۲۶۵ء۔۱۳۲۱ء) Dante کا نام اُن اہلِ قلم میں سرِفہرست ہے جنھوں نے دونوں ادوار کے درمیان ایک پل کا کردار ادا کیا۔ چنانچہ اگر یہ دیکھنا ہو کہ اس پُل پر سے کیا کچھ گزر کر دوسرے دور میں داخل ہوا تو کوئی غیر جانبدار مؤرخ ڈانٹے کی طربیہ خداوندی (Divine Comedy) کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اِس دور میں رسول اللہ ﷺ کی کردارکشی کے لیے عام وخاص میں یہ بات پھیلائی گئی کہ آپ کی وجہ سے دنیائے عیسائیت فرقوں میں بٹ گئی۔ ڈانٹے صلیبی ماحول کے پیدا کردہ اثرات کے زیرِ اثر ایک انتہائی متعصب عیسائی شاعر تھا۔ وہ اپنی مشہور نظم کے قوافی اور بند وغیرہ میں بھی تین اور نو اعداد کا پورا التزام کرتا ہے۔ یہ کتاب تین حصوں ...... دوزخ، برزخ اور جنت ...... پر مشتمل ہے۔ دوزخ کے Canto-28 میں العیاذ باللہ اس نے حضرت محمد ﷺ اور حضرت علیؓ کو مبتلائے عذاب دکھایا۔ جہنم کے ایک اور طبقہ میں سلطان صلاح الدین ایوبی، بوعلی سینا اور ابن رشد کو بھی حالت عذاب میں دکھایا گیا۔ یہ تمام مسلم زعماء بھی بعد از مسیح (Post Christian Era) سے تعلق رکھتے ہیں۔ ڈانٹے کے نزدیک ان کا یہ اقدام ناقابل معافی ہے کہ انھوں نے عیسائی مذہب کیوں اختیار نہ کیا۔ ڈانٹے اپنے تعصب میں اس حد تک اندھا ہو گیا کہ قبل از مسیح دور (Pre Christian Era) کے سقراط، افلاطون اور ارسطو کو بھی نہ بخشا۔ وہ ان کی بعض صفات کا قدردان ہے۔ پھر بھی ان حضرات کو جہنم کا مزا اس لیے چکھایا ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمد سے سیکڑوں سال قبل پیدا ہو کر عیسائیت کی روشنی سے محروم رہ گئے تھے۔ (۶)

ڈانٹے تو خیر ایک متعصب عیسائی تھا۔ چاسر (Chaucer) جیسے وسیع المشرب اور مارلو (Marlow) جیسے ملحد مغربی اہلِ قلم بھی اپنے آپ کو مروجہ تعصب سے آزاد نہ کر سکے۔ چاسر کی Prologue میں مسلمان حکما اور فلسفی حضرات کی عظمت کا اعتراف موجود ہے، لیکن Tale of the Man of Law میں قرآن اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں تحقیر آمیز مواد ملتا

ہے۔ مارلو کے ڈرامہ Tamberlane میں اس افسانے کا ذکر موجود ہے کہ نعوذ باللہ آپ ﷺ کا جسدِ خاکی ایک تابوت میں موجود اور مکہ کی مسجد کے اوپر معلق ہے۔ اس دور کی مروجہ ضرب الامثال اور اقوال میں بھی بلاتحقیق پیغمبر اسلام ﷺ کو نشانہ تضحیک بنایا گیا۔

چنانچہ صلیبی جنگوں اور بعد کے ان ادوار کو نخوت و فرعونیت (Age of arrogance) کہنا چاہیے۔ تحریک نشاۃ ثانیہ سے پہلے دو ایسے تاریخی واقعات ہوئے جس سے اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے بارے میں اہلِ مغرب احساسِ برتری اور احساسِ کمتری کی دو انتہاؤں پر چل کر راہِ اعتدال کھو بیٹھے۔ ایک طرف ۱۴۵۳ء میں سلطان محمد فاتح کے ہاتھوں فتح استنبول نے دنیائے عیسائیت کو حواس باختہ کر دیا اور دوسری طرف ۱۴۹۲ء میں سقوطِ غرناطہ کے بعد سپین میں اسلامی اقتدار کا سورج غروب ہوا اور اس کے ساتھ ہی اہلِ یورپ کا احساسِ برتری غیر معقولیت کی حدوں کو چھونے لگا۔ تحریک احیائے علوم کی وجہ سے یورپ میں بہت سی فکری اور تہذیبی تبدیلیاں آئیں۔ سنی سنائی باتوں کے بجائے اصل مآخذ تک رسائی کے رجحان نے جنم لیا۔ خرد افروزی اور انسان پرستی بھی اس تحریک کی دو نمایاں خصوصیات ہیں۔ قدرتی طور پر مروجہ مذہب کا عمومی اثر بہت کمزور پڑنے لگا۔ عیسائی علما کو مسلسل پسپائی کی صورت میں بقا کی ایک صورت یہ نظر آئی کہ اپنے "علم و تحقیق" کا رخ اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی طرف موڑ دیا جائے۔ سولھویں اور سترھویں صدی میں استشراقی تحریک باقاعدہ منظم ہوئی۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں واضح طور پر تحریک استشراق، نو آبادیاتی اور سامراجی ممالک کی ایک سیاسی ضرورت بن گئی۔ کیا تاجر، کیا مبلغین، کیا سیاح اور کیا "محققین" سب نے اپنے اپنے مقاصد کے لیے مشرقی ممالک کی راہ لی۔ ایڈرروڈ سعید کی تحقیق کے مطابق ۱۸۰۰ء سے ۱۹۵۰ء کے عرصہ میں مشرقی ممالک کی تاریخ، جغرافیہ، مذہب اور تہذیب و تمدن سے متعلق معلومات کی فراہمی کے لیے کم از کم ساٹھ ہزار کتب تحریر کی گئیں۔ (۷)

اٹھارھویں اور انیسویں صدی سے فرانس سے شروع ہونے والی روشن خیالی کی تحریک (Enlightenment) اور جرمنی کی تحریک اصلاحِ مذہب (Reformation) نے مذہب

اور اہلِ مذہب کو پے در پے چرکے لگائے۔ نقادانِ اسلام یا تو خود عیسائیت کے بھی کھلم کھلا منکر تھے یا کم از کم تشکیک کا رویہ رکھتے تھے۔ جہاں تک اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کا تعلق ہے، اٹھارھویں سے بیسویں صدی تک کے ادوار کو کسی ایک مخصوص اصطلاح سے موسوم کرنا مشکل ہے۔ سہولت کے لیے اس پانچویں مگر طویل ترین دور کو انتشارِ فکر کے دور (Age of confusion) کا نام دیا جاسکتا ہے۔ اس پورے عرصے میں اس باب میں دو واضح رجحانات نظر آتے ہیں۔ پہلے رجحان کو قتل حقیقت (Distortion) اور دوسرے کو (جزوی طور پر) اعترافِ حقیقت (Recognition) کے نام سے موسوم کیا جاسکتا ہے۔ ایک نیم مردہ روایت کے تسلسل کے لیے قتل حقیقت کو تو ایک مجبوری سمجھنا چاہیے۔ البتہ جزوی اعتراف نام نہاد غیر جانبداری کا بھرم قائم رکھنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ کہیں کہیں کوئی اللہ کا بندہ کسی قسم کے تحفظات کے بغیر بھی کلمۂ حق کہہ ڈالتا ہے۔ بعض اوقات ایک ہی صدی اور ایک ہی مصنف کے ارتقائی ادوار میں دونوں رجحانات کا عکس نظر آتا ہے۔ طوالت سے بچنے کے لیے صرف والٹیر اور مارکس ڈاڈ کی علمی قلابازیوں کو ملاحظہ کیجیے:

انقلابِ فرانس کے ایک فکری رہنما والٹیر (۱۶۹۴ء۔۱۷۷۸ء) نے ۱۷۴۱ء میں پیغمبر اسلام ﷺ کی تحقیر و تضحیک کے لیے (Le Fanatisme on Mohammetle Prophete) کے عنوان سے ایک ڈراما پیش کیا۔ یہ ڈراما انتہائی غیر ثقہ اور اشتعال انگیز باتوں پر مشتمل تھا۔ اُس وقت تک مذہبی پیشواؤں کے خلاف والٹیر کا جھگڑا شروع نہ ہوا تھا۔ اِس لیے اُس نے پوپ xiv کے نام اِس رسوائے زمانہ ڈرامے کا انتساب کیا۔ ڈرامے کے مقدمہ میں بھی اُس نے آنحضرت ﷺ کے خلاف ہرزہ سرائی کی اور آپ ﷺ کو (نعوذ باللہ) نبی کاذب Imposter اور اسلام کو ایک وحشی مذہب قرار دیا۔ (۸) عین اُس وقت جب فرانس کا والٹیر پیغمبر اسلام ﷺ کے خلاف بدزبانی کرتے ہوئے اسلامیانِ عالم کے دلوں کو چھلنی کر رہا تھا، اس کے پڑوس میں مشہور جرمنی شاعر Goethe (۱۷۴۹ء۔۱۸۳۲ء) رسول اللہ ﷺ کی منقبت میں اپنی

مشہور نظم Mahomets Gesang (۱۷۷۴ء) لکھ کر یورپ میں رفع ذکر مصطفیٰ ﷺ کا ذریعہ بن گیا تھا۔ واضح رہے کہ اہلِ فن کے نزدیک اس معاملے میں گوئٹے کے کلام کی ادبی قدر و قیمت والٹیر سے کہیں زیادہ ہے۔(۹) امتدادِ زمانہ کے ساتھ والٹیر کا عیسائیت کے مذہبی پیشواؤں کے خلاف تصادم شدید ترین صورت اختیار کر گیا۔ اُس نے عیسائیوں کو دنیا میں سب سے بڑھ کر تشدد پسند اور عدم برداشت رکھنے والے گروہ کا طعنہ دیا۔ چنانچہ ۱۷۶۲ء میں اپنی کتاب Philosophic Dictionary میں اُس نے بادلِ نخواستہ ہی سہی، اسلام کے حق میں چند کلمہ ہائے خیر بھی بلند کیے۔ مذہبی ٹھیکیداروں کے اندھے مقلدین کے بارے میں اس کے خیالات میں حبِ علی نہیں بغض معاویہ کی روح جھلک رہی ہے۔ اپنی ڈکشنری میں Mohammedans کے عنوان سے لکھتے ہوئے اگرچہ وہ ترک مسلمانوں کو عورتوں کے معاملے میں ظالم و مستبد اور فنونِ لطیفہ کا دشمن کہتا ہے لیکن کچھ دوسرے حقائق کو تسلیم کرنے پر مجبور ہے۔

> ''میں ایک بار پھر آپ کو بتا تا چلوں کہ یہ آپ کی جہالت ہے جس کی وجہ سے آپ محمد ﷺ کے مذہب کو شہوانی سمجھتے چلے آ رہے ہیں۔ اس میں ایک لفظ کی بھی سچائی نہیں ہے۔ اِس بات پر بھی کئی دوسری سچائیوں کی طرح آپ کو دھوکا دیا گیا ہے۔ تمھارے راہب، پادری، مذہبی رہنما کیا انسانوں پر یہ قانون لاگو کر سکتے ہیں کہ صبح ۴ بجے سے رات ۱۰ بجے تک نہ کچھ کھانا ہے نہ پینا اور روزہ رکھنا ہے۔ کیا شراب ممنوع قرار دی جا سکتی ہے؟ کیا جلتے ہوئے صحراؤں میں سفر کر کے تم حج کا حکم دے سکتے ہو؟ کیا تم غریبوں کو اپنی آمدنی کا ایک معقول حصہ زکوٰۃ کے طور پر دے سکتے ہو؟ اگر تم اٹھارہ اٹھارہ عورتوں کی محبت سے لطف اٹھا رہے ہوتے اور حکم دیا جاتا کہ صرف چار بیویاں ہی رکھی جا سکتی ہیں تو کیا تم یہ حکم مان لیتے؟ کیا تم ایسے مذہب کو شہوانی کہہ سکتے ہو؟''(۱۰)

دوسری مثال مارکوس ڈاڈز (Marcus Dods) کے ہاں ملتی ہے۔ ۱۸۹۳ء میں اس

کی کتاب Buddha and Christ,Muhammad کے نام سے منظر عام پر آئی۔ کتاب کے ۲۴۰ صفحات میں سے پورے ۱۲۸ صفحات پیغمبر اسلام ﷺ کے لیے وقف کیے گئے ہیں۔ مارکوس کھلے دل سے تسلیم کرتا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی سنجیدگی (Sincerity) کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ بقول اس کے یہ بات کہ مکہ کے متمول تاجر ہوتے ہوئے اور ایک انتہائی باوفا اہلیہ کی موجودگی میں مکہ کی پر تعیش زندگی کو چھوڑ کر آپ ﷺ نے غارِ حرا کو اپنا مسکن بنا لیا، آپ ﷺ کی غیر معمولی سنجیدگی کو ظاہر کرتی ہے۔ اس طرح یہ بات بھی اہم ہے کہ سب سے پہلے آپ ﷺ کی دعوت پر اُن لوگوں نے لبیک کہا جو آپ ﷺ کے قریب ترین عزیز یا رفیق تھے۔ مارکوس Imposter Theory کی تردید میں دو اور واقعات کا بطورِ خاص ذکر کرتا ہے۔ ایک جب مسیلمہ کذاب نے اپنا ایلچی اس پیغام کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بھیجا تھا کہ رسالت میں مجھے آپ کے ساتھ شریک کیا گیا ہے، تو آپ ﷺ نے جس واضح اور دو ٹوک انداز میں اس کی پیشکش کو رد کیا، وہ کسی نبیٔ کاذب کی زبان سے نہیں نکل سکتا۔ مسیلمہ نے لکھا تھا:

''مسیلمہ خدا کے نبی کی طرف سے محمد پیغمبر خدا کے نام۔ زمین آدھی میری ہے اور آدھی آپ کی ملکیت ہے۔''

محمد مصطفیٰ ﷺ نے جواب دیا:

''اللہ کے پیغمبر محمد کی جانب سے مسیلمہ کذاب کے نام۔ زمین اللہ کی ہے۔ وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے اور جو لوگ اس سے ڈرتے ہیں ان کے لیے خوشخبری ہے۔''

دوسرے جب رسول اللہ ﷺ کے فرزند ابراہیم کا انتقال ہوا تو آپ ﷺ کا ردِ عمل آپ کی شخصیت کے شایانِ شان تھا۔ اتفاق سے اُس روز سورج گرہن تھا۔ چند صحابہ نے کہا کہ آپ ﷺ کے فرزندِ ارجمند کی موت کا سوگ سورج بھی منا رہا ہے تو آپ ﷺ نے جواب دیا، ''سورج اور چاند میں کسی انسان کی موت سے گہن نہیں لگتا۔ وہ اللہ کی نشانیوں میں سے نشانیاں ہیں۔''

اس قدر اعترافات کے بعد کچھ اعتراض وارد کرنا بھی مارکوس کی مذہبی اور عصری کمزوری

تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے رسول اللہ ﷺ کی کثیر الازواجی پر زبان طعن دراز کی۔ توسیع اسلام میں تلوار کے کردار کو بھی مبالغہ آمیز انداز میں بیان کیا۔ اس کا طنزیہ انداز اس نوع کا ہے۔

''دوسرے پیغمبر معجزات لے کر آئے تھے اور جھٹلا دیے گئے۔ چنانچہ محمد (ﷺ) تلوار لے کر آئے۔''(۱۱)

مارکوس کا اصل مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ اسلام بہر صورت عیسائیت سے کمتر مذہب ہے اور زیادہ سے زیادہ یہ کہ عیسائیت ہی کا ایک ناقص ایڈیشن ہے۔ وہ کہتا ہے:

''اگر محمد (ﷺ) کو اپنے علم کے ساتھ لاعلمی (نقل کفر کفر نباشد) کا شعور بھی ہوتا تو دنیا میں ایک مذہب کم ہو جاتا یا عیسائیت میں ایک اور مصلح کا اضافہ ہو جاتا۔''(۱۲)

کتاب کے چوتھے خطبے میں بلی تھیلے سے باہر آ جاتی ہے اور وہ دعویٰ کرتا ہے: ''عیسائیت ہی سب سے بہترین اور سچا دین ہے۔''(۱۳)

مستشرقین کی کاوشوں کا ایک مثبت پہلو یہ ہے کہ اسلامی تاریخ کے بہت سے قدیم اور نادر مصادر تک ان کی رسائی ہوئی اور بہت سے تاریخی حقائق کو جھٹلانا ممکن نہ رہا۔ تاہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ان کے ذہن میں روایتی طور پر جو تصورات راسخ ہو چکے تھے، پیغمبر اسلام ﷺ کو بھی انھوں نے اسی کسوٹی پر جانچنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں پے در پے ٹھوکریں کھائیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے متاہل زندگی نہیں گزاری۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سماجی ضروریات اور سیاسی تقاضوں کے تحت ایک سے زائد شادیاں کیں۔ یہی بات ان کے نزدیک نعوذ باللہ نفس پرستی قرار پائی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کسی ریاست کی بنیاد نہیں رکھی۔ حضور ﷺ نے نہ صرف بھرپور سیاسی زندگی گزاری بلکہ سربراہِ ریاست کے طور پر نازک ذمہ داریاں بھی ادا کیں۔ نیز عالمی سیاسی اخلاقیات کا بھی ایک عظیم ورثہ بنی نوع انسان کو عطا فرمایا۔ متعصب مستشرقین کے نزدیک یہ بات نعوذ باللہ رسول اللہ ﷺ کی جاہ طلبی اور ہوسِ اقتدار کی دلیل ٹھہری۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے طاغوتی قوتوں کے خلاف کوئی جنگ نہیں لڑی۔ حضور ﷺ نے نہ

صرف غزوات میں بنفس نفیس شرکت فرمائی بلکہ شیطانی قوتوں کے خلاف مسلسل مزاحمت و کشمکش کی ترغیب بھی دی اور اللہ سے باغی قوتوں کو فری ہینڈ دینے سے صاف انکار کر دیا۔ یہ بات ان لوگوں کے لیے نعوذ باللہ آپ ﷺ کی جنگجویانہ پالیسی اور عسکریت پسندی کے ہم معنی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ان کے مخالفین بظاہر اپنے راستے سے ہٹانے میں کامیاب ہو گئے۔ حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے اپنے جملہ مخالفین و معاندین کو اخلاقی ہی نہیں سیاسی، عسکری اور سفارتی محاذ پر بھی شکست فاش دی۔ آپ ﷺ کی اس ہمہ جہت کامیابی کی توجیہ یوں کی گئی کہ آپ (ﷺ) تخریبی معنوں میں العیاذ باللہ بہت بڑے منصوبہ ساز Unscrupulous Schemer تھے۔ (۱۴) ظاہر ہے صلیبی عینک کے ساتھ مطالعہ کے بعد اسی قسم کے اوٹ پٹانگ نتائج فکر پیش کیے جا سکتے تھے۔

مطالعۂ سیرت کے لحاظ سے چھٹے دور کا تعلق بیسویں صدی سے ہے جسے ہم محدود معنوں میں روشنی Enlightenment کا دور کہتے ہیں۔ اس دور میں روایتی اور متعصب قسم کی تحریروں کے برعکس حضور ﷺ کی شخصیت، آپ ﷺ کے پیغام اور آپ ﷺ کے کارناموں کو سمجھنے کے لیے کچھ سنجیدہ کوششیں بھی نظر آتی ہیں۔ اس روشنی کا آغاز انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہی ہو گیا تھا۔ تھامس کارلائل قرآن حکیم کے بارے میں صریح ناانصافی کا مرتکب ہوا لیکن سیرت محمدی ﷺ کے بارے میں نئے سرے سے کسی قدر مثبت غور و خوض کا محرک بھی بن گیا۔ جان ڈیون پورٹ کی کتاب Apology for Muhammad and Quran. (1869) اس رجحان کی بہت مضبوط اور نمایندہ کتاب ہے۔ باسورتھ سمتھ کی کتاب Muhammad and Muhammadanism بھی اس دور میں تازہ ہوا کا جھونکا ہے۔ جی ڈبلیو لیٹنر نے نبوتِ محمدی ﷺ کی تصدیق کرتے ہوئے ایک ایسے تاریخی واقعہ کا حوالہ دیا جس پر غور کرنے کی کسی دوسرے مستشرق کو توفیق نہ ہوئی تھی۔ ۱۸۸۹ء میں اس نے واضح طور پر لکھا۔

''محمد (ﷺ) نے از خود کسی معصومیت کا دعوٰی نہیں کیا، بلکہ ایک موقع پر تو ایسی وحی نازل ہوئی جس میں انھیں تنبیہ کی گئی کہ انھوں نے ایک باعزت شہری سے بات کرنے میں ایک فقیر

بے نوا سے کیوں منہ موڑا۔(۱۵) یہی نہیں، انھوں نے اس وحی کو شائع بھی کیا۔ یہ وہ آخری دلیل ہے جس کی روشنی میں اس بات کی تردید ہو جاتی ہے کہ وہ نعوذ باللہ ایک نبی کاذب تھے جیسا کہ معصوم مسیحی اس عظیم عرب کو الزام دیتے ہیں۔"(۱۶)

تاہم فرانس کے مشہور مورخ، شاعر اور وزیر لامارٹن نے پیغمبر اسلام ﷺ کو جن شاندار الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا، وہ بہت کم غیر مسلم مصنفین کے حصے میں آیا۔ اس کی کتاب کے چند اقتباسات لامارٹن کے منصفانہ ویژن کی منہ بولتی تصویر ہیں۔ ۱۸۶۴ء میں شائع ہونے والی اپنی کتاب "تاریخ ترکی (Histoire deca Turquie)" میں وہ لکھتا ہے:

"دورِ حاضر کی عظیم ترین تاریخی شخصیات میں سے کون سی ایسی شخصیت ہے جسے انسانی نقطۂ نظر سے حضرت محمد ﷺ کا ہم پلہ قرار دیا جا سکے، کیونکہ مشاہیر میں سے مشہور ترین شخصیتوں نے صرف افواج کو حرکت دی، قوانین میں ردو بدل کیا اور حدودِ مملکت کی توسیع کی تحریکیں چلائیں اور انھوں نے کوئی ایسی تحریک نہیں چلائی جس کی بنیاد مادی اقتدار کے حصول کے علاوہ کسی بالاتر اخلاقی و انسانی اقدار پر ہو اور اکثر اوقات یہ تحریکیں ان کی اپنی زندگی میں ہی زوال پذیر ہو گئیں۔ ان کے برعکس آنحضرت (ﷺ) نے افواج، قوانین، ممالک، اقوام، ملکی پیداوار اور کرہ ارضی کے لاکھوں کروڑوں انسانوں کی اصلاح کی تحریک چلائی۔ علاوہ ازیں آنحضرت (ﷺ) نے اپنی تحریک سے بادشاہوں کے مصاحبین، جھوٹے خداؤں، ادیانِ باطلہ، افکار و معتقدات اور ارواح کو متاثر کیا۔ پھر ایک کتاب کی اساس پر...... جس کے ہر حرف کو قانون کا درجہ حاصل ہے...... ایسی روحانیت کی بنیاد رکھی جس کے آگے جملہ لسانی و نسلی قومیتوں کی چکا چوند ماند پڑ گئی اور باطل معبودوں کے خلاف بغض اور غیر مادی الکوتے خدا کی محبت اس اسلامی قومیت کی ایک لافانی خصوصیت قرار پائی۔"(۱۷)

اس تجزیہ کا اختتام مصنف ان ایمان افروز الفاظ کے ساتھ کرتا ہے:

"انسانی عظمت کو جانچنے اور پرکھنے کے جو معیار اور میزان بھی ہوں کیا اس دنیا میں کوئی ایسا شخص ہے جو آنحضرت (ﷺ) سے زیادہ عظیم ہے۔" (۱۸)

چھٹے دور میں قتل حقیقت Distortion اور اقرار حقیقت Recognition کے علاوہ قبولِ حقیقت Conversion کا بھی واضح رجحان نظر آتا ہے۔ اس دور میں بھی کردارِ مصطفیٰ ﷺ کو مسخ کرنے کی بظاہر کچھ نئی کوششیں بھی نظر آتی ہیں۔ یہ بات قابل فہم بھی ہے۔ اس لیے کہ معرکۂ خیر و شر ازل سے جاری ہے اور تا ابد جاری رہے گا۔ چنانچہ مارگولیتھ (Margoliath) اور اس کے ہمنواؤں نے رسول اللہ ﷺ کو محض ایک تیز طرار سیاست دان کہہ کر اپنے بغض کا اظہار کیا۔ اطالوی مستشرق کیتانی نے پورے انقلاب اسلامی کو ہی ایک معاشی تحریک قرار دیا۔ اسی طرح لامانس، طور اینڈرے اور بہل وغیرہ نے رسول اللہ ﷺ کی شخصیت اور وحی کا نفسیاتی تجزیہ کرنے کی جسارت کی۔ یہ گویا نئی بوتلوں میں پرانی شراب پیش کرنے کی ہی ایک ناکام کوشش ہے۔ اہلِ نظر جانتے ہیں کہ اس نوع کے جملہ اعتراضات عہد رسالت ﷺ میں کفارِ مکہ اور یہودِ مدینہ پہلے ہی وارد کر چکے تھے۔ آج علما اسلام اسی بنا پر اس طرح کے اعتراضات کو بجا طور پر جاہلیت جدیدہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ بہر حال اس دور میں بہت سے ایسے مغربی اہل قلم اور دانشور ملتے ہیں جو آزادانہ مطالعہ اور غیر جانبدارانہ غور و فکر کے بعد دولتِ ایمان سے مالا مال ہو گئے۔ محمد مارما ڈیوک پکھتال، علامہ محمد اسد، محترمہ مریم جمیلہ اور ابوبکر سراج الدین (مارٹن لنگز) کا شمار ایسے ہی خوش نصیب انسانوں میں ہوتا ہے۔ بعض جدید مستشرقین کے ہاں پیشکش کا انداز بھی نسبتاً بہتر نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں ایڈورڈ گبن، ولیم میور اور روبن لیوی کے برعکس گب اور منٹگمری واٹ کی تحریروں کو زیادہ دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے۔ رومانیہ کے ناول نگار اور ممتاز سفارت کار کانسٹنٹ ورجل جیورجیو (۱۹۱۶ء۔ ۱۹۹۲ء) نے فرانس میں جلاوطنی کے دوران سیرت پاک پر جو عہد ساز کتاب رومانی زبان میں لکھی، فرانسیسی زبان میں اس کا ترجمہ Vie De Mahomet اور اردو

زبان میں ''محمد ﷺ پیغمبر اسلام'' کے نام سے ہو چکا ہے۔ اس کتاب کو بجا طور پر مصنف کے ''جذبِ دروں کی روشن دلیل'' کہا گیا ہے۔(۱۹) اسی طرح مائیکل ایچ ہارٹ نے The Hundred لکھ کر مشرق و مغرب کے غیر مسلم اہلِ علم کو چونکا دیا۔ خصوصاً اہلِ مغرب کے سامنے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بجائے حضرت محمد ﷺ کو دنیا کی موثر ترین شخصیت کے طور پر پیش کرنے کا اعزاز اسی دور میں مصنف مذکور کے حصے میں آیا۔

اکیسویں صدی کا پہلا عشرہ بھی اسی دورِ روشن Enlightenment کی توسیع ہے۔ یہ صدی سوویت یونین کے انہدام کے پس منظر اور نائن الیون کے حادثہ کے ساتھ شروع ہوئی۔ خصوصاً سقوطِ ماسکو نے سرمایہ دارانہ نظام کے حامیوں کو ایک عجیب قسم کے احساسِ برتری میں مبتلا کر دیا تھا۔ کمیونزم کے بعد اگلا ہدف اسلام قرار پایا۔ چنانچہ نائن الیون سے بھی پہلے دہشت گردی کے خلاف جنگ War on terrorism کے نام پر اسلام اور مسلمانوں کی ٹارگٹ کلنگ شروع کر دی گئی۔ افغانستان اور عراق کو تاخت و تاراج بعد میں کیا گیا، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی کردار کشی کی مہم بہت پہلے سے شروع کر دی گئی۔ مسلمان ممالک میں ایسے قلمی کارندوں کو چن چن کر ہیرو بنا کر پیش کیا گیا، جنھوں نے پیغمبر اسلام ﷺ کے خلاف اپنے بغض وعناد کا اظہار کیا تھا۔ بدبخت تسلیمہ نسرین کی خوب آؤ بھگت کی گئی۔ سلمان رشدی ملعون کو Knight کا خطاب دیا گیا۔ اس وقت اُس کا شمار جنوبی ایشیا کے امیر ترین اشخاص میں ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے توہین آمیز خاکے بار بار شائع کر کے تہذیبی تصادم کے نظریہ کو فروغ دیا گیا۔ حد یہ ہے کہ جرمنی کی چانسلر انجیلا مرکل نے آزادی اظہار کے کسی مجہول تصور کی آڑ میں ایک ایسے ہی خاکہ باز کو سرکاری اعزاز سے نوازا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ مغرب کے ہاں کوئی خفیہ ہاتھ موجود ہے جو وقفہ وقفہ سے جان بوجھ کر عالمِ اسلام کے نازک ترین جذبات کو مشتعل کرنے کی گھٹیا پالیسی پر کاربند ہے اور اُسے آزادیِ اظہار کا نام دیتا ہے۔ پھر جب اِس نام نہاد آزادیِ اظہار (Freedom of Expression) کے خلاف کچھ دوسرے لوگوں کی آزادیِ عمل (Freedom of Action) کے مظاہر سامنے

آتے ہیں تو گلا پھاڑ پھاڑ کر تمام مسلمانوں کو شدت پسند، عسکریت پسند اور دہشت گرد کے فتووں سے نوازا جاتا ہے۔ طرفہ تماشا یہ ہے کہ آزادیِ اظہار کے وعظ بھی اُس براعظم سے نشر کیے جاتے ہیں جہاں کم از کم سات ممالک ایسے ہیں جن میں ہولوکاسٹ کے خلاف کوئی بات کہنے پر سخت پابندی ہے اور جہاں شاہی خاندان سے منسلک خاتون کی نیم عریاں تصویر شائع ہونے پر متعلقہ رسالے کے خلاف کارروائی کی جاتی ہے۔ حال ہی میں امریکہ میں یوٹیوب پر Innocence of Muslims کے نام سے جو دلآزار فلم سامنے آئی اسے بنیادی طور پر Desert Warrior کے نام پر بنانے کا پروگرام ظاہر کیا گیا تھا۔ پانچ ملین ڈالر سے تیار کی جانے والی اس فلم کے اداکاروں نے اپنے گہرے صدمے کا اظہار کرتے ہوئے اس فلم کو خود ایک گہری سازش قرار دیا ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ فلم کے بہت سے مقامات پر ڈبنگ کی گئی جس سے اُن کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اُن کا یہ بھی بیان ہے کہ فلم کے بیک وقت مصنف، ڈائریکٹر اور پروڈیوسر نیکولا بسلے نیکولا نے کسی موقع پر یہ شبہ تک نہ ہونے دیا کہ اِس فلم کا تعلق پیغمبر اسلام ﷺ کی شخصیت سے ہوسکتا ہے۔ اس سے پہلے ایک ننگ انسانیت پادری ٹیری جونز کی طرف سے قرآن حکیم کو دہشت گردی کا منبع قرار دے کر کھلے عام نذرِ آتش کرنے کی واردات ہو چکی ہے اور انٹرنیٹ پر ایک جعلی قرآن (The True Quran) کے نام سے بھی دستیاب ہے۔ اس صلیبی قرآن میں تحریف کا انداز کچھ یوں ہے:

> ''تم نے کیسے گمان کرلیا کہ ہم نے تمھیں کہا تھا کہ اللہ کے رستے میں لڑو اور مومنین کو قتال پر ابھارو۔ ہم نے مومنین کو قتال پر ابھارنے کا حکم نہیں دیا، بلکہ یہ حکم شیطان مردود نے مجرم قوموں کو دیا ہے۔'' (العیاذ باللہ) (۲۰)

اس انتہائی افسوس ناک بلکہ تشویش ناک صورت حال کا ایک ہی سبب ہے اور وہ یہ کہ استعمار اور استشراق دو جڑواں بہنیں ہیں اور اسی بنا پر آج کی استعماری قوتیں استشراق کے عہد طفولیت (ردعمل Reaction، جہالت Ignorance اور رعونت Arrogance) سے باہر نکلنے کے لیے فی الحال تیار نہیں ہیں۔ یہ تقریباً وہی ذہنی ساخت Mindset ہے جس کا منظر دنیا نے

بیسویں صدی کے اوائل میں ہی دیکھ لیا تھا۔ یہ جولائی ۱۹۲۰ء کی بات ہے۔ فرانسیسی جنرل گیوراڈ (۱۸۶۸ء۔۱۹۴۶ء)Gouraud دمشق میں داخل ہونے کے بعد سب سے پہلے اس مشہور مزار پر گیا جو مسجد امیہ کے سامنے ہے۔ اس نے مزار کے دروازے کو کھٹکھٹایا، قبر کو ٹھوکر ماری اور صاحب مزار سے کہا، "صلاح الدین اٹھو! ہم واپس آگئے ہیں۔"(۲۱)

اس ذہنی ساخت کے مظاہر تنگ نظر یورپی اہل قلم اور متعصب صحافیوں کی تحریروں میں اب بھی نظر آتے ہیں۔ ان کے وجود میں (اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے خلاف) دھماکا خیز مواد ایک مدت سے پک رہا ہے۔ اس کے فیتے کو بس آگ دکھانے کی ضرورت ہے۔ اطالوی صحافی اور مصنفہ اوریانا فلاسی نے اپنی ذہنی اور نفسیاتی کیفیت کو بیان کرنے کے لیے بڑے فخر کے ساتھ اپنے بارے میں یہ تشبیہ خود استعمال کی ہے۔ سلمان رشدی کی ہفوات کو یورپ میں جمہوریت اور آزادی رائے کے نام پر خوب پذیرائی بخشی گئی۔ لیکن جب امام خمینی کا فتویٰ سامنے آیا تو مذکورہ دھماکا خیز مواد پھٹ پڑا تھا۔ اسی طرح نائن الیون کے سانحے کے پیچھے جو تاریخی ناانصافیاں موجود ہیں وہ تو پس منظر میں چلی گئیں۔ البتہ اس کی آڑ میں جو دھماکا خیز مواد پھٹ پڑا، اس کی جھلکیاں ۲۰۰۲ء میں شائع ہونے والی اوریانا فلاسی کی کتاب (The Rage and the Pride)(۲۰۰۲ء) میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

اُس کا کہنا ہے:

"یورپ بہت تیزی سے اسلام کی نوآبادی میں تبدیل ہوتا جارہا ہے۔ (اس کے لیے اُس نے Eurobia کی اصطلاح استعمال کی ہے)۔ اسلامی دُنیا سے نکل کر یورپ میں بسنے والے مغرب کی مادی ترقی کو تو قبول کر لیتے ہیں مگر یہاں ثقافتی اور تہذیبی طور پر ضم ہونے کے لیے تیار نہیں ہیں...... مسلم گھرانوں میں زیادہ بچے پیدا کرنے کا رُجحان اب تک مستحکم ہے جبکہ مغربی معاشرہ کم بچوں کے اصول پر کاربند ہے...... مسلم دُنیا کے سامنے رومن کیتھولک چرچ غیر معمولی پسپائی دکھا رہا ہے۔"

اِن "ہولناک" حقائق کو بیان کرنے کے بعد وہ گویا خطرے کی گھنٹی یوں بجاتی ہے:

"اسلامی شدت پسند عناصر مغرب کی بخشی ہوئی شخصی آزادی کی نعمت کو برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اہل یورپ نے اسلامی بنیاد پرستی کے بڑھتے ہوئے خطرے سے بے نیازی اور بے حسی پر مبنی رؤیہ اپنا رکھا ہے۔ اگر اسلامی عناصر کو فروغ پانے سے نہ روکا گیا تو آمریت، شدت پسندی اور بنیاد پرستی کا زہر مغربی تہذیب کی رگوں میں بھی سرایت کر جائے گا۔" (۲۲)

پوپ اربن ثانی نے مشرق میں مقاماتِ مقدسہ کو لاحق فرضی خطرے کی دہائی دے کر یورپ کی صلیبی طاقتوں کو عالم اسلام پر چڑھائی کے لیے اُکسایا تھا اور اوریا فلاسی اور اِس کے ہم نوا یہی کھیل جمہوریت کے تحفظ کے نام پر افغانستان اور عراق میں کھیل چکے ہیں۔ واضح طور پر ان افکار میں صلیبی جنگوں کی بدروح بول رہی ہے۔ کوئی لاکھ کہے کہ اس نوع کے مغربی اہل قلم بہت آزاد خیال ہیں اور عیسائی مذہب کیا، خود نفس مذہب سے ہی بیزار ہیں، پیغمبر اسلام ﷺ کے خلاف اُن کا بغض ماضی کی صلیبی جنگوں اور اُن کے ساتھ وابستہ تلخ یادوں کا لاشعوری اظہار ہے۔ (۲۳) کیرن آرمسٹرانگ نے واضح طور پر لکھا ہے کہ اسلاموفوبیا (Islamphobia) (۲۴) کی طویل تاریخ کے ڈانڈے صلیبی جنگوں سے ملتے ہیں۔ ۲۰۰۲ء میں شائع ہونے والی اپنی کتاب "محمد (ﷺ)۔ ہمارے دور کے پیغمبر" (Muhammad-Prophet for our Time) میں اُس نے نام لیے بغیر ایسے تمام مغربی مصنفین کو برخود غلط کہا ہے جو اہل مغرب کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکاتے ہیں۔ کس اعتماد سے وہ کہتی ہے:

It seems wrong to defend a liberal principle by reviving a medieval prejudice .(۲۵)

"کسی جمہوری اصول کے دفاع کے لیے قرونِ وسطیٰ کے تعصب کو اُبھارنا غلط ہے۔"

اپنا حاصل مطالعہ پیش کرتے ہوئے وہ کہتی ہے:

"قرآن جارحیت کی مذمت کرتا ہے..... محمد (ﷺ) کی زندگی ایک جہاد تھی۔ اس لفظ کا مطلب مقدس جنگ نہیں بلکہ کوشش ہے۔ محمد (ﷺ) نے جنگوں سے تباہ ملک میں امن قائم کرنے کے لیے فی الواقع اپنا خون پسینہ ایک کر دیا اور ہمیں آج بھی ایسے ہی لوگوں کی ضرورت ہے جو یہ کچھ کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

اُسے یہ بھی یقین ہے کہ:

"محمد (ﷺ) کی تعلیمات میں "جاہلیت" کی جو اصطلاح استعمال کی گئی ہے، اُس سے مراد کوئی خاص تاریخی دور نہیں بلکہ یہ ایک ذہنی رویہ ہے جو تشدد اور دہشت گردی کو جنم دیتا ہے اور میرے نزدیک یہ جاہلیت جس طرح ساتویں صدی عیسوی میں (قبل از بعثت) موجود تھی، اُسی طرح آج مسلم دُنیا بلکہ خود مغرب میں بھی موجود ہے۔"

اپنے افکار و مشاہدات کا نچوڑ پیش کرتے ہوئے وہ کہتی ہے:

As a paradigmatic personality, Muhammad has important lessons not only for the Muslims but also for Western peoples. His life was a tireless compaign against greed, injustice and arrogance.(۲۶)

"محمد (ﷺ) کی معیاری شخصیت سے نہ صرف مسلمان بلکہ مغربی عوام بھی بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ آپ ﷺ کی زندگی لالچ، ناانصافی اور کبر و غرور کے خلاف ایک انتھک جدوجہد کا نام تھی۔"

کیرن آرم سٹرانگ کے ان خیالات سے کسی یہ غلط فہمی لاحق نہ ہونی چاہیے کہ وہ پیغمبر اسلام ﷺ کے بارے میں مکمل طور پر مثبت سوچ رکھنے والی مصنفہ ہے۔ المیہ یہ ہے کہ اپنی اس

کتاب میں وہ بھی بعض بنیادی امور کے بارے میں منٹگمری واٹ کے نقشِ قدم پر چل نکلی ہے۔
ڈاکٹر واٹ نے اپنی پہلی کتاب Muhammad at Mecca میں افسانہ غرانیق کو اس کی کمزور ترین بنیادوں کے پیشِ نظر مسترد کر دیا تھا اور آخری کتاب Muhammad-The Prophet and Stateman میں اسی افسانے کو قبول کر کے آپ ﷺ کی پیغمبرانہ حیثیت کو مشکوک بنانے کی کوشش کی۔ غالباً تحریک استشراق کا یہ ایک جدید ترین تقاضا تھا۔ کیرن آرم سٹرانگ نے بھی اپنی پہلی کتاب میں افسانہ غرانیق کو یہ کہہ کر رد کر دیا تھا کہ یہ کہانی دوسری روایات اور خود قرآن مجید سے متصادم ہے۔ (۲۷) تاہم آٹھ سال بعد شائع ہونے والی زیرِ نظر کتاب میں اُس نے اِس افسانے کو ایک امرِ واقعہ کے طور پر قبول کر لیا۔

کیرن آرم سٹرانگ کے خیالات سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ عہد حاضر کے عالم طفولیت میں محصور مغربی اہلِ قلم کی مجبوریوں اور سازشوں کے باوجود حضور ﷺ کے اعترافِ عظمت کی لہر بھی ایک توانا آواز ہے۔

اب سوال یہ ہے استشراق کی یورش اور سامراج کی یلغار کے ہوتے ہوئے قبولِ حقیقت کے رجحان کا Conversion مستقبل کیا ہے؟ منٹگمری ڈبلیو واٹ نے مسلمان اہل علم و دانش کو مخاطب کرتے ہوئے اس باب میں ایک مشروط امکان کی جانب اشارہ کیا تھا:

> ”مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ حضرت محمد (ﷺ) کا کردار پوری دنیا کے لیے مثالی اور قابل تقلید ہے۔ یہ دیکھنا ابھی باقی ہے کہ حضرت محمد (ﷺ) کی زندگی اور تعلیمات میں کیا ایسے اصول موجود ہیں جو انسانیت کی اخلاقی ترقی کا باعث بن سکیں؟ اس سوال کا جواب نہیں دیا گیا۔ اب یہ مسلمانوں کا فرض ہے کہ اپنا کیس مضبوط دلائل کے ساتھ پیش کریں۔ کیا وہ محمد (ﷺ) کی زندگی کے مقامی کردار میں سے بین الاقوامی عناصر کو چھانٹ کر دکھا سکیں گے؟ یا اگر یہ زیادہ مشکل ہے تو کیا وہ ثابت کر سکتے ہیں کہ ممکن حد تک ہی سہی، آپ (ﷺ) کی زندگی پوری

انسانیت کے لیے مشعل راہ ہے؟ اس راہ میں بہت سی مشکلات موجود ہیں۔ اس کے لیے اعلیٰ (علمی) ذوق اور گہری اخلاقی بصیرت درکار ہے اور یہ دونوں چیزیں فی الحال نایاب ہیں۔"(۲۸)

یہ بات تسلیم کی جانی چاہیے کہ اسلام اور سیرتِ طیبہ کی تفہیمِ جدید کے لیے علمی وفکری سطح پر ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ ایک اُلجھن کو صاف کرنا البتہ اہلِ مغرب کے ذمہ ہے۔ کیا واقعی اسلام اور حیات طیبہ کو مروجہ مغربی سانچے میں ڈھالے بغیر اسلامی پیش قدمی ناممکن ہے؟ کیا مقامی کرداراور بین الاقوامی عناصر کے بارے میں مروجہ مغربی معیارات قطعی اور حتمی کہے جا سکتے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ مابعد جدیدیت Post Modernism نے روایتی مذہب کے ساتھ خود جدیدیت Modernism اور اس سے وابستہ بین الاقوامی تصورات پر بھی بہت بڑا سوالیہ نشان لگا دیا ہے۔ جدیدیت Modernism اگر بہت سی مسلمہ مذہبی اقدار کو ڈھا دینے کی مدعی ہے تو مابعد جدیدیت نے اس کے ساتھ آزادی، مساوات، انصاف اور جمہوریت وغیرہ سے متعلق بہت سے سیکولر تصورات کو بھی محض بلند و بانگ اعلانات (Meganarratives) کا نام دے دیا ہے۔(۲۹) مابعد جدیدیت کے حامی کسی عالمی یا آفاقی سچائی کے وجود ہی سے انکار کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ دنیا محض ایک وڈیو گیم ہے جس میں ہم اپنی پسند کی سچائیاں دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں۔ فکری اور تہذیبی سطح پر یہ تقریباً ویسا ہی عبوری قسم کا بحران ہے جو اٹھارویں صدی میں برکلے اور ڈیوڈ ہیوم کی فکری آویزش سے پیدا ہوا تھا۔ برکلے نے ثابت کیا تھا کہ مادہ کوئی وجود نہیں رکھتا۔ ہیوم نے جواب میں ذہن کو بھی ایک واہمہ ثابت کر دیا تھا۔ ایک ذہین وفطین شخص نے بندگلی میں موجود متحارب فریقوں کو یہ کہہ کر ٹھنڈا کیا تھا Never mind, No matter۔(۳۰)

آج بھی اہلِ مغرب کے لیے بہترین راہ یہی ہے کہ وہ اپنے آپ کو بھی علمی وفکری احتساب کے لیے پیش کریں اور تہذیبی نرگسیت کے دائرے سے باہر نکلیں۔ المیہ یہ ہے کہ حد سے زیادہ مادہ پرستی، آزاد جنسی اختلاط اور منشیات کے بے محابا استعمال نے مغربی اور یورپی معاشرے کی

بنیادیں ہلا کر رکھ دی ہیں۔معروف تجزیہ نگار اور سابق برطانوی وزیر اعظم ٹونی بلیئر کی خواہر نسبتی لورین بوتھ نے مغربی طرزِ زندگی سے اپنی بیزاری کی یہی وجوہات بتائی ہیں۔(۳۱) ظلم یہ ہے کہ اُس کے قبول اسلام Conversion کے واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے مغربی پریس نے انکشاف کیا کہ یہ شروع سے ہی شدت پسند تھی۔اسی لیے تو مشرق وسطیٰ کے دورے کرتی اور فلسطینی مسلمانوں کی کہانیاں لکھتی تھیں۔مشہور برطانوی صحافی یوآنے ریڈلے کئی ماہ تک افغانستان کے طالبان کی قید میں رہی۔آزادی کے بعد اس نے قرآنِ حکیم کا مطالعہ کیا اور دولت ایمان سے سرفراز ہوئی۔مغربی پریس میں کہا گیا کہ یہ سب کچھ Stockholm Syndrome کا کیا دھرا ہے جس میں قیدی اپنے داروغۂ جیل سے محبت کرنے لگتا ہے۔(۳۲)

عقلِ عیار اپنی مغالطہ آفرینیوں میں کھوئی ہوئی ہے اور قانونِ قدرت اپنا کام کر رہا ہے۔انسانیت کے عالمی ضمیر نے عالم اسلام کے خلاف "تہذیبوں کے تصادم" Clash of Civilizations کے نظریہ کو قبول کیا ہے نہ "مسلم تہذیب کے اندر تصادم" Clash within civilization کے نظریہ کا تادیر چلنا ممکن ہے۔دنیا بتدریج اتفاق بین المذاہب Interfaith Harmony اور مکالمہ بین التہذیب Dialogue between civilizations کی جانب بڑھ رہی ہے۔یہ ٹھیک وہی دعوت ہے جو خاتم الانبیا ﷺ نے سب سے پہلے اہلِ کتاب کو قرآن کی زبان میں پیش کی تھی۔(آل عمران:۶۴)۔قدرت کی طرف سے یہ بھی گویا ذکرِ مصطفیٰ ﷺ کے ترفع کی ایک صورت ہے۔اس دوران اسلام بتدریج یورپ کا دوسرا بڑا مذہب بنتا جا رہا ہے۔سوان سی یونیورسٹی کے کیون برائس کے تجزیہ کے مطابق دہشت گردی، بنیاد پرستی اور انتہا پسندی کے تمام تر الزامات کے باوجود برطانیہ عظمیٰ کے پانچ ہزار سے زائد لوگ سالانہ اسلام قبول کر رہے ہیں۔ان میں ساٹھ فیصد خواتین ہیں۔(بعض سماجی مفکرین کے نزدیک خواتین کو کسی بھی معاشرے کی تباہی و بربادی کا سب سے پہلے علم ہو جاتا ہے)۔۲۰۱۱ء نیویارک سے شروع ہونے والی تحریک Occupy the Wall Street کے مظاہرین نے یورپ کے بے شمار شہروں میں سرمایہ

دارانہ نظام (Capitalism) کے خلاف اپنا پُر امن اور موثر احتجاج ریکارڈ کرادیا ہے۔ایک ایسے ہی مظاہرے میں ایک خاتون کے ہاتھ میں موجود بینر عالمی ذرائع ابلاغ کی توجہ کا مرکز بن گیا۔اس بینر پر یہ نعرہ بلکہ مطالبہ درج تھا Why not banks the Islamic way یعنی بنکوں کو آخر اسلامی اصولوں پر کیوں نہیں چلایا جاسکتا۔ بالفاظِ دیگر سوشلسٹ معیشت کی ناکامی کے بعد سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت بھی ناکام ہو چکا ہے اور بلاسود بینک کاری پر مبنی اسلامی نظامِ معیشت خاموشی کے ساتھ مگر بتدریج پیش قدمی کر رہا ہے۔اس کی وجہ اس کے سوا کیا ہے کہ رب کائنات نے فخرِ کائنات ﷺ کے رفع ذکر کا خود ہی ذمہ لے رکھا ہے۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝ (النساء:۷۹)

”ہم نے آپ ﷺ کو لوگوں پر رسول بنا کر بھیجا ہے اور اس پر اللہ کی گواہی کافی ہے۔“

مراجع وحواشی

۱۔ آر۔ڈبلیو۔ساوڈرن ...... Western Views of Islam in the Middle Ages،۱۹۶۲ء

۲۔ ہاسٹن پیٹرسن ...... A Treasury of the World's Great Speeches
Simon and Schuster New York. (1954)

۳۔ ایڈورڈ گبن ...... Decline and Fall of Roman Empire

۴۔ ظفر اسحق انصاری/ جان ایل ایسپوزیٹو ...... Muslims and the West
Encounter and Dialogue
Islamic Research Institute Islamabad. (2001)

۵۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ ...... مقالہ صلیبی جنگیں از ڈاکٹر ظہور احمد اظہر

۶۔ ایڈورڈ سعید ...... Orientalism. (1979) ...... Vintage Books New York

۷۔ ایضاً

۸۔ والٹیر ...... Le Fanatisma on Mohammetic Prophete

۹۔ جوزف شاخت/ سی۔ای باسورتھ ...... The Legacy of Islam
The Westeen Image and Western Studies of Islam:Article)
(By Mazime Rodinson

۱۰۔ والٹیر ...... Philosophic Dictionary
Translated from French by Woolf Knopt. (1924)

والٹیر کے اصل الفاظ ہیں:

I tell you again, ignorant, imbeciles whom other ignoramuses have made believe that the Mohammedan religion is voluptuous and sensual, there is not a word of truth in it, you have been deceived on this point as on so many others.

Canons, monks, vicars even, if a law were imposed on you not to eat or drink from four in the morning till ten at night during the month of July, when lent came at this period, if you were

forbidden to play at any game of chance under pain of damnation, if wine were forbidden you under the same pain; if you had to make a pilgrimage into the burning desert; if it were enjoined on you to give at least half a percent of your income to the poor; if, accustomed to enjoy possession of eighteen women, the number were cut down suddenly by four; honestly, would you call that religion sensual?

۱۱۔ مارکوس ڈاڈز...... Buddha Christ and Muahmmad
Hodder and Stoughton. (1877)

۱۲۔ ایضاً

۱۳۔ ایضاً

۱۴۔ ظفر الحق انصاری/ جان ایل ایسپو زیٹو...... Muslims and the West
Encounter and Dialogue

۱۵۔ جی۔ ڈبلیو لیٹینر...... Muhammadanism بحوالہ نقوش رسول نمبر جلد یازدہم
مضمون مستشرقین اور مطالعہ سیرت از ڈاکٹر نثار احمد

۱۶۔ یہ دراصل ایک نابینا صحابی...... عبداللہ ابن ام مکتومؓ...... تھے۔ ایک بار رسول اللہ ﷺ کے پاس سردارانِ قریش...... شیبہ، عتبہ، ابوجہل، امیہ بن خلف، ولید بن مغیرہ...... وغیرہ حاضر تھے۔ آپ ﷺ پوری دل سوزی کے ساتھ تبلیغ حق میں مصروف تھے۔ اس دوران ابن مکتوم بھی حاضر ہوئے۔ نابینا ہونے کی بنا پر وہ موجود صورتِ حال کو بھانپ نہ سکے اور فی الفور ہدایت کے طالب ہوئے۔ اس مداخلت بے جا کے بعد چہرۂ انور پر ناگواری کے اثرات ظاہر ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ بات غریبوں اور بیکسوں کے ملجاء وماوی نبی e کے شایانِ شان نہ تھی۔ اس پر قرآن حکیم (سورۂ عبس: ۱۔ ۱۶) میں گرفت فرمائی گئی۔

۱۷۔ الفونس لامارٹن...... تاریخ ترکی بحوالہ نقوش رسول نمبر ۱۱

۱۸۔ ایضاً

۱۹۔ کانسٹنٹ ورجل جیورجیو...... محمد ﷺ پیغمبر اسلام (Vie De Mahomet)...... ترجمہ مشتاق حسین نیر
ادارہ ترقی فکر لاہور

۲۰۔ ماہنامہ افکار معلم، شمارہ اگست ۲۰۰۵ء مضمون 'صلیبی قرآن۔ فرقان الحق' از پروفیسر رانا اصغر علی

۲۱۔ (۱) طارق علی...... The Clash of Fundamentalists
Jehad and Modernity, Crusade. (2002)

Verso. (2003)

(۲) عرفان حسین ..... Waiting for Saladin

Daily Dawn (April 4, 2003)

جنرل گیوارڈ کے اصل الفاظ یہ ہیں:

"The crusades are ended now. Awake Saladin. We have returned. My presence here consecrates the victory of the Cross over the Crescent".

۲۲۔ اوریانا فلاسی ..... The Rage and the Pride. (2002) ..... Rizzoli New York

۲۳۔ ماہرین نفسیات کے نزدیک انسان کے اندر ایک Atavistic Instinct پائی جاتی ہے جس کے مطابق بچپن کی تلخ یادیں شعوری یا غیر شعوری طور پر زندگی میں انسان کے ساتھ بہت دور تک چلتی ہیں۔

۲۴۔ محمد ابراہیم خان ..... متنازع کتابیں ..... سٹی بک پوائنٹ اردو بازار کراچی

مصنف مذکور نے برطانیہ کے Runnymede Trust. (1997) کے حوالے سے لکھا ہے "اسلاموفوبیا سے مراد یہ رائے ہے کہ اسلام کی اقدار دنیا کی کسی بھی تہذیب کی اقدار سے نہیں ملتیں۔ اسلام مغربی تمدن سے کمتر درجے کا ہے۔ یہ مذہب نہیں بلکہ ایک پر تشدد سیاسی نظریہ ہے۔ مغرب پر اس کی تنقید میں کچھ دم نہیں اور یہ کہ مسلمانوں سے امتیازی سلوک کسی طور غلط نہیں۔"

۲۵۔ کیرن آرمسٹرانگ ..... Prophet for our Time-Muhammad

Harper. (2006)

۲۶۔ ایضاً

۲۷۔ کیرن آرمسٹرانگ ..... A Biography of the Prophet:Muhammad

Phoenix Press Loundon. (2001)

۲۸۔ منٹگمری ڈبلیو واٹ ..... Muhammad-Prophet and Statesman

۲۹۔ ماہنامہ ترجمان القرآن جولائی ۲۰۰۸ء ..... مضمون "مابعد جدیدیت کا چیلنج اور اسلام" از سعادت اللہ حسینی۔

۳۰۔ ول ڈیوران ..... The story of philosophy

۳۱۔ ماہنامہ ترجمان القرآن ..... لورین بوتھ ..... قبول اسلام کا سفر، انٹرویو فروری ۲۰۱۱ء

۳۲۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ آخر یہ کیسا سنڈروم ہے جو گوانتانامو بے میں ملا عبدالسلام ضعیف اور امریکہ کے عقوبت خانوں میں ڈاکٹر عافیہ صدیقی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ خاص طور پر یہ سوال اُن لوگوں سے ہے جو تہذیبوں کے تصادم اور اس میں مغربی تہذیب کی اساسی برتری پر ایمان بالغیب رکھتے ہیں۔

---❀❀❀---

ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ

(Heroes and Hero Worship)

کارلائل کے خیالات کا تجزیہ

صلیبی جنگ بازوں نے پیغمبر اسلام ﷺ اور قرآنِ حکیم کے بارے میں بہت طاقتور جنگی پروپیگنڈا شروع کر رکھا تھا۔ حضور ﷺ کے اُجلے اور صاف ستھرے کردار پر طرح طرح کے الزامات کی بوچھاڑ ان کا معمول بن چکا تھا۔ مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ مبینہ خامیوں اور نقائص کے ساتھ کسی فرد کو ایک ایسا پیغمبر کیوں کر تسلیم کیا جا سکتا ہے جو پوری بنی نوع انسان کے لیے ہمیشہ کے لیے نمونۂ عمل سمجھا جائے۔ حضور ﷺ پر نزولِ وحی کے وقت جو ایک خاص کیفیت طاری ہوتی تھی، اس کو بنیاد بنا کر بہت سی بے بنیاد اور خود ساختہ کہانیاں بنائی گئیں۔ ایک ایسی کہانی کے مطابق حضور ﷺ نے معاذ اللہ ایک کبوتر پال رکھا تھا جو آپ ﷺ کے کانوں میں رکھے ہوئے (Peas) کے دانے چُگا کرتا جسے آپ ﷺ کسی فرشتے کی وحی گردانتے (نعوذ باللہ)۔ اس قسم کے مضحکہ خیز الزامات کو پڑھ کر خود کارلائل بھی بہت شرمندہ ہوا۔ اس نے صاف صاف کہا کہ کذب وافترا کے یہ نمونے نہ صرف غیر معقول (Untenable) تھے بلکہ خود مغربی اہلِ علم کے لیے شرمناک (Disgraceful) بھی۔(۱)

کارلائل نے اپنی کتاب Heroic in History& Hero worship, Hero میں شیکسپیئر، ڈانٹے، کرامویل وغیرہ کو اپنے اپنے شعبوں میں ہیرو کا درجہ دیا۔ مغربی دنیا یہ دیکھ کر ایک شدید صدمے سے دوچار ہو گئی کہ نبوت کے سلسلۃ الذھب کا ہیرو اس کے نزدیک پیغمبر اسلام ﷺ ہیں۔ اپنی کتاب کے باب The Prophet as a Hero میں اس نے اس

انتخاب کا جواز اپنے محتاط الفاظ میں پیش کرتے ہوئے کہا:

''ہم نے محمد (ﷺ) کا انتخاب ممتاز ترین پیغمبر کے طور پر نہیں کیا۔اس لیے کیا ہے کہ آپ ہی وہ (شخصیت) ہیں جن کے بارے میں ہم (تاریخی طور پر) بہت کھل کر گفتگو کر سکتے ہیں۔''(۲)

اس کے کلمات میں بلاشبہ ایک مشہور مستشرق ارنسٹ ریناں (Earnest Renan) کے قول کی گونج سنائی دیتی ہے جس کے مطابق پیغمبر اسلام ﷺ وہ واحد پیغمبر ہیں جو تاریخ کی مکمل روشنی میں پیدا ہوئے۔قدرت کی ستم ظریفی یہ ہے کہ فاضل مصنف خود اس کے اہل نہیں کہ اپنی علاقائی حدود اور ثقافتی قیود سے بالاتر ہو کر اس موضوع پر کھل کر کچھ کہہ سکیں۔

اسی طرح حضور ﷺ پر لگائے گئے گھسے پٹے الزامات کی تردید سے پہلے وہ یہ وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہے:

''ہمارے مسلمان بننے کا اب کوئی خطرہ باقی نہیں رہا۔''(۳)

کارلائل کو اس بات کا ہرگز اندازہ نہ تھا کہ مستقبل کے مغرب میں اسلام سب سے زیادہ تیزی سے پھیلنے والا مذہب بن جائے گا اور یہ سب کچھ اس المناک حقیقت کے باوجود ہوگا کہ حضور ﷺ کے خلاف مذموم اور منفی پروپیگنڈا ابھی زوروں پر ہوگا۔آج اکیسویں صدی کے ابتدائی عشرے میں بھی یورپ کے پینتیس میں سے سترہ ممالک میں اسلام عیسائیت کے بعد دوسرا بڑا مذہب ہے۔اسے تعصب کہیے یا خود فریبی کہ توسیع اسلام کا واحد سبب وہاں مسلمانوں کے ہاں شرح پیدائش میں زیادتی کو قرار دیا جا رہا ہے۔

کتاب کے پہلے حصے میں مصنف نے حضور ﷺ کے ابتدائی نقادوں کے خیالات کا ذکر کرتے ہوئے یکے بعد دیگرے ان کا پرزور ابطال کرنے کی کوشش کی ہے۔حضور ﷺ کے یہودی و عیسائی معاندین نے آپ ﷺ کو نعوذ باللہ ایک جعل ساز (Imposter) کہہ کر آپ ﷺ کی عظمت کو گہنانے کی کوشش کی تھی۔کارلائل کا فوری ردِعمل یہ ہے:

''اگر دنیا میں جعل سازی اس قدر تیزی سے پھیل سکتی ہے اور اسے قبولِ عام بھی حاصل ہو

سکتا ہے تو پھر اس دنیا کا خدا ہی حافظ ہے...... اس نوع کا بے خدا نظریہ دنیا میں آج تک پیش نہیں کیا گیا۔"(۴)

مصنف اپنی طرف سے ایک تیکھا سوال اُٹھا کر خود اس کا جواب بھی دیتا ہے:

"جھوٹا شخص اور کسی مذہب کی بنیاد رکھے! عجیب بات ہے۔ کوئی جھوٹا شخص ایک اینٹوں والا مکان تو بنا نہیں سکتا۔ اگر ایسا معمار مسالے کی خصوصیات، پکی اینٹیں اور اس کے علاوہ جو کچھ کام بھی وہ کرتا ہے اس کے بارے میں بنیادی معلومات سے ہی بے بہرہ ہے تو وہ مکان نہیں محض جھاڑ جھنکار کا ایک ڈھیر ہی تعمیر کر سکتا ہے اور یہ ڈھیر بارہ صدیوں تک لاکھوں، کروڑوں انسانوں کو سکونت فراہم نہیں کر سکتا۔ ایسا مکان فی الفور منہدم ہو جائے گا۔ کسی بھی انسان کے لیے لازم ہے کہ وہ فطری قوانین سے ہم آہنگ ہو۔ فطرت کے ساتھ اس کا رابطہ استوار ہو۔ بصورتِ دیگر فطرت کا اس کے لیے ایک ہی جواب ہے۔ "نہیں، ہرگز نہیں۔"(۵)

الغرض پیغمبر اسلام ﷺ ہر لحاظ سے اپنے نصب العین کے بارے میں سنجیدہ تھے۔ کارلائل اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے:

"ایسا عظیم انسان سنجیدہ (Sincere) ہوئے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔ ایسے ہی انسان کو ہم طبع زاد (Original) انسان کہتے ہیں۔ وہ ہمارے پاس براہ راست آتا ہے۔ وہ ایک ایسا پیامبر ہے جو لامحدود انجانی ذات سے ہمارے لیے اہم خبریں لاتا ہے...... کیا اس کی باتیں از قسم وحی نہیں؟ کسی دوسرے موزوں لفظ کی عدم دستیابی کی بنا پر ہم اسے اور کس چیز کا نام دیں...... خدائے بزرگ و برتر کی طرف سے اشارۂ غیبی (Inspiration) اسے فہم عطا کرتا ہے۔ سب سے پہلے ہمیں اس کے پیغام کو سننا ہوگا۔"(۶)

کارلائل ان بے سر و پا اخلاقی الزامات سے تعرض نہیں کرتا جو دشمنانِ اسلام حضور علیہ الصلوۃ

السلام کی ذات اقدس پر لگاتے آئے ہیں۔ظاہر ہے ایسے تمام الزامات کردارکشی کی مہم کا ایک عمومی حصہ ہیں اور کسی سنجیدہ بحث وتمحیص کا موضوع نہیں بن سکتے۔کارلائل بائبل کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی عظیم شخصیت کے ساتھ اخلاقی عیوب ہی نہیں، سنگین جرائم تک منسوب کیے گئے ہیں۔عیسائیت کا کوئی بھی منکر ناک بھوں چڑھا کر اعتراض کر سکتا ہے۔" کیا یہی ہے تمھارے نزدیک اس شخصیت کا کردار جسے خدا نے اپنی شبیہ پر پیدا کیا۔"(۷) اس بحث کے بعد وہ اپنا نتیجہ فکر بایں الفاظ پیش کرتا ہے:

"ہم پیغمبر اسلام ﷺ کی مبینہ اخلاقی خامیوں کو بھی بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں۔اگر ہم اس قسم کی باتوں میں اُلجھ کر رہ گئے تو آپ ﷺ کی شخصیت کے راز کو نہ پاسکیں گے۔"(۸)

مستشرقین مختلف ادوار میں مختلف انداز سے اس بات پر بھی زورِ بیان اور زورِ قلم صرف کرتے رہے ہیں کہ پیغمبر اسلام ﷺ العیاذ باللہ ایک جاہ پسند (Ambitious) انسان تھے۔ کارلائل حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے مختلف مراحل کی جھلکیاں پیش کر کے اس الزام کو یکسر مسترد کر دیتا ہے۔وہ آپ ﷺ کے لیے مشرکین مکہ کی طرح صادق (Honest)، انصاف پسند (Just) اور سنجیدہ (Sober) جیسے الفاظ استعمال کرتا ہے۔حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے رشتہ ازواج میں منسلک ہونے کے بعد بھی آپ ﷺ بقول کارلائل انکسار پسند (Humble)، باحیا (Modest) اور ملنسار (Cordial) تھے۔ یہ بات کہ ان صفات سے متصف انسان راتوں رات ایک جاہ پسند انسان کے روپ میں سامنے آ گیا، انسانی نفسیات کے بنیادی حقائق سے متصادم ہے۔نظریہ جاہ پسندی کی اس بنیادی کمزوری کو سامنے رکھتے ہوئے پورے زور کے ساتھ وہ کہتا ہے:

"اس وقت جب کہ آپ ﷺ بڑھاپے کی حدود میں قدم رکھ چکے تھے اور زندگی کی حرارت مدھم پڑ چکی تھی، آپ ﷺ صرف امن وسکون کی خواہش ہی اس دنیائے آب وگل میں کر سکتے تھے۔(کس قدر عجیب بات ہے کہ اس دور میں) آپ ﷺ جاہ پسندی کے راستے پر چل نکلے ہوں۔یوں آپ ﷺ نے اپنے گذشتہ کردار پر

خود خطِ تنسیخ پھیر دیا اور اس بے روح دنیا داری کے حصول میں کوشاں ہو گئے جس سے (پوری طرح) متمتع بھی نہ ہو سکتے تھے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، اس طرح کی باتوں پر میں ہرگز یقین نہیں رکھتا۔"(۹)

مخالفین نے اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کو نعوذ باللہ ایک نفس پرست انسان قرار دے کر ذاتِ اقدس اور خود دین اسلام کو زہریلے پروپیگنڈے کا نشانہ بنا رکھا تھا۔ ان کے نزدیک اشاعتِ اسلام کا ایک بڑا سبب نفس پرستی پر مبنی اسلامی تعلیمات ہیں۔ کارلائل کے بقول مذہب اسلام میں نفس پرستی (Sensuality) کے حوالے سے بہت کچھ بلا جواز لکھا گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بہت سی باتیں، جنھیں ہمارے ہاں جرائم سمجھا جاتا ہے، پیغمبر اسلام ﷺ نے انھیں اپنے ہاں رائج دیکھا۔ زمانۂ قدیم سے عرب میں غیر مسئول انداز میں ان کا عام چلن تھا۔ آپ ﷺ نے تو مختلف انداز سے ان پر پابندیاں عائد کر کے ان کا دائرہ محدود کر دیا۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ آپ ﷺ کا پیش کردہ مذہب کوئی بہت آسان مذہب بھی نہیں۔ پُرمشقت روزوں، سخت ترین اصول وضوابط، دن میں پانچ وقت نماز اور شراب سے مکمل پرہیز کے ساتھ اسلام کو قطعاً کوئی آسان مذہب نہیں سمجھا جا سکتا۔ ویسے بھی کوئی مذہب محض اس لیے تیزی کے ساتھ نہیں پھیلتا کہ وہ بہت آسان ہے۔ مذہب کی خاطر جان کا نذرانہ پیش کرنے کے لیے انسان کے اندر موجود پاکیزہ اور نفیس جذبات کو متحرک کرنا پڑتا ہے۔ اگر کوئی مذہب انسان کے حیوانی جذبات کو اُبھارنے پر تکیہ کرے تو وہ اسلام کی طرح صاحب کردار پیروکاروں کی بہت بڑی کھیپ حاصل نہیں کر سکتا۔ اس بحث کے بعد وہ بڑے اعتماد سے کہتا ہے:

"محمد (ﷺ) کے بارے میں جو کچھ بھی کہہ لیں (یہ بات واضح ہے کہ) وہ نفس پرست انسان ہرگز نہیں تھے۔"

یہی وجہ ہے کہ:

No emperor with his tiaras was obeyed as this man in a cloak of his own clouting.

"کسی صاحب تاج وکُلاہ کی ایسی اطاعت نہیں ہوئی جیسی اپنی پیوند لگی عبا میں ملبوس اِس انسان (ﷺ) کی۔"

کیا اسلام کی حتمی فتح اور غلبے میں تلوار کا کردار فیصلہ کن تھا؟

حضور ﷺ کے متعصب نقاد اس مفروضے کی پرزور وکالت کرتے ہیں۔ بقول کارلائل وہ اس نظریے کے قائل ہیں کہ تلوار ایک دنیادار اور بدکردار شخص کے ہاتھ میں تو خوب جچتی ہے۔ لیکن وہی تلوار ایک مذہبی وروحانی شخصیت کے ہاتھوں میں پہنچ کر آناً فاناً ایک مجسم برائی بن جاتی ہے۔ اس موضوع پر اس کا موقف تین پہلوؤں پر مشتمل ہے۔

اولاً: پیغمبر کو پُرامن طریقے سے تبلیغ اسلام کی اجازت نہ دی گئی۔ یہ آپ ﷺ کے مخالفین تھے جنھوں نے بزور آپ ﷺ کا راستہ روکنے کی کوشش کی۔ آپ ﷺ نے جواب میں ایک مرد اور عرب کی طرح عزیمت کا راستہ اختیار کیا۔(۱۰)

ثانیاً: یہ بات قابل ذکر ہے کہ عیسائیت کی تبلیغ و اشاعت میں بھی تلوار کا کردار کچھ کم نہیں رہا۔ "ہمارے علم کی حد تک تلوار سے اس وقت تک گریز کیا گیا جب تک تلوار ہاتھ نہ لگ گئی۔ شارلیمان (Charlemagne) کے ہاتھوں سیکسن قبائل (Saxons) کے تبدیل مذہب کا عمل، تبلیغ کے ذریعے ہرگز انجام نہ پایا تھا۔"(۱۱) واضح رہے کہ شارلیمان (۷۴۲ء۔۸۱۴ء) کو مقدس رومی سلطنت کا بانی کہا جاتا ہے۔ اس نے سیکسن قبائل کے ایک چوتھائی حصے کو تبدیل مذہب کے سلسلے میں موت کے گھاٹ اتار دیا تھا اور ۸۰۰ء میں پوپ لیو III نے اہلِ روم کا شہنشاہ قرار دیتے ہوئے اس کی رسم تاجپوشی ادا کی تھی۔(۱۲)

ثالثاً: تلوار کا استعمال یا عدم استعمال چنداں اہمیت نہیں رکھتا۔ "جو چیز بذاتِ خود بہتر ہے، تلوار اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتی۔ تلوار بالآخر اسی چیز کو نقصان پہنچاتی ہے جو بدتر ہے۔ دنیا کے اس عظیم معرکے میں قدرت ہی اصل منصف ہے اور وہ کبھی غلطی نہیں کرتی۔"(۱۳)

کارلائل کا مذکورہ نظریہ بظاہر قرآن حکیم کے ایک مشہور آفاقی اصول کا ترجمان ہے۔ یعنی

فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ۭ (الرعد:١٧)

''جو جھاگ ہے وہ اڑ جایا کرتا ہے اور جو چیز انسانوں کے لیے نافع ہے وہ زمین میں ٹھہر جاتی ہے۔''

المیہ یہ ہے کہ قرآن اور کارلائل کے راستے مختلف ہیں۔ حضور اکرم ﷺ کو بظاہر ایک پیغمبر اور عملاً محض ایک عظیم مصلح کے طور پر پیش کر کے بھی اس نے متعصب عیسائی و یہودی دنیا کو جو صدمہ پہنچایا تھا، عظمت قرآن کا سراسر انکار کر کے امت مسلمہ کو اس سے کہیں بڑا صدمہ پہنچایا اور یوں حساب برابر کر دیا۔

قرآن حکیم کے بارے اس کے انتہائی منفی اور جارحانہ تبصرے کی ایک جھلک ملاحظہ ہو:

A wearisome confused jumble crude, incondite, endless iterations, long windedness, entanglement, most crude, incondite, insupportable stupidity........in short nothing but a sense of duty could carry any European, through the Koran". (۴۱)

''متفرق اور منتشر جملے، ایک دوسرے سے غٹ پٹ، ایک ہی بات کی بار بار تکرار، پیچ در پیچ، الجھی ہوئی تقریر، مہمل اور مبہم، غرض بالکل مہمل، ناقابل تائید احمقانہ پن.....کوئی یورپین، سوا اس کے کہ اسے فرض ادا کرنا ہو، سارے قرآن کو پڑھنے کا متحمل ہی نہیں ہو سکتا۔'' (العیاذ باللہ)

یہ اس قرآن کے بارے میں کارلائل کے ریمارکس ہیں جس کے چیلنج کے جواب میں فصحائے عرب کی زبانیں گنگ ہو گئی تھیں۔ چیلنج یہ تھا کہ قرآن کے کلام الٰہی ہونے کے بارے میں تمھیں کوئی شک ہے تو اس جیسی کوئی ایک سورت ہی بنا کے دکھاؤ۔ یہ اس قرآن کے بارے میں حکم لگایا جا رہا ہے جس کے بہت سے اولین مخاطب منکر ہوتے ہوئے بھی راتوں کو چھپ چھپ

کر اس کی تلاوت سنا کرتے۔ یہی نہیں، وہ لوگ اس بات کے بھی قائل تھے کہ قرآن کی تاثیر، فاتح عالم ہے۔ بنابریں وہ اپنے تمام ساتھیوں کو تلقین کیا کرتے کہ قرآن کی آواز عوام الناس تک نہ پہنچنے پائے۔ "یہ منکرین کہتے ہیں اس قرآن کو ہرگز نہ سنو اور جب یہ سنایا جائے تو اس میں خلل ڈالو۔ شاید کہ اس طرح تم غالب آ جاؤ۔" (حم السجدہ:۲۶)

یہاں سے زیرِ بحث مضمون کا دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے۔ ایک اوسط درجے کا قاری بھی کارلائل کے اس یوٹرن کو دیکھ کر پریشان ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ قرآنِ مجسم ﷺ کی مدح و توصیف کے بعد قرآنِ معظم کی تردید و تضحیک چہ معنی دارد؟ تقریباً پینتیس صفحات پر پھیلے ہوئے مضمون کے درمیان میں پورے تین صفحات قرآن کے لیے مخصوص کیے گئے ہیں۔ ان صفحات میں قرآن کے متعلق انتہائی قابل اعتراض بلکہ دل آزار قسم کی زبان استعمال کی گئی ہے۔ بغور دیکھا جائے تو ان تین صفحات میں بنیادی اعتراضات تین ہی ہیں جو الفاظ کے الٹ پھیر کے ساتھ دہرا دیے گئے ہیں۔

۱۔ قرآن منتشر اور متفرق جملوں کا (العیاذ باللہ) دفترِ بے معنی ہے۔

۲۔ قرآن میں مختلف باتوں کی بے جا تکرار ملتی ہے۔

۳۔ قرآن کو پڑھنا ایک تھکا دینے والا اور بے کیف تجربہ ہے جو کم از کم کسی یورپین کے بس کی بات نہیں۔

پہلا اعتراض اس لیے بے وزن ہے کہ قرآن کے منتشر اور متفرق جملوں میں (اگر بالفرض ایسا ہی ہے تو) اہلِ فکر و دانش اور اہلِ سخن کو اس میں حقائق و معارف کے گنج ہائے گرانمایہ کیسے مل جاتے ہیں؟ چند مثالیں

قرآن کریم میں ہے:

اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ۭ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاۗءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۭ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ ؀

(الانبیا:۳۰)

"کیا وہ لوگ جنھوں نے (نبی کی بات ماننے سے) انکار کر دیا ہے غور نہیں کرتے کہ یہ سب آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے تھے، پھر ہم نے انھیں جدا کر دیا اور پانی سے ہر زندہ چیز پیدا کی۔ کیا وہ ہماری (خلاقی کو نہیں مانتے)۔"

آج کا سائنسدان چودہ سو سال پہلے کے اس سائنسی انکشاف کو پڑھ کر حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔

فرانسیسی مستشرق مورس بکائے لکھتا ہے:

"جنین کے ارتقائی مراحل کا قرآنی بیان اُن معلومات کے بالکل عین مطابق ہے جو اِس موضوع پر آج ہمیں دستیاب ہیں اور قرآن میں ایک بھی بیان ایسا نہیں جس پر جدید سائنس کو تنقید یا اعتراض کا موقع مل سکے۔"(۱۵)

مورس بکائے قرآن میں اِس طرح کے سائنسی انکشافات کو دیکھ کر ششدر رہ جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔"یہ بات میری سمجھ سے بالکل بالا تر ہے کہ جزیرہ نما عرب کا ایک باشندہ ایسی سائنسی معلومات سے بہرہ ور ہو جس سے باقی دُنیا کم از کم دس صدیوں بعد روشناس ہوئی۔"(۱۶)

علامہ عنایت اللہ مشرقی مرحوم اس بات کے راوی ہیں کہ مشہور ماہرِ فلکیات سر جیمز جینز (James Jeans) کے سامنے انھوں نے سورۃ الفاطر کی آیت ۲۸ تلاوت کی۔

اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ط

"حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے صرف اہلِ علم ہی اس سے ڈرتے ہیں۔"

جیمز جینز نے برجستہ کہا۔"کیا قرآن میں واقعی یہ آیت موجود ہے۔ اگر ہے تو میری شہادت لکھ لو کہ قرآن ایک الہامی کتاب ہے۔ محمد (ﷺ) پڑھے لکھے نہ تھے۔ انھیں یہ حقیقت خود بخود معلوم نہیں ہو سکتی۔ انھیں یقیناً اللہ نے بتائی۔ بہت خوب، بہت عجیب۔"(۱۷)

قرآن کا ایک اعجاز یہ بھی ہے کہ انتہائی دانشور شخص اور انتہائی معمولی عقل وفہم رکھنے والے

انسان کے لیے بیک وقت باعث ہدایت ہے۔ ایک شخص ڈکیتی کے لیے رات کے پچھلے پہر ایک گھر میں گھس گیا۔ گھر کے کسی کونے میں صاحب خانہ اطمینان کے ساتھ سورۃ الحدید کی آیت ۱۶ بار بار پڑھ رہے تھے۔

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِکْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ۔

"کیا اہلِ ایمان کے لیے وہ وقت نہیں آ گیا کہ اللہ کی یاد سے ان کے دل پگھل جائیں اور اس کے نازل کردہ حق کے آگے جھکیں۔"

گھر میں گھس جانے والے اس اجنبی پر اس آیت کا اتنا گہرا اثر ہوا کہ اس نے آئندہ سے چوری اور ڈکیتی سے ہمیشہ کے لیے توبہ کر لی۔ دنیا اس خوش نصیب شخصیت کو مشہور تابعی بزرگ حضرت فضیل بن عیاضؒ کے نام سے جانتی ہے۔

دوسرے اعتراض کے جواب میں اتنا کہہ دینا بھی کافی ہے کہ کارلائل کے اپنے مضمون میں شروع سے آخر تک بہت تکرار ملتی ہے۔ اس تکرار کا تعلق محض افکار و خیالات سے نہیں، الفاظ سے بھی ہے۔ محولہ بالا اقتباس میں بھی اس کی ایک نادر مثال ملتی ہے۔ پہلے جملے کے پہلے حصے میں لفظ Crude اور Incondite استعمال ہوا ہے۔ جملہ ختم ہونے نہیں پاتا کہ Crude اور Incondite کے الفاظ دوبارہ استعمال ہوئے ہیں۔ قرآن کے بارے میں یہ الفاظ کس حد تک غیر متعلق ہیں، اس بحث سے صرفِ نظر بھی کر لیا جائے تو گویا بالواسطہ یہ صاف اعتراف ہے، اس بات کا کہ تکرار بعض اوقات حسنِ کلام کی دلیل ہوتی ہے نہ کہ عجز کلام کی۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کے حسنِ معنی کو اس کے حسنِ بیان نے چار چاند لگا دیے ہیں۔ بے جا تکرار والی بات عربی زبان کی باریکیوں سے عدم واقفیت کا نتیجہ ہے۔ مثلاً قرآن کی ایک مختصر آیت میں اللہ تعالیٰ نے "ہم" کا لفظ پانچ بار استعمال کیا ہے۔ تقریباً چار بار الفاظ مختلف استعمال ہوئے ہیں۔ مجال ہے جو تکرار بارِ سماعت ہو۔ ارشاد ہوتا ہے:

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحٰفِظُونَ ○ (الحجر:۹)

''بے شک ہم نے اس قرآن کو نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔''

جہاں جہاں پوری آیات کی تکرار ملتی ہے وہاں بھی فہمِ قرآن کے لیے رازی، زمخشری اور بیضاوی جیسے آئمہ تفسیر کی بصیرت اور مہارت درکار ہے۔صرف ایک مثال سے بات واضح ہو سکتی ہے۔سورۃ المائدہ میں ایک ہی آیت صرف ایک ایک لفظ کے فرق کے ساتھ یکے بعد دیگرے تین بار پڑھنے کو ملتی ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ○

''جو لوگ اللہ کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہی لوگ کافر ہیں۔''

آیت نمبر ۴۴ کے بعد آیت نمبر ۴۵ میں یہی آیت ظالمون اور آیت نمبر ۴۷ میں بھی یہی آیت فاسقون کے لفظ کے ساتھ ملتی ہے۔علامہ بیضاوی نے ایسے شخص کو کافر، ظالم اور فاسق کہنے کے بارے میں ایک بڑا بلیغ نکتہ بیان کیا ہے۔یعنی اس وجہ سے کہ انھوں نے احکام الٰہی کو تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے وہ کافر ہیں۔اس وجہ سے کہ انھوں نے اس قانون کو پس پشت ڈال دیا جو سراسر عادلانہ ہے وہ ظالم ٹھہرے۔اس وجہ سے کہ انھوں نے اللہ کی حدود کو پامال کیا وہ فاسق قرار پائے۔(۱۸)

تیسرے اعتراض کا جواب دینے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ قرآن دراصل ہے کیا؟ اور کیا کوئی ترجمۂ قرآن اس کتاب مبین کا بدل ہو سکتا ہے؟ قرآن اس خالق کائنات کا بنی نوع انسان کے نام آخری پیغام ہے جس ذات کی کوئی ابتدا ہے نہ انتہا۔قرآن عام معنوں میں نہ تو دینیات پر کوئی مقالہ (Treatise) ہے، نہ مواعظِ حسنہ کی کوئی مقدس کتاب۔ یہ محض ایک مجموعہ قوانین بھی نہیں ہے۔ بلاشبہ قرآن میں الہیاتی مسائل، اخلاقی ہدایات اور انفرادی واجتماعی زندگی سے متعلق قوانین ملتے ہیں۔قرآن میں سب کچھ ہے لیکن ان سب کے علاوہ بھی بہت سی مختلف اور حسین

چیزوں کا یہ ایک گلدستہ ربانی ہے۔

بالفاظ دیگر، تلاشِ حق کے جذبہ سے قرآن کے بعض اجزا کا بھی مطالعہ کیا جائے تو قرآن کسی کو مایوس نہیں کرتا۔ اگر توحید باری تعالیٰ کی سچی اور کھری تعلیم جاننا چاہو تو سورۃ الاخلاص جیسی سورۃ نمونہ کامل ہے۔ مقامِ الوھیت اور مقامِ عبدیت کے اظہار کامل کے ساتھ طلب ہدایت کی سچی آرزو ہو تو سورۃ الفاتحہ اپنی تاثیر میں لاجواب ہے۔ قرآن کی جملہ تعلیمات کا خلاصہ کم سے کم الفاظ میں خود قرآن کی زبان میں پڑھنا مقصود ہو تو سورۃ العصر کا مطالعہ مفید رہے گا۔ امام شافعیؒ کا قول ہے ''انسان ہدایت حاصل کرنے کا ارادہ رکھتا ہو تو سورۃ العصر بھی ہدایت کے لیے کافی ہے۔'' کوئی قاری حسنِ معانی اور صوتی آہنگ کا حسین ترین اور ارفع ترین معیار دیکھنا چاہے تو سورۃ النجم، سورۃ القمر اور سورۃ الرحمٰن ہی نہیں، الحمد سے الناس تک تسکین اور تشفی کا پورا سامان موجود ہے۔ امثالِ قرآن کا مطالعہ ایک الگ موضوع ہے۔ ان امثال کی خصوصیت یہ ہے کہ شعور (Instruction) بھی دیتی ہیں اور مسرت یعنی (Delight) بھی۔ انبیائے کرام کے حالات، موضوع کی مناسبت سے قرآن میں جگہ جگہ پڑھنے کو ملتے ہیں۔ کم از کم کسی ایک پیغمبر کے جملہ حالات وکوائف کو علمی و ادبی محاسن کے ساتھ کسی ایک مقام پر پڑھنے کی خواہش ہو تو سورۃ یوسف کا مطالعہ کیجیے۔ جسے خود قرآن نے ''احسن القصص'' کہا ہے۔ اس سب کے باوجود قرآن بنیادی طور پر پورے کا پورا ہر شخص، ہر زمانے اور ہر علاقے کے لیے صحیفۂ ہدایت ہے۔ قرآن کو جو شخص بھی کسی مخصوص فائدے کے لیے پڑھے گا وہ محض چند کلیوں پر قناعت کرے گا جبکہ قرآن میں تو علاجِ تنگیِ داماں بھی ہے۔ مطالعۂ قرآن کے بعد جمالیات کے اس اصول کی سچائی بھی سمجھ میں آجاتی ہے کہ کسی شے کے حسن و رعنائی کا اندازہ اُس احساس سے ہوتا ہے جو اس شے کے جملہ لوازم کو دیکھ کر پیدا ہوتا ہے اور اس مجموعی تاثر کو محض تحلیل وتجزیہ کی اصطلاح میں ہرگز بیان نہیں کیا جاسکتا۔

اس وضاحت کے بعد یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ قرآن کا کوئی بھی بے جان اور لفظی ترجمہ حتیٰ کہ بہترین ترجمہ بھی قرآن کا قائم مقام نہیں ہوسکتا۔ اب سوال یہ ہے کہ کارلائل کے ممدوح مترجم جارج

سیل کا قرآن کے بارے میں علمی حدود اربعہ کیا ہے؟

اس سوال کے جواب میں بیک وقت دلچسپ اور تکلیف دہ حقائق سامنے آتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ کارلائل عربی زبان سے مکمل طور پر نابلد تھا۔ اس کا ماخذ (جیسا کہ وہ خود بھی بتاتا ہے) جارج سیل (George Sale) کا انگریزی ترجمۂ قرآن Al-Coran of Muhammad ہے۔ اوّل تو یہ عنوان ہی سراسر گمراہ کن ہے۔ قرآن کلامِ محمد نہیں، کلامِ الٰہی ہے۔ ویسے بھی اس نے صاف کہا ہے کہ محمد (ﷺ) نہ صرف قرآن کے مصنف (Author) بلکہ منصوبہ ساز (Contriver) ہیں۔ (۱۹) (نقلِ کفر کفر نباشد)، جارج سیل سے زیادہ دیانت داری کا ثبوت تو آرتھر جان آربری نے دیا جس کا ترجمہ قرآن نسبتاً مستند بھی ہے۔ روانی اور ادبی چاشنی کی خصوصیات بھی رکھتا ہے پھر بھی اس نے اپنے ترجمۂ قرآن کو The Koran Interpreted کا نام دیا ہے۔ گویا اس کے نزدیک بھی کوئی ترجمۂ قرآن خود قرآن مجید یا اس کا متبادل نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ سیل کے ترجمہ قرآن کو کسی طور بھی معیاری نہیں قرار دیا جا سکتا۔ یہ ترجمہ بذاتِ خود ایک لاطینی ترجمہ کا ترجمہ ہے۔ مذکورہ ترجمے میں آیاتِ قرآنی کے نمبر باضابطہ طور پر درج نہیں کیے گئے۔ ناگزیر حواشی و ضروری تشریحات کو بھی درخورِ اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ اس قسم کے ترجمہ کو پڑھ کر قرآن کے بارے میں کوئی رائے بلکہ حکم لگانے کا کارلائل یا کسی بھی صاحبِ علم کو جس قدر استحقاق حاصل ہے، اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ امریکی نژاد یہودی خاتون مارگریٹ مارکوس نے جب جارج سیل کا ترجمۂ قرآن پڑھا تو اُن کی تسلی نہ ہوئی اور جب اُسی خاتون نے محمد مارماڈیوک پکتھال کا ترجمۂ قرآن پڑھا تو وہ ایک نومسلم خاتون محترمہ مریم جمیلہ بن چکی تھیں۔

جارج سیل (۱۶۹۷ء۔ ۱۷۳۶ء) ایک پرجوش عیسائی مشنری تھا۔ وہ عیسائی علوم کے فروغ کی سوسائٹی (Society for Promoting Christian Knowledge) کا باقاعدہ ممبر تھا۔ اس کے ترجمۂ قرآن کو مستند ثابت کرنے کے لیے یہ بات تواتر کی ساتھ پھیلائی گئی کہ اس نے براہِ راست عربی زبان اور روایات کا علم حاصل کرنے کی خاطر پورے پچیس برس جزیرۃ العرب میں

گزارے۔ اس کے مستند سوانح نگار آر۔اے۔ ڈیون پورٹ (Davenport.R.A) نے ناقابل تردید شواہد سے اس دعوے کو مسترد کر دیا ہے۔ اس کے ترجمہ قرآن میں بعض ایسے فنی نقائص ہیں جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ عربی زبان و بیان پر اسے ضروری دسترس حاصل نہ تھی۔ اس کے باوجود اس کے ترجمہ قرآن کی بار بار نوک پلک درست کر کے مختلف یورپی زبانوں میں اب تک اس کے تیس سے زائد ایڈیشن شائع کیے جا چکے ہیں۔

قرآن حکیم کے بارے میں بہت سے دوسرے مستشرقین کی طرح جارج سیل بھی اِس بات کا مدعی ہے کہ جس طرح بائبل کے مختلف ایڈیشن (Version) ہیں۔ اِسی طرح قرآن کی مختلف قراءتیں بھی قرآن کے مختلف versions ہیں۔ اُس کے بقول

> ''قرآن کے ابتدائی ایڈیشن سات ہیں، اگر اُن کو ایڈیشن کہنا مناسب ہو یا ہم اُن کو قرآن کی سات نقلیں کہہ سکتے ہیں جن میں سے دو مدینہ میں شائع ہوئیں اور وہیں استعمال ہوتی ہیں، تیسری مکہ میں چوتھی کوفہ میں، پانچویں بصریٰ میں، چھٹی شام میں اور ساتویں نقل کو عام ایڈیشن کہہ سکتے ہیں۔''(۲۰)

کارلائل کے فکری مرشد کے مبلغ علم کا تار و پود بکھیرنے کے لیے تین ناقابل انکار حقائق کا ذکر کافی ہوگا۔

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ قرآن حکیم شروع شروع میں اعراب بلکہ نقطوں کے بغیر لکھا جاتا تھا۔ نئی نئی اقوام اور نئے علاقوں کی فتح کے بعد اِس بات کا احتمال تھا کہ مختلف النوع طریقوں سے تلاوتِ قرآن کے بعد بات تحریفِ قرآن تک نہ پہنچ جائے۔ سات منزل قراءتوں میں قرآن کو محدود کر دینے سے حفاظتِ قرآن کا گویا خدائی بندوبست ہوگیا۔

دوسری بات یہ ہے کہ جن شہروں کے ساتھ جارج سیل نے قرآن کے مختلف ایڈیشن منسوب کیے ہیں اُن میں سے بیشتر عہدِ رسالت میں اسلامی حکومت میں شامل تک نہ ہوئے تھے۔ حضرت عثمانؓ نے جو کام کیا وہ یہ تھا کہ آپ نے لغتِ قریش کے مطابق قرآن حکیم کے مختلف نسخے تیار

کرائے اور انھیں سرکاری سطح پر مملکت کے دور دراز حصوں میں پھیلا دیا۔(۲۱)

تیسری بات یہ کہ موصوف سات قراءتوں کی نوعیت سے قطعاً بے خبر معلوم ہوتے ہیں۔ سات قراءتوں سے مراد قرآن کے مختلف وترمیم و اضافہ شدہ ایڈیشن نہیں ہیں۔ اختلافِ قراءت کی وجہ سے کہیں بھی قرآن کے مفاہیم میں تضاد رونما نہیں ہوتا، جس سے بائبل کے طالب علم کو واسطہ پڑتا ہے۔ قرآن کی ہر قراءت متعلقہ آیت میں تنوع اور جامعیت کی ایک نرالی شان پیدا کر دیتی ہے جو کہ اِس کے کلامِ الٰہی ہونے کی ایک اور واضح دلیل ہے۔ اِس کی صرف ایک مثال بات کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے۔ قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے بارے میں ارشاد فرمایا لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ (التوبۃ:۱۲۸)۔ اِس آیہ مبارکہ میں اَنفُسِکُم میں ف کو پیش کے ساتھ پڑھا جاتا ہے اور اِس کا مروجہ ترجمہ یہ ہے ''دیکھو تم لوگوں کے پاس ایک رسول آیا جو خود تم ہی میں سے ہے۔'' حضرت انسؓ کی روایت کی مطابق رسول اللہ ﷺ نے اِس آیت میں اَنفَسِکُم کو ف کی زبر کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس قرأت کے مطابق ترجمہ یہ ہوگا۔ ''بے شک آئے تمھارے پاس اللہ کے رسول تمھارے اشرف و افضل اور سب سے زیادہ نفیس خاندان سے۔'' اب یہ ظاہر ہے کہ زیرِ نظر آیہ مبارک میں انفُسکم پڑھا جائے یا انفَسکم پڑھا جائے، دونوں مفاہیم میں کوئی تضاد پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک ایسی جامعیت محسوس ہوتی ہے جس کی مثال انسانی ادب پیش کرنے سے قاصر ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ مفہوم کی اس نزاکت کو جاننے کے لیے کسی جارج سیل کی نہیں، بالغ نظر اور صحیح الفکر مفسر کی فہم و ذکاوت درکار ہے۔ اِس بحث سے ظاہر ہے کہ اچھے سے اچھا ترجمۂ قرآن بھی اصل قرآن کا متبادل نہیں ہو سکتا۔ راجر گیراڈی (Roger Geradi) نے اس بات کو بہت خوبصورت پیرائے میں بیان کیا ہے:

''کسی بھی ترجمۂ قرآن کا قرآن کے اصل متن سے موازنہ کرنا ایسے ہی (کارِ لاحاصل) ہے جیسے کسی منظر کے سرسری سے خاکے کا مقابلہ ایک ایسے پُرشکوہ قدرتی منظر سے کیا جائے جو رنگ، روشنی اور عکس کے ساتھ ساتھ ترنم میں بھی بلند آہنگ ہو۔''(۲۲)

قرآن کے مروّجہ یورپی تراجم میں اس نوع کے فنی نقائص کے باوجود بعض سعید روحیں ایسی ہیں جو مترجم قرآن کے ذریعے بھی رازِ حیات اور سراغِ خالق کائنات پانے میں کامیاب ہوگئیں۔ انگلستان کے مشہور پاپ سنگر یوسف اسلام (سابقہ Cat Stevens) اپنے قبولِ اسلام کی کیفیت ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"میں ایک ایسی ناؤ کی مانند تھا جو پتوار اور کھیون کے بغیر چلی جارہی تھی اور جس کی کوئی منزل نہ تھی۔ لیکن جب میں نے قرآن کا مطالعہ کیا تو مجھے احساس ہوا کہ میں اس کے لیے اور یہ میرے لیے تخلیق کیا گیا ہے۔" (۲۳)

جن لوگوں نے قرآن کو عربی مبین میں پڑھا اور سمجھا، ان میں بڑے بڑے مغربی دانشور اور اہلِ قلم حضرات کے نام آتے ہیں۔ ایک مشہور نام فرانسیسی فلسفی اور معروف اشتراکی مصنف راجر گیراڈی کا ہے۔ مطالعۂ قرآن نے اس کے دل کی دنیا بدل ڈالی اور وہ دائرۂ اسلام میں داخل ہو گیا۔ ایک ایسا ہی نام فرانس کے صاحب ایمان شوال کا ہے۔ وہ دعوے کے ساتھ کہتا ہے:

"قرآن کے الفاظ اور حروف میں اس طرح کا کیمیائی اثر یا سحر آفرینی ہے جس سے قلب و ذہن جلا پاتا ہے۔ انسانی جسم حسن و رعنائی کے قالب میں ڈھلتا اور عالم کون ومکان میں انقلاب رونما ہو جاتا ہے۔" (۲۴)

بیسویں صدی میں ہی رومانیہ کے دانشور کانسٹنٹ ورجل، جارجیو بے ساختہ پکار اٹھے۔ "مجھے حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح عربوں نے قرآنی آیات کو سننے کے بعد بھی محمد (ﷺ) کو پیغمبر تسلیم نہ کیا۔" اور ہزاروں بلکہ لاکھوں میں سے ایک نمایندہ مثال پولینڈ کے علامہ محمد اسد (سابقہ لیو پولڈ ویَس) کی ہے جو ۱۹۲۶ء میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ علامہ صاحب سالہاسال تک کعبہ وکلیسا کی کشمکش سے دوچار رہے۔ ان کے قلبِ مضطر کو اس وقت قرار آیا جب ایک دن انھوں نے سورۃ التکاثر کو پڑھا۔ پھر کیا تھا تمام پردے نگاہوں سے ہٹ گئے اور بالآخر انھوں نے جامِ شریعت نوش کرلیا۔ (۲۵) ایک زندہ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت بھی اسلام مشرقِ وسطی کی بجائے یورپی ممالک

میں کہیں زیادہ تیز رفتاری سے پھیل رہا ہے۔ کاش کارلائل کو اندازہ ہوتا کہ قرآنِ پاک کا مطالعہ کوئی بے کیف تجربہ نہیں، ایک پُر کیف روحانی کیفیت ہے اور قیدِ زمانی و مکانی کے علی الرغم مشرق و مغرب اور ایشیا و یورپ وغیرہ میں اہلِ ہدایت اور اہلِ ضلالت قانونِ فطرت کے مطابق پیدا ہوتے ہیں۔ خود قرآن میں ہے یُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّ يَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا۔

کارلائل پیشہ ور مشنری یا مستشرق نہیں تھا۔ وہ ایک صاحبِ طرز ادیب اور سماجی مصلح تھا۔ اُسے زبان و بیان پر بے پناہ قدرت حاصل تھی۔ وہ قاری کو اپنی سلاست، بلاغت اور شعریت کے بل پر ہم خیال بنانے کا ہنر جانتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے مسلمان اہلِ علم بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ بعض صورتوں میں اس کے پورے مضمون کے اُردو تراجم شائع کر کے برصغیر میں وسیع پیمانے پر پھیلائے گئے۔ بہت کم لوگوں کو اس بات کا احساس تھا کہ طویل مضمون کے اندر قرآن کے خلاف جو ملفوف (Sugarcoated) پروپیگنڈا کیا گیا وہ کس قدر خطرناک ہو سکتا ہے۔ کارلائل کم از کم ایک لحاظ سے مکہ کے مشرکین کی صدائے بازگشت ہے۔ وہ بھی رسول اللہ ﷺ کی شخصی عظمت کو تسلیم کرتے تھے۔ البتہ قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے کا برملا اعتراف نہ کرتے۔ ایک دوسرے لحاظ سے کارلائل عہدِ حاضر کے مستشرقین کے لیے نمونۂ تقلید بن گیا ہے جو پیغمبرِ اسلام ﷺ کی بعض معاملات میں تائید کر کے بعض دوسرے معاملات میں تردید کر ڈالتے ہیں۔ کارلائل کے بعد انیسویں اور بیسویں صدی میں مستشرقین کی ایک لمبی قطار ملتی ہے جنھوں نے اس اصول کو اپنا کر سیرتِ طیبہ ﷺ پر قلم اُٹھایا۔ یعنی بہت سے امور میں اسلام اور پیغمبرِ اسلام ﷺ کی خوب تحسین کی اور بعض امور میں شدید ترین تنقید کے نشتر لگائے۔ ایک عام قاری ایسے مستشرقین کو منصف مزاج گردانتا ہے اور اندر ہی اندر منفی پروپیگنڈا اپنا کام کرتا رہتا ہے۔ ایک ایسے ہی مستشرق بیسویں صدی کے منٹگمری ڈبلیو واٹ ہیں۔ ایک اہم فرق کے ساتھ کہ کارلائل کے برعکس منٹگمری ڈبلیو واٹ، عربی زبان اور دینِ اسلام کے بنیادی مصادر تک رسائی رکھتے ہیں۔

مراجع وحواشی

۱۔ تھامس کارلائل ...... Sartor Resartus/On Heroes and Hero Worship

London Everyman library 1908:Dent

(The Hero as Prophet:Chapter) New York 1964:Dutton

...... ۲۷۹

۲۔ ایضاً ۲۷۸

۳۔ ایضاً ۲۷۹

۴۔ ایضاً ۲۷۹

کارلائل کے اصل الفاظ ہیں۔

One would be entirely at a loss what to think of this world at all, if quackery so grew and sanctioned here ..... .More godless theory was never promulgated in this earth.

۵۔ ایضاً ۲۸۰

کارلائل کے اصل الفاظ ہیں۔

"A false man found a a religion? Why, a false man cannot build a brick house! If he does not know and follow truly the properties of mortar, burnt clay and what else he works in, it is no house that he makes, but a rubbish heap. It will not stand for twelve centuries to lodge a hundred and eighty millions, it will fall straight away. A man must conform himself to Nature's laws, be verily in communion with Nature and the truth of things, or Nature will answer him, No, not at all"!

۶۔ ایضاً......۲۸۱

۷۔ ایضاً......۲۸۱

۸۔ ایضاً......۲۸۲

۹۔ ایضاً......۲۸۹

"Not till he was already getting old, the prurient heat of his life all burnt out, and peace growing to be the chief thing this world could give him, did he start on the'career of ambition' and belying all his past character and existence, set up as wretched empty charlatan to acquire what he could now no longer enjoy. For my share, I have no faith whatever in that".

۱۰۔ ایضاً......۳۰۴

۱۱۔ ایضاً......۳۰۵

۱۲۔ ایضاً......۳۰۵

۱۳۔ ایضاً......۳۰۵

۱۴۔ ایضاً......۳۹۵

۱۵۔ موریس بکائے......The Quran and Science,The Bible
اصل الفاظ یہ ہیں۔

The Quranic description of certin stages in the development of the embrio corressponds exactly to what we today know about it, and the Quran does not contain a single statement that is open to criticism from modern science).Maurice Bucaille(

۱۶۔ ایضاً

۱۷۔ وحیدالدین خان......مذہب اور جدید چیلنج

۱۸۔ پیر محمد کرم شاہ الازہری"......ضیاءالقرآن، جلد اول تفسیر سورۃ المائدہ

۱۹۔ جارج سیل......Preliminary Discourses

۲۰۔ ایضاً

"Having mentioned the different editions of the koran, it may not be amiss here to acquaint the reader, that there are seven principal editions, if I may so call them, or ancient copies of the book, two of which were published and used at Medina, a third at Mecca, a fourth at Cufa, a fifth at Basra, a sixth at Syria and a seventh called the common or vulgar edition".

۲۱۔ پیر محمد کرم شاہ الازہری"......ضیاالنبی ﷺ جلد ششم......ضیاالقرآن پبلی کیشنز لاہور

۲۲۔ راجر گیراڈی......The Dome of the Rock

? Tried and True:Translation

راجر گیراڈی کے اصل الفاظ ہیں:

"Comparing any translation with the original Arabic is like comparing thumbnail sketch with the natural view of a splendid landscape rich in colour, light and shade and sonorous in melody"

۲۳۔ عبدالغنی فاروق......ہم کیوں مسلمان ہوئے؟......مکتبہ تعمیرِ انسانیت لاہور

۲۴۔ شوآن......The Dimensions of Islam

۲۵۔ علامہ محمد اسد......Fons Vitae......Road to Mecca. (Reprint edition 2000)

محمد ﷺ ...... پرافٹ اینڈ سٹیٹس مین

(Muhammad - Prophet and Statesman)

منٹگمری ڈبلیو واٹ کے خیالات کا محاکمہ

حیاتِ طیبہ ﷺ مستشرقین کا ایک محبوب موضوع رہا ہے۔ چند مستثنیات کو چھوڑ کر زیادہ تر ان لوگوں نے اپنے مختلف النوع سیاسی اور مذہبی محرکات کے تحت اس موضوع پر مقالات اور کتب شائع کیں۔ کردار نگاری (Character Delineation) کے زعم میں یہ لوگ بسا اوقات کردار کشی (Character Assassination) پر اُتر آئے۔ منٹگمری ڈبلیو واٹ نے بجا طور پر کہا ہے:

"Of all the world's great men, none has been so much maligned as Muhammad(1)

"دنیا کی تمام عظیم شخصیات میں محمد (ﷺ) کی ذات پر سب سے زیادہ کیچڑ اُچھالا گیا ہے۔"

واٹ نے اپنی پہلی کتاب ۱۹۵۳ء میں Muhammad at Mecca کے عنوان سے اور دوسری کتاب ۱۹۵۶ء میں Muhammad at Madina کے عنوان سے لکھ کر بیسویں صدی کے مستشرقین کے گروہ میں ایک عالم گیر شہرت حاصل کی۔ بعد ازاں ان دونوں کتابوں کی تلخیص (Abridgement) کچھ ترمیمات کے ساتھ ۱۹۶۱ء میں لکھ کر اس نے ایک ہی کتاب Prophet and Statesman-Muhammad کے نام سے شائع کی۔ زیرِ بحث مضمون میں اس کی آخری کتاب کا جائزہ پیشِ نظر ہے۔ حسب ضرورت پہلی دو کتب کے مباحث کا بھی کہیں کہیں ذکر آئے گا۔ پہلے ہم ان مباحث کو لیتے ہیں جہاں مستشرقین کے حلقہ میں اُس کی خدمات سے

انکار نہیں کیا جا سکتا۔

وہ کہتا ہے:

۱۔ مختلف مستشرقین کی مخالفانہ آرا کسی معروضی یا غیر جذباتی مطالعہ کا نتیجہ ہرگز نہیں ہیں۔ اس قسم کی آرا کا تعلق صلیبی جنگوں کے پیدا کردہ ماحول سے ہے۔ یہ ایک جنگی پروپیگنڈا ہے جس نے اسلام کے بجائے عیسائیوں کے مشن کو زیادہ نقصان پہنچایا۔ (۲)

۲۔ نزولِ وحی کے وقت پیغمبر اسلام ﷺ پر ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ بعض مستشرقین العیاذ باللہ اسے مرگی کا دورہ قرار دیتے ہیں۔ اس بنا پر وہ وحی کا مطالعہ ابنارمل سائیکالوجی کے تحت کرتے ہیں۔ واٹ اس بات کی لغویت سے آگاہ ہے اور پرزور الفاظ میں اس کی تردید کرتا ہے۔

۳۔ واٹ اس الزام کی بھی تردید کرتا ہے کہ نعوذ باللہ پیغمبر اسلام eایک Imposter تھے اور دنیاوی غرض اور اقتدار کے لیے مذہبی رہنما بن گئے۔ انیسویں صدی میں تھامس کارلائل نے اس نظریے کے پرخچے اُڑا دیے تھے۔ اس کے باوجود کسی نہ کسی انداز میں اس الزام کو دہرایا جاتا رہا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ حضور ﷺ کے معاندین جرمنی کے گوئیبلز (Goebles) سے بہت متاثر ہیں جس نے کہا تھا کسی بھی جھوٹ کو عوام میں قابل قبول بنانا ہو تو اسے بار بار ذرائع ابلاغ کے ذریعے دہرایا جائے۔ واٹ اس موضوع پر چار امور کی جانب توجہ دلاتا ہے۔

(الف) پیغمبر اسلام ﷺ نے جو کچھ کہا اور کیا، وہ غیر معمولی سنجیدگی کا مظہر ہے۔ اگر آپ ﷺ کو کسی طور بھی غیر سنجیدہ کہا جائے تو آپ ﷺ کے دور میں اور بعد ازاں بھی اسلام کی تیز رفتار اشاعت وترقی ایک لاینحل امر ہے۔

(ب) اپنے آپ پر اور اپنے نصب العین پر غیر متزلزل یقین واعتماد نے آپ ﷺ کو ہمیشہ جادۂ حق پر گامزن رکھا۔

(ج) سنجیدگی کے بغیر اپنے پیروکاروں کی جانب سے عموماً اور حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ جیسے مشاہیر کی خصوصاً غیر مشروط اطاعت سے رسول اللہ ﷺ محروم رہ جاتے۔

(د) خدا کا قائل کوئی شخص بھی یہ سوال اُٹھا سکتا ہے کہ اگر اسلام کی بنیاد کسی جھوٹ اور فریب پر ہوتی تو اللہ تعالیٰ ایسے مذہب کو پھلنے پھولنے کیوں دیتا۔(۳)

۴۔ یہودیوں کے تین بڑے قبائل اپنی مسلسل وعدہ خلافیوں پر ریاست کے خلاف مختلف سازشوں کی بنا پر مدینہ منورہ سے نکال دیے گئے تھے۔ خصوصاً بنی قریظہ نے عین حالتِ جنگ میں اہلِ مدینہ کو اندر سے تباہ کر دینے کی پوری کوشش کی۔ یہ سب کچھ اس کے باوجود ہوا کہ ریاستِ مدینہ کے ساتھ مکمل وفاداری کا وہ حلف اٹھا چکے تھے۔ کیرن آرمسٹرانگ کے الفاظ میں اپنی حرکتوں کی وجہ سے یہ لوگ مدینہ کی ریاست کے لیے باقاعدہ سیکیورٹی رسک Security Risk بن چکے تھے۔ ریاست کے خلاف اس غداری کی پاداش میں ان کے خلاف فوج کشی کر کے ان کا استیصال کر دیا گیا۔ اس موضوع پر بھی عام مستشرقین کے ایک گروہ نے سخت دریدہ دہنی سے کام لیا ہے۔ واٹ ان باغی اور جنگ پسند یہودیوں کے خلاف کارروائی کا جواز پیش کرتے ہوئے صاف الفاظ میں تسلیم کرتا ہے:

"(ایک تو) یہ لوگ بہت پہلے سے پیغمبر اسلام (ﷺ) کے خلاف دشمنوں کی سازش میں شریک تھے۔ (اور دوسرے) قرآن کی آیات کے ساتھ تمسخر اور تضحیک کا رویہ اختیار کر کے اسلامی معاشرے کی بنیادوں کو متزلزل کرنے کے درپے تھے۔ جب تک وہ اپنی معاندانہ سرگرمیوں سے مجتنب رہے محمد (ﷺ) نے انھیں مدینہ میں بے دھڑک رہنے کی اجازت دیے رکھی۔"(۴)

کیا نوزائیدہ اسلامی ریاست اور یہودیت کا یہ ٹکراؤ ناگزیر تھا؟ واٹ کہتا ہے:

"یہودِ مدینہ ہجرتِ مدینہ کے وقت ہی مسلمانوں کے ساتھ اسی قسم کی مفاہمت کے دروازے بند کر چکے تھے۔ محمد (ﷺ) یہودیوں کے متعلق اس فیصلے پر کہیں ڈیڑھ

سال بعد پہنچے۔"(۵)

۵۔ جنگِ احزاب کے متعلق واٹ کی رائے بڑی صائب ہے۔ اس کے نزدیک "جنگِ خندق یا احزاب دراصل ایک زبردست اعصابی جنگ (A battle of nerves) تھی۔ جس میں مکمل فتح مسلمانوں کے حصے میں آئی۔ خود کوئی (قابل ذکر) نقصان اٹھائے بغیر مسلمانوں نے دشمن کو کمزور کر دیا اور ان کے باہمی اختلافات میں بھی اضافہ کر دیا۔"(۶)

۶۔ صلح حدیبیہ کو سیرتِ طیبہ اور اسلامی تاریخ میں ایک اہم سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ عسکری مہمات کے بل پر مسلمانوں کو جھکانے کی کوششیں دم توڑ چکی تھیں۔ اس پس منظر میں مسلمانوں اور کفارِ مکہ کے مابین جنگ بندی کا دس سالہ معاہدہ طے پایا۔ اس معاہدے کی ایک شق یہ تھی۔ "اگر کوئی شخص مدینہ سے فرار ہو کر مکہ چلا جائے تو اسے واپس نہیں کیا جائے گا اور اگر کوئی شخص مکہ سے مدینہ میں چلا آئے تو اسے واپس کرنا ہوگا۔" بعض مسلمانوں کو بھی اس یک طرفہ شرط پر شرحِ صدر حاصل نہ تھا۔ حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے ایسے صحابہ کے اطمینان کے لیے فرمایا: "جو شخص مدینہ سے بھاگ جائے، ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔ جو مکہ سے آنا چاہے گا، اللہ تعالیٰ اس کے لیے کوئی نہ کوئی راستہ پیدا کر دے گا۔"

واٹ کہتا ہے:

> "یہ بات کہ معاہدہ کی مذکورہ شرط سراسر یک طرفہ تھی، محمد (ﷺ) کے اسلام کی برتر جاذبیت کے بارے میں یقینِ کامل کی مظہر ہے۔"(۷)

۷۔ اسلام کے قانونِ وارثت اور اس کی عظمت کے بارے میں بھی واٹ کی رائے اس کے بہتر شعور کی علامت ہے۔ وہ اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے:

> "دلچسپی کی بات قانونِ وراثت اور اس کی تفصیلات نہیں۔ اگرچہ یہ بات قابل ذکر ہے کہ عورت کو بھی اسی طرح حق ملکیت دیا گیا ہے جیسے کہ مردوں کو۔ اہم بات یہ ہے کہ اسلام متوفی کے تمام قریبی عزیزوں کے حقوق متعین کر دیتا ہے اور یوں

بااثر مگر بے ضمیر افراد کو نادار و بے کس رشتہ داروں کے حقوق غصب کرنے سے
روک دیتا ہے۔"(۸)

۸۔ مکہ میں حضور ﷺ کے فاتحانہ داخلے اور اس کی اخلاقی عظمت پر بہت سے قدیم و جدید غیر مسلم مصنفین بھی رطب اللسان ہیں۔اس تاریخ ساز لمحے کو گرفت میں لیتے ہوئے واٹ کا قلم بھی سرِ نیاز جھکا دیتا ہے۔

"انتہائی نامساعد حالات میں، بال بال بچتے ہوئے مگر ہمیشہ یقین محکم کے ساتھ آپ ﷺ اپنے نصب العین کی جانب پیش قدمی کرتے رہے۔اگر ہمیں ان واقعات کی تاریخیت کا یقین نہ ہوتا تو بہت کم لوگ یہ بات ماننے پر آمادہ ہوتے کہ مکہ کا ستم رسیدہ پیغمبر ایک بار پھر لیکن ایک فاتح کے طور پر مکہ میں داخل ہو گیا تھا۔"(۹)

۹۔ مستشرقین کے ایک بڑے گروہ نے حضور ﷺ کی کثیر الازواجی (Polygamy) کو بھی بار بار ہدفِ تنقید بنایا ہے۔عام مستشرقین کے برعکس واٹ اس امر کو کسی نفسانی غرض سے منسوب نہیں کرتا۔ایک قبائلی اور بدوی معاشرے میں کثرتِ ازواج کی سیاسی ضرورت کو وہ تسلیم کرتا ہے۔آپ ﷺ کے آزاد کردہ غلام حضرت زیدؓ کی مطلقہ بیوی حضرت زینبؓ سے آپ ﷺ کے نکاح پر بھی ولیم میور، اے سپرنگر، سیل، درمنگھم اور لامانس جیسے مستشرقین نے بہت لے دے کی ہے۔مقامِ افسوس ہے کہ ہمارے بعض قدیم مفسرین بھی اس بارے میں محتاط رویہ نہیں اپنا سکے۔کیرن آرمسٹرانگ نبی اکرم ﷺ کی کثیر الازواجی کے سیاسی اہداف کو قبول کرتی ہے اور اُسی سانس میں وہ حضرت زینبؓ کے ساتھ آپ ﷺ کی شادی کو غیر مستند روایات کی آڑ میں ایک رومانی معاملہ سمجھتی ہے جس میں سیاسی عنصر کا محض احتمال موجود ہے۔واٹ اس کے برعکس اس نکاح کو بھی ایک مکمل سیاسی معاملہ سمجھتا ہے جس میں رومانی عنصر کا محض احتمال موجود ہے۔واٹ کہتا ہے:

"یہ داستان کہ زید کی غیر موجودگی میں زینب کو ایک بار دیکھ کر محمد (ﷺ) ان کے حسن پر

اچانک فریفتہ ہو گئے، ہرگز قرین قیاس نہیں ہے۔(سیرت کے) ابتدائی مآخذ میں بھی اس کاذکر تک نہیں ہے۔"(۱۰)

سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے وہ کہتا ہے:

"اس (حضرت زینبؓ کے ساتھ) نکاح میں سیاسی محرکات اور سماجی اصلاحات دونوں کا دخل تھا۔اس کے بعد آخری درجے میں بھی کسی روحانی اندازِ محبت کی گنجایش بہت کم رہ جاتی ہے۔"(۱۱)

یہ اور اس نوع کے کچھ دوسرے واقعات سیرت ہیں، جہاں ایک صحیح العقیدہ مسلمان چند قدم واٹ کے ساتھ چل سکتا ہے۔اس کے آگے راستے مختلف ہو جاتے ہیں۔اس کے اٹھائے ہوئے بہت سے نکات ایسے ہیں جنھیں اس کی سنگین غلطیاں (Blunders) کہا جا سکتا ہے اور اس لحاظ سے ان پر شدید گرفت کی ضرورت ہے۔

(۱) وحی الٰہی کے بارے میں اس کی رائے قطعاً بے بنیاد ہے۔اس کی بات یہاں تک تو سوفیصد درست ہے کہ وحی کیا نہیں ہے۔لیکن وحی دراصل ہے کیا، اس کے بارے میں اس کی تعبیر سراسر خلافِ واقعہ ہے۔یعنی یہ کہنا کہ وحی سرگی کی کیفیت کا نام نہیں ہے، یقیناً درست بات ہے۔لیکن اسی کے ساتھ ہی یہ کہنا کہ وحی ایک طرح کے تخلیقی تخیل (Creative Imagination) کا نام ہے۔(۱۲) یکسر ناقابل قبول ہے۔اس کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

"یہ کہنا کہ محمد (ﷺ) اپنے مشن میں سنجیدہ تھے، یہ معنی نہیں رکھتا کہ آپ اپنے عقیدے میں حق بجانب بھی تھے۔یہ عین ممکن ہے کہ کوئی شخص بڑی سنجیدگی کے ساتھ کسی غلط راہ پر گامزن ہو۔"(۱۳)

اس کے بعد وہ بڑے دعوے سے کہتا ہے:

"آج کے جدید مغربی انسان کو یہ سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی کہ محمد (ﷺ) (معاذ اللہ) کس مقام پر غلطی کا شکار ہوئے ہوں گے۔ایک انسان جس چیز کو خارجی تجربہ سمجھتا ہے وہ

دراصل اس کے اپنے لاشعور ہی کی تخلیق ہوتا ہے۔"(۱۴)

(۲) کسی غلطی کی اگر بروقت اصلاح نہ کی جائے تو بہت سی دوسری غلطیوں کو جنم دیتی ہے۔ چونکہ واٹ وحی کو سراسر ایک داخلی کیفیت سمجھتا ہے اس لیے دوسرے مستشرقین کی طرح وہ وحی کے بنیادی مآخذ و مصادر کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہے۔ وہ اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح یہ بات کھل کر نہیں کہتا کہ محمد ﷺ بائبل کا براہِ راست علم رکھتے تھے۔ اس کا مسئلہ یہ ہے کہ شمالی عرب کے عیسائی قبائل اور مدینہ و دوسرے مقامات پر فروکش قبائل یہود کے ساتھ وہ آپ ﷺ کے تجارتی و سماجی روابط کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ یہ بات تسلیم کرنے کے بعد بھی کہ اسلام قدیم مذاہب کا محض دھندلا عکس (Pale Reflection of Older Religions) نہیں، وہ اس بات پر اصرار کرتا ہے کہ محمد ﷺ نے صحائف آسمانی کا علم یا تو یہود و نصاریٰ کے ساتھ ذاتی مکالمہ سے اخذ کیا یا پھر اس کا ماخذ مکہ کا عام فطری ماحول ہے۔ اس کے بعد وہ اپنا نتیجۂ فکر ان الفاظ میں پیش کر کے اپنے تئیں فارغ سمجھتا ہے:

"اسلام ایک امتزاج ہے بائبل کے عناصر اور انسانی روح کی آزادانہ تحریک کا جو کہ مقامی حالات کی پیداوار ہے۔"(۱۵)

(۳) واٹ اقلیتوں کے بارے میں اسلام کے شاندار ٹریک ریکارڈ کو تسلیم کرتا ہے۔ وہ اس کے لیے (The Excellent Record of Islam) کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ اسے اعتراف ہے کہ چھوٹی چھوٹی اقلیتی پارٹیاں دولتِ اسلامیہ کے تحت بہت بہتر زندگی گزار رہی تھیں۔ اس کے معاً بعد وہ اس اسلامی روایت کو پہلے سے رائج بدوی طرزِ زندگی سے منسوب کر دیتا ہے جس کے تحت کوئی طاقتور قبیلہ کسی کمزور قبیلے کو اپنی حفاظت میں لے لیتا تھا۔(۱۶) گویا اقلیتوں کے ساتھ حسنِ سلوک مقامی سیاسی حالات اور ثقافتی جبر کا نتیجہ تھا نہ کہ اسلام کی اصل تعلیمات کا بنیادی تقاضا۔

(۴) مستشرقین کا ایک اور محبوب موضوع یہ رہا ہے کہ مکہ کے مظلوم پیغمبر کا کردار حاکمِ مدینہ بن جانے کے بعد کس قدر بدل گیا تھا۔ اول تو اپنے مخصوص مذہبی و تہذیبی پس منظر کے ساتھ وہ اس تصور سے ہی شدید اختلاف رکھتے ہیں کہ پیغمبر کا عصری سیاسیات کے ساتھ بھی کوئی تعلق ہو سکتا ہے۔ وہ اس بات کو سمجھنے سے قاصر ہیں کہ جس پیغمبر کا اسوہ رہتی دنیا تک کے تمام انسانوں کے لیے رول ماڈل ہو، وہ سیاسی امور سے کیونکر لاتعلق رہ سکتا ہے۔ پھر وہ زیادہ سے زیادہ اس حد تک جا سکتے ہیں کہ مکی زندگی میں رسول اللہ ﷺ کے اخلاقی مشن کو پیغمبرانہ کہیں اور مدینہ میں ایک مخصوص خطہ عرب کا ایک کامیاب حاکم اور زیرک سیاست دان مان لیں۔ واٹ کی دونوں کتابیں ''محمد (ﷺ) مکہ میں'' اور ''محمد (ﷺ) مدینہ میں'' اپنے عنوان کے لحاظ سے اس تاثر کو تقویت دیتی نظر آتی ہیں۔ ان دونوں کتب کے مطالعہ کے بعد بھی یہی تاثر قائم رہتا ہے۔ یہ الگ بات کہ ذائقہ بدلنے کے لیے کبھی کبھی وہ یہ اعتراف بھی کر لیتا ہے کہ سیاسی اہداف کے پیچھے مذہبی جذبات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اپنی تیسری کتاب ''محمد (ﷺ) پیغمبر اور سیاست دان'' کے آخری ابواب میں ''جائزہ'' (Assessment) کے عنوان سے جو کچھ اس نے لکھا، وہی دراصل اس کا اصل نظریہ ہے۔ اس نظریہ کے مطابق واٹ پیغمبر اسلام ﷺ کو زیادہ سے زیادہ ایک اخلاقی اور معاشرتی رہنما سمجھتا ہے۔ بقول اُس کے

''مکی اور مدنی دونوں ادوار میں محمد (ﷺ) کے ہم عصر لوگوں نے آپ کو ایک اچھا اور راست باز انسان سمجھا اور تاریخ کی نگاہوں میں آپ ﷺ ایک اخلاقی اور سماجی مصلح ہیں۔''(۱۷)

یہاں واٹ کے فکری مغالطوں کا مختصر جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

وحی کے بارے میں واٹ کا موقف ژولیدہ فکری کا شاہکار ہے۔ ایک موقع پر وہ تسلیم کرتا ہے کہ وحی کسی مزمن مرض کا نام نہیں۔ دوسرے موقع پر وہ وحی کو تخلیقی تخیل کی کوئی قسم سمجھتا ہے۔ تیسرے

موقع پر وہ خود تسلیم کرتا ہے کہ یہ نظریہ بھی وحی کی صرف ہیئت (Form) کی تعبیر کرتا ہے نہ کہ مواد (Content) کی۔ اس کی مشکل قابل فہم بھی ہے۔ وحی جیسے غیر معمولی اور استثنائی علم کے بارے میں کوئی پیغمبر ہی آخری بات کہہ سکتا ہے۔ ختم نبوت کے ساتھ ہی یہ باب ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا ہے۔ غیر متعلق لوگوں کے بیانات محض اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے کے مترادف ہیں۔

وحی کے مبینہ ماخذ کا مسئلہ بھی وحی کی نوعیت کے ساتھ منسلک ہے۔ جب تک منکرین، وحی محمدی ﷺ کے الوہی سرچشمے کو تسلیم نہیں کرتے، وہ اسی طرح کے ممکنہ مآخذ کی بے سود تلاش میں بھٹکتے رہیں گے۔ ناقدین وحی محمد ﷺ غالباً ایک اہم بات سے بالکل غافل ہیں۔ الہامی مذاہب کے کسی منکر کے لیے نبوتِ محمدی ﷺ کے منکر ہونے کی کوئی گنجایش نہیں۔ وحی محمدی ﷺ کے انکار کا مطلب کسی بھی پیغمبر کے انکار کے ہم معنی ہے۔ جیسا کہ باسورتھ سمتھ نے کہا:

> ”ہمارے پاس اس امر کا کوئی معیار نہیں جس کے تحت پیغمبر اسلام (ﷺ) کے دعویٰ نبوت کا تو ہم انکار کر دیں اور قدیم عبرانی انبیا کرام کے ایسے ہی دعویٰ نبوت کو تسلیم کر لیں۔“ (۱۸)

واٹ کا ایک اور انداز یہ ہے کہ پہلے اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے کسی فرمان یا اختیار کردہ پالیسی کو وہ بنظر استحسان دیکھتا ہے اور پھر اسی سانس میں اس پہلو کو یا تو خطۂ عرب کے قبائلی معاشرے کی مروجہ رسوم کے ساتھ منسوب کرتا ہے یا پھر حالات کے جبر کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ اس کا موقف یہ ہے کہ اقلیتوں کے ساتھ حسنِ سلوک اسلام کی تعلیمات کا بنیادی تقاضا نہیں، رائج الوقت بدوی قبائل کے طرزِ زندگی کے اثرات کا نتیجہ تھا۔ یہ بیک وقت ایک مقامی یا علاقائی بات کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دینے (Over estimation) اور اصلاً غیر معمولی بات کو غیر اہم بنانے (Under estimation) کے مترادف ہے۔ فاضل مصنف نے اسلام کے بین الاقوامی مزاج کو سرے سے قابل ذکر نہیں سمجھا۔ اسلام وہ دین ہے جس میں اللہ رب العالمین ہے۔ رسول اللہ ﷺ رحمۃ للعالمین ہیں اور قرآن ذکر للعلمین ہے۔ اپنے بنیادی و عالمی تصورات و عقائد کے تحت

اسلام اقلیتوں کے ساتھ کسی بھی ظلم و زیادتی کا روادار کیونکر ہو سکتا ہے۔

حضور ﷺ کی مکی و مدنی زندگی کا موازنہ کرتے ہوئے بھی واٹ نقطۂ اعتدال کو نہیں پا سکا۔ واٹ کے مقابلے میں ہملٹن گب کا ایک ہی جملہ کہیں زیادہ مبنی برحقیقت ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی مکی اور مدنی زندگی کا تقابل کرتے ہوئے اس نے درست کہا تھا کہ ان دونوں ادوار میں کوئی تفاوت نہیں ہے۔ مکی زندگی کی تعلیمات میں جو بات مضمر (Implicit) تھی، مدنی دور میں وہ ظاہر یعنی (Explicit) ہو کر سامنے آ گئی۔ (۱۹) اسی طرح واٹ نے کھل کر اس سوال کا جواب نہیں دیا کہ مدینہ میں رسول اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں کیا تغیر رونما ہوا تھا۔ بعض اوقات اُسے مدنی دور کے سیاسی اقدامات ایک پیغمبر کی شان کے منافی نظر آتے ہیں۔ ایک دوسرے مستشرق آر باسورتھ سمتھ (Basworth Smith,R) کے ہاں واٹ کو اپنے اعتراض کا شافی جواب مل سکتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

> ''مجموعی طور پر میرے لیے حیران کن بات یہ نہیں کہ محمد (ﷺ) مختلف حالات میں کس قدر بدل گئے۔ اصل حیرانی کی بات یہ ہے کہ آپ ﷺ کس قدر کم بدلے۔ صحرا میں ایک گلہ بان کے طور پر، شام کی طرف جانے والے ایک تاجر کے طور پر، مدینہ میں ایک جلاوطن کے طور پر، ایک مسلم فاتح کے طور پر، شاہانِ کسریٰ اور قیاصرۂ روم کے مدمقابل غرض جس حیثیت سے بھی دیکھیں، ہمیں آپ ﷺ کی شخصیت کے اندر ایک بامعنی وحدت نظر آتی ہے۔ مجھے اس امر میں شبہ ہے کہ کسی بھی دوسرے انسان کے خارجی حالات اس قدر تبدیل ہوئے ہوں اور پھر بھی ان حالات کا سامنا کرتے ہوئے بذاتِ خود وہ اس قدر کم تبدیل ہوا ہو۔ یہاں واقعات و حوادث تبدیل ہو گئے ہیں۔ شخصیت کا جوہر بہرصورت یکساں رہا ہے۔'' (۲۰)

واٹ کے ہاں اور بھی بہت سی خلافِ واقعہ باتوں کی بھرمار ہے مثلاً:

۱۔ ''محمد (ﷺ) نے کعبہ میں مورتیوں کی پوجا پر کبھی بھی براہِ راست تنقید نہیں کی۔'' اس کے

نزدیک "خود قرآن میں کعبہ کے بتوں پر کوئی تنقید نہیں کی گئی۔ اگر محمد ﷺ کعبہ کے بتوں پر تنقید کرتے تو عرب کے باشندے مکہ آنا بند کر دیتے اور اس وجہ سے تجارت ٹھپ ہو جاتی۔ مکہ کے اطراف میں مورتیوں پر نکتہ چینی کرنے سے ایسا کوئی خطرہ نہیں تھا۔" (۲۰ الف) یہ دعویٰ اس حقیقت کے باوجود کیا جا رہا ہے کہ بتوں پر رسول اللہ ﷺ کی مسلسل تنقید سے قریش مکہ سخت پریشان تھے۔ جب کوئی چارہ کار نہ رہا تو کچھ لو اور کچھ دو کے اصول پر مصالحت کے لیے آپ ﷺ کے چچا جناب ابوطالب کے پاس پہنچ گئے تھے۔ مزید یہ کہ حق و باطل میں اس مصالحانہ پیش کش کو جب آپ ﷺ نے اپنے پائے استحقار سے ٹھکرا دیا تو ابتلاء و آزمایش کا بہت کڑا دور شروع ہوا جس کے مراحل شعب ابی طالب، سفر طائف اور پھر ہجرت مدینہ ہیں۔

۲۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ کفار کی طرف سے مسلمانوں پر ظلم و ستم کے جو پہاڑ توڑے گئے ان کے بیان میں مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہے۔ بقول اس کے قریش کی طرف سے حریفانہ دباؤ معمولی تھا۔ کاش واٹ سورۃ العنکبوت، سورۃ القصص، سورۃ الزمر اور سورۃ النحل جیسی مکی سورتوں کا بغور مطالعہ کر لیتا تو اسے مکہ میں حالات کی سنگینی کا کچھ اندازہ ہو جاتا۔

۳۔ ایک جگہ وہ یہ دلچسپ دعویٰ بھی کرتا ہے کہ غارِ حرا میں آپ کے جانے کی ایک سے زیادہ وجوہ ہو سکتی ہیں۔ مثلاً گوشہ نشینی کو مستحسن سمجھنے میں یہودیوں اور مسیحیوں کا راہبانہ جذبہ کارفرما ہو سکتا ہے۔ محدود شخصی تجربہ بھی ایک امکانی وجہ ہو سکتی ہے۔ یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ جو لوگ مکہ میں سخت گرمی سے بچنے کے لیے طائف جانے کی قدرت نہیں رکھتے تھے وہ گرمی کی شدت سے بچنے کے لیے غاروں کا بھی رخ کیا کرتے تھے۔ ممکن ہے کہ محمد ﷺ نے بھی ایسا ہی کیا ہو۔ (۲۱) علمائے اسلام نے بجا طور پر سوال اٹھایا ہے کہ گرمی گزارنے کے لیے آنے والے تنگدست اور محتاج لوگ آخر کہاں قیام کرتے تھے؟ کیا ہر ایک کنبہ الگ الگ غار میں رہتا تھا جس طرح اس کے خیال کے مطابق رسول ﷺ غار میں رہتے تھے یا پھر پہاڑ کی سطح

پر خیمے نصب کر دیتے تھے۔ پھر اس پہاڑ کی کیا خصوصیت ہے جبکہ مکہ میں اور بھی پہاڑ تھے۔(۲۲)

۴۔ واٹ کے نزدیک وہ لوگ غلطی پر ہیں جو جنگِ احد میں شکست کو حضرت محمد ﷺ کی سیاسی یا فوجی شکست سمجھتے ہیں۔ وہ اس جنگ کو ایک برابر کا مقابلہ سمجھتا ہے۔(۲۳) تاہم اس بیان کی سیاہی خشک نہیں ہونے پاتی کہ وہ اسے حضرت محمد ﷺ کی روحانی شکست (Spiritual Defeat) کا نام دے دیتا ہے۔(۲۴) واٹ کو اس بات کا اندازہ نہیں کہ روحانی شکست عسکری شکست سے بھی زیادہ بری ہوتی ہے اور پھر یہ بات طے شدہ ہے کہ جنگِ احد بہر حال مسلمانوں کی اخلاقی اور روحانی برتری پر منتج ہوئی۔ صرف ایک ہی موازنہ کافی ہے۔ جنگِ بدر میں فتح کے بعد اسیرانِ جنگ کے ساتھ مسلمانوں کا سلوک کیا تھا اور جنگِ اُحد میں مسلمانوں کی لاشوں کے ساتھ کفارِ مکہ کا سلوک کیا تھا۔ یہ امر اس حقیقت کے تعین کے لیے کافی ہے کہ روحانی شکست کیا ہے اور کیا نہیں ہے؟ اور یہ کہ روحانی شکست کس فریق کے حصہ میں آئی؟

۵۔ واٹ نے نمازِ پنجگانہ کے متعلق بھی عجیب وغریب دعویٰ کیا ہے۔ اس کے بقول ”کوئی مستند شہادت دستیاب نہیں جس سے ثابت ہو کہ پانچ مستقل نمازیں پیغمبرِ اسلام ﷺ کی زندگی میں متعین کی جا چکی تھیں۔ یہ گویا بعد کی پیش رفت ہے۔ نماز کے متعلق اُمت کا تواتر بھی اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ بظاہر اسلامی تاریخ لکھتے ہوئے واٹ ابتدائی ماٰخذ کو بہت اہمیت دیتا ہے لیکن ابتدائی ماٰخذ پر ہی مبنی سیرتِ پاک کی ایک دوسری کتاب میں مارٹن لنگز کا دعویٰ ہے کہ نمازِ پنجگانہ کا تعین حیاتِ طیبہ ﷺ میں ہی ہو چکا تھا۔“(۲۵)

ہجرتِ حبشہ، افسانہ غرانیق اور حضور ﷺ کی شمالی پالیسی کے عنوان سے اُس نے جو کچھ لکھا ہے اس پر قدرے تفصیل سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

ہجرتِ حبشہ

ہجرتِ حبشہ کے بارے میں مشہور اور مسلمہ روایات اور حقائق کو نظر انداز کرتے ہوئے واٹ

کچھ دوسرے غیر متعلق اسباب وعلل پر ساری توجہ مرکوز کر دیتا ہے۔ یہ بات کہ ہجرت حبشہ کا اصل سبب اہلِ ایمان کے ساتھ اہلِ مکہ کی ہونے والی مسلسل اور ناقابل برداشت زیادتیاں تھیں وہ پہلے ہی مسترد کر چکا ہے۔ اس کے خیال میں وجوہات بالکل دوسری تھیں۔ (۱) محمد ﷺ اہلِ حبشہ سے عسکری امداد کی توقع کر رہے تھے۔ جس کے بل پر آپ ﷺ مکہ کا کنٹرول حاصل کر لیتے۔ (۲) محمد ﷺ حبشہ کو اپنا مرکز بنا کر مکہ کی تجارت پر حملہ آور ہونا چاہتے تھے۔ جیسا کہ آپ ﷺ نے بعد ازاں مدینہ کو بنایا۔ (۳) آپ ﷺ جنوب میں بازنطینی سلطنت کی طرف سے ایک متبادل تجارتی راستے کی تلاش میں تھے تاکہ تجارت مکہ کی اجارہ داری کا خاتمہ ہو۔ (۲۶) ان وجوہات کو بیان کرنے کے بعد وہ ان سے بھی الگ سب سے اہم وجہ بیان کرتا ہے۔

''نوزائیدہ اسلام کے اندر (اختلافِ رائے کی وجہ سے) ایک زبردست تقسیم رونما ہو چکی تھی۔ اس کے کچھ ہلکے نشانات اس رقابت میں مل جاتے ہیں جو ابوبکرؓ کے گروہ اور عثمان بن مظعونؓ کے گروہ کے مابین موجود تھی۔''

آگے چل کر واٹ بتاتا ہے۔ ''عثمان بن مظعونؓ قبولِ اسلام سے قبل بھی ایک منضبط زندگی گزارتے تھے اور شراب سے پرہیز کرتے تھے۔ بعد ازاں وہ اسلام میں بھی راہبانہ تصور (Ascetic Note) کے نفوذ کے لیے کوشاں رہے۔ جس کی محمد ﷺ نے تائید وتوثیق نہ کی۔ اپنے انتہائی متقیانہ جوش وخروش (Puritian zeal) اور موثر روابط کی وجہ سے انھیں وہ پالیسی بالکل ناگوار تھی جس کی تائید وحمایت ابوبکرؓ جیسے بااثر لوگ کر رہے تھے۔'' (۲۷)

اس بحث کے بعد وہ قیاس آرائی کرتے ہوئے کہتا ہے:

''غالباً مہاجرین حبشہ بڑھتی ہوئی اور شدید مزاحمت کے بارے میں حضور ﷺ کے اختیار کردہ راستے کو ناپسند کرتے تھے۔ جیسا کہ سیاست میں آپ کی بتدریج سرگرمی سے ظاہر ہوتا ہے...... محمد (ﷺ) اس ابتدائی گروہ بندی سے آگاہ ہو گئے ہوں گے اور اس کی درستی کے لیے آپ ﷺ نے اقدامات بھی اٹھائے ہوں

گے۔ آپ ﷺ نے ایسے صحابہ کو حبشہ جانے کے لیے کہا ہو گا تا کہ اسلامی مفادات کو آگے بڑھایا جاسکے۔"(۲۸)

فن سیرت ایک مستقل فن ہے اور دوسرے علوم وفنون کی طرح اس میں ترقی اور ارتقا کے بہت سے امکانات پوشیدہ ہیں۔ نیز کسی بھی علم کی ترقی کے لیے نئے نئے سوالات کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ مستشرقین کو جہاں اس بات کا کریڈٹ ملنا چاہیے کہ ان کی وجہ سے بہت سے عظیم اسلامی مصادر اور مآخذ دریافت ہوئے اور انھیں جدید اسلوب کی روشنی میں پیش کیا گیا۔ وہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ انھوں نے بعض نئے سوالات اٹھائے ہیں جن کا جواب جدید مسلمان علما و محققین کے ذمے ہیں۔ ان سوالات کے جواب میں سیرتِ پاک ﷺ کے بہت سے نادر گوشے دستیاب ہوسکتے ہیں جن پر متقدمین کی نظر نہیں گئی۔ ہجرتِ حبشہ ایک ایسا ہی موضوع ہے۔

یہ کہنا کہ ہجرتِ حبشہ کا بنیادی سبب کفار کا ناقابل برداشت ظلم وستم تھا، بڑی حد تک درست ہے۔ تاہم یہ کہنا مکمل طور پر درست نہیں کہ ہجرتِ حبشہ کا یہ واحد سبب تھا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ مہاجرین حبشہ میں بعض وہ صحابہؓ شامل نہیں ہیں جو مکہ میں شدید ظلم وستم کی چکی میں پس رہے تھے۔ حضرت بلالؓ اور حضرت عمار یاسرؓ مصائب سہتے رہے لیکن انھوں نے ہجرت نہ کی۔ اس کے برعکس حضرت جعفر طیارؓ، حضرت عثمان بن مظعونؓ، حضرت زبیر بن العوامؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ، حضرت حذیفہ بن عتبہؓ، حضرت خالد بن سعیدؓ اور حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ جیسے مکہ کے سربرآوردہ صحابہ کا مظلومین مکہ میں شمار نہیں ہوتا۔ پھر بھی انھوں نے ہجرت کی۔ چنانچہ یہ یقین کرنے کی بہت سی وجوہ موجود ہیں کہ حضور ﷺ کے سامنے ہجرتِ حبشہ کے ایک سے زیادہ مقاصد تھے۔ ایک ایسا ہی مقصد یہ ہوسکتا ہے کہ آپ ﷺ دعوتِ اسلامی کے مستقل مرکز کے لیے بیرونِ ملک بھی کسی مقام کی تلاش میں تھے اور قائدانہ صلاحیت رکھنے والے صحابہؓ کو حبشہ بھیجنے کا مقصد گویا (Fact Finding Mission) تھا۔(۲۹) بہرحال جدید مسلم سیرت نگاروں کا یہ فرض ہے کہ حبشہ کے متنوع اسباب پر روشنی ڈالیں اور یہ کہ ہجرتِ مدینہ کے بعد بھی بعض مہاجرین کے سالہا سال

تک حبشہ میں قیام کے کیا دور رس مقاصد تھے۔

تاہم واٹ نے ہجرتِ حبشہ کی بحث کرتے ہوئے اس خلا کو جس طرح خود پر کرنے کی کوشش کی ہے، مسلمان محققین کو بجا طور پر اس بارے میں شدید تحفظات ہیں۔ پروفیسر ظفر علی قریشی نے اپنی کتاب (Prophet Muhammad and His Western Critics) میں واٹ کے نظریے کو عجیب وغریب (Fantastic) اور دور از کار (Far fetched) قرار دے کر اس کے بنیادی نقائص کی خوب نشان دہی کی ہے۔ ان کے بیان کے مطابق:

۱۔ مہاجرین حبشہ کے پہلے گروہ کی قیادت کے بارے میں ابن ہشام کے ہاں کسی گمنام عالم کے حوالے سے حضرت عثمان بن مظعونؓ کے بارے میں معمولی سا اشارہ ملتا ہے۔ مسلمانوں کی تاریخی روایت میں کسی مجہول راوی کی کوئی اہمیت نہیں۔ کسی دوسری قابل ذکر روایت میں بھی حضرت عثمان بن مظعونؓ کی قیادت کا ذکر نہیں ملتا۔ یہ بات بھی ثابت شدہ ہے کہ جب مہاجرین حبشہ کو نجاشی کے دربار میں بلایا گیا تو مسلمانوں کی طرف سے حضرت عثمان بن مظعونؓ نے نہیں، حضرت جعفر طیارؓ نے نمایندگی کی تھی۔ (۳۰)

۲۔ یہ بات قرینِ قیاس نہیں ہے کہ اسلام کے بالکل ابتدائی دور میں بنیادی اختلافات بہت شدید ہو گئے تھے یا ان اختلافات کے حل کی واحد صورت یہ تھی کہ ایک گروہ کو ملک سے باہر بھیج دینا ضروری ہو۔ خصوصاً اس حالت میں کہ مسلمانوں کی جمعیت پہلے ہی کل چالیس نفوسِ قدسیہ سے زیادہ نہ تھی۔ یہ بات بھی ناقابل تصور ہے کہ حضرت ابوبکرؓ سے بنیادی اختلافات کے بعد ان اختلافات کو اپنے منطقی انجام تک پہنچائے بغیر حضرت عثمانؓ نے حبشہ کی راہ لی ہو۔ (۳۱)

۳۔ واٹ نے حضرت عثمان بن مظعونؓ کے خصوصی مزاج پر ایک بہت بڑی لیکن بہت کمزور عمارت تعمیر کر دی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ حضرت عثمانؓ ایام جاہلیت میں بھی شراب اور فسق وفجور سے کنارہ کش تھے۔ یہی بات حضرت ابوبکرؓ کے بارے میں بھی ریکارڈ پر ہے کہ وہ ایام

جاہلیت میں بھی رائج الوقت ثقافتی عیاشیوں کے قریب نہ پھٹکتے تھے۔ اسلام لانے کے بعد ان کا کردار اور زیادہ قابل رشک ہوگیا۔ دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ جب بھی کبھی حضرت عثمان بن مظعونؓ پر ترکِ دنیا کا غلبہ ہوتا تو حضور ﷺ کی بروقت ہدایت کے بعد وہ اپنے رویے پر نظر ثانی کر لیتے۔ پروفیسر ظفر علی قریشی نے اس کی مثالیں بھی پیش کی ہیں۔

۴۔ فاضل مصنف اس بات سے پوری طرح آگاہ نہیں ہے کہ اسلام نام ہے احکام الٰہی اور فرمودات رسول ﷺ کے مجموعے کا۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عثمان بن مظعونؓ جیسی بلند مرتبت شخصیات بھی اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھیں کہ اسلام میں کسی کو بھی اپنے ذاتی نظریے یا مخصوص مزاج کو داخل کرنے کا استحقاق حاصل نہیں ہے۔ اسلام عیسائیت نہیں ہے جس میں کسی وقت کوئی سینٹ پال اٹھے اور اپنے ذاتی نظریات و مزعومات کو مذہب میں داخل کر کے اس مذہب کا بانی ثانی قرار پائے۔ (۳۲)

افسانہ غرانیق

واٹ نے اگر پہلے یہ اعتراض کیا تھا کہ حبشہ کے مہاجرین ہجرتِ مدینہ کے بعد بھی اتنی زیادہ دیر حبشہ میں کیوں مقیم رہے؟ تو دوسری طرف وہ اِس سوال کو بھی لے کر بیٹھ جاتا ہے کہ بعثت کے پانچویں سال ہی مہاجرین کی کچھ تعداد اس قدر جلد کیوں واپس آگئی اور پھر واپس بھی چلی گئی۔ پہلے اعتراض کے بارے میں قبل ازیں لکھا جا چکا ہے کہ مسلم مورخین نے اِس سوال کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دی۔ پھر بھی یہ بات خارج از امکان ہے کہ اِس تاخیر کا کوئی تعلق اس پیغمبر ﷺ کی ذات مبارک یا آپ ﷺ کے دوسرے قریبی صحابہؓ کے ساتھ کسی سیاسی اختلاف سے ہو جن سے وابستہ ہونے کے بعد انھوں نے اپنا سب مفاد بلکہ وطن تک قربان کر دیا تھا۔ دوسرے سوال کا جواب اِس قدر مشکل نہ تھا اگر واٹ اور بعض ابتدائی مسلم مورخین ایک دو امور پر ہی اچھی طرح غور و خوض کر لیتے۔ مثلاً یہ ایک حقیقت ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کے قبولِ اسلام کے بعد مسلمان اپنے اسلام کا برملا اظہار کرنے لگے تھے اور حرم شریف میں بعض اوقات نماز کی ادائیگی بھی ممکن تھی۔

حالات کی یہ عارضی تبدیلی حبشہ کے دور دراز مقام پر ایک افواہ بن کر پہنچ سکتی ہے کہ مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان حالات کو پر امن رکھنے کے لیے کوئی سمجھوتہ طے پا چکا ہے۔(۳۳) اِسی طرح مسلمان مورخین کے ہاں یہ بات بھی ملتی ہے کہ خود حبشہ میں نجاشی کے قبولِ اسلام کی جانب رُجحان کو دیکھ کر اس کے خلاف ایک بغاوت کا شدید امکان پیدا ہوگیا تھا۔ بعض مسلمان حالات کی اس کروٹ کا اندازہ لگاتے ہوئے واپس چلے آئے۔(۳۴) اور ایک بار پھر انھوں نے مکہ کے یقینی خطرے کو دیکھ کر حبشہ کے موہوم خطرے کو ترجیح دی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مشرکین مکہ کی سفارت حبشہ سے ناکام لوٹی تو بعد ازاں انھوں نے اپنے موثر ذرائع ابلاغ سے مہاجرین حبشہ کو پریشان کرنے کے لیے خود ہی یہ جھوٹی خبر پھیلا دی ہو کہ مکہ میں حالات نارمل ہو گئے ہیں۔

ان سب امکانات کو مسترد کرتے ہوئے مستشرقین نے غرانیق کے نام سے ایک افسانے کا بار بار ذکر کیا ہے اور پھر مہاجرین حبشہ کی جلد واپسی کو اس افسانے کے ساتھ منسوب کر دیا۔ بدقسمتی سے ہمارے دینی ادب میں انھیں بعض مشہور و مقبول قسم کے لوگوں کے ذریعے ایسی غیر ثقہ روایات ہاتھ آگئی ہیں جنھیں قرآن اور حامل قرآن ﷺ کی صداقت و ثقاہت کو مجروح کرنے کے لیے خوب اُچھالا گیا ہے۔ اسپرنگر، ایچ گریمی، میکسم راڈنسن اور ولیم میور نے اِس افسانے کو بڑھ چڑھ کر ہوا دی۔ ولیم میور نے لکھا:

> ''لوگوں کی مسلسل عداوت نے حضرت محمد ﷺ کے جوش و جذبہ کو متاثر کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہ بات راسخ العقیدہ راوی (؟) بھی مانتے ہیں کہ وہ دل ہی دل میں کسی ایسے فقرے پر غور کر رہے تھے جو کہا جاتا ہے کہ شیطان نے اُن کی زبان سے ادا کر دیا۔'' (نعوذ باللہ)۔(۳۵)

وہ مزید لکھتا ہے:

> ''بظاہر ایک غیر معتبر قصہ موجود ہے جس سے محمد ﷺ کا کفار مکہ کے ساتھ ایک عارضی موافقت اور مصالحت کرنا ثابت ہوتا ہے۔''(۳۶)

واٹ بھی ولیم میور اور بعض دوسرے مستشرقین کی لے سے لے ملا کر بلکہ کچھ اُونچے سروں میں افسانہ طرازی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اُس نے بھی اپنی کتاب کے تیسرے باب Opposition and Rejection کے ایک ذیلی عنوان The incident of Satanic Verses میں اس افسانے کا حوالہ دیتے ہوئے خوب رنگ آمیزی کی ہے۔ واٹ لکھتا ہے:

> This is a strange and surprising story. The prophet of the most uncompromisingly monotheistic religion seems to be authorizing polytheism. Indeed the story is so strange that it must be true in essentials. It is unthinkable that anyone should have invented such a story and persuaded the vast body of Muslims to accept it. (۳۷)

> "یہ ایک عجیب وغریب اور حیران کن داستان ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے انتہائی بے لچک توحیدی مذہب لانے والا پیغمبر شرک کو سندِ جواز بخش رہا ہے۔ (العیاذ باللہ) فی الحقیقت یہ داستان اس قدر متحیر کر دینے والی ہے کہ بنیادی امور کی حد تک تو ضرور ہی مبنی بر حقیقت ہوگی۔ یہ بات ناقابل قیاس ہے کہ کسی ایک شخص نے یہ کہانی خود گھڑلی اور مسلمانوں کی ایک معتدبہ تعداد کو اس واقعہ کی قبولیت کے لیے آمادہ بھی کرلیا۔"

اب ذرا وہ افسانہ بھی ملاحظہ ہو جس کو گو واٹ نے مختصراً بیان کیا ہے لیکن ہمیں اس پر قدرے تفصیل کے ساتھ لکھنا ہے۔ کیونکہ دراصل یہ دین کی پوری بنیاد کو منہدم کرنے کی ایک بھونڈی کوشش ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ایک بار حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے حرم کعبہ میں مشرکین کی موجودگی میں سورۃ والنجم کی تلاوت کی۔ جب آپ ﷺ اس آیت پر پہنچے۔

اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى ۝ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى ۝ (النجم ۵۳: ۱۹۔۲۰)

”کیا تم نے کبھی اِس لات، عزیٰ اور تیسری ایک دیوی منات کی حقیقت پر غور کیا ہے۔“ تو یکا یک آپ ﷺ کی زبان پر یہ الفاظ جاری ہو گئے۔

تلك الغرانيق العلیٰ۔ وان شفاعتهن لترتجیٰ

”یہ بلند مرتبہ دیویاں ہیں، اُن کی شفاعت ضرور متوقع ہے۔“ (نعوذ باللہ)

رسول اللہ ﷺ نے اِسی حالت میں باقی سورت مکمل کی اور آخر میں جب سجدہ کیا تو مسلمانوں کے ساتھ وہاں پر موجود مشرکین بھی سجدے میں گر گئے۔ مشرکین نے کہا۔ اب ہمارا محمد ﷺ سے اختلاف باقی نہیں رہا۔ ہم تو پہلے سے کہتے تھے کہ اللہ کے دربار میں یہ بت ہمارے سفارشی ہیں۔ مشرکین مکہ نے اِسی خوشی میں آپ ﷺ کو کندھوں پر اُٹھا کر حرم کعبہ کا چکر لگایا اور کہتے جاتے تھے۔ ”یہ بنوعبد مناف کے نبی ہیں۔“ شام کو جبریل امین تشریف لائے۔ انھوں نے کہا۔ اللہ کی پناہ! یہ دو فقرے تو میں نے ہرگز نہیں پڑھے تھے۔ اس پر حضور ﷺ شدید صدمے سے دوچار ہوئے۔ سورۃ بنی اسرائیل کی آیات (۷۳۔۷۵) آپ ﷺ کی تشفی کے لیے نازل ہوئیں، جن میں فرمایا گیا کہ: ”اگر ہم نے آپ ﷺ کو نہ روکا ہوتا تو آپ ضرور مائل ہو جاتے اُن کی طرف کچھ نہ کچھ۔“ اِس کے کچھ عرصے بعد سورۃ الحج کی آیت (۵۲) کا نزول ہوا، جس کا مفہوم ہے کہ آپ کے ساتھ یہ کوئی انوکھا واقعہ پیش نہیں آیا۔ اس سے پہلے بھی شیطان انبیا پر نازل ہونے والی وحی میں مداخلت کرتا رہا ہے اور ”اس طرح جو کچھ بھی شیطان دخل اندازیاں کرتا ہے اللہ اُن کو مٹا دیتا ہے۔“

یہ ہے وہ افسانہ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں اور مشرکوں میں عارضی صلح کا باعث بن گیا۔ اس عارضی صلح کی خبر پا کر مہاجرین حبشہ واپس پہنچے تو پتا چلا کہ صلح کی خبر غلط تھی کیونکہ

مشرکین کی پسندیدہ دیویوں کے حق میں نازل ہونے والی آیات منسوخ ہو چکی تھیں۔ واضح رہے کہ واٹ نے اپنی پہلی کتاب Muhammad at Macca میں اس افسانے کو یہ کہہ کر نظر انداز کر دیا تھا کہ اس کی تفصیلات ہمارے اندر کوئی اعتماد پیدا نہیں کرتیں۔ زیرِ بحث کتاب میں پیغمبر اسلام ﷺ کو وہ ایک ایسے دُنیادار سیاست دان کے روپ میں پیش کرنا چاہتا ہے جو نعوذ باللہ بنیادی دینی اقدار تک کو سیاسی مصالح پر قربان کرنے کے لیے تیار تھے۔ اس کے نزدیک حالات کے جبر نے آپ ﷺ کو بت پرستی کا زبردست مخالف بنا دیا، ورنہ اسلام شروع میں بت پرستی کے خلاف نہ تھا۔ جب اسلام اور کفر کی کشمکش شدید تر ہوگئی تو بھی آپ کی خواہش بلکہ کوشش تھی کہ کسی نہ کسی طرح یہ محاذ آرائی کم ہو جائے۔ بقول واٹ شیطانی کلمات کے نزول اور اُن کے منسوخ ہونے کے پیچھے سیاسی عوامل موجود تھے۔ (۳۸) واٹ اس افسانے کی آڑ میں فنِ تفسیر کی ایک اصطلاح ناسخ و منسوخ کے حوالے سے یہ تاثر دینا چاہتا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ جس آیت کو جب بھی خلافِ مصلحت سمجھتے تھے اُسے منسوخ (Abrogate) کر دیا کرتے تھے اور اس میں عقیدۂ توحید تک کو استثنیٰ حاصل نہ تھا۔ قرآنی علوم کا ادنیٰ طالب علم بھی جانتا ہے کہ ناسخ و منسوخ کا نہ یہ مفہوم ہے اور نہ اِس کا کوئی تعلق عقائد کے ساتھ ہے۔

بدقسمتی سے یہ افسانہ ابن جریر طبری، ابن سعد، موسیٰ بن عقبہ، عروہ بن زبیر، ابن اسحٰق، ابن شہاب زہری اور بہت سے دوسرے ابتدائی مورخین کے ہاں بھی راہ پا گیا ہے۔ قاضی عیاض کے نزدیک صحاح ستہ کے مؤلفین میں سے کسی نے بھی اس واقعہ کو اپنے ہاں نقل نہیں کیا اور نہ یہ کسی صحیح، متصل اور بے عیب سند کے ساتھ ثقہ راویوں سے منقول ہوا ہے۔ بیہقی، ابن کثیر، قرطبی، شوکانی اور آلوسی جیسے محققین نے اِسے سراسر غلط اور من گھڑت قرار دیا ہے۔ سرسید احمد خان نے سیرتِ محمدیؐ میں، مولانا مودودی نے تفہیم القرآن میں، محمد حسین ہیکل نے حیات محمد ﷺ میں اور پیر کرم شاہ نے ضیاالنبی ﷺ جلد ششم میں اِس افسانے پر وارد ہونے والے جو فنی اعتراضات و اشکالات پیش کیے ہیں۔ اُن کی روشنی میں اِس افسانے کی حقیقت غبارِ راہ سے زیادہ نہیں ہے۔ مثلاً

۱۔ اِس واقعہ کے راویوں میں صرف ایک صحابی حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا ذکر ملتا ہے اور اِن آیات کے نزول کا جو زمانہ بتایا جاتا ہے خصوصاً مہاجرین حبشہ کی واپسی سے اِس کا جو جبری تعلق جوڑا جاتا ہے اُس وقت اُن کی ولادت بھی نہ ہوئی تھی۔ بعض مفسرین کے مطابق سورۃ النجم کے آغاز میں واقعہ معراج کا ذکر آیا ہے اور یہ واقعہ ہجرت سے چند سال قبل پیش آیا۔ اُس وقت حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی عمر صرف تین سال تھی۔

۲۔ شیطان کو اللہ تعالیٰ نے یہ اختیار نہیں دیا کہ وہ نبی ﷺ کی شکل وصورت کے ساتھ کسی کے سامنے حالتِ بیداری یا خواب میں ظاہر ہو سکے اور یہ تو بالکل ممکن نہیں کہ وہ آپ ﷺ کی آواز میں اپنی آواز کچھ اِس انداز سے ملائے کہ سامعین، خواہ وہ مسلمان ہوں یا مشرکین، یہ تمیز ہی نہ کر سکیں کہ یہ آواز کس کی ہے۔ پیغمبر کا رتبہ تو بہت بلند ہے، فرمانِ الٰہی کے مطابق شیطان اللہ کے دوسرے بندوں کو بھی زبردستی گمراہ نہیں کر سکتا۔ اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ (الحجر:۴۲) ”بے شک جو میرے حقیقی بندے ہیں اُن پر تیرا بس نہ چلے گا۔“

۳۔ قرآن حکیم میں تقریباً چار مقامات ایسے ہیں جب رسول اللہ ﷺ کی معمولی فردگذاشت پر خالق کائنات کی جانب سے تنبیہ جاری ہوئی۔ یہ معمولی باتیں بھی اس ذات باری کے ہاں آپ ﷺ کے علوِ مرتبت سے فروتر قرار پائیں جس نے آپ ﷺ کے حسنِ کردار کو پوری انسانیت کے لیے تاابد اسوۂ حسنہ بنایا تھا۔ وحی الٰہی میں اتنی عجیب بلکہ نازیبا ملاوٹ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، جبکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انتہائی سخت الفاظ میں حکم ہے۔

”اگر وہ خود گھڑ کر بعض باتیں ہماری طرف منسوب کرتا تو ہم اُس کا دایاں ہاتھ پکڑ لیتے پھر ہم کاٹ دیتے اُس کی رگِ دل۔ پھر تم میں سے کوئی بھی (ہمیں) اِس سے روکنے والا نہ تھا۔“(الحاقۃ:۴۴۔۴۷)

۴۔ یہ واقعہ جن طرق سے روایت کیا گیا ہے، اُن کی نہ صرف اسناد کمزور ہیں بلکہ ان کے متن میں

بھی زبردست اضطراب پایا جاتا ہے۔کسی جگہ بتایا جاتا ہے کہ حضور ﷺ کی زبان سے مذکورہ الفاظ حالتِ نماز میں ادا ہوئے۔کہیں مذکور ہے کہ اس وقت آپ ﷺ حرم کعبہ میں قوم سے مخاطب تھے۔ایک جگہ کہا گیا ہے کہ آپ ﷺ پر اونگھ طاری ہوگئی اور آپ ﷺ نے غیر شعوری طور پر یہ الفاظ ادا کیے۔یہ بھی کہا گیا ہے آپ ﷺ کے دل میں ایک خیال پیدا ہوا اور آپ ﷺ نے اپنی خواہش نفس سے یہ الفاظ ادا کیے۔سب سے مختلف روایت یہ کہ شیطان نے مشرکین کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ حضور ﷺ نے یہ الفاظ ادا کیے ہیں۔

۵۔ ایک نقطۂ نظر یہ ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے مذکورہ آیت کی تلاوت کی تو حرم کعبہ میں موجود مشرکین کو پہلے سے بجا طور پر اندازہ تھا کہ اُن کے محبوب بتوں کے بارے میں اب زبانِ مبارک سے کوئی نہ کوئی منفی بات ہی کہی جائے گی۔لہٰذا انھوں نے پیش بندی کے لیے ایک الحاقی کلمہ اُسی ردیف میں ملا کر پڑھ دیا۔اس سے مسلمانوں کو تو کوئی غلط فہمی نہ ہوئی۔خدانخواستہ ایسا ہوتا تو کوئی نہ کوئی مسلمان ضرور مرتد ہو جاتا۔البتہ بہت سے غیر جانبدار لوگوں کو بھی اشتباہ پیدا ہوگیا۔چنانچہ سورۃ کے آخر میں مسلمانوں نے اپنے رب کو سجدہ کیا اور مشرکین نے اپنے اپنے معبودوں کو۔تلاوتِ قرآن کے دوران مشرکین کی مداخلت کا یہ کوئی پہلا واقعہ نہ تھا۔قرآن نے اُن کے ایک قول کا حوالہ دیا ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ وہ ایسی حرکات کرتے رہتے تھے۔ لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ (حٰمٓ السجدہ:۲۶)۔''اس قرآن کو سنو مت اور اِس میں گڑبڑ کرو۔''

۶۔ افسانۂ غرانیق سے وابستہ روایات کی سب کڑیاں بہت ناقص اور انتہائی کمزور ہیں۔ مہاجرین حبشہ کی جلد واپسی کو اِس سورت کے پس منظر اور مضامین کے ساتھ منسوب کرنا بہت ہی بے بنیاد دعویٰ ہے۔اصل یہ ہے کہ سورۃ النجم کے آغاز میں واقعہ معراج کا ذکر آیا ہے اور بالاتفاق یہ واقعہ ہجرت سے ایک ڈیڑھ سال قبل پیش آیا۔سورۃ حج کی آیات ایک سال بعد از ہجرت نازل ہوئیں۔یہ بات کسی عجوبے سے کم نہیں کہ نعوذ باللہ شیطانی مداخلت تو

۵ بعثت نبوی یا ۸، ۹ بعثت نبوی اور قبل از ہجرت ہوئی۔ اُس پر توجہ اُسی شام دلائی گئی۔ اُس پر عتاب بنی اسرائیل میں کیا گیا اور آیات کی منسوخی سورۃ الحج میں ہجرت کے ڈیڑھ سال بعد عمل میں آئی۔ یوں افسانۂ غرانیق سراسر باطل ٹھہرتا ہے۔

افسانۂ غرانیق کی خرافات کو بہت پہلے مسلم محققین نے محسوس کرلیا تھا۔ ابن ہشام نے جب ابن اسحق کی کتاب سیرت ''المبعث والمغازی'' کی تدوین نو کا بیڑا اٹھایا تو اُس میں موجود بہت سے حشو وزوائد بشمول افسانۂ غرانیق کو رَد کردیا۔ امام مالکؒ (جو ابن اسحق کے ہم عصر بھی ہیں) اور امام احمدؒ بن حنبل جیسے فقہا نے ابن اسحق کی حقیقت وافسانہ کو خلط ملط کردینے کی عادت کے پیش نظر بہت سی باتوں میں اُسے ناقابل اعتبار ٹھہرایا۔ حقیقت یہ ہے کہ کچھ لوگوں نے جنھیں فن تاریخ نویسی میں دخل اندازی کا حق نہ تھا، افواہوں کو بھی اپنی تصانیف میں شامل کرلیا۔ یہ افواہیں اُن کی اپنی ایجاد کردہ بھی تھیں اور غیر مصدقہ قصوں کو بھی اُنھوں نے آرائش بیان کے لیے اپنی تصانیف میں شامل کرلیا۔ بدقسمتی سے بعض متاخرین نے اُن سے یہ قصے آنکھیں بند کرکے ہم تک پہنچا دیے۔ بابائے تاریخ ابن خلدون (۱۳۳۲ء۔ ۱۴۰۶ء) نے انھی وجوہات کی بنا پر اس نوع کے مؤرخین کو تاریخ کے میدان میں ''بن بلائے مہمان'' قرار دیا ہے۔ (۳۹)

بہرحال جدید مفسر شیخ محمد عبدہؒ کی یہ رائے بڑی صائب ہے کہ عصمت انبیا کے عقیدے کو کوئی مرفوع حدیث بھی مجروح نہیں کرسکتی۔ کجا یہ کہ کسی مرسل روایت کو یہ مقام دیا جائے۔ مفتی محمد شفیعؒ اور مولانا امین اصلاحیؒ نے اپنی تفاسیر میں اِس بے سروپا قصے کا ذکر تک کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ مولانا اصلاحیؒ نے سورۃ النجم کی آیات کے رواں ترجمے، بعض الفاظ کی تشریح اور مرکزی مضمون کو اس طریقے سے بیان کیا ہے کہ نظم قرآن کی رو سے شیطانی کلمات سراسر بے جوڑ، غیر متعلق اور الحاقی معلوم ہوتے ہیں۔ اہل عرب کا تو ذکر ہی کیا جنھیں اپنی زبان دانی پر بہت ناز تھا۔ عربی زبان و ادب سے معمولی شدبد رکھنے والا کوئی طالب علم بھی ان کلمات کو الہامی نہیں کہہ سکتا۔ باسٹھ آیات پر مشتمل اس سورۃ کی بعض ابتدائی آیات، مرکزی مضمون اور اختتامی آیات کے ربط کو معلوم کرنے سے

مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ہم اپنی سہولت کے لیے سورۃ النجم کو مضامین کے اعتبار سے پانچ حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

سورۃ کے بالکل آغاز میں آیات (۱۔۲) میں ہے۔''شاہد ہیں ستارے جب وہ گرتے ہیں کہ تمھارے ساتھی پیغمبر نہ بھٹکے ہیں نہ گمراہ ہوئے ہیں''۔ضل سے مراد عام طور پر وہ گمراہی ہے جس کا تعلق بھول چوک یا اجتہادی غلطی سے ہوتا ہے۔غویٰ کا تعلق اُس گمراہی سے ہے جس میں نفس کی اُکساہٹ شامل ہو۔ یہ آیت وحی میں کسی قسم کی کامیاب شیطانی مداخلت کی کھلی تردید ہے۔ستاروں کے غروب وسقوط کی قسم کھا کر مشرکین مکہ کو تنبیہ کی گئی ہے کہ ستارے تو خود خالق کائنات کے مطیع ہیں۔کتنے احمق ہیں وہ لوگ جو اُن سے تقدیر کا حال معلوم کرتے ہیں اور احمق ترین وہ لوگ جو پیغمبر پر نازل ہونے والی وحی کو کاہنوں کی خرافات سے ملا دیتے ہیں۔آیت (۳۔۴) میں فرمایا گیا۔ ''اور وہ (پیغمبر) اپنے جی سے کچھ نہیں بولتا۔ یہ تو بس وحی ہے جو اُس کو کی جاتی ہے۔'' آیت (۵۔۸) میں فرمایا گیا''اِس کو ایک مضبوط قوتوں والے،عقل و کردار کے توانا نے تعلیم دی ہے۔ وہ نمودار ہوا اور وہ اُفق اعلیٰ میں تھا۔پھر قریب ہوا اور جھک پڑا''۔اِس میں وحی لانے والے فرشتہ کے طریق تعلیم کا بیان ہے۔یعنی ایسا نہیں ہوا کہ جبریل امین نے رسمی طور پر کوئی آیت محض پڑھ کر سنادی بلکہ مکمل ابلاغ ان کی منصبی ذمہ داری ہے۔(۴۰) خود نبی ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کو سیکھنے اور قبول کرنے کی جو استعداد عطا ہوئی تھی اُس کی حقیقت آیت (۱۱) میں بتائی گئی۔''جو کچھ اُس نے دیکھا یہ دل کی خیال آرائی نہیں''۔ پھر آیت (۱۷) میں فرمایا۔''نہ نگاہ کج ہوئی اور نہ بے قابو''۔نظر کی غلطی دو وجہ سے ہو سکتی ہے۔(۴۱) ایک یہ کہ جس چیز کو دیکھنا چاہتا تھا نظر اس سے ہٹ کر دوسری طرف چلی گئی۔لفظ مازاغ سے اِسی قسم کی غلطی کی نفی کی گئی ہے۔گویا آپ ﷺ جس چیز کو دیکھنا چاہتے تھے نظر ٹھیک اُسی پر پڑی۔دوسری وجہ نظر کی غلطی کی یہ ہو سکتی ہے کہ نظر پڑی تو اُس چیز پر جس کو دیکھنا مقصود تھا مگر وہ اِس کے ساتھ اِدھر اُدھر دوسری چیزوں کو بھی دیکھتی رہی اُس میں بھی بعض اوقات التباس کا خطرہ ہوتا ہے۔اِس قسم کی غلطی کو رفع کرنے کے لیے وما طغیٰ

کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔(۴۲) آیت (۱۸) میں فرمایا" اُس نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیوں کے مشاہدے کیے۔"

نزول وحی کی اس حقیقت کو بیان کرنے کے بعد دوسرے حصے یعنی آیات (۱۹۔۲۳) میں اِس مفہوم کو بیان کیا گیا کہ کہاں ذی قوت وحشمت جبرئیل امین اور کہاں لات منات وعزیٰ جیسی تمھاری خود ساختہ بے جان مورتیاں جن کے تم نے لمبے چوڑے بے معنی سے نام رکھ دیے ہیں۔ (اسماء سمیتموھا)۔ اِس پر ستم یہ کہ تم انھیں اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے ہو اور خود تمھارے ہاں بیٹیوں کو جو ذلت آمیز مقام حاصل ہے اُس سے دُنیا واقف ہے۔ آیت (۲۶) میں واضح کیا گیا " کتنے فرشتے ہیں آسمانوں میں کہ کام نہیں آئے گی اُن کی سفارش کچھ بھی مگر بعد اس کے کہ حکم دے گا اللہ جس کے لیے چاہے اور پسند کرے۔" یعنی اللہ کے دربار میں اُس کے اپنے فرشتے بھی اُس کی اجازت کے بغیر کسی کے حق میں لب کشائی نہیں کرسکتے۔(۴۳)

تیسرے حصے میں بات مرکزی مضمون تک پہنچ جاتی ہے۔ سورۃ کے مرکزی مضمون کا تعلق کفار کے ہاں رائج شفاعت کے گمراہ کن عقیدے کی تردید سے ہے۔ چنانچہ صحف ابراہیم علیہ السلام و موسیٰ علیہ السلام کے حوالے سے آیات (۳۸۔۴۰) میں فرمایا گیا۔

أَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ أُخْرَىٰ ○ وَأَن لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ ○ وَأَنَّ سَعْيَهُ سَوْفَ يُرَىٰ ○

" کوئی جان کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھائے گی اور یہ کہ انسان کے لیے وہی ہے جو اُس نے کمائی کی ہو گی اور یہ کہ اُس کی کمائی عنقریب ملاحظہ کی جائے گی۔"

چوتھے حصے کی آیات (۴۱۔۴۹) میں اللہ تعالیٰ کی عظمت وکبریائی کا بیان کرتے ہوئے اُس کی قدرت کاملہ کے مختلف ناقابل تردید مظاہر کا ذکر ہے اور پھر آیات (۵۰۔۵۵) میں قوم عاد، قوم ثمود اور قوم نوح کا حوالہ دیا گیا جو اپنے مشرکانہ عقائد اور بداعمالیوں کی وجہ سے عبرت ناک انجام سے دوچار ہوئیں۔ اس حصے میں آیات (۵۶۔۵۷) اور پھر (۵۸۔۶۱) تک اُن کو آنے

والے عذاب کی خبر دی گئی اور فرمایا گیا "تو کیا تم اِس کلام پر متعجب ہوتے ہو! اور ہنستے ہو، روتے نہیں۔"

پانچویں اور آخری حصے میں انھیں انجامِ بد سے بچنے کے لیے فوری طور پر کرنے کا کام آیت (۶۲) میں بتا دیا گیا جو کہ پوری زندگی اُن کا دستور العمل ہونا چاہیے یعنی

فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا ۩

(ہوش میں آؤ!) اللہ ہی کو سجدہ کرو اور اُسی کی بندگی کرو۔

الغرض سورۃ النجم شروع سے آخر تک ایک عضوی اور معنوی وحدت ہے۔ یہ کہنا کہ درمیان میں نعوذ باللہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی خواہش نفس سے یا شیطان کی ترغیب سے لات، منات و عزیٰ کی سفارش کے مشرکانہ عقیدہ کو تسلیم کرنے کا اعلان کیا، نہ صرف سورۃ کے ابتدائی محکم حصے کی صریحاً نفی ہے۔ (۴۴) بلکہ یہ بات اس سورت کے مجموعی مزاج کے ساتھ بھی ایک بے ہنگم جوڑ (a discordant note in general symphony) کا درجہ رکھتی ہے۔ اِس طرح کے تداخل کو صحیح مان لیا جائے تو آیات باہم متناقض ہو جاتی ہیں کہ پہلے تو ایک جملہ میں کسی چیز کی تعریف کی جائے اور معاً بعد مسلسل چار جملوں میں اُس کی مذمت بھی کر دی جائے۔ (۴۵) بہت سے آئمہ فن تفسیر کے نزدیک افسانہ غرانیق بلاشبہ زنادقہ کا وضع کردہ ہے۔ دراصل اِن آیات کی زبانِ وحی ترجمان سے صحنِ حرم میں بلند آواز کے ساتھ تلاوت نے وہ سماں باندھا کہ جب آخر میں سجدہ کرنے کا حکم ہوا تو مسلمانوں کے ساتھ مشرکین مکہ بھی بے اختیار سربسجود ہو گئے۔ بعد میں اپنی خفت مٹانے کے لیے وہ مختلف قسم کی تاویلیں کرنے لگے جن میں سے ایک افسانہ غرانیق ہے۔ یہ بات دعوے کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ سورۃ النجم کو عربی متن کے ساتھ اُس کے مفہوم کو جانتے ہوئے تجوید و قرأت کے اصولوں کی روشنی میں آج بھی کوئی غیر مسلم تلاوت کرے تو اُس کا دل بے اختیار رب کائنات کے روبرو سجدہ ریز ہونے کو چاہے گا۔ واٹ نے اپنے مقاصد کے لیے بعض کمزور روایتوں کا سہارا لے کر اِس واقعہ کے بارے میں خوب خامہ فرسائی کی ہے جبکہ بعض مغربی

محققین نے خود بھی جدید ذرائع تحقیق کی رو سے اِس قصے کو سراسر جعلی اور من گھڑت قرار دیا ہے۔ تور آندرے (Tor Andrae) اپنی کتاب Muhammad: The Man and his Faith میں لکھتا ہے۔"ابن سعد کی لکھی ہوئی کہانی مشکل سے ہی قابل اعتماد کہی جا سکتی ہے۔" وہ مزید کہتا ہے۔"موجودہ حیثیت میں شیطانی آیات کی ساری کہانی تاریخی اور نفسیاتی تضادات سے لبریز ہے۔"(۴۶)

واٹ کے ہاں موجود بے پایاں تضادات میں سے ایک یہ ہے کہ ایک طرف وہ پیغمبر اسلام ﷺ کو سب سے زیادہ بے لچک عقیدۂ توحید کا علمبردار Prophet of the most uncompromising monotheistic religion کہتا ہے اور پھر اِس افسانے کی آڑ میں اِسی بنیادی عقیدے پر سمجھوتہ کرتے ہوئے پیش کرتا ہے۔ واٹ نے قصۂ غرانیق کو جس طرح سیاست نبوی کے ساتھ خلط ملط کیا ہے، اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لفظ پیغمبر (Prophet) کو گویا آپ کے نام کا کوئی سابقہ یا لاحقہ سمجھتا ہے اور اِسے آپ ﷺ کا حقیقی منصب ہرگز نہیں سمجھتا۔

حضور ﷺ کی شمالی پالیسی

حضور ﷺ کی "شمالی پالیسی" کے بارے میں بھی واٹ کا موقف بہت سے مقامات پر عجیب وغریب تضادات کا ملغوبہ ہے۔ بعض مقامات پر وہ حضور ﷺ کو ایک پیغمبر تسلیم کرنے کے بعد اکثر دوسرے مواقع پر بنیادی طور پر ایک ذہین ماہر سیاست اور کبھی ایک معاشی منصوبہ ساز کے طور پر پیش کرتا ہے۔ پھر کسی دوسرے مقام پر تسلیم کر لیتا ہے کہ آپ ﷺ کی ملکی اور بین الاقوامی پالیسیوں کے پیچھے مذہبی مقاصد بھی کارفرما تھے۔ حضور ﷺ کی شمالی پالیسی کے عنوان سے اس نے جو کچھ لکھا ہے اس میں سارا زور اس بات پر دیا گیا ہے کہ شمال کی بازنطینی سلطنت کے خلاف شروع سے ہی گویا اپنے معاشی وتجارتی مقاصد کے تحت آپ ﷺ جارحانہ عزائم رکھتے تھے۔ اس کا نظریہ خود اس کے الفاظ میں کچھ یوں ہے:

"عربوں پر حکمرانی کے لیے آپ ﷺ پر لازم تھا کہ قبائل کی آویزش کا خاتمہ کیا

جائے لیکن اس کے لیے اس قدر کافی نہ تھا کہ خون کے بجائے خون کے اصول پر اصرار کیا جائے۔ یہ بھی ضروری تھا کہ ایک کثیر آبادی کی جنگجویانہ قوتوں کی نکاسی کے لیے کوئی (متبادل) راستہ مہیا کیا جائے۔ آپ ﷺ کو یقین تھا کہ یہ راستہ شمال کی طرف سے ہو کر گزرتا ہے۔" (۴۷)

محدثین اور اسلامی مورخین کے بیان کے مطابق عرب کے شمالی اور عیسائی قبائل کے ساتھ جھگڑے کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ حضور ﷺ نے صلح حدیبیہ کے بعد ان قبائل کے سرداروں کے نام دعوتی و تبلیغی خطوط لکھے تھے۔ جیسا کہ بہت سے دوسرے مقامات کے قبائلی زعما یا فرماں رواؤں کو بھی لکھے گئے تھے۔ بعض روایات کے مطابق کم از کم ایک سو چار مکاتیب نبوی ﷺ اس مضمون پر مشتمل تھے۔ قیصر روم کے نام آپ ﷺ کے خط کا مکمل متن صحیح بخاری میں بھی تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ ایک ایسا ہی خط حاکم بصریٰ کے نام تھا جو رسول اللہ ﷺ کے قاصد حارث بن عمیرؓ لے کر گئے اور جنھیں غسان کے حاکم شرحبیل بن عمرو نے شہید کر دیا۔ ان کے سوا حضور ﷺ کے کسی اور سفیر کو قتل نہیں کیا گیا۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے عمرۃ القضا سے واپسی کے بعد ذاتِ اطلح میں پندرہ مسلمانوں کو تبلیغ کے لیے روانہ فرمایا تھا۔ ان میں کعب بن عمیرؓ کے سوا سب کو شہید کر دیا گیا۔ بہر حال اسلام کے سفیر کا قتل ہو یا ذاتِ اطلح کا حادثۂ فاجعہ، ان حرکات کا واضح مطلب مسلمانوں کے خلاف اعلانِ جنگ تھا۔ غزوۂ موتہ ایسے ہی سانحات کے ردعمل میں پیش آیا۔ (۴۸)

واٹ اوّل تو مکاتیب نبوی ﷺ کی تاریخی سند کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔ اس کے نزدیک یہ الحاقی خطوط ہیں جن کا "مستند" ماٰخذ میں ذکر نہیں ہے اور اگر صحیح بھی ہوں تو ان میں قبولِ اسلام کی دعوت ضرور بعد کے لوگوں کی ایجاد ہے۔ (۴۹) پھر وہ استناد کا کوئی معیار بھی متعین نہیں کرتا۔ یہ اس کی اپنی صوابدید پر منحصر ہے کہ جس خط کو چاہے مستند کہے اور جسے چاہے غیر مستند کہہ دے۔ بس یہی بات کافی ہے کہ وہ اپنے ہر دعوے کے لیے یقینی (Certain) اور غیر مشتبہ (Doubtless) جیسے الفاظ استعمال کر سکتا ہے۔ پھر وہ یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ بعض مقامات پر کچھ قبائل کے سرداروں نے

آپ ﷺ کے قاصد کو شہید کر ڈالا ۔ اس کے نزدیک غزوۂ موتہ کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شرجیل نے آپ ﷺ کے نامہ بر کو شہید کر دیا تھا۔ ان سب متنوع اور بلکہ متناقض باتوں کے بعد وہ دعوے کے ساتھ کہتا ہے کہ یہ سب باتیں محض ثانوی اہمیت رکھتی ہیں۔ اصل بات کچھ اور ہے:

> ''یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ڈپلومیٹک نقطۂ نظر سے آپ کی توجہ شمالی راستے کی جانب ہی مرکوز تھی۔''(۵۰)

پوری بات کا خلاصہ یہ ہے رسول اللہ ﷺ اپنے عرب عوام کی جنگی صلاحیتوں کو ایک دوسرے کے خلاف ضائع ہونے سے بچانا چاہتے تھے۔ اس لیے آپ ﷺ نے ان کی جنگی جبلت کی تسکین کے لیے اس کا رخ بیرونِ ملک شمال کی عیسائی سلطنت کی طرف موڑ دیا اور یوں ایک طرف اپنی مملکت کے استحکام کو یقینی بنایا اور دوسری طرف معاشی مسائل بھی حل کرنے کی منصوبہ بندی کی۔ واٹ کی زیر بحث کتاب میں حضور ﷺ کی شمالی پالیسی کے متعلق قدرے محتاط انداز اختیار کیا گیا ہے۔ اس کے نزدیک شمالی علاقوں کے بارے میں آپ کی پیش بندی تجزیاتی Analytical نہ بھی ہو تو وجدانی Intuitive کی ضرور تھی۔(۵۱) گویا یہ پالیسی کچھ بھی ہو پیغمبرانہ (Prophetic) نہ تھی۔ عام قاری بھی یہ بات بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ اس لفظی موشگافی کی آڑ میں واٹ اپنے اصل ہدف سے ہرگز اِدھر اُدھر نہیں ہوتا۔ اس طرح وہ حضور ﷺ کو ان عام دنیادار اور توسیع پسندانہ ذہنیت رکھنے والے سیاست دانوں کی صف میں شامل کرتا ہے جو اپنے عوام کی توجہ اصل اور اندرونی مسائل سے ہٹا کر بیرونی محاذ پر چھیڑ چھاڑ شروع کرتے ہیں اور پھر جذبہ حب الوطنی کو ابھار کر اپنے عوام کو متحد رکھتے ہیں۔ چنانچہ آگے چل کر صاف الفاظ میں وہ مکاتیب نبوی ﷺ کو عموماً اور حاکم بصریٰ کے نام خصوصاً ایک ایسے مکتوب کا انکار کرتا ہے:

> ''اسلام روز اول سے ہی اپنی سرشت کے اعتبار سے ایک عالمی مذہب تھا اور اسلامی ریاست کی توسیع کے ساتھ ہی یہ ایک عالمی مذہب بن بھی گیا۔ لیکن یہ بات ناقابل یقین ہے کہ ایک ذہین ماہر سیاست ہوتے ہوئے ایک نازک موقع پر

(صلح حدیبیہ کے بعد) اپنے سیاسی کردار کے اس مرحلہ پر آپ ﷺ نے (قبول اسلام کی) مخصوص دعوت پیش کی۔"(۵۲)

حضور ﷺ کی شمالی پالیسی کے اس تجزیے سے واٹ نے کثیر المقاصد اہداف حاصل کرنے کی ایک شعوری کوشش کی ہے جس کے خدوخال بہت واضح ہیں۔(۱) حضور ﷺ کے دعوتی خطوط کو مکمل طور پر مسترد نہیں کیا گیا۔ البتہ ان کی تاریخی حیثیت کو مشکوک بنا دیا ہے۔(۲) مکاتیب نبوی ﷺ میں قبول اسلام کی دعوت تھی بھی تو اس کی حیثیت محض ثانوی تھی۔ اصل اور بنیادی مقصد ان علاقوں اور ملک پر اپنے اندرونی مسائل پر قابو پانے کے لیے محض فوج کشی تھا۔(۳) قرب و جوار کے عیسائی علاقے اور ممالک تو اسلام کی دعوتِ توحید کو اپنے لیے کوئی خطرہ نہ سمجھتے تھے۔ یہ اسلام ہی تھا جو یک طرفہ طور پر ان کے لیے خطرہ بن گیا۔ اسلام اگر عالمی مذہب تھا تو بھی اس کا بنیادی مقصد دنیا پر عربوں کی حاکمیت قائم کرنا ہی تھا۔

اس بحث کو ہم دو نکات پر ختم کرتے ہیں۔

۱۔ اسلام یقیناً روز اوّل سے ہی ایک عالمی مذہب تھا۔ اس لحاظ سے محض عربوں کی وحدت اور اصلاح اس کا حتمی مقصد نہ تھا۔ اسلام کی تعلیمات بین الاقوامی اور آفاقی مزاج کی حامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف نسلوں، زبانوں اور علاقوں کے لوگ قبولِ اسلام کے بعد برابری کی سطح پر اسلامی برادری کے رکن بن گئے۔ دوسری قوموں کے خلاف خواہ مخواہ جنگ چھیڑ کر مسلم امہ میں وحدت پیش کرنے کی مصنوعی کوشش نہیں کی گئی۔ ایسی وحدت قائم کرنے کے لیے اسلامی اصولِ مواخات اور جاہلی عصبیت کے خلاف موثر اور مسلسل مہم ہی کافی تھی۔ اس بات کا اعتراف مشہور مستشرق فلپ کے ہٹی نے بھی کیا ہے۔

"مدینہ میں مذہبی بنیادوں پر قائم ہونے والا بھائی چارہ بعد کے عالمی بھائی چارے (امہ) کی ہی ابتدائی شکل تھی۔"(۵۳)

۲۔ ہم نے شروع میں ہی کہا تھا کہ واٹ کے ہاں تضادات بہت زیادہ ملتے ہیں۔ حضور ﷺ

کی شمالی پالیسی کے عنوان سے اس نے جو کچھ لکھا، اس کے دوسرے دعاوی کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو قاری بھول بھلیوں میں بھٹکنے لگتا ہے۔ اس کا ایک ایسا ہی جملہ کچھ یوں ہے۔

''اس وقت بھی جب آپ ﷺ سیاسی مضمرات سے خوب آگاہ تھے، واقعات کا مذہبی پہلو ہی غالب رہتا تھا۔'' (۵۴)

اس کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہے کہ واٹ مسلمان قارئین اور اہل علم کے سامنے اپنی علمی ساکھ (Credibility) کو کسی قیمت پر داؤ پر نہیں لگانا چاہتا۔ ویسے بھی حضور ﷺ کی نبوت کے لفظ کا برائے بیت لسانی اظہار اس کی استشراقی مجبوری تھی۔ پھر نبوت بھی ایسی جہاں روحانی آدرش اور سیاسی تقاضوں میں کمال درجہ کی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ ایسی نبوت کو سمجھنا کسی بھی مستشرق کے لیے دشوار ہے اور اُسے سمجھانا دشوار تر۔

بر کفِ جامِ شریعت بر کفِ سندانِ عشق
ہر ہوسناکے نہ داند جام و سنداں باختن

واٹ کی تحریروں کے بارے میں پہلا سوال اس کے مآخذ کے بارے میں ہے۔ مسلمانوں کے نزدیک سیرت پاک ﷺ کے اصل مآخذ قرآنِ حکیم اور صحیح احادیث ہیں۔ ابن اسحٰق ہوں یا ابن ہشام یا واقدی ان کا درجہ ان کے بعد کہیں آتا ہے۔ بہت کم مستشرقین ایسے رہ گئے ہیں جو قرآن میں کسی تحریف یا الحاق کے قائل ہوں۔ اس لیے احادیث کو مشتبہ ثابت کرنے کی کوششیں ہوتی رہتی ہیں۔ واٹ سیرتِ طیبہ کے مآخذ کے لحاظ سے قرآن کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ قرآن کو کبھی وہ اس لحاظ سے جزیاتی (Fragmentary) کبھی متضاد (Contradictory) اور کبھی غیر اغلب (Improbable) جیسے القابات سے نوازتا ہے۔ احادیث کے بارے میں وہ گولڈ زیہر (Goldzieher) اور جوزف شاخت (Joseph Schacht) جیسے منکرین حدیث کو معتبر مانتا ہے۔ تاریخی مآخذ میں بھی وہ ان تاریخی روایات سے

متاثر ہے جو فن تاریخ کے اصولوں پر پوری نہیں اترتیں۔ صباح الدین عبدالرحمٰن نے بالکل درست کہا ہے کہ اگر ابن اسحٰق اور واقدی وغیرہ کی بیان کردہ ہر روایت قابل قبول ہے تو یہ حضرات ایمان باللہ اور ایمان بالرسول کے بھی قائل تھے۔ ہمارے مستشرقین ان کی یہ باتیں بھی کیوں نہیں قبول کر لیتے؟(۵۵) قرآن کے انگریزی تراجم میں واٹ کو جارج سیل کا ترجمہ سب سے زیادہ پسند ہے۔ مارماڈیوک پکتھال جیسے مسلمان مترجم کی حیثیت ثانوی ہے۔ اسی طرح مستشرقین کے اٹھائے ہوئے سوالات و اعتراضات کے جو جوابات مسلمان محققین نے دیے ہیں، واٹ کو ان سے دلچسپی نہیں ہے۔ اس کی کتاب میں صرف امیر علی کی روحِ اسلام (The Spirit of Islam-1922) اور محمد حمید اللہ کی کتاب (Le Prophete de Islam-1959) کا سرسری ذکر ہے۔ موخر الذکر کتاب کو بقول اس کے "پروپیگنڈا" کی کم تر سطح پر ہونے کی وجہ سے قبول کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح ولیم میور اور جوزف شاخت وغیرہ کو مستند ماخذ کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے جب کہ مسلمان علما ان کے نظریات میں بھی سنگین فنی نقائص کی نشاندہی کر چکے ہیں۔

کارلائل اور واٹ عیسائیت کے پرجوش مبلغ یا موید نہیں ہیں۔ ان کو اہلِ یورپ کے اس گروہ میں شمار کیا جا سکتا ہے جو مروجہ عیسائیت کے علم الکلام اور اس کے تاریخی کردار سے بظاہر بہت زیادہ اتفاق نہیں رکھتے۔ بایں ہمہ اپنے مخصوص عیسائی پس منظر سے وہ مکمل طور پر دامن نہیں چھڑا سکے۔ ڈیوڈ ڈیشیز (David Daiches) نے کارلائل کے نظام فکر پر ایک دوسرے حوالے سے بہت جامع بات کہی۔ زیرِ بحث موضوع کے حوالے سے یہی بات نہ صرف کارلائل بلکہ واٹ کے بارے میں بھی زیادہ یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے۔ وہ کہتا ہے:

> He had rejected the letter of Christianity, but not its spirit. (۵۶)

"اس نے عیسائی صحائف کے متن کو تو مسترد کر دیا تھا، روح کو ہرگز نہیں۔"

واٹ کا المیہ یہ بھی ہے کہ اس کا ارادہ بلکہ دعوٰی تو تاریخ کو معروضی نقطۂ نظر سے لکھنے کا ہے لیکن

عملاً وہ تاریخ نویسی میں شاعری شروع کر دیتا ہے۔ مسلمہ روایات کو چھوڑ کر وہ اپنے تخیل کی پرواز سے عجیب الخلقت قسم کے نظریات پیش کرتا ہے۔ چنانچہ اس کے ہاں ایسے مواقع پر چند خاص قسم کی لفظی تراکیب سے بار بار کام چلایا جاتا ہے مثلاً might , may be, might be,can be could have , could be, may have been,have been probably,been,presumably وغیرہ۔ ظاہر ہے یہ طرز بیان شاعری کے ساتھ خاص ہے۔ اس کا تاریخ یا تاریخی تجزیہ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ ہم نے اسے تاریخ میں شاعری بلاوجہ نہیں کہا۔ اہلِ نظر جانتے ہیں کہ افلاطون کا بھی شاعری کے ساتھ یہی اختلاف تھا۔ اس کے نزدیک تاریخ کا مقام شاعری سے بدرجہا بلند ہے۔ تاریخ، جو کچھ ہوا یا ہو رہا ہے اسے بلا مبالغہ پیش کر دیتی ہے۔ بقول اس کے شاعری حقیقت سے کہیں دور لے جاتی ہے۔ اس کے تلمیذ رشید اور علمِ انتقادیات کے جدِ امجد ارسطو نے اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ شاعری تاریخ کے مقابلے میں برتر ہے۔ تاریخ صرف یہ بتاتی ہے کہ کیا ہوا۔ شاعر اپنے تخیل کی مدد سے یہ بھی بتا سکتا ہے کہ کیا ہوا ہوگا؟ کیا ممکن ہے؟ اور آیندہ کیا ہو سکتا ہے۔ (۵۷) واٹ اگر اپنا مقام اچھے شعرا میں شامل کرانا چاہتا ہے تو بعض مقامات پر شدید اختلاف کے باوجود اسے بھرپور داد دی جا سکتی ہے۔ تاہم تاریخ کے واضح حقائق کا خونِ ناحق اس کی گردن پر رہے گا۔ شاعری میں یقیناً تاریخی واقعات بیان کیے جا سکتے ہیں لیکن تاریخ میں شاعری کو داخل نہیں کیا جا سکتا۔ واٹ کے مقام کے تعین کے لیے شیکسپیئر کے ڈرامے جولیس سیزر (Julius Caesar) میں انٹونی کی لاش پر بروٹس (Brutus) کی تقریر کے درج ذیل کلمات کافی ہیں:

> As Caesar loved me, I weep for him, as he was fortunate, I rejoice at it, as he was valiant, I honour him, but as he was ambitious, I slew him. There is tears for his love, joy for his fortune, honour for his valour and death for his

ambitions.(۵۸)

''چونکہ سیزر مجھ سے محبت کرتا تھا، (اس کی موت پر) میں رو رہا ہوں ۔ چونکہ وہ خوش قسمت تھا مجھے اس امر پر خوشی ہے ۔ چونکہ وہ ایک بہادر انسان تھا اس بنا پر میں اس کا احترام کرتا ہوں ۔لیکن چونکہ وہ ایک جاہ پسند انسان تھا اس لیے میں نے اسے قتل کر دیا۔اس کی محبت کے لیے میرے پاس آنسو،اس کی خوش قسمتی کے لیے خوشی اور بہادری کے لیے ندرانہ احترام ہے اور (اس کے ساتھ ہی) اس کی ہوسِ اقتدار کے لیے پروانہ موت ۔''

مراجع وحواشی

۱۔ منٹگمری ڈبلیو واٹ...... Muhammad-Prophet and Statesman
Oxford University Press. (1961)
...... ۲۳۱

۲۔ ایضاً...... ۲

۳۔ ایضاً...... ۲۳۲

۴۔ ایضاً...... ۱۷۵

۵۔ ایضاً...... ۱۹۴

۶۔ ایضاً...... ۱۷۰

۷۔ ایضاً...... ۱۸۵

۸۔ ایضاً...... ۱۵۵

۹۔ ایضاً...... ۲۰۷

واٹ کے الفاظ ہیں:

"Against considerable odds, often with narrow margins, but nearly always with sureness of touch, he had moved towards his goal. If we were not convinced of the historicity of these events, few would credit that the despised Meccan prophet could re-enter his city as triumphant conqueror".

۱۰۔ ایضاً...... ۱۵۸

۱۱۔ ایضاً...... ۱۵۹

۱۲۔ ایضاً...... ۲۳۸

۱۳۔ ایضاً...... ۱۷

۱۴۔ ایضاً...... ۱۷

۱۵۔ ایضاً...... ۵۵

۱۶۔ ایضاً...... ۲۲۰

۱۷۔ ایضاً...... ۲۳۴

واٹ کا کہنا ہے:

"In both Meccan and Mednian periods, Muhammad's contemporaries looked on him as a good and upright man, and in the eyes of history, he is a moral and social reformer".

۱۸۔ آر سی زینر R.C.Zaenar، لندن ۱۹۵۸ء، At Sunday Times.

مصنف کے نزدیک:

"For there is no criterion by which the gift of prophecy can be withheld from him unless it is withheld from the Hebrew prophets too".

۱۹۔ ایچ۔آر۔اے جملٹن گب...... A Historical Survey:Muhammadanism

((1950Oxford University Press

۲۰۔ آر بارسوتھ سمتھ، Muhammad and Muhammadanism

۲۰الف۔ منٹگمری ڈبلیو واٹ...... Muhammad at Madina

۲۱۔ ایضاً

۲۲۔ مجلہ معارف۔اسلام اور مستشرقین نمبر...... مدون صباح الدین عبدالرحمٰن

۲۳۔ منٹگمری ڈبلیو واٹ...... Muhammad-Prophet and Statesman

...... ۱۴۲

۲۴۔ ایضاً

۲۵۔ مارٹن لنگز...... Muhammad-His life based on earlier souces

Services Book Club. (1985)

۲۶۔ منٹگمری ڈبلیو واٹ...... Muhammad-Prophet and Statesman

...... ۶۸

۲۷۔ ایضاً...... ۶۹

۲۸۔ ایضاً...... ۶۹

ہجرتِ حبشہ کے موضوع پر مصنف کی خیال آرائی کا انداز ملاحظہ ہو۔

Perhaps the emigrants disliked some attitude adopted by Muhammad to meet the growing vehemence of the opposition, such as an increased involvement in politics.........

He (Muhammad(should quickly have become aware of the

incipient schism and have taken steps to heal it. This might have been by suggesting the journey to Abyssinia in furtherance of some plan to promote the interests of Islam.

۲۹۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی ...... محاضراتِ سیرت ﷺ ......

۳۰۔ ظفر علی قریشی ...... Prophet Muhammad and His Western Critics

Idara Maarif-i-Islami Lahore. (1992)

۳۱۔ ایضاً

۳۲۔ ایضاً

۳۳۔ محمد حسین ہیکل ...... حیاتِ محمد ﷺ (۱۹۹۰ء) ...... ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور

۳۴۔ ایضاً

۳۵۔ ولیم میور ...... Life of Muhammad

۳۶۔ ایضاً

۳۷۔ منٹگمری ڈبلیو واٹ ...... Muhammad-Prophet and Statesman

......۶۱

۳۸۔ ایضاً ...... ۶۲ تا ۶۵

۳۹۔ ابن خلدون ...... مقدمہ

۴۰۔ مولانا امین احسن اصلاحیؒ ...... تدبرِ قرآن، جلد ہشتم

۴۱۔ مفتی محمد شفیعؒ ...... معارف القرآن جلد ہشتم

۴۲۔ ایک اور تعبیر کے مطابق "زیغ سے مراد یہ ہے کہ آپ ﷺ نے ہر چیز کا مشاہدہ اس کے بالکل صحیح زاویے سے کیا۔ طغیٰ سے مراد یہ ہے کہ اگرچہ انوار و تجلیات کا زبردست ہجوم تھا پھر بھی آپ ﷺ نے ہر چیز کا مشاہدہ اچھی طرح جم کر کیا۔" (معارف القرآن، جلد ہشتم)

۴۳۔ شفاعت کے اسلامی تصور کو قرآنِ حکیم میں دوسرے مقامات پر بھی بیان کیا گیا ہے۔ (مثلاً سورۃ یونس: ۳، سورۃ طٰہٰ: ۱۰۸ اور سورۃ الانبیا: ۲۸ جو کہ مکی سورتیں ہیں، نیز سورۃ البقرۃ: ۲۵۵ جو کہ مدنی سورۃ ہے۔) بدقسمتی سے کیرن آرمسٹرانگ کو یہاں بھی اصرار ہے کہ سورۃ النجم کی مذکورہ آیت میں فرشتوں کے غیر مشروط حق شفاعت کی تائید کی گئی ہے۔ اس پر بھی دعویٰ قرآن فہمی کا ہے اور حال یہ ہے کہ یہاں خود سخن فہمی کو اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔

۴۴۔ واقعہ معراج سے متعلقہ آیات نفسِ واقعہ کے لحاظ سے محکم آیات ہیں گو صورتِ واقعہ کے لحاظ سے انھیں متشابہات کہتے ہیں جیسا کہ ما اوحیٰ اور ما یغشیٰ جیسے الفاظ سے ظاہر ہے۔

۴۵۔ محمد حسین ہیکل ..... حیاتِ محمد ﷺ

۴۶۔ ڈاکٹر رفیق ذکریا ..... محمد ﷺ اور قرآن (Muhammad and Quran) (۲۰۰۶ء)
فکشن ہاؤس مزنگ روڈ لاہور

۴۷۔ منٹگمری ڈبلیو واٹ ..... Muhammad at Madina
Oxford Clarendon Press. (1956)

واٹ اپنے استدلال کی عمارت تعمیر کرنے کے لیے مندرجہ ذیل پیرایہ بیان اختیار کرتا ہے۔

"To keep the Arabs under his rule, he must stop inter-tribal fighting, but to do so, it was not enough to insist on acceptance of blood-money instead of taking a life for a life, he must also provide some outlet for the warlike energies of the Arabs and for their excess population. This outlet he believed was to be found along the route to the north".

۴۸۔ محمد حسین ہیکل ..... حیاتِ محمد ﷺ

۴۹۔ منٹگمری ڈبلیو واٹ ..... Muhammad at Madina

۵۰۔ ایضاً

۵۱۔ منٹگمری ڈبلیو واٹ ..... Muhammad-Prophet and Statesman
..... ۲۲۲

۵۲۔ منٹگمری ڈبلیو واٹ ..... Muhammad at Madina

۵۳۔ فلپ کے ہٹی ..... The Near East in History

"Madinese religious brotherhood was in miniature the subsequent world community of Islam".

۵۴۔ (الف) منٹگمری ڈبلیو واٹ ..... Muhammad at Madina
(ب) منٹگمری ڈبلیو واٹ ..... Muhammad-Prophet and Statesman

۵۵۔ مجلہ معارف۔ اسلام اور مستشرقین نمبر ..... مدون صباح الدین عبدالرحمٰن

۵۶۔ ڈیوڈ ڈیشز ..... A critical History of English literature
Ronald Press Company. (1970)

۵۷۔ ارسطو ..... Poetics

۵۸۔ ولیم شیکسپیر ..... Julius Caesar ..... Oxford Clarendon Press

---❀❀❀---

دی ہنڈرڈ

(The Hundred)

مائیکل ایچ ہارٹ کے خیالات پر تبصرہ

مشہور تاریخی عیسائی جوڑی ملکہ ایزابیلا اور بادشاہ فرڈی نینڈ کی قیادت میں بالآخر غرناطہ (سپین) سے مسلم عہدِ حکومت کا خاتمہ کر دیا گیا۔ اس آخری جنگ کا آغاز ۱۴۸۱ء اور اختتام ۱۴۹۲ء میں ہوا۔ اس دوران سپین میں بدنامِ زمانہ مذہبی عدالت (Inquisition) بھی قائم کر دی گئی تھی۔ اس مذہبی عدالت کو اگرچہ کیتھولک پوپ کی جانب سے اختیارات تفویض کیے گئے تھے مگر بعض تاریخی اسباب کی بنا پر یہ مکمل طور پر ہسپانوی شہنشاہیت کے زیرِ اثر تھی۔ شروع میں یہ عدالت مخالف عیسائی فرقوں، یہودیوں اور اُن مسلمان عوام کے خلاف سرسری سماعت کے بعد اذیت ناک سزائیں سناتی تھی جو چھپ چھپ کر بھی اسلامی عبادات ادا کرنے سے باز نہ آتے تھے۔ سقوطِ غرناطہ کے بعد طے پانے والے معاہدے کے تحت خطہ میں موجود مسلمانوں کو مذہبی آزادی کی ضمانت دی گئی تھی۔ تاہم ۱۵۰۲ء میں یہ آزادی بھی یک قلم ختم کر دی گئی۔ اب مسلمانوں کے سامنے دو ہی راستے تھے۔ عیسائیت اختیار کر لیں یا ملک چھوڑ جائیں۔

مسلمانوں کے دورِ اقتدار میں اندلس ایک تکثیری معاشرہ (Pluralistic Society) تھا۔(۱) مسلمان، عیسائی اور یہودی باہم مل کر اجتماعی ترقی اور تہذیب وثقافت کے فروغ کے لیے کوشاں تھے۔ ملکہ ایزابیلا کی جابرانہ پالیسی اور بادشاہ فرڈی نینڈ کے قاہرانہ اقدامات کی بدولت معاشرے سے ہنرمند اور صاحبِ فکر آبادی کے بہت بڑے حصے کا اندھا دھند اور بے رحمانہ انخلا عمل میں آیا۔ مائیکل ایچ ہارٹ کے نزدیک پندرہویں صدی کے بعد پورا مغربی یورپ مادی و

سائنسی ترقی کے راستے پر چل نکلا لیکن یورپ میں واقع سپین کا ملک مذہبی عدالت کے وحشیانہ خوف و ہراس کے باعث ایک بند گلی میں محبوس ہو کر رہ گیا۔ سترہویں صدی کے اختتام تک سپین مکمل طور پر فکری جمود سے دو چار رہا۔(۲) اگرچہ آج سے دو سو سال قبل سپین میں مذہبی عدالت ختم کر دی گئی تھی۔ پھر بھی سپین مذہبی جبر و تشدد اور نسلی تعصب سے پیدا ہونے والے تاریخی انحطاط سے ابھی تک سنبھل نہیں سکا۔ اِس بات سے انکار ممکن نہیں کہ ملکہ ایزابیلا کی نظریاتی رہنمائی اور مادی معاونت سے کولمبس نے براعظم امریکہ کی دریافت کا کارنامہ انجام دیا۔ بعدازاں براعظم امریکہ کے جنوبی اور وسطی علاقوں میں ہسپانوی کالونیاں قائم ہوئیں اور وہاں ہسپانوی ثقافت اور اُس سے متعلقہ ادارے بشمول مذہبی عدالت بھی رواج پذیر ہوئے۔ لہٰذا اِس باب میں قطعاً تعجب نہ ہونا چاہیے کہ جس طرح سپین اُس دور میں مغربی یورپ کے مقابلے میں پسماندہ رہ گیا، اِس طرح براعظم امریکہ میں برطانوی کالونیوں کے بالمقابل وہاں ہسپانوی کالونیاں بھی ذہنی و فکری طور پر بہت پیچھے رہ گئیں۔ (۳)

سپین میں مسلم اقتدار کا یہ شہر آشوب کسی مسلمان مصنف کے قلم سے نہیں نکلا۔ یہ امریکی مصنف مائیکل ایچ ہارٹ کا معروضی تجزیہ ہے۔ مائیکل ایچ ہارٹ کی کتاب "The 100" A - Ranking of the most Influential Persons in History کئی اعتبار سے ایک قابل مطالعہ کتاب ہے۔ اُس نے اپنے مخصوص انداز میں سقوطِ غرناطہ کا نوحہ ہی نہیں پڑھا، عالمی شخصیات کے کارناموں کا مختصر مگر جامع تبصرہ بھی کتاب میں پیش کیا ہے۔ ان شخصیات کا تعلق زندگی کے مختلف شعبوں مذہب، سائنس، سیاست، ٹیکنالوجی، معاشیات، ادب، فلسفہ، نفسیات وغیرہ سے ہے۔ ان میں سے اکہتر (۷۱) کا تعلق یورپ، سات (۷) کا شمالی امریکہ، ایک (۱) کا جنوبی امریکہ، تین (۳) کا افریقہ اور اٹھارہ (۱۸) کا ایشیا سے ہے۔ پھر اس فہرست میں سینتیس (۳۷) سائنسدان اور موجد، تیس (۳۰) سیاسی اور عسکری قائدین، چودہ (۱۴) سیکولر فلسفی، گیارہ (۱۱) مذہبی مصلحین اور چھ (۶) فنکار اور ادیب شامل ہیں۔

مصنف کی ان مشاہیر کے کارناموں پر گہری نظر ہے۔ اس نے ان شخصیات کی اپنے تئیں

درجہ بندی بھی کی ہے جس سے مکمل اتفاق ضروری نہیں۔ اس درجہ بندی کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام تیسرے نمبر پر، مہاتما بدھ چوتھے نمبر پر اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سولھویں (۱۶) نمبر پر ہیں۔ تقابل ادیان کے طلبہ کے لیے بھی کتاب میں قیمتی اشارات موجود ہیں۔

اس درجہ بندی میں نیوٹن کو دوسرے، سینٹ پال کو چھٹے، آئن سٹائن کو دسویں، کارل مارکس کو گیارہویں، سکندر اعظم کو تینتیس اور شیکسپیئر کو چھتیس نمبر پر رکھا گیا ہے۔ تمام عالمی شخصیات میں مصنف کے نزدیک دنیا کی موثر ترین شخصیت حضرت محمد ﷺ ہیں۔ وہ آپ ﷺ کو دنیا کی سب سے بڑی تاریخ ساز شخصیت قرار دیتا ہے۔ اِس انتخاب کے لیے اس کے پاس ٹھوس وجوہ موجود ہیں۔ اس کے نزدیک پیغمبر اسلام ﷺ وہ واحد شخصیت ہیں جنھوں نے بیک وقت تاریخ کے مذہبی اور دنیاوی معاملات پر سب سے زیادہ اثر ڈالا ہے اور یہ اثر روز افزوں ہے۔ وہ کہتا ہے

He(Muhammad) was the only man in history who was supremely successful in both religious and secular levels. (۴)

مائیکل ایچ ہارٹ کے مطابق حضرت محمد ﷺ کے تاریخی کردار کا مطالعہ دو پہلوؤں ...... مذہبی اور سیاسی ...... سے ضروری ہے۔ مذہبی سطح پر دیکھا جائے تو آپ ﷺ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام جیسے مشہور و ممتاز پیغمبروں سے بھی اعلیٰ و برتر ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے بارے میں ہماری بنیادی معلومات بہت غیر یقینی (Uncertain) ہیں۔ ہم ان کے اصل نام، سال پیدائش اور سال وفات تک کے متعلق صحیح طور پر نہیں جانتے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں Mathew اور Luke کی انجیلوں کے بیانات مختلف ہیں اور دونوں بیانات بھی براہِ راست عہد نامہ قدیم (The Old Testament) سے ماخوذ ہیں۔ (۵) اسی طرح حضرت محمد ﷺ کے برعکس دوسرے پیغمبروں کی زندگی کے بارے میں بھی ہماری بنیادی معلومات بہت ناقص ہیں۔ علاوہ ازیں دوسرے پیغمبروں کی جو تعلیمات ہم تک پہنچی ہیں، مذکورہ پیغمبروں

سے ان کی نسبت بھی مشتبہ ہے۔ مہاتما بدھ کی تعلیمات بھی تحریری شکل میں موجود نہ تھیں۔ اُن کے پیروکاروں نے اُن تعلیمات کو زبانی طور پر محفوظ رکھا۔ مہاتما بدھ کی وفات کے صدیوں بعد انھیں تحریری شکل دی گئی۔ (۶) ایران کے مذہبی پیشوا زرتشت (Zoroaster) کے بارے میں بھی ہماری سوانحی معلومات سرسری (Sketchy) قسم کی ہیں۔ (۷) حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تمام تر شہرت کے باوجود اُن کے متعلق ہمارے پاس معتبر معلومات نہ ہونے کے برابر (Scarce) ہیں۔ موجودہ تورات کے مصنفین ایک سے زیادہ ہیں اور اُس کا بہت سا حصہ بھی اُن کے انتقال کے بعد ضبطِ تحریر میں لایا گیا۔ (۸) بقول مصنف الوہیت مسیح (Divinity of Christ) اور گناہ اِوّل Original Sin جیسے عقائد کو سینٹ پال نے عیسائیت میں داخل کیا۔ (۹) عہد نامہ جدید (The New Testament) کے ستائیس میں سے کم از کم چودہ ابواب یعنی (Books) سینٹ پال سے منسوب کیے جاتے ہیں۔ (۱۰) ان (مختلف) وجوہات کی بنا پر کچھ لوگ یہاں تک دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بجائے سینٹ پال کو مروجہ عیسائیت کا بانی سمجھنا چاہیے۔ (۱۱) ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے منسوب بعض بنیادی تعلیمات ناقابل عمل ہیں۔ عیسائیت کا بنیادی اصول ہے "اپنے دشمن سے پیار کر"...... "برائی کی مزاحمت نہ کر"...... جو تیرے دائیں رخسار پر تھپڑ رسید کرے اسے اپنا بایاں رخسار بھی پیش کر دے۔" اس نوع کے اصول یقیناً اخلاقی رویے کا ایک خوشنما تصور پیش کرتے ہیں۔ لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے کہ ہم اپنی عملی زندگی میں ان اصولوں پر عمل نہیں کرتے۔ دوسرے لوگوں سے بھی اپنے معاملے میں ہم ایسے رویے کی عملاً توقع نہیں کرتے۔ ہم اپنے بچوں کو بھی ان اصولوں پر عمل کرنے کی تلقین نہیں کرتے۔ (۱۲) تاریخ میں بدھ مت کے مجموعی اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے مصنف کا دعویٰ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بہ نسبت بظاہر مہاتما بدھ نے اپنے پیروکاروں کی زندگیوں پر کہیں زیادہ اثر ڈالا ہے۔ (۱۳) حضرت محمد ﷺ کی عظمت کا ایک پہلو یہ ہے کہ آپ ﷺ کی تعلیمات پر دنیا بھر میں بہت سے مسلمان عمل کرتے ہیں۔

سیاسی میدان میں حضرت محمد ﷺ نے دنیا کی کسی بھی عظیم شخصیت کے مقابلے میں کہیں زیادہ سیاسی فتوحات حاصل کیں۔ لینن، ماؤزے تنگ، چنگیز خان، جارج واشنگٹن، سکندر اعظم، نپولین بوناپارٹ، سیاسی طور پر بہت مشہور و معروف ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک بھی معمارِ تاریخ کے طور پر پیغمبر اسلام ﷺ سے بڑا نہیں۔ مائیکل ایچ ہارٹ ایک قابل فہم معیار موازنہ کے طور پر پیش کرتے ہوئے کہتا ہے:

Of many historical events one might say that they were inevitable and would have occurred even without the particular leader who guided them. (۱۴)

"بہت سے تاریخی واقعات کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ وہ ناگزیر تھے اور اس سیاسی قائد کے بغیر بھی رونما ہو سکتے تھے جس نے ان کی جانب رہنمائی کی۔"

مصنف کے خیال میں جنوبی امریکہ کے مقبوضات سائمن بولیور کے بغیر بھی آزادی حاصل کر سکتے تھے۔ ابراہام لنکن (جس کا نام پہلی سو شخصیات میں شامل نہیں) کا یہ کارنامہ معمولی نہیں کہ اس نے چار ملین امریکیوں کو غلامی سے نجات دلائی۔ بہ ایں ہمہ وہ اس بات کا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ غلاموں کے حقوق کا وہ واحد چیمپئن ہے۔ لنکن سے بہت پہلے بے شمار سماجی اور سیاسی قوتیں غلاموں کے حقوق کے لیے میدان میں آ چکی تھیں۔ اس لحاظ سے بھی حضرت محمدؐ ایک منفرد مقام رکھتے ہیں:

Nothing similar had occurred before Muhammad and there is no reason to believe that the conquests would have been achieved without him. (۱۵)

"حضرت محمد ﷺ سے پہلے اس نوع کی صورت حال پیدا نہیں ہوئی اور یہ یقین

کرنے کے لیے کوئی وجہ موجود نہیں کہ آپ ﷺ کے بغیر یہ فتوحات حاصل کی جا سکتی تھیں۔"

مصنف کے نزدیک تیرھویں صدی میں منگولوں کی فتوحات عربوں کی فتوحات کے مقابلے میں وسیع تر تھیں۔ اس وسعت پذیری کے باوجود عربوں کی فتوحات اس بنا پر اہم تر ہیں کہ یہ مستقل نوعیت (Permanent) کی حامل ہیں۔ مصنف بحث کو سمیٹتے ہوئے کہتا ہے کہ دوسرے تمام قائدین کا ایک مخصوص دور اور ایک محدود دائرہ اثر تھا۔ حضرت محمد ﷺ کا اثر و رسوخ انتہائی جامع (Complete) اور جاری و ساری (Pervasive) ہے۔(۱۶)

دنیائے علم و ادب میں اس کتاب کا کافی دیر تک چرچا رہا۔ ایک مشہور نقاد نے کتاب کی مدح سرائی کرتے ہوئے کہا:

"یہ (کتاب) تاریخ کی بہت سی عظیم شخصیات کی مختصر داستان ہے جو تاریخی واقعات، سوانحی مواد، اور بڑے بڑے کارناموں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے...... دی ہنڈرڈ کسی بھی لائبریری کی زینت بننے کے لائق ہے۔"(۱۷)

یورپ اور دنیا کے دوسرے مقامات پر اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ پر مثبت انداز میں لکھی ہوئی شاید ہی کوئی کتاب ہو گی جسے اس کے تمام مندرجات سمیت مکمل طور پر قبول کیا جا سکے۔ اِس قسم کی توقع ایک بہت ہی منصف مزاج اور راسخ العقیدہ مسلمان سے ہی کی جا سکتی ہے۔ "دی ہنڈرڈ" کے مصنف کے بہت سے افکار و نظریات سے بھی شدید اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ پہلا اعتراض تو یہی ہو سکتا ہے کہ انبیا کرام جیسی بلند مرتبت ہستیوں کا نہ صرف ذکر بلکہ موازنہ فلسفی حضرات، موجدین اور سائنس دانوں کے ساتھ کیا گیا ہے۔ دراصل مصنف کسی بھی مذہب سے پرخاش رکھتا ہے نہ ہمدردی۔ اُس نے خود وضاحت کی ہے کہ اُس کا مقصد تاریخ پر سب سے زیادہ اثر انداز ہونے والی شخصیات کا جائزہ اور اُن کی درجہ بندی سے ہے، قطع نظر اِس سے کہ اُن کا تعلق مذہب سے ہے یا کسی دوسرے شعبہ حیات سے۔ اُس کو اِس سے بھی غرض نہیں کہ متعلقہ شخصیت کا مجموعی اثر

تاریخ انسانی پر مثبت یا منفی نوعیت کا ہے۔ اسی لیے کتاب میں چنگیز خاں، ہٹلر اور سٹالن کے نام بھی شامل ہیں۔ کوئی بھی شخص مصنف کے طریق مطالعہ اور طریق استدلال سے اختلاف کا حق رکھتا ہے۔ ایک اور بات یہ کہ کتاب کے دیباچے (The Premise) میں اُس نے اپنی تہذیبی و ثقافتی اُلجھن کو دور کرنے کا ایک خوش کن راستہ اختیار کیا ہے۔ اُس کا کہنا ہے کہ اُس کی کتاب کا تعلق تاریخ کی عظیم ترین (The greatest) شخصیات سے نہیں بلکہ تاریخ کی موثر ترین (The most influential) شخصیات سے ہے اور یہ کہ اُس کے نزدیک حضرت عیسیٰ علیہ السلام حضرت محمد ﷺ کے مقابلے میں عظیم تر شخصیت ہیں۔ (۱۸) ظاہر ہے ایک طرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور سینٹ پال کو مشترکہ طور پر مذہب عیسائیت کا بانی کہنا، پھر موازنہ کرتے ہوئے حضرت محمد ﷺ کو موثر ترین شخصیت کے طور پر پیش کرنا اور اُسی سانس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے منسوب مذہبی تعلیمات کی بے بسی کے اعتراف کے بعد بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو عظیم تر کہنا، مصنف کی تضاد بیانی یا نرم ترین الفاظ میں اُس کی خوش گمانی ہی کہا جا سکتا ہے۔ اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق یہ عمومی رائے پیش کرنے کے بعد کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام عقیدۂ توحید (Monotheism) کے بانی ہیں، وہ ایک دوسری رائے کو راجح قرار دیتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام عقیدۂ توحید کے اصل بانی ہیں۔ اس کی تحقیق یہ ہے کہ عیسائیت اور اسلام دونوں ہی یہودی عقیدۂ توحید سے ماخوذ ہیں۔ (۱۹) وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد ﷺ تک انبیا کرام ایک ہی دعوت توحید کے داعی، مبلغ اور موید ہیں۔ قرآن حکیم میں اس حقیقت کبریٰ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ۔ (الانبیاء:۲۵)

''اور تجھ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی طرف ہم (یہی) وحی کرتے تھے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں۔ سو میری عبادت کرو۔''

مائیکل ایچ ہارٹ کھلے دل سے اعتراف کرتا ہے کہ عرب فتوحات کی وسعت اور استقرار (Duration) کو دیکھا جائے تو حضرت عمرؓ (جن کا فہرست میں نمبر ۵۱ ہے) کی فتوحات جولیس سیزر اور شارلیمان کے مقابلے میں زیادہ اہم اور زیادہ اثر انگیز تھیں۔(۲۰) حضرت عمر بن خطابؓ نے مفتوحہ علاقوں میں فاتح عربوں کے لیے چند خصوصی حقوق مقرر کیے تھے۔ اس بنا پر وہ یہ عجیب و غریب دعویٰ کرتا ہے کہ عرب فتوحات ''مقدس جنگ'' سے زیادہ قومی جنگیں تھیں اگر چہ مذہبی پہلو مکمل طور پر غیر موجود نہ تھا۔(۲۱) ظاہر ہے یہ دعویٰ ٹھوس تاریخی حقائق سے متعارض ہے۔ ایک جدید مغربی سکالر راجر ہارڈی کی تحقیق یہ ہے کہ ''عملی مقاصد کے حصول کے لیے ریاست نے ایک خالص عرب مہم جوئی کے بجائے بطور مسلم ریاست کردار ادا کیا۔(۲۱الف)

۱۹۷۹ء میں شائع ہونے والی اس کتاب (The 100) پر ۱۹۹۱ء میں پنجاب اور سرحد کی صوبائی حکومتوں نے پابندی لگا دی۔ کتاب پر پابندی کے حق میں پیش کیے جانے والے کم از کم دو اعتراضات یقیناً قابل غور ہیں۔ ایک یہ کہ مصنف حضرت محمد ﷺ کو نعوذ باللہ قرآن کا مصنف قرار دیتا ہے۔(۲۲) اور دوسرے یہ کہ اس نے حضور ﷺ کے لیے خاکم بدھن ''ڈکٹیٹر''(۲۳) کا لفظ استعمال کیا ہے۔ حادثہ یہ ہے کہ پہلے جھوٹ کی حقیقت واضح کی جا سکتی ہے لیکن اہل یورپ کچھ سننا اور سمجھنا نہیں چاہتے۔ دوسرے جھوٹ کے متعلق مغربی دنیا کچھ سمجھنا چاہتی ہے لیکن ہم اب تک سمجھا نہیں سکے۔ جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے۔ یہ المیہ ہارٹ کا ہی نہیں کم و بیش تمام مستشرقین کا ہے۔ مغربی ذہن اپنے مخصوص پس منظر کے ساتھ کسی بھی پیغمبر کے لیے وحی جیسے منفرد ذریعہ علم کا منکر ہے۔ جب قرآن کے ''علمی ماٰخذ'' کے متعلق پوچھا جاتا ہے تو مستشرقین کی بے بنیاد اور متضاد باتیں سن کر گمان ہوتا ہے کہ ہمارا مخاطب افسانوی ادب سے متعلق غالباً ملا نصیر الدین جیسا کوئی مزاحیہ کردار ہے نہ کہ کوئی فاضل محقق۔ ملا نصیر الدین کے پاس ایک آدمی نے کسی کی شکایت کی۔ ملا نے جھٹ سے کہا: تم درست کہتے ہو۔ اس کے بعد مخالف فریق آیا اور اس نے اپنا موقف پیش کر دیا۔ ملا نے اُسے بھی کہا: تم بھی درست کہتے ہو۔ ملا کی بیوی نے ٹپٹا کر کہا ''آخر یہ دونوں اشخاص بیک وقت

کیسے حق پر ہو سکتے ہیں؟" ملا نصیر الدین نے فوراً جواب دیا: "بے شک تم بھی درست کہتی ہو۔" اب یہی بات علمی تحقیق کے نام پر فری لینڈ ایبٹ (Freeland Abbot) سے سنئے:

"بعض لوگ کہتے ہیں ا۔ محمد ﷺ کا ایک یہودی اتالیق تھا جو کہ درست بات ہو سکتی ہے۔ ۲۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ ﷺ عیسائی راہبوں سے واقف بلکہ متاثر تھے، یہ خیال بھی درست ہو سکتا ہے۔ ۳۔ کچھ اور لوگوں کا کہنا ہے کہ جس تجارتی معاشرے میں آپ ﷺ رہتے تھے اس سے آپ ﷺ نے مختلف مذاہب کا ایک متنوع تصور اخذ کیا۔ یہ بات بھی اپنی جگہ صحیح ہو سکتی ہے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ آپ ﷺ نے خود کسی طبع زاد بات (Originality) کا دعویٰ نہیں کیا۔" (۲۴)

فری لینڈ ایبٹ نے اس بحث سے جو نتیجہ اخذ کیا ہے، اس سے قطع نظر، اگر یہ پوچھا جائے کہ یہ تینوں باتیں بیک وقت کیسے صحیح ہیں تو جواب یہی ہونا چاہیے: "ہاں یہ بات بھی درست ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ اگر دنیا میں اس قبیل کے استدلال کو قبولیت عام حاصل ہو جائے تو ہر قسم کی عقلی سوچ کا مستقبل معرض خطر میں پڑ جائے گا۔ پھر کسی بھی چیز سے کچھ بھی ثابت کیا جا سکتا ہے۔ قرآن حکیم کے نام نہاد مصادر کی تلاش میں مستشرقین ہر اس شے کو لے بیٹھتے ہیں جہاں پر ان کے خود ساختہ معیار کے مطابق انھیں کوئی کوتاہی نظر آئے۔ وحی جیسے ماورائی علم کو ناقابل تصور اور ناقابل قبول جاننا ان کی طبعی اور ثقافتی کمزوری ہے۔ وحی الٰہی کے منکرین شدید قسم کی پریشان خیالی میں مبتلا ہیں۔ یہ وہ حاطب اللیل ہیں جو وحی کو کبھی مرگی (Epilepsy)، کبھی ہسٹریا (Hysterical) اور کبھی خود خیالی (Auto Suggestion) جیسے بے معنی، مغلق اور غیر متعلق الفاظ سے موسوم کرتے ہیں۔ فری لینڈ ایبٹ جیسے اہل قلم اس بات سے بے خبر دکھائی دیتے ہیں کہ محدود عقلِ انسانی کی مدد سے لامحدود وحی کی مکنیزم کو سمجھنا قطعاً ممکن نہیں۔ وحی جیسے لامحدود اور ماورائی ذریعہ علم کے بارے میں محدود اور ناقص ذہن کے ساتھ کوئی حکم لگانے کی کوشش کرنا ابن خلدون کے نزدیک ایسے ہی ہے جیسے سونا تولنے والی ترازو پر کوئی پہاڑ تولنے کی کوشش کرے۔

دوسرے اعتراض کے متعلق بھی اتنا کہنا کافی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے نظمِ حکومت اور خلافتِ راشدہ کے متعلق اہل دُنیا کو سمجھانے کی بہت کچھ ضرورت اب بھی باقی ہے۔ اس تفہیم کا تعلق فکری اور عملی دونوں میدانوں کے ساتھ ہے۔ ایک ہارٹ پر ہی کیا موقوف ہے، اسلام کی آزادانہ ترجمانی کے مدعی بعض حضرات عہدِ رسالت ﷺ اور خلافتِ راشدہ جیسے جمہوری نقطہ نظر سے سنہری ادوار کو بھی وقت کی آمرانہ حکومتوں کو سندِ جواز بخشنے کے لیے ''ماڈل'' کے طور پر پیش کرتے آئے ہیں۔ چہ بے خبر ز مقام محمد عربی است۔ فرقوں اور فقہی مسالک پر مبنی جماعتوں سے تو کوئی تعرض نہ کیا گیا۔ البتہ یہ دعویٰ ضرور کیا گیا کہ اسلام میں سیاسی جماعتوں کے وجود کی کوئی گنجایش نہیں۔ یہاں تک دعویٰ کیا گیا کہ مارشل لاء عین اسلامی ہے اور یہ کہ سب سے پہلا مارشل لا سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے لگایا تھا۔ ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے

عملی سطح پر ضرورت اس امر کی ہے ایک سے زیادہ ممالک میں نظامِ اسلامی اپنی سچی روح کے ساتھ جلوہ گر ہو۔ ورنہ ژولیدہ فکری کے ایک عام ماحول میں کوئی مغربی سکالر یہ بات کیونکر سمجھے گا کہ ہر مسلمان کے دھڑکتے دل اور اسلام کے سیاسی نظام میں سنت نبوی ﷺ کا کیا مقام ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ قرآنِ حکیم کے بعد سنتِ رسول ﷺ اسلامی قانون کا دوسرا بنیادی ماخذ ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ایمان تھا کہ آپ ﷺ کی اطاعت دراصل اللہ ہی کی اطاعت ہے۔ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ (النساء: ۸۰)۔ یہاں دو ضروری امور پیشِ نظر رہنے چاہییں۔ ایک یہ کہ جس قانونِ الٰہی کی پیروی کا مطالبہ آپ ﷺ مومنین سے کرتے، اُس قانون کے سب سے بڑھ کر پیروکار بھی آپ ﷺ خود ہی تھے۔ خشیت الٰہی اور محاسبہ آخرت کی جو کیفیت آپ ﷺ اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں دیکھنا چاہتے تھے، اس کا مظہر کامل بھی خود آپ ﷺ کی ذاتِ اقدس تھی۔ سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے عرض کیا۔ یارسول اللہ ﷺ! میں آپ کے بالوں میں سفیدی آتے دیکھ رہا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مجھ کو سورۃ ہود اور اُس کی ہم مضمون سورتوں نے بوڑھا کر دیا ہے۔ فتح مکہ کے موقع پر عفو و درگزر کی تعلیم دیتے ہوئے آپ ﷺ نے جاہلیت

کے خون معاف کرنے کا حکم دیا اور سب سے پہلے اپنے خاندان کی طرف سے اسی قسم کا ایک خون معاف کیا۔ جاہلیت کے سود کی معافی کا حکم صادر کیا تو سب سے پہلے اپنے چچا حضرت عباسؓ کا سود معاف کیا۔

ایک اور بات یہ کہ اپنے ذاتی معاملات میں صحابہؓ و صحابیاتؓ کسی اُلجھن کے موقع پر آپ ﷺ کی رہنمائی کے بارے میں دریافت کر لیتے تھے کہ یہ آپ ﷺ کا مشورہ ہے یا اللہ اور رسول اللہ ﷺ کا حکم ہے؟ انتظامی امور میں آپ ﷺ خود مشاورت کا باقاعدہ بندوبست فرماتے اور اپنی ذاتی رائے پر دوسری آرا کو ترجیح بھی دیتے۔ جنگ بدر میں پہلے جس مقام پر آپ ﷺ نے پڑاؤ کیا، اُس پر حضرت حباب بن منذرؓ کو تحفظات تھے۔ انھیں جب معلوم ہوا کہ جگہ کا فیصلہ وحی الٰہی سے نہیں، رسول اللہ ﷺ کی ذاتی رائے سے ہوا ہے تو اُنھوں نے ایک دوسرے مناسب مقام پر پڑاؤ ڈالنے کی تجویز دی، جسے آپ ﷺ نے فوراً قبول فرمالیا۔ حقیقت یہ ہے کہ عہدِ رسالت میں اسلامی نظمِ حکومت قرآن وسنت کی بنیادی اور غیر متبدل ہدایات کے ساتھ ساتھ اصولِ شورائیت پر مبنی تھا۔ اس کا کسی قسم کی ڈکٹیٹر شپ کے ساتھ دور دور کا تعلق نہ تھا۔

حاصل بحث یہ کہ ''دی ہنڈرڈ'' کا انداز مجموعی طور پر اسلام کے بارے میں مخاصمانہ نہیں ہے۔ کتاب کا مطالعہ ''روحانی ضیافت'' نہ سہی، ''روحانی خودکشی'' بھی نہیں ہے جیسا کہ بعض مسلم نقادوں کا دعویٰ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جدید مستشرقین بھی اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے بارے میں جہاں بے شمار مقامات پر اعتراف حقیقت کر جاتے ہیں وہاں بسا اوقات دانستہ یا نادانستہ طور پر سخت ٹھوکر بھی کھا جاتے ہیں۔ انیسویں صدی کا مستشرق کارلائل جب حضور ﷺ کی سیرت پر اظہار خیال کرتا ہے تو اس کے منہ سے پھول جھڑتے ہیں اور قرآن حکیم پر تبصرہ کرتا ہے تو اُس کا قلم آگ اُگلتا ہے۔ (۲۵) بیسویں صدی میں منٹگمری ڈبلیو واٹ اہل یورپ کے سامنے حضور ﷺ کی یہود کے بارے میں پالیسی اور تعدد ازواج کا کامیاب علمی دفاع کرتا ہے لیکن وحی کے بارے میں اس کے ریمارکس سخت قابل اعتراض ہیں۔ (۲۶) اسی طرح جس انسائیکلو پیڈیا میں یہ لکھا ہے کہ ''تمام

پیغمبروں اور مذہبی شخصیتوں میں سب سے زیادہ کامیاب حضرت محمد ﷺ ہیں" اس میں اسلام اور حضور ﷺ کے بارے میں کم از کم ۲۲ غلط بیانیاں موجود ہیں۔(۲۷) جن میں سے ایک نمونہ یہ ہے کہ "(اسلام کا) تصور خدا جس میں طاقت، عقل اور رحم کے اوصاف ملے جلے نظر آتے ہیں، یہودی وعیسائی روایات اور عربوں کے جاہلی تصورات سے ماخوذ ہے۔"(۲۸) اس طرح ہجرت کو "فرار" قرار دیا گیا ہے۔ اس قسم کی خرافات کے باوجود کارلائل کی کتاب Hero and Hero Worship منٹگمری ڈبلیو واٹ کی کتاب Mohammad-The Prophet and Statesman اور Encyclopaedia of Britanica پر پابندی کا مطالبہ کسی نے نہیں کیا۔ ان کتب میں موجود بے بنیاد مفروضات کا علمی تعاقب ہی کیا گیا ہے اور یہی بات دین و دانش کے مفاد میں ہے۔

مراجع وحواشی

۱۔ مائیکل ایچ ہارٹ .... The 100

A ranking of the most influental persons in History

ازابیلا...... ۳۶۰

۲۔ ایضاً...... ۳۵۹

۳۔ ایضاً......

۴۔ محمد ﷺ...... ۳۳

۵۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام...... ۴۹

۶۔ مہاتما بدھ...... ۵۴

۷۔ زرتشت...... ۴۶۶

۸۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام...... ۱۱۵۔۱۱۶

۹۔ سینٹ پال...... ۶۹

۱۰۔ ایضاً...... ۶۳

۱۱۔ ایضاً...... ۶۵،۴۵

۱۲۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام...... ۵۰۔۵۱

اس تجزیے کے بعد وہ لکھتا ہے۔

"Jesus' most distinctive teaching, therefore, remains an intriguing but basically untried suggestion".

۱۳۔ مہاتما بدھ...... ۵۶

۱۴۔ حضرت محمد ﷺ...... ۳۹

۱۵۔ ایضاً

۱۶۔ ایضاً...... ۳۸

۱۷۔

"Here is a brief, concise and brilliant catalogue of many great persons in history, complete with anecdotes, biographical data and major accomplishments....The 100is a book that should grace every library." (Memphis Commerical Appeal)

۱۸۔ابتدائیہ(The Premise)......۲۶۔۲۸

۱۹۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام......۱۱۶

۲۰۔ عمر بن خطابؓ......۲۷۵

۲۱۔ ایضاً ۲۷۵

۲۱الف۔ راجر ہارڈی:

The Muslim Revolt:

A Journey through political islam C. Hurst & Co London (۲۰۱۰)

۲۲۔ حضرت محمد ﷺ......

۲۳۔ ایضاً......۳۴

۲۴۔ فری لینڈ ایبٹ......Islam and Pakistan

"Some say Muhammad(SAW) had a Jewish teacher which may be true; some say he was acquainted with and impressed by Syrian Christian Monks which may be true. Others think the trading society in which he lived offered in itself a kaleidoscopic picture of different religions which may also be ture. What is fundamental, of course, is that he did not lay claim to originality for his religion."

۲۵۔ تھامس کارلائل......Sartor Resartus/On Heroes and Hero Worship

۲۶۔ منٹگمری ڈبلیو واٹ......Muhammad-Prophet and Statesman

۲۷۔ پروفیسر ڈاکٹر غلام مرتضیٰ ملک......انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا میں اسلام اور محمد ﷺ پر بہتانات

۲۸۔ ایضاً

دی کرائسس آف اسلام

(The Crisis of Islam)

برنارڈ لیوس کے افکار و نظریات کا تجزیہ

برنارڈ لیوس (Bernard Lewis) کو شمالی امریکہ و یورپ میں اسلام اور مشرق وسطیٰ کے معاملات پر ایک مستند اتھارٹی سمجھا جاتا ہے۔ اس برطانوی نژاد یہودی مستشرق نے ۱۹۸۲ء میں باقاعدہ طور پر امریکی شہریت حاصل کر لی تھی۔ دوسری جنگِ عظیم میں لیوس نے برطانیہ کے محکمہ سراغ رسانی کے لیے خدمات انجام دیں۔ لیوس نے لندن یونیورسٹی، پرنسٹن یونیورسٹی اور کارنیل یونیورسٹی کے تدریسی اور تحقیقی شعبوں کے ساتھ بھی وابستگی اختیار کیے رکھی۔ اسلام پر مصنف کے قلم سے بہت سی کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں اور ان میں سے بیشتر کا ترجمہ عربی، فارسی، ترکی، انڈونیشی زبانوں میں بھی ہو چکا ہے۔

اہل علم کے ایک اچھے خاصے طبقے کا خیال ہے کہ اسلامی بنیاد پرستی (Islamic Fundamentalism) کی اصطلاح سب سے پہلے لیوس نے ۱۹۹۰ء میں اپنے ایک مضمون The Roots of Muslim Rage کے ذریعے متعارف کرائی تھی۔ اسی طرح سموئیل ہنٹنگٹن کی کتاب The Clash of Civilizations میں پیش کردہ "تہذیبوں کے تصادم" کی اصطلاح بھی بہت عرصہ قبل یعنی ۱۹۵۷ء میں لیوس نے واشنگٹن کے ایک اجلاس میں پیش کی تھی۔ نائن الیون کے بعد لیوس کی کتابوں کی مانگ میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ اس کی تین کتب نائن الیون کے تناظر میں ہی شائع ہوئیں۔ اس کی کتاب What Went Wrong نائن الیون سے قبل شائع ہو چکی تھی۔ اس کتاب کا مرکزی خیال مسلم دنیا میں جدیدیت (Modernization) کے عمل سے

پیدا ہونے والا خوف اور بعد ازاں اس جدیدیت کی مخالفت ہے۔اس سلسلے کی دوسری کتاب ۲۰۰۳ء میں شائع ہونے والی The Crisis of Islam ہے اور تیسری کتاب ۲۰۰۹ء میں Religion and the People کے نام سے شائع ہوئی۔

برنارڈ لیوس کو زبان و بیان پر خاصی قدرت حاصل ہے۔بہت سے مغربی اہلِ قلم اور مستشرق لفظ ہجرت کو انگریزی زبان میں Hejra لکھتے اور اُس کا ترجمہ ''فرار'' Flight کرتے ہیں۔لیوس نے صحیح تلفظ Hijra بتایا ہے اور ترجمہ کے لیے انگریزی کا لفظ Move استعمال کیا ہے جو کہ زیادہ قرین قیاس ہے۔عربوں کے نزدیک ہجرت کے معنی یہ ہیں کہ کوئی خانہ بدوش صحرا نشین اپنے صحرا کو چھوڑ کر کسی شہر میں جا بسے۔گویا ہجرت کے معنی ہیں کسی نعم البدل کو حاصل کرنا۔زبان و بیان پر اِس دسترس کو اُس نے اپنے طبقاتی و مذہبی تعصب کے اظہار کے لیے بھی بڑی مہارت کے ساتھ استعمال کیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اُس کی مرتب کردہ ایک کتاب کا عنوان Islam from Muhammad to the Capture of Constantinople یعنی ''اسلام محمد ﷺ سے قسطنطنیہ کے قبضہ تک'' ہے۔ظاہر ہے یہاں لفظ ''قبضہ'' (Capture) کے بجائے ''فتح'' (Conquest) بھی لکھا جا سکتا تھا اور یہ لیوس کو کسی صورت گوارا نہیں ہے۔

لیوس کا عمومی موقف یہ ہے کہ مشرق وسطیٰ کے مسلمان اپنی پسماندگی کا اصل ذمہ دار غیر ملکی استعمار کو سمجھتے ہیں جبکہ اس پسماندگی کے ذمہ دار وہ خود ہیں۔اپنی ثقافتی رعونت (Cultural Arrogance) کے زیرِ اثر مسلمان دوسرے ذرائع سے تخلیقی طور پر بھی کچھ بھی حاصل نہ کر سکے۔وہ یہ دعویٰ بھی کرتا ہے کہ صلیبیوں (Crusaders) کی کامیابیوں (؟) کا راز بھی بہت حد تک مسلمانوں کی کمزوریوں میں مضمر ہے۔(۱)

اس اندازِ فکر کے ذریعے مصنف بظاہر مسلم دُنیا کو خود احتسابی کی دعوت دیتا ہے۔خود احتسابی یقیناً کسی بھی قوم کے لیے بہترین حکمت عملی ہے۔کسی بھی قومی و ملی سانحہ کے پیچھے اندرونی تضادات کا بہت زیادہ عمل دخل ہوتا ہے۔بیرونی یا غیر ملکی محرکات زیادہ تر عمل انگیز (Catalyst) کا کام

کرتے ہیں۔ کاش خود لیوس کی منظورِ نظر حکومت بھی خود احتسابی کے عمل سے یہ جان سکتی کہ نائن الیون کے سانحے کے اصل محرکات کیا ہیں؟ کیا یہ بھی دُنیا بھر کے مسلمانوں کو مسلسل دیوار سے لگانے کی استعماری پالیسی کا ایک بے ہنگم اور بے فائدہ ردِ عمل تو نہیں؟ بہر حال عالم اسلام نے خود احتسابی کے راستے کو چھوڑ کر حقیقی طور پر بہت نقصان اٹھایا ہے۔ مسلمانوں کو علم ہونا چاہیے تھا کہ مستقبل میں استعماری طاقتیں ایٹمی میزائل، نیپام بموں اور ڈیزی کٹر بموں سے مسلح ہونے والی ہیں۔ عالم اسلام میں دشمن کی جارحیت کا مقابلہ کرنے کے لیے قبل از وقت کم از کم Deterrant کا اہتمام ہونا چاہیے تھا تاکہ عالم کفر جنگ کا آغاز گو اپنی مرضی سے کرے مگر اس جنگ کا خاتمہ عالم اسلام کی مرضی سے ہو۔ قرآن پاک میں اِس حکمتِ عملی کو دشمن کے خلاف اپنے گھوڑے تیار رکھنے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جنگ عظیم کے دوران برطانیہ نے عربوں سے جو وعدے کیے اور پھر صیہونی مفادات کی تکمیل کے لیے ان وعدوں کا خود اپنے ہاتھوں جو حشر کیا، اس کا قبل از وقت اندازہ بھی مومنانہ فراست کا لازمی تقاضا تھا۔ حالیہ تاریخ میں سوویت یونین کے خلاف جہاد کرتے ہوئے، سوتے وقت بھی عالم اسلام کو ایک آنکھ کھلی رکھنی چاہیے تھی۔ انھیں اندازہ ہونا چاہیے تھا کہ روسی فوج کے انخلا کے بعد افغانستان کو مستقل خانہ جنگی کے حوالے کرنا استعماری طاقتوں کا مقصدِ اوّلین ہے۔ اسلامی نظریات اور عالم اسلام کے مفادات کی حامل کسی بھی افغان حکومت کا قیام سرمایہ دار ممالک کے لیے افغانستان پر سوویت قبضے سے بھی زیادہ ناقابل قبول ہوگا۔ خود احتسابی کے کسی مناسب بندوبست کی عدم موجودگی نے یہ دن بھی دکھائے کہ آج جن ملکوں نے امریکی بانڈز میں بھاری سرمایہ کاری سے امریکی معیشت کو سہارا دے رکھا ہے ان میں جاپان اور چین کے علاوہ عرب ممالک بھی شامل ہیں۔

تاہم لیوس کی یہ بات خلافِ واقعہ ہے کہ مسلمانوں کی پسماندگی کی اصل وجہ ان کی ثقافتی (مذہبی) اقدار ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اپنی ثقافتی اقدار کی بدولت مسلمانوں نے صدیوں تک علمی اور فنی میدان میں دُنیا کی امامت کی جس کا خود لیوس کو بھی اعتراف ہے۔ بعد میں جو کچھ ہوا وہ ترکِ مذہب کی وجہ سے ہوا...... ایک ایسا مذہب جو جمود کے بجائے جہاد اور تقلید کے بجائے اجتہاد پر

زور دیتا ہے۔ برنارڈ لیوس اطمینان رکھیں۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر جو یکے بعد دیگرے مسلمان ملکوں کی مشکیں کسی جا رہی ہیں، یہ بھی ایک Passing Phase ہے۔ اسلام اپنی اندرونی قوتِ مزاحمت کے بل پر ماضی میں صلیبی جنگوں، فتنہ تاتار اور سامراجی یلغار کے خلاف کامیاب مزاحمت کا عملی ثبوت دے چکا ہے اور موجودہ یا آیندہ پیش آنے والے کسی بھی بحران کا مقابلہ کرنے کی بے پناہ صلاحیت رکھتا ہے۔

لیوس کا یہ نقطۂ نظر بھی خلاف حقیقت نہیں کہ اسلام کو محض ایک خونریز مذہب (Bloodthirsty Creed) یا سراسر امن کا پیامی مذہب جیسی دو مختلف انتہاؤں (extremes) سے منسوب نہیں کیا جا سکتا اور یہ کہ اسلام مختلف النوع حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے مختلف قسم کے جوابی ردعمل (a range of responses) پیش کرتا ہے۔(۲) بلاشبہ مسئلہ جنگ کا ہو یا امن کا، حقیقی مسلمان نظریں آسمان پر مگر قدم زمین پر رکھتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝ اِنَّمَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰٓي اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ (الممتحنہ:۸۔۹)

''اللہ تعالیٰ تمھیں منع نہیں کرتا کہ جن لوگوں نے تم سے دین کے معاملے میں جنگ نہیں کی اور نہ انھوں نے تمھیں گھروں سے نکالا کہ تم ان کے ساتھ احسان کرو اور ان کے ساتھ انصاف کا برتاؤ کرو۔ بے شک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تمھیں صرف ان لوگوں سے روکتا ہے جنھوں نے تم سے دین کے معاملے میں جنگ کی اور تمھیں تمھارے گھروں سے نکالا یا مدد دی۔

تمھارے نکالنے میں کہ تم انھیں دوست بناؤ اور جو انھیں دوست بناتے ہیں تو وہی (اپنے آپ پر) ظلم توڑتے ہیں۔"

یہی وجہ ہے کہ اسلام امن کے نام پر نعرے لگاتے ہوئے دوسرے ملکوں پر دھاوا بولنے اور معصوم آبادی کو تہ تیغ کرنے کا قائل نہیں۔ اسلام ناگزیر حالات میں جنگ کے بعد مفتوحہ عوام کے ساتھ مہربانہ سلوک کرنے کا داعی ہے۔ اس نوع کا پہلا اور انمٹ انسانی رویہ پیغمبر اسلام ﷺ نے فتح مکہ کے بعد مشرکین مکہ کے ساتھ روا رکھا اور خون کے پیاسوں کے لیے عام معافی کا اعلان فرمایا۔ مسلمان سنت محبوب الٰہی ﷺ کی پیروی میں مفتوحین اور اقلیتوں کے ساتھ حسن سلوک کی شاندار روایت کے وارث ہیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں فتح بیت المقدس ہو یا صلاح الدین ایوبی کے ہاتھوں اسی مقدس مقام پر صلیبیوں کی ہزیمت کا معاملہ، مفتوحین کے ساتھ مسلمانوں کے حسن سلوک نے فتح مکہ کی یاد تازہ کر دی۔ اس حسنِ سلوک کے واقعات لکھنے کے بعد سٹینلے لین پول لکھتا ہے:

> ''صلیبیوں نے فتح بیت المقدس کے موقع پر مسلمانوں کے قتل عام سے مسیحی دُنیا کی عزت کو بٹا لگایا تھا اور اس مقدس شہر کو انھوں نے ظلم و بدنامی کے رنگ میں رنگ دیا جہاں رحم و محبت کا وعظ مسیح علیہ السلام نے سنایا تھا اور فرمایا تھا 'خیر و برکت والے ہیں وہ لوگ جو رحم کرتے ہیں۔ ان پر خدا کی برکتیں نازل ہوتی ہیں'۔'' (۳)

لیوس نے پیغمبر اسلام ﷺ کی حیات مبارکہ پر کوئی مستقل بالذات کتاب نہیں لکھی۔ یہ الگ بات کہ اس کی تقریباً ہر کتاب میں حضور عالی مرتبت ﷺ کے حوالہ سے کچھ نہ کچھ لکھا گیا ہے۔ ان تحریروں میں منفی اور بظاہر مثبت دونوں قسم کے اشارات مل جاتے ہیں۔ منفی بات کہنے کا انداز بھی بہت ملفوف قسم کا ہے۔ اس کی ایک نادر مثال اس کا ایران کے بارے میں سیرت پاک کے حوالہ سے ایک انتہائی شرانگیز بیان ہے۔ اس نے پیش گوئی کی تھی کہ ایران، امریکہ اور (خود لیوس کے ممدوح ملک) اسرائیل پر ۲۲ راگست ۲۰۰۶ء میں ایٹمی حملہ کر دے گا۔ یہ حملہ نہ صرف اسرائیل

بلکہ پوری دُنیا کے خاتمے کا باعث بن سکتا ہے۔ اس بیان کے ذریعے مغربی طاقتوں کو ایران پر گویا پیشگی حملے (Pre-emptive Attack) کی ترغیب دی گئی۔ یہ تاریخ تو بخیریت گزر گئی۔ تاہم مغربی میڈیا میں لیوس کی استنادی حیثیت میں بہت کمی دیکھنے میں آئی۔ مذکورہ تاریخ پر لیوس نے اپنے اصرار کی وجہ یہ بتائی کہ ''اسلامی کیلنڈر کے مطابق ۱۴۲۷ ہجری رجب کی ۲۷ تاریخ ہے اور اس دن دُنیا بھر کے مسلمان پیغمبر اسلام ﷺ کے واقعہ معراج کی یاد مناتے ہیں۔ یہ تاریخ اسرائیل اور اگر ضروری سمجھا گیا تو دُنیا کے قیامت خیز اختتام کی ایک موزوں تاریخ ہو سکتی ہے۔'' (۴) سب جانتے ہیں کہ واقعہ معراج ایک خالصتاً دینی معاملہ ہے۔ عالمی ادب پر بھی اس تاریخی واقعے کے تخلیقی اثرات ناقابل انکار ہیں۔ لیوس نے اپنی فنکارانہ چابکدستی سے واقعہ معراج کی جمالیات (Aesthetics) کو جدلیات (Dialectics) میں بدل ڈالا۔

برنارڈ لیوس کی ایک مشہور کتاب ۱۹۴۷ء میں The Arabs in History کے نام سے منظرِ عام پر آئی۔ اب تک اس کتاب کے تقریباً بارہ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ پہلے ایڈیشن کے مقدمے Preface میں ہی مصنف نے واضح کر دیا تھا:

> This is not so much a history of the Arabs as an essay in interpretation.

''عربوں کی تاریخ سے زیادہ یہ کتاب (تاریخ کی) ایک تعبیر ہے۔''

ظاہر ہے کتاب کا عنوان اگر A History of the Arabs ہوتا تو مصنف ایک معروضی نقطۂ نظر اختیار کرنے پر مجبور ہوتا۔ اس کے برعکس The Arabs in History میں اُسے اپنی جولانیٔ طبع کے لیے ایک کھلا میدان مل جاتا ہے۔ تاریخ کی من مانی تعبیر کرنے کا خود ساختہ حق حاصل ہونے کے بعد وہ مسلّمہ تاریخی حقائق کو مسخ کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ مثلاً عام مستند تاریخی روایات کے مطابق غزوۂ بدر کا معرکہ مدینہ منورہ کے مسلمانوں اور مکی لشکر کے درمیان بدر کے مقام پر پیش آیا۔ ابوسفیان کا تجارتی قافلہ اس جنگ کا ایک بڑا محرک ضرور تھا۔ لیکن وہ قافلہ پیش آنے

والے حالات سے قبل از وقت باخبر ہو کر دوسرے راستے سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ ابوجہل کو اس کے قریبی ساتھیوں نے سمجھایا بھی تھا کہ اب جنگ کا رلا حاصل ہے۔ابوجہل نے یہ کہہ کر واپس جانے سے انکار کر دیا تھا کہ مسلمانوں کے ساتھ اگلے پچھلے حسابات چکانے کا یہ بہترین موقع ہے۔مالِ غنیمت جو مسلمانوں کے ہاتھ آیا، وہ بھی اسی پہلے بڑے معرکۂ حق و باطل کے نتیجے میں حاصل ہوا۔قرآن حکیم میں لشکرِ قریش، قافلۂ ابوسفیان اور اسلامی لشکر کی جائے قیام کے بارے میں جو اشارات پیش کیے ہیں، اُن کو سمجھنے کے لیے نہ صرف گہرے فہمِ قرآن بلکہ متعلقہ جغرافیائی حالات سے براہ راست واقفیت کی ضرورت ہے۔(بریگیڈئر گلزار احمد نے بڑی عرق ریزی کے ساتھ اپنے ایک تیار کردہ نقشے کی صورت میں مکمل محل وقوع سمجھانے کی کوشش کی ہے۔) برنارڈ لیوس اس کتاب کے دوسرے باب میں بڑی غیر ذمہ داری کے ساتھ صورتِ معاملہ کو ایک آدھ جملے میں بالکل الٹ کر رکھ دیتا ہے۔بقول اُس کے:

> Muslims under the leadership of Muhammad surprised a Maccan caravan at Bader. The raiders won much booty and their achievements are celebreated in the Quran as an expression of divine good will(۵)

"محمد (ﷺ) کی قیادت میں مسلمانوں نے مکہ کے تجارتی قافلے پر اچانک حملہ کر دیا۔حملہ آوروں کو بہت سا مالِ غنیمت ہاتھ آیا اور قرآن میں اُن کے کارناموں کو رضائے الٰہی کے شاندار اظہار کی صورت میں سراہا گیا ہے۔"
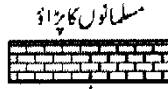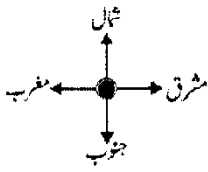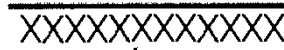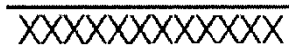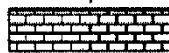
میدانِ بدر کا ایک سرسری خاکہ

ظاہر ہے یہ مستند تاریخی واقعات کی تعبیر نہیں، صاف اور صریح قسم کی تحریف اور جھوٹ ہے۔
اس تحریف کی دوسری مثال بھی اس کتاب کے اسی باب میں موجود ہے۔ مشہور و معروف تاریخی روایات کے مطابق حضور اکرم ﷺ اپنے صحابہ کے ساتھ عمرہ کرنے کی نیت سے حرم مکہ کی جانب روانہ ہوئے تھے۔ اپنے ساتھ آپ ﷺ اور آپ کے اصحاب نے جو ہدی (قربانی کے جانور) لیے تھے ان کے گلے میں نشانی کے طور پر قلادے ڈالے گئے تھے۔ حفاظت خود اختیاری کے لیے صرف ایک تلوار نیام میں ساتھ لے جانے کی اجازت دی گئی تھی۔ قریش کو خبر ہوئی تو انھوں نے خالد بن ولید کی قیادت میں ایک مسلح دستہ بھیج کر آپ ﷺ سے ٹکرانے کی کوشش کی۔ آپ ﷺ نے غیر ضروری تصادم سے بچنے کے لیے راستہ بدل لیا اور حدیبیہ کے مقام پر پڑاؤ ڈالا۔ یہاں بھی رات کی تاریکی میں پرامن اصحابِ رسول پر شب خون مار کر اشتعال دلانے کی کوشش کی گئی۔ سفارتی نامہ و پیام کے سلسلہ میں آپ ﷺ نے حضرت عثمانؓ کو اہلِ مکہ کے پاس بھیجا۔ بعد میں جب حضرت عثمانؓ کی شہادت کی افواہ پھیل گئی تو یہ موقع تھا جب آپ ﷺ نے اپنے جان نثار صحابہ سے حتمی لڑائی کے لیے بیعت لی، جسے بیعتِ رضوان کہا جاتا ہے۔ آپ ﷺ کے عزم و استقلال اور صحابہ کرام کے جوشِ شہادت کو دیکھ کر ہی قریش مکہ مصالحت کے لیے آمادہ ہوئے۔ حدیبیہ کی جانب یہ سارا سفر آغاز سے اختتام تک ایک کامیاب پُرامن پیش قدمی (Peaceful Offensive) تھا۔ برنارڈ لیوس اس سارے واقعے کو ایک دوسرا مگر سراسر غیر حقیقی رُخ دیتے ہوئے کہتا ہے:

> In the early spring of 628 Muhammad felt strong enough to attempt an attack on Mecca. On the way, however, it became clear that the attempt was premature and the expedition was converted into a peaceful pilgrimage(.٦)

"۶۲۸ء کے موسم بہار میں محمد (ﷺ) نے اپنے آپ کو قوی سمجھتے ہوئے مکہ پر حملہ کرنے کی کوشش کی۔ راستے ہی میں یہ بات واضح ہوگئی کہ یہ کوشش قبل از وقت ہے۔ چنانچہ اس مہم کو ایک پر امن سفر عمرے کا نام دے دیا گیا۔"

اس نوع کی تاریخی قلابازیوں کے ساتھ ساتھ لیوس نے علمِ حدیث کی حجیت پر بھی بظاہر فنی اعتراضات اُٹھانے کی مضحکہ خیز کوشش کی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ کی مادی تعبیر میں بھی جھوٹ کے ساتھ ساتھ سچ کے عناصر دریافت کیے جاسکتے ہیں۔ لیکن تاریخ کی صیہونی تعبیر میں تو سرے سے کسی سچ کی گنجایش ہی نہیں ہے۔ حقائق کا وہ خون کیا گیا ہے کہ انصاف پسند یہودی بھی شرما جائیں۔ صحیح احادیث کو ضعیف اور موضوع روایات سے الگ کرنے کے لیے محدثین نے اسماء الرجال کے نام سے جو عظیم الشان فن ایجاد کیا، جرمن مستشرق اے سپرنگر سمیت ایک دنیا اُس کی معترف ہے۔ برنارڈ لیوس کو یہاں بھی اطمینان نصیب نہیں ہوا۔ وہ کہتا ہے:

"It is as easy to forge a chain of authorties as a tradition(۷)."

"جس طرح کسی روایت حدیث کو وضع کرنا ممکن ہے بالکل اسی طرح اس کے سلسلہ اسناد کو بھی وضع کیا جاسکتا ہے۔"

ہم بھی کہتے ہیں کہ نہ صرف مسلمانوں کے بعض گمراہ فرقوں نے بلکہ غیر مسلم طاقتوں نے بھی اپنے اپنے مفادات کے لیے یہ دونوں کام کرنے کی کوشش کی اور منہ کی کھائی۔ برنارڈ لیوس کو معلوم ہونا چاہیے کہ احادیث کے سلسلہ اسناد کو جانچنے کے لیے محدثین نے غیر معمولی جانفشانی سے کام لیا۔ ایک ایسے ہی محدث ایک حدیث کے واحد راوی کے ہاں طویل سفر کے بعد پہنچے۔ وہ بزرگ اپنے ایک گھریلو جانور کو قابو کرنے کے لیے بعد از دوپہر چارے کا جھانسا دے کر اپنی طرف بلا رہے تھے۔ ہمارے محدث یہ سوچ کر اُلٹے پاؤں واپس چلے آئے کہ جو شخص اپنے فائدے کے لیے ایک بے زبان جانور کو دھوکا دے سکتا ہے وہ روایت حدیث جیسے نازک منصب کے لیے قابل

اعتبار نہیں ہو سکتا۔ غیر مسلموں کی جانب سے اس قسم کی ایک مشہور مگر ناکام کوشش کا بھی ذکر یہاں ضروری ہے۔ مشہور واقعہ ہے کہ عباسی خلیفہ قائم بامر اللہ کے سامنے یہودیوں کی جانب سے ایک تحریری دستاویز پیش کی گئی، جسے ان کے فنی ماہرین نے بڑی محنت سے تیار کیا تھا۔ اس تحریر کی رُو سے رسول اللہ ﷺ نے خیبر کے یہودیوں کا جزیہ معاف کر دیا تھا اور اس تحریر کے کاتب حضرت علیؓ تھے۔ دستاویز پر دو گواہوں ...... حضرت معاویہ بن ابوسفیانؓ اور سعد بن معاذؓ ...... کے دستخط ثبت تھے۔ یہ تحریر عباسی خلیفہ نے تصدیق و توثیق کے لیے مشہور مؤرخ علامہ خطیب بغدادیؒ (۴۶۳ھ / ۱۰۷۰ء) کے سامنے رکھی۔ تحریر میں موجود اندرونی تضادات کی بنا پر انھوں نے اسے سراسر جعلی قرار دیا۔ ایک نقص یہ تھا کہ خیبر کی فتح ہجرت کے ساتویں سال مکمل ہوئی تھی اور حضرت معاویہ بن ابوسفیانؓ غزوۂ خیبر کے کہیں بعد دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ دوسری خامی یہ تھی کہ مذکورہ دستاویز کے دوسرے مبینہ گواہ حضرت سعد بن معاذؓ ہجرت کے پانچویں برس غزوۂ خندق کے موقع پر شدید زخمی ہوئے اور اُسی سال غزوۂ بنی قریظہ کے بعد شہید ہو گئے تھے۔ تیسری اور اہم ترین بات یہ کہ اُس وقت تک جزیہ کا حکم نازل نہ ہوا تھا۔ جزیہ کا حکم قرآنِ حکیم میں جنگِ تبوک کے بعد نازل ہوا۔

لیوس کی کتاب The Crisis of Islam میں نائن الیون کے حوالے سے جا بجا اُسامہ بن لادن کے نظریات کو بیان کیا گیا ہے۔ ان بیانات میں جہاں جہاں مسجد اقصیٰ، حرم شریف اور دوسرے عرب علاقوں سے غیر ملکی افواج کے انخلا کا مطالبہ کیا گیا ہے، وہاں مصنف اپنے غم و غصہ کو چھپا نہیں سکا۔ اُسے سخت گلہ ہے کہ: ''لوگ کویت کے خلاف صدام حسین کی جارحیت کو بھولتے جا رہے ہیں۔ انھیں یہ تک یاد نہیں رہا کہ ۱۹۹۱ء کی جنگ خلیج (Gulf War) امریکہ نے اکیلے نہیں، بلکہ اپنے عرب اور غیر عرب اتحادیوں سے مل کر کویت کی آزادی اور سعودی عرب کے تحفظ کے لیے لڑی تھی۔ لوگوں کو بس اس قدر یاد ہے کہ عراق کے خلاف پابندیاں لگائی گئی ہیں۔ امریکی اور برطانوی جہاز عرب فضاؤں میں اُڑانیں بھر رہے ہیں۔ عراقی عوام مصائب کی چکی میں پس رہے ہیں اور یہ کہ امریکہ میں اسرائیل کے حق میں تعصب بڑھتا جا رہا ہے۔'' (۸) لیوس کے اندازِ بیان

سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ دُنیا کے کسی بھی علاقے میں غیر ملکی قبضے کے خلاف تحریک آزادی جائز ہو سکتی ہے لیکن مسلمان اور عرب عوام کو یہ حق نہیں دیا جا سکتا۔ اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے وہ بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ کہتا ہے: ''مغرب دہشت گردوں کے خلاف اپنے ''دفاع'' کے لیے جو بھی مؤثر ذرائع ہوں وہ لازماً اختیار کرے لیکن دہشت گردوں سے لڑتے وقت یہ بات مفید ہوگی کہ ان عوامل کو سمجھا جائے جو انھیں متحرک رکھتے ہیں۔'' ایک ایسے ہی فیصلہ کن عامل کی نشاندہی کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے: ''پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنے آخری ایام میں بستر علالت سے حکم جاری کیا تھا کہ عرب میں دو مختلف دین اکٹھے نہیں رہ سکتے۔'' (۹)

یہاں تفصیلات پیش کرنے کا محل نہیں۔ اس قدر اشارہ کافی ہے کہ کوئی بھی نظریاتی ریاست اپنے پسندیدہ نظریے کی مخالفت کرنے والوں کو ایک حد تک ہی برداشت کر سکتی ہے۔ اسلامی ریاست میں کسی کا تعلق ریاستی دین سے ہو یا کسی دوسرے دین سے، شراب کے لین دین اور سودی کاروبار میں ملوث ہونے کو برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ پھر کسی تکثیریت کے نام پر توحید کے اولین مرکز میں تو اس بات کی اجازت بھی ممکن نہیں کہ خدائے واحد کی بندگی بھی ہو رہی ہو اور ساتھ ہی بت پرستی بھی جاری ہو۔ لیوس نے ایسے معاملات میں ارشاد نبوی ﷺ کو سیاق وسباق سے الگ کر کے خلط مبحث کیا ہے۔ ویسے آج کے دور میں سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں خود ساختہ ادیان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ دونوں بقائے باہمی کے اصول پر اکٹھے رہ سکے ہیں؟ امر واقعہ یہ ہے کہ اپنی ریاستی حدود کے اندر تو کجا، دونوں بڑی طاقتوں نے ایک دوسرے کے وجود کو اپنی جغرافیائی حدود سے باہر بھی چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔ بالآخر ایک طاقت نے دوسری طاقت کو مکمل طور پر اِس طرح ناک آؤٹ کیا کہ اُس کے حصے بخرے ہو گئے۔ (۱۰) ایک اور سلگتا ہوا سوال یہ ہے کہ آج کی کوئی بھی مغربی جمہوریت مبینہ دہشت گردوں کو قبول کرنے کے لیے تیار ہے؟

بہت سے مشہور مستشرقین کی طرح لیوس بھی بات کا آغاز کرتے وقت اسلام کے بارے میں

کچھ کلمہ ہائے خیر کہہ دیتا ہے اور جب لوہا گرم دیکھتا ہے تو چپکے سے ایک دو خطرناک ضربات لگا کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ پہلے اس کے مثبت اشارات ملاحظہ ہوں۔

''اسلام، عیسائیت کے مقابلے میں کہیں زیادہ قدیم مشرق اور جدید مغرب کے لیے ایک درمیانی واسطے کا کام دیتا رہا ہے اور جدید مغرب کی تعمیر میں اس کا کردار نمایاں ہے۔ تاہم گذشتہ تین صدیوں سے یہ تہذیب زوال پذیر ہے۔''(۱۱)

غالباً تینوں بڑے الہامی مذاہب میں ہم آہنگی دیکھنے کے ادعا کے ساتھ وہ یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار ہے کہ ایشیا کے کسی بھی دوسرے بڑے مذہب یعنی ہندومت، بدھ مت، کنفیوشش مت کے برعکس

''یہودیت، عیسائیت اور اسلام ایک دوسرے سے گہرا تعلق رکھتے ہیں اور بظاہر ایک ہی مذہبی روایت کے متنوع مظاہر (Variants of the same religious tradition) ہیں۔''(۱۲)

اس کے بعد جلد ہی لیوس تینوں بڑے مذاہب کے مشترکہ نکات سے اُکتا جاتا ہے اور اُسے فی الفور یاد آتا ہے کہ اسلام اور عیسائیت کے درمیان بہت گہرے اختلافات موجود ہیں۔ یہاں بھی وہ اسلام و عیسائیت کے عام دینیاتی (theological) اختلافات کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک مخصوص نقطۂ اختلاف پر اپنی جملہ قلمی توانائیاں صرف کر دیتا ہے جس سے عیسائیت کا رشتہ اسلام کے بجائے ہندومت، بدھ مت اور زرتشت وغیرہ سے قائم ہو جاتا ہے۔ کتاب کا ایک ضروری اقتباس ملاحظہ ہو:

''صدیوں تک عیسائیت مظلوموں کے مذہب کے طور پر ترقی کرتی رہی۔ یہاں تک کہ شہنشاہ کونسٹنٹائن (Constantine the Great) نے عیسائی مذہب قبول کر لیا۔ قیصر کے تبدیلی مذہب کے ساتھ ہی عیسائیت میں ایسی تبدیلیوں کا سلسلہ شروع ہوا جس سے یہ نیا مذہب رومی سلطنت میں پھیل گیا اور اس نے

موجود تہذیب کو مکمل طور پر بدل ڈالا۔ بانی اسلام ﷺ خود ہی کونسٹنٹائن تھے اور انھوں نے خود اپنی ریاست اور سلطنت کی بنیاد رکھی .... محمد ﷺ کی زندگی میں ہی مسلمان بیک وقت ایک سیاسی اور مذہبی وحدت بن گئے، جس کے سربراہ ریاست پیغمبر ﷺ خود تھے۔ اس لحاظ سے آپ ﷺ ایک علاقے اور ایک قوم کے حکمران تھے۔ آپ ﷺ خود ہی انصاف کا قیام عمل میں لاتے ٹیکس کی فراہمی کا بندوبست کرتے۔ فوجوں کی قیادت فرماتے جنگیں لڑتے اور امن بھی قائم کرتے۔"(۱۳)

تاریخی و دینی لحاظ سے محولہ بالا اقتباس میں بھی بہت سی باتیں درست ہیں۔ لیوس کو اصل اختلاف اسلام میں دین و دنیا کی یکجائی سے ہے۔ قطع نظر اس سے کہ چرچ اور ریاست کی دوئی نے خود مغربی معاشرے کو کس تہذیبی بحران کے حوالے کر دیا ہے۔ قابل لحاظ بات یہ ہے کہ مختلف مذاہب کی ترویج کے لیے عیسائیت ہی نہیں دوسرے مذاہب کے ہاں بھی تلوار اور حکمرانوں کا کردار غیر معمولی رہا ہے۔ یہودیوں نے تو اپنے مذہب کو ویسے ہی ایک نسلی مذہب بنا کے رکھ دیا۔ براہ راست حکمران بننے کے بجائے یہ لوگ (قیام اسرائیل کے بعد بھی) دوسرے ملکوں میں اپنی دولت اور ذہانت کے بل پر حکمرانوں کے عزل و نصب میں زیادہ دلچسپی لیتے رہے۔ یہ ابھی کل کی بات ہے کہ بس چلا تو صابرہ اور شتیلہ کے مہاجر فلسطینی کیمپوں میں موجود نہتے مردوں اور عورتوں کو تہ تیغ کر کے صہیونی درندوں نے اُن کی بے گور و کفن لاشوں پر رقص ابلیس کیا۔ کیا عجب کہ سابق اسرائیلی وزیراعظم کی قیادت میں بے کس اور بے بس فلسطینی مسلمانوں پر ہلہ بول دینے والے مسلح صہیونی دہشت گرد اپنے تئیں تورات کے اِس حکم پر عمل کر رہے ہوں:

"اُن قوموں کے شہروں میں جن کو خداوند تیرا خدا میراث کے طور پر تجھے دیتا ہے، کسی ذی نفس کو زندہ نہ چھوڑنا بلکہ تو اُن کو جیسا خداوند تیرے خدا نے تجھ کو حکم دیا ہے بالکل نیست و نابود کر دینا۔"(۱۴)

زرتشت کی تبلیغ کے لیے ایران کے بادشاہ گشتاشپ (Vishtaspa) اور بعد کی صدیوں میں دوسرے ایرانی بادشاہوں کے مسلسل تعاون کے بعد بالآخر ساسانیوں نے اُسے سرکاری مذہب بنا لیا۔(۱۵) ہندوؤں کی مہا بھارت کے مطابق کورو اور پانڈو کی جنگ شروع ہوتے ہی ارجن نے اس خیال سے جنگ سے اعراض کرنا چاہا کہ اس کے بہت سے اعزہ واقارب کی ہلاکت یقینی ہے۔ اس موقع پر شری کرشن جی نے اُسے آمادہ جنگ کرنے کے لیے جو طویل اُپدیش دیا اُسے بھگوت گیتا کہتے ہیں۔جس کا مرکزی مضمون ہی مقدس جنگ (Holy War) ہے۔شری کرشن کے نزدیک معرکہ خیر وشر میں شریک ہونا سب سے بڑی عبادت ہے۔رضائے الٰہی کے لیے باطل قوتوں کے خلاف جنگ کرنے سے دُنیا میں عزت اور آخرت میں جنت نصیب ہوتی ہے۔اس کے برعکس جہاد سے منہ موڑنے والا نہ صرف دُنیا میں ذلیل وخوار ہوتا ہے بلکہ آخرت میں بھی اُسے ''نرک'' یعنی جہنم نصیب ہوتا ہے۔(۱۶) بدھ مت پہلے پہل ہندستان کے شمال مغربی حصے میں ایک مقامی مذہب کے طور پر مقبول تھا۔اشوک (Asoka) بادشاہ نے بدھ مذہب اختیار کیا تو اس مذہب کی نشرو اشاعت کے لیے تمام سرکاری اور شاہی وسائل جھونک دیے۔مہاتما بدھ کے بعد اشوک بادشاہ وہ واحد شخص ہے جو بدھ مت کو ایک عالمی مذہب بنانے کا ذمہ دار ہے۔(۱۷)

ان تاریخی حقائق سے پتا چلتا ہے کہ مجرد وعظ وتلقین کسی دیرپا اور پایدار انقلاب کی بنیاد نہیں بن سکتے۔اقبال کے الفاظ میں عصا کے بغیر کلیمی ایک کار بے بنیاد ہے۔ایک اور حقیقت یہ ہے کہ قانون قدرت کے مطابق کوئی خلا زیادہ دیر تک باقی نہیں رہ سکتا۔اگر تعمیری قوتیں میدان چھوڑ دیں تو پھر تخریبی قوتیں اس خلا کو پُر کرتی ہیں۔شعبہ سیاست کو بھی جب مذہب واخلاق کے دائرہ سے خارج کیا گیا تو اس سے پیدا ہونے والے خلا کو فکری سطح پر کسی چانکیا یا میکاولی اور عملی سطح پر کسی چنگیز خان، کسی ہلاکو، کسی ہٹلر یا کسی بش نے ہی پُر کیا اور جس بھدے طریقے سے پُر کیا، اُس پر کسی تبصرے کی حاجت نہیں ہے۔

جہاں تک کانسٹنٹائن (۲۸۰ء۔۳۳۷ء) کے قبولِ عیسائیت اور فروغ عیسائیت کے

لیے کوششوں کا تعلق ہے، تاریخی طور پر یہ بات طے شدہ ہے کہ اُسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اصولِ محبت و رواداری کی ہوا تک نہ لگی تھی۔ البتہ اپنی اُفتادِ طبع کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کے اُس حصے سے وہ شدید متاثر تھا جس کا تعلق عسکریت سے ہے۔ اللہ کے سچے اور برگزیدہ پیغمبر کے طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق یہ کہنا صحیح نہیں کہ وہ ہر قیمت پر بدی اور شر کے ساتھ صلح اور رواداری کے قائل تھے۔ یہ بات قانونِ قدرت کے خلاف ہے اور پیغمبرانہ منصب کے بھی شایانِ شان نہیں۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات میں بھی بدی کی قوتوں کے ساتھ عسکری مزاحمت کے واضح اشارے بلکہ احکامات تک ملتے ہیں:

> ''یہ نہ سمجھو کہ میں زمین پر صلح کرانے آیا ہوں۔ صلح کرانے نہیں بلکہ تلوار چلانے آیا ہوں۔ کیونکہ میں اس لیے ہوں کہ آدمی کو اُس کے باپ سے اور بیٹی کو اُس کی ماں سے اور بہو کو اُس کی ساس سے جدا کر دوں۔ جو کوئی باپ اور ماں کو مجھ سے زیادہ عزیز رکھتا ہے وہ میرے لائق نہیں۔ جو کوئی اپنی صلیب نہ اُٹھائے اور میرے پیچھے نہ چلے، وہ میرے لائق نہیں۔ جو کوئی اپنی جان بچاتا ہے، اُسے کھوئے گا اور جو کوئی میری خاطر اپنی جان کھوتا ہے وہ اُسے بچائے گا۔''(۱۸)

جہاد کی اس ترغیب کے بعد سامانِ جہاد فراہم کرنے کے لیے بھی بائبل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے الفاظ واضح ہیں:

> ''جس کے پاس بٹوا ہو وہ اُسے (آلاتِ حرب) لے اور اس طرح جھولی بھی۔ اور جس کے پاس نہ ہو اپنی پوشاک بیچ کر تلوار خریدے۔''(۱۹)

کہا جاتا ہے کہ اقتدار پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے بعد ایک روز کانسٹنٹائن کو آسمان پر ایک سرخ صلیب دکھائی دی جس پر لکھا تھا: ''اِس نشان کے صدقے تمھیں فتح نصیب ہو گی۔''(۲۰) صلیب کی اِس پکار کے بعد اُس نے اپنے ایک فرمان (Edict of Milan) کے ذریعے نہ صرف عیسائیت کو پوری سلطنت کا قانونی مذہب بنا دیا بلکہ اسی کے دورِ اقتدار میں

یہودیوں کو سخت ایذا و تعذیب کا نشانہ بنانے کی وہ خونی روایت شروع ہوئی، جس کا سلسلہ بعد کی کئی صدیوں تک جاری رہا۔(۲۱) برنارڈ لیوس جیسے پڑھے لکھے مستشرق سے یہ تاریخی حقائق مخفی نہیں ہو سکتے۔ اصل بات یہ ہے کہ الکفر ملة واحدہ کا ایک فرد ہوتے ہوئے اِن حقائق کو دیکھ کر بھی وہ منہ دوسری طرف پھیر لیتا ہے۔ اب یہ بات واضح ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ جیسی جامع الصفات شخصیت نے شعبہ سیاست کو مذہب و اخلاق سے کس لیے جدا نہیں کیا۔ بے شک آپ ﷺ کی ذاتِ بابرکات ہی زندگی کے جملہ شعبوں بشمول سیاست پوری انسانیت کے لیے رول ماڈل ہونے کا استحقاق رکھتی ہے۔

برنارڈ لیوس کے کام کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ نائن الیون کے بعد نظریہ ضرورت کے تحت اُسے اسلام کی کچھ تاریخی خوبیوں کا اعتراف کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اپنی کتاب Religion and the People میں وہ دعویٰ کرتا ہے کہ

> ''خود کش دھماکوں کی پھیلتی ہوئی تازہ لہر بیسویں صدی کی ایجاد ہے۔ اسلامی تاریخ میں اس کی کوئی مثال ہے نہ اسلامی دینیات میں اِس کا جواز موجود ہے۔''

اسی کتاب میں وہ ایک قدم اور آگے بڑھ کر تسلیم کرتا ہے:

> ''غیر مسلموں کے ساتھ اسلامی رواداری کی کوئی مثال سترہویں صدی میں رواج پانے والے سیکولرازم سے پہلے خود عیسائی تاریخ میں بھی نہیں ملتی۔''(۲۲)

زیرِ نظر کتاب The Crisis of Islam میں لیوس امام خمینی کے مشہور زمانہ فتوے کا ذکر بھی کرتا ہے۔ بقول لیوس ملعون سلمان رشدی کے خلاف امام خمینی کا فتویٰ خود کش قاتل کے نظریہ و عمل کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ اس فتوے کی تردید کے لیے لیوس اسلامی قانون کا سہارا لیتا ہے اور اُس کے قلم سے کچھ تعریفی کلمات صادر ہوئے ہیں:

> ''اسلامی فقہ ایک نظام قانون اور انصاف کا نام ہے نہ کہ سراسر دہشت کا۔ اس نظام میں وہ طریقہ کار طے کر دیا گیا ہے جس کے مطابق ملزم کے خلاف باقاعدہ مقدمہ

چلایا جاتا ہے۔ اُسے مدعی کے سامنے پیش کیا جاتا ہے اور اِسے اپنے دفاع کا موقع دیا جاتا ہے۔''(۲۳)

اِسی کتاب میں وہ بڑی فراخ دلی کے ساتھ اعتراف کرتا ہے:

''اسلام کا شمار دُنیا کے عظیم مذاہب میں ہوتا ہے۔ اسلام نے کئی بے بس اور بے روح زندگیوں کو وقار اور معانی سے آشنا کیا۔ اِس نے مختلف نسلوں اور مختلف عقائد کے لوگوں کو اخوت اور معقول رواداری کے ساتھ رہنا سکھایا۔ اس نے ایک عظیم تہذیب کو جلا بخشی جس میں مسلمانوں کے علاوہ دوسرے لوگ بھی تخلیقی لحاظ سے مفید زندگیاں گزار سکتے تھے۔ لیکن دوسرے مذاہب کی طرح اسلام میں ایسے ادوار بھی آئے ہیں جب اُس نے اپنے بعض پیروکاروں میں نفرت اور تشدد کو جنم دیا۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہمیں مسلم دُنیا کے ایک ایسے حصے سے سابقہ پڑا ہے جو (نفرت وتشدد کے) ایک ایسے دور سے گزر رہا ہے اور یہ کہ اِس نفرت کا بہت زیادہ رخ ہماری جانب ہے۔''(۲۴)

اس اقتباس میں مصنف نے اپنی جو اُلجھن بیان کی ہے وہ کچھ ایسی ہی ہے جیسے افغانستان پر کارپٹ بم باری اور عراق پر آہن و آتش کی بارش سے ان ملکوں کو کھنڈر بنا دینے اور اس سے قبل نہتے فلسطینیوں کی قیمت پر اسرائیل کی غیر مشروط مادی، اخلاقی اور سفارتی حمایت و تائید کے بعد سابق صدر امریکہ جارج بش نے امریکہ میں دانشوروں کی ایک کانفرنس اِس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے بلائی تھی کہ Why do they hate us۔ ''وہ (مسلمان) ہم سے نفرت کیوں کرتے ہیں؟'' سابق امریکی صدر کے بظاہر معصوم سے سوال اور برنارڈ لیوس کی سادہ سی اُلجھن کو ایک طرف رکھتے ہوئے لیوس کے لیے بہتر تھا کہ وہ ایک طرف عصر حاضر میں مسلم دُنیا میں مغرب کے خلاف بڑھتی ہوئی نفرت کے حقیقی اسباب کا کھوج لگاتا اور دوسری طرف ان مآخذ پر روشنی ڈالتا جو مسلمانوں کے ہاں ضرب المثل کی حد تک مشہور رواداری کے پیچھے موجود ہیں۔ ظاہر ہے اس

تاریخی رواداری کا تعلق کسی مسلمان حکمران کے انفرادی عمل سے تو ہرگز نہیں ہے۔ کسی بڑے سے بڑے مسلم حکمران کو بھی اسلام میں یہ حیثیت حاصل نہیں کہ وہ اُمت مسلمہ کے لیے مشعل راہ بن جائے۔ یہ مرتبہ ومقام تو صرف اور صرف پیغمبر اسلام ﷺ کو ہی حاصل ہے کہ ان کی ہر سنت مسلمان رعایا اور حکمران دونوں کے لیے واجب الاتباع ہے۔ لیوس اس حقیقت کا محض ایک سرسری ساذکر کر کے آگے بڑھ جاتا ہے۔

قریب ترین تاریخ کے ناقابل تردید حقائق کا انکار کرنے کا ہنر بھی لیوس خوب جانتا ہے۔ سوویت یونین کے انہدام کے ساتھ ہی امریکہ کے جنگ بازوں Hawks اور اُس کے پیشہ ور دانشوروں نے آیندہ ہدف کے لیے اسلام اور عالم اسلام کو اپنی ہٹ لسٹ پر رکھ لیا تھا۔ اب لیوس نے یہ انکشاف کیا ہے: ''کہ یہ مخالف اور خطرناک (مسلم) بنیاد پرستوں کی اکثریت ہے جنھیں کسی دشمن کی ضرورت ہے نہ کہ ''ہم'' جو کسی دشمن کی تلاش میں ہیں۔'' (۲۵)

کتاب کے صفحات (۲۵۔۴۰) میں اسلام کے تصورِ جہاد پر بھی طبع آزمائی کی گئی ہے۔ لیوس کے بقول ''پیغمبر اسلام ﷺ نے دُنیا سے تشریف لے جاتے وقت اُمت کے سپرد جو کام کیے ان میں سے ایک جہاد بھی ہے۔'' دوسرے کاموں کا تعلق عورتوں اور غلاموں کے حقوق کی ادائیگی اور باہمی خونریزی سے پرہیز کے ساتھ تھا۔ اِن کے ذکر سے دُنیا کو پیغمبر اسلام ﷺ کی انسانیت کے مظلوم اور مجبور طبقات کے ساتھ دلچسپی اور عملی ہمدردی کا علم ہوسکتا تھا۔ لہٰذا مصنف ان کے متعلق بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ مصنف کی تحقیق یہ ہے کہ مکی زندگی میں جہاد سے مراد اصلاح ذات اور اصلاح معاشرہ کے لیے اخلاقی تگ و دو تھی۔ مدنی دور میں غیر مبہم طور پر جہاد عسکری جدوجہد کے ہم معنی قرار پایا۔ بعض مسلم مفسرین کا حوالہ دیتے ہوئے وہ دفاعی جہاد اور اقدامی جہاد کا ذکر بھی کرتا ہے۔ یہاں پہلی بار ان احادیث کا حوالہ بھی دیا گیا ہے، جن میں جہاد کی ترغیب دی گئی ہے اور بڑی احتیاط کے ساتھ کسی ایسی حدیث کو پیش کرنے سے احتراز کیا گیا ہے جس میں جہاد سے ہر نوع کی قومی ونسلی عصبیت کو خارج کر دیا گیا ہے۔ بڑی ہوشیاری کے ساتھ قرآن کی اِس آیت جہاد کو

بھی مخالف مطلب سمجھ کر چھوڑ دیا گیا ہے جسے پڑھتے ہی کوئی بھی ذی ہوش انسان اور دردمند مسلمان یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آج کی صورت حال میں یہ حکم الٰہی کس قدر مناسب حال (Relevant) ہے:

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَ الْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُولُونَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ۝ (النساء:۷۵)

”آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں ان بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہ لڑو جو کمزور پا کر دبائے گئے ہیں اور فریاد کرتے ہیں کہ خدایا! ہم کو اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی و مددگار پیدا کر دے۔“

یہ آیہ مبارکہ اس باب میں بالکل واضح ہے کہ جہاد کا مقصد ہوسِ ملک گیری نہیں اور نہ کسی بھی درجے میں جبراً تبدیلی مذہب مقصود ہے۔ قرآن پاک نے لا اکراہ فی الدین (دین میں جبر نہیں) کہہ کر جہاد کے مقاصد کو اور بھی واضح کر دیا ہے۔ مصنف نے خود بھی اِس آیہ مبارکہ کا حوالہ دیا ہے۔(۲۶) جہاد کا مقصد تو کفر و شرک کی اس قوت و شوکت کو توڑنا ہے جس کے ساتھ کچھ عسکری قوتیں اسلام کی راہ میں معاند یا مزاحم کا کردار ادا کرتی ہیں۔ اسی طرح جہاد کے پورے عمل کے لیے متعین شرائط اور حدود و قیود ہیں اور یہ حدود و قیود فقہائے اسلام کی وضع کردہ نہیں۔ اِن کا منبع قرآن و سنت کی تعلیمات ہیں۔ اِن شرائط کو نظر انداز کرنے سے دینی جہاد محض ایک دُنیوی جنگ بن کر رہ جاتا ہے۔ لیوس ان شرائط سے بخوبی آگاہ ہے مگر اِن شرائط کی اہمیت کم کرنے کے لیے انھیں جنگ کے آغاز، جنگ کے اختتام، حالتِ جنگ میں مجاہد کے طرزِ عمل اور بعد از جنگ غیر محارب (Non combatants) و جنگی قیدیوں سے سلوک وغیرہ معاملات تک محدود سمجھتا ہے۔(۲۷)

کچھ آگے چل کر لیوس اظہار تاسف کرتا ہے:

''جہاد کا لفظ اپنا تقدس کھو بیٹھا ہے اور اب صرف عسکری معنوں (Military Connotation) میں استعمال ہوتا ہے۔ عہد حاضر میں کشمیر، چیچنیا، فلسطین اور دوسرے مقامات پر جو تنظیمیں جہاد کا لفظ استعمال کر رہی ہیں وہ اسے محض اخلاقی جدوجہد (Moral Striving) کے معنوں میں ہرگز استعمال نہیں کرتیں۔''(۲۸)

یہاں بجا طور پر سوال پوچھا جا سکتا ہے کہ جب کسی جگہ مظلوم یا محکوم لوگ سالہا سال سے ریاستی دہشت گردی کا نشانہ بن رہے ہوں اور دہشت گرد عالمی طاقتوں کی طرف سے مظلوم اور آزادی پسند عوام کے خلاف ظالموں کو جدید ترین ہتھیار اور خطیر سرمایہ بھی فراہم کیا جا رہا ہو۔ یہاں تک کہ ظالم قوتوں کے خلاف محض قراردادِ مذمت کو بھی انصاف کے عالمی اداروں میں بار بار ویٹو کر دیا جائے تو بے بس عوام کے پاس آخری چارہ کار کیا رہ جاتا ہے؟ ویسے کیوبا، نکاراگوا، ایلسلویڈار اور انگولا وغیرہ ممالک کو اِس ترقی یافتہ دور میں اخلاق و مروت کے وعظ نہیں سنائے گئے۔ ویت نامی عوام نے امریکہ کے خلاف کیا محض اخلاقی جدوجہد پر اکتفا کیا تھا؟ اور خود روسی جارحیت کے خلاف امریکہ نے افغان عوام کی کیا محض اخلاقی امداد کی تھی؟ اِس بحث کا ایک خوش آیند پہلو بھی ہے۔ صدیوں تک مستشرقین ایک ہی راگ الاپتے رہے ہیں کہ اسلام تلوار کے ذریعے پھیلا۔ اب نائن الیون کے بعد خودکش حملوں نے مغرب میں خوف و ہراس کی ایک فضا قائم کر رکھی ہے۔ مسلمان عوام کے خلاف غیر ملکی جارح افواج ہر جگہ بے شمار نفسیاتی مسائل سے دوچار ہیں۔ اب عالم اسلام کو یہ سبق پڑھایا جا رہا ہے کہ اسلام خودکش حملوں کے ذریعے نہیں بلکہ ایک ایسے مقدس جہاد کے ذریعے پھیلا ہے جس کی مخصوص شرائط اور طے شدہ اصول و قواعد ہیں۔ برنارڈ لیوس پورے یقین کے ساتھ کہتا ہے:

''اسلام کے بنیادی مآخذ میں کہیں دہشت گردی اور قتل کا حکم نہیں دیا گیا۔ جہاں تک مجھے علم ہے کہ کسی بھی جگہ اسلام میں جنگ سے غیر متعلق راہ چلتے لوگوں کے

اندھا دھند قتل عام کی بات نہیں کی گئی۔(۲۹)

خودکش بمباروں سے مصنف اس قدر پریشان ہے کہ وہ خودکشی کے خلاف بہت سی احادیث نبوی ﷺ کا حوالہ دینے کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ اِن احادیث میں بار بار اِس بات پر زور دیا گیا ہے کہ جو شخص جس طریقے سے بھی اپنے آپ کو قتل کرے گا، روزِ محشر اُسے اُسی طریقے سے سزا دی جائے گا۔ ایک حدیث قدسی بھی نقل کی گئی ہے جس کے مطابق جہاد کرتے ہوئے ایک شدید زخمی شخص کے لیے تکلیف ناقابل برداشت ہوگئی اور اُس نے خود ہی اپنی زندگی کا خاتمہ کر ڈالا۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ شخص شدید غضب کا مستحق ٹھہرا۔ اِسی طرح پیغمبر اسلام ﷺ نے اُس شخص کا جنازہ پڑھنے سے انکار کر دیا جس نے خودکشی کی تھی۔ اِس ساری بحث سے مصنف یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ خودکش حملے انسانیت اور تہذیب کے خلاف ہی جرائم کی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے بھی اُن کا شمار توہین اسلام کے زمرے میں آتا ہے کہ یہ لوگ ایسے جرائم اللہ، رسول اور اسلامی تعلیمات کے نام پر کرتے ہیں۔ مصنف نے اسی لیے اپنی کتاب کا ایک ذیلی عنوان Holy war and unholy terrorism رکھا ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

خودکشی کے خلاف لیوس کے ان ''اسلامی'' خیالات سے کسی قسم کے اختلاف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ویسے یہاں اگر کوئی صاحب لیوس سے یورپی استعمار اور امریکی سامراج کے انسانیت اور تہذیب کے خلاف جرائم سے متعلق سے کچھ پوچھنا چاہیں تو یہ اُن کی سادہ لوحی ہوگی۔ لیوس ایسی باتوں میں وقت ضائع کرنا پسند نہیں کرتا یا شاید انھیں جرائم ہی نہیں سمجھتا۔ اُس کے مخاطب صرف مسلمان ہیں۔ اسلام کے تصور جہاد پر بحث کرتے ہوئے مصنف نے اسلامی جہاد اور صلیبی جنگوں کا ایک دلچسپ مگر غیر حقیقی موازنہ بھی پیش کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

> ''اسلام اور عیسائیت کی طویل کشمکش کے دوران صلیبی جنگوں کا کردار بہت بعد میں اور وہ بھی ایک محدود عرصے کے لیے شامل ہوا جبکہ اسلامی تاریخ میں جہاد شروع سے ہی موجود ہے۔ اسے قرآن، سیرت رسول ﷺ، صحابہ کرام اور خلفائے

راشدین کے کردار میں دیکھا جا سکتا ہے..... عیسائی دُنیا میں اب یہ لفظ اپنے ابتدائی مفہوم کے بجائے کسی بھی بہتر مقصد کے حق میں چلائی جانے والی اخلاقی مہم کے معنوں میں مستعمل ہے۔ انسان اپنے ماحول کی بہتری، صاف پانی کے حصول، بہتر سماجی خدمات، عورتوں کے حقوق اور ایک وسیع تر دائرے میں صلیبی جنگ (Crusade) لڑ سکتا ہے۔ لفظ جہاد بھی مختلف مفاہیم میں استعمال ہوتا ہے لیکن صلیبی جنگ کے برعکس اب اس کا ابتدائی مفہوم ہی باقی رہ گیا ہے۔''(۳۰)

لیوس کے ان دعاوی میں دو بڑے فکری مغالطوں (Fallacies) سے کام لیا گیا ہے۔ ایک تو یہ کہ افغانستان پر فوجی حملہ کرتے وقت خود سابقہ صدر امریکہ جارج بش نے لفظ Crusade استعمال کیا تھا۔ بعد میں بعض مسلمان ممالک میں امریکہ کے کاسہ لیس اور اتحادی حکمرانوں کو عوامی غیظ وغضب سے بچانے کے لیے یہ لفظ واپس لے لیا گیا۔ البتہ دہشت گردی کے خلاف نام نہاد جنگ میں مذہبی اصطلاحات سے پورا کام لیا گیا۔ مخالف ملکوں کو ''بدی کے محور'' اور ''بدمعاش ریاستیں'' (Rogue States) قرار دینا اس جنگ کو مذہبی رنگ دینا نہیں تو اور کیا ہے؟ کانسٹنٹائن کی طرح خود سابق صدر امریکہ نے اپنی ایک ''اندرونی آواز'' (Inner Voice) کا ذکر کیا تھا جو دہشت گردی کے خلاف مقدس مشن کے لیے انھیں اُبھارتی رہتی ہے۔ دوسرا مغالطہ جہاد کے بارے میں لیوس کا تجاہلِ عارفانہ ہے۔ جہاد ایک جامع اصطلاح ہے۔ اس میں جنگ کے علاوہ دوسری سماجی خدمات بھی پہلے دن سے شامل ہیں۔ اسی لیے دشمن کے خلاف باقاعدہ جنگ کے لیے ''قتال'' کا لفظ بھی قرآن پاک میں استعمال ہوا۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ قتال تو جہاد ہے لیکن ہر جہاد قتال نہیں ہے۔ رسولِ عربی ﷺ کی تعلیمات کی روشنی میں آغاز سے ہی جہاد بالمال اور جہاد بالنفس کی اصطلاحات رائج رہی ہیں۔ اس بات پر اتفاق موجود ہے کہ اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے اخلاص کے ساتھ جو بھی علمی، سیاسی، اخلاقی یا معاشی جدوجہد کی جائے وہ بھی جہاد ہے۔

برنارڈ لیوس کو اس بات پر بہت تشویش ہے کہ اس گئے گزرے دور میں بھی مسلمان عوام پر

دین و ایمان کی گرفت بہت گہری ہے۔ ماضی قریب کی تاریخ سے مثالیں پیش کرتے ہوئے وہ صاف اقرار کرتا ہے کہ:

> ”انیسویں صدی کے نصف اوّل میں جب یورپی سلطنتیں عالم اسلام کے بہت سے علاقوں میں پیش قدمی کر رہی تھیں تو اُن کے راستے میں سب سے بڑی مزاحمت واضح طور پر اُن کا مذہبی جذبہ ہی تھا۔ فرانسیسیوں کو الجزائر میں، روس کو قازقستان میں اور انگریزوں کو ہندستان میں جن بڑی بغاوتوں کا سامنا کرنا پڑا وہ مذہبی نوعیت کی تھیں جن پر وہ (طاقتیں) بڑی طویل اور شدید جنگوں کے بعد قابو پانے میں کامیاب ہوئیں۔“ (۳۱)

اِس تجزیے میں نہ تو حالیہ تاریخ میں روس کے خلاف افغان عوام کی کامیاب دینی جدوجہد کا ذکر کیا گیا ہے اور نہ روسی انخلا کے بعد خود امریکی اور نیٹو افواج کے خلاف افغان عوام کی طویل اور جانگسل جدوجہد کا عکس نظر آتا ہے جس کے پیچھے بھی مضبوط مذہبی جذبہ ہی کارفرما ہے۔ اصل میں مصنف کا بین السطور پیغام یہ ہے کہ عالم اسلام میں مذہب کے خلاف جدیدیت پسندوں (Modernists) کو بہت سے مسائل کا سامنا ہے۔ بقول اُس کے سوائے ترکی کے عالم اسلام کے جدیدیت پسند ہر جگہ ناکام ہو رہے ہیں۔ چنانچہ امریکہ اور یورپ کے مقتدر حلقوں میں لیوس کی اِس سوچ کو پذیرائی مل رہی ہے کہ اسلام کے خلاف محض براہ راست جنگ خطرناک ہو گی اور تہذیبوں کے تصادم کے ساتھ ساتھ اب گویا (اسلامی) تہذیب کے اندر تصادم (Clash within civilazation) کی بات بھی ہونی چاہیے۔ اِس باب میں راہنمائی کے لیے لیوس کے ہاں اسلام کی مختلف تعبیریں یعنی روایتی (dogmatic) اسلام، ماڈرن یا سیکولر اسلام، صوفیانہ (mystic) اسلام اور جہادی یا وہابی اسلام کی اصطلاحیں عام ملتی ہیں۔ اُس کے نزدیک جہادی اسلام کے خلاف بقیہ ٹائپ کے مسلمانوں کو صف آرا کرنا ایک بہترین حکمت عملی ہو سکتی ہے۔

لیوس اِس امر کی ایک اور نمایندہ مثال ہے کہ استعمار اور استشراق عام طور پر قدم سے قدم ملا

کر چلتے ہیں۔قاہرہ کے Elite Studies Centre کے سربراہ احمد فودہ لکھتے ہیں:

''۸۰ کی دہائی کے آغاز میں امریکی وزاتِ دفاع پنٹاگان نے معروف صہیونی دانشور لیوس کو یہ ذمہ داری سونپی تھی کی عالم اسلام کو مزید ٹکڑے کرنے کے لیے وہ ایک جامع منصوبے پیش کرے۔اُس نے ایک ایسا مسودہ تیار کیا جسے امریکی کانگریس نے ۱۹۸۳ء میں اپنے ایک خفیہ اجلاس کے دوران منظور کیا اور اُسی وقت سے اس پر عمل درآمد شروع ہے۔''(۳۲)

اب یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ عراق پر امریکی جارحیت کے پیچھے جو دماغ کام کر رہے تھے اُن میں لیوس بھی شامل رہا ہے۔اُس کا نظریہ تھا کہ عراق کو زیروزبر کرنے کے بعد پورا مشرق وسطی جدیدیت کی راہ پر چل پڑے گا۔یہی وجہ ہے کہ خالص علمی حلقوں میں لیوس کی ساکھ بڑی طرح متاثر ہو رہی ہے۔ایڈورڈ سعید نے تو اُسے تحریکِ استشراق کا محض فیض یافتہ Beneficiary کہا تھا۔لیکن جب سابق صدرِ امریکہ جارج بش نے اُس کی ''خدمات'' کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے ہاتھوں سے اُسے National Humanities Medal دیا تو امریکی آرمینین کمیٹی نے لیوس کو تنخواہ دار ملازم Mercenary کے لقب سے پکارا اور اِس اقدام کو اعزاز کی توہین قرار دیا۔ امریکی مؤرخ جوئیل بینن (Joel Beinin) نے صاف کہا کہ برنارڈ لیوس شمالی امریکہ میں صہیونیت (Zionism) کا سب سے منضبط اور پڑھا لکھا وکیل ہے۔

لیوس کے بارے میں امریکہ کے مقتدر حلقوں اور وہاں کے خالص علمی حلقوں کی متضاد سوچ کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ موجود ہے کہ اُس کا پھیلایا ہوا پروپیگنڈا بدستور اپنا کام کر رہا ہے۔عالم اسلام میں جن چار مختلف مکاتب فکر کی اُس نے نشاندہی کی تھی، امریکی حکومت کی سرپرستی میں شائع ہونے والی مشہور رپورٹ Building Moderate Muslim Networks میں اُس کی روح پوری طرح بول رہی ہے۔ ۲۰۰۶ء میں شائع ہونے والی اِس رپورٹ میں بھی مسلمانوں کو سیکولر و لبرل مسلمان، معتدل مسلمان، روایتی اور تصوف کے قائل مسلمان اور وہابی، جہادی یا انتہا پسند مسلمانوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔رپورٹ کے مطابق عالم اسلام میں انتہا پسند مسلمانوں کے خلاف

مغرب کے پروردہ ماڈرن یا ماڈریٹ مسلمانوں کی سرکردگی میں باقی مسلمانوں کا وسیع تر اتحاد وقت کی اصل ضرورت ہے۔

رپورٹ میں یہ دلچسپ انتباہ بھی کیا گیا ہے کہ ماضی میں ہم جن افراد اور انجمنوں کو معتدل سمجھ کر اُن کی سرپرستی کرتے رہے ہیں، وہ بھی بالآخر نیم معتدل (Pseudo Moderate) نکلے۔ ڈنمارک میں شائع ہونے والے پیغمبر اسلام ﷺ کے بارے میں توہین آمیز کارٹونوں کے خلاف جو شدید احتجاج ہوا اور جس نے بڑھتے بڑھتے ایک بین الاقوامی طوفان کی شکل اختیار کر لی اُس کے پیچھے ڈنمارک کی مساجد کے وہ امام ہی تھے جن کو یہاں اعتدال پسند سمجھا جاتا تھا اور اِس حیثیت سے وہ بہت ساری سرکاری مراعات سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔(۴۳) ایک سادہ سی بات جو اِس رپورٹ کے مرتبین اور خود برنارڈ لیوس نہیں سمجھ پائے، وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے مذکورہ گروہوں کے گویا ساز تو مختلف ہو سکتے ہیں لیکن اُن کا نغمہ ایک ہی ہے اور یہ نغمہ عقیدۂ توحید اور حب رسول ﷺ کے علاوہ کچھ نہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جہاں بھی مسلمان عوام کو اپنی آزادانہ رائے کے اظہار کا موقع ملا تو انھوں نے بے جان مذہبیت کے ساتھ نام نہاد ترقی پسندی کو بھی مسترد کر دیا۔ برنارڈ لیوس جدید ''ترکی'' کو تمام مسلمان ممالک کے لیے رول ماڈل کے طور پر دیکھتا ہے وہ اس بات پر پھولا نہیں سماتا کہ ''ترکی کے مصطفےٰ کمال پاشا نے خلافت کی قبا چاک کی تو اس اقدام سے ''اُمت'' کے سیاسی تصور اور اُس کے تاریخی تسلسل کا بھی خاتمہ ہو گیا اور رہی (آفاقی) امت آگے چل کر بہت سی جدید ریاستوں میں بٹ گئی۔''(۴۴) نصف صدی سے بھی زیادہ عرصہ پر محیط جہد مسلسل کے بعد ترکوں کے اسلامی شعور نے بھرپور انگڑائی لی اور آج سیکولر ترکی میں دینی عناصر پھر برسرِ اقتدار ہیں اور سیکولر حضرات اپنی بقا کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ یہ وہ چیلنج ہے جو عالم اسلام میں خود جدیدیت کو درپیش ہے۔ اِس لیے ہماری نظر میں لیوس کی کتاب کا مناسب اور بہتر عنوان ''اسلام میں جدیدیت کو درپیش چیلنج'' (Crisis for Modernism in Islam) ہونا چاہیے تھا۔

مراجع وحواشی

۱۔ برنارڈ لیوس...... Muslim Discovery of Europe. (1982)

۲۔ برنارڈ لیوس/ بی ایلس چرچل...... Religion and the People

Whaston School Publishing. (2008)

۳۔ سٹینلے لین پول...... Saladin and the Fall of the Kingdom of Jerusalem

۴۔ لیوس لکھتا ہے۔

"This might well be deemed an appropriate date for the apocalyptic ending of Israial, and if necessary, of the world." (Wall Street Journal, August 6, 2006)

۵۔ برنارڈ لیوس...... Arabs in History

Muhammad and the Rise of Islam:Chapter-2

Hutchinson University Press (1964)

۶۔ ایضاً

۷۔ ایضاً

۸۔ برنارڈ لیوس...... The Crisis of Islam

Weidenfeld and Nicolson,(2003)

Introducation xxvi

۹۔ ایضاً xxvii

۱۰۔ افغان مجاہدین نے پہلے برطانیوی سامراج کو اپنی سرزمین سے نکالا تھا۔ اپنی تاریخی روایات کے عین مطابق جب انھوں نے اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر روسی سامراج کو وطن عزیز سے نکالنے کے لیے جہاد شروع کیا تو پھر امریکہ بہادر بھی ویت نام کی تاریخی شکست کا بدلہ لینے کے لیے میدانِ جنگ میں کود پڑا۔'' افغان

حریت پسندوں کی حمایت'' کی آڑ میں اپنے روسی حریف کو نیچا دکھانے کے لیے اُس نے اپنے عسکری اور مالی وسائل جھونک دیے۔ تفصیل کے لیے جمی کارٹر سابق صدرِ امریکہ کے مشیر قومی سلامتی امور Zbigniew Brezizinski (۱۹۷۷ء۔۱۹۸۱ء) کی کتاب The Grand Chessboard کا مطالعہ مفید رہے گا۔

۱۱۔ برنارڈ لیوس...... The Crisis of Islam
...... ۴

۱۲۔ ایضاً

۱۳۔ ایضاً...... ۵

برنارڈ لیوس لکھتا ہے۔

For centuries Christianity grew and developed as a religion of the downtrodden, until with the conversion to Christianity of the emperor Constantine, Caesar himself became a Christian and inaugurated a series of changes by which the new faith captured the Roman Empire and transformed its civilization. The Founder of Islam was his own Constantine, and founded his own state and empire. He did not therefore create -- or need to create -- a church. The dichotomy of regnum and sacerdotium, so crucial in the history of Western Christendom, had no equivalent in Islam. During Muhammad's lifetime, the Muslims became at once a political and a religious community, with the Prophet as head of state. As such, he governed a place and a peoples, dispensed justice, collected taxes, commanded armies, waged war and made peace.

۱۴۔ عہد نامہ قدیم...... استثنا...... باب ۲۰ (۱۷۔۱۸)

۱۵۔ مائیکل ایچ ہارٹ...... The 100

۱۶۔ ڈاکٹر نصیر احمد ناصر...... سرگذشتِ فلسفہ حصہ اوّل

۱۷۔ مائیکل ایچ ہارٹ...... The 100

۱۸۔ بائبل......متی......باب ۱۰(۳۴۔۳۹)

۱۹۔ بائبل......لوقا......باب ۲۲(۳۶)

۲۰۔ مائیکل ایچ ہارٹ......The 100

۲۱۔ ایضاً

۲۲۔ برنارڈ لیوس/ پی ایلس چرچل......Religion and the People

۲۳۔ برنارڈ لیوس......The Crisis of Islam
......۱۲۰

۲۴۔ ایضاً

Islam is one of the world's great religions. It has given dignity and meaning to drab and impoverished lives. It has taught men of different races to live in brotherhood and peoples of different creeds to live side by side in reasonable tolerance. It inspired a great civilization in which others besides Muslims lived creative ant useful lives and which by its achievement, enriched the whole world. But Islam, like other religions, has also known periods when it inspired in some of its followers a mood of hatred and violence. It is our misfortune that we have to confront part of the Muslim world while it is going through such a period, and when most--though by no means all--of that hatred is directed against us.(p21-22)

۲۵۔ ایضاً......۲۴

۲۶۔ ایضاً......۳۸تا۳۹

۲۷۔ ایضاً......۲۸

۲۸۔ ایضاً......۳۱

۲۹۔ ایضاً......۳۴

۳۰۔ ایضاً......۳۲

۳۱۔ ایضاً......۱۲۷

۳۲۔ ماہنامہ ترجمان القرآن مارچ ۲۰۱۲ء (اخبار امت از عبدالغفار عزیز)

۳۳۔ Building Moderate Muslim Networks

Rand-Centre for Middle East Public Policy

۳۴۔ برنارڈ لیوس...... Modern Turkey

Oxford University Press. (1961)

حرفِ آخر

اس کتاب کے (حصہ سوم) کے پہلے مضمون ورفعنا لك ذكرك میں ایک آفاقی حقیقت کا اجمالاً ذکر کیا گیا تھا۔ یعنی یہ کہ نبی اللہ تعالیٰ کا مقرب خاص اور بندوں کی طرف اس کا نمایندہ خصوصی ہوتا ہے۔ نبی کے خلاف کسی قسم کی دریدہ دہنی دراصل اللہ تعالیٰ کے خلاف کھلی بغاوت کا درجہ رکھتی ہے۔ ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ کی تخلیق کردہ کائناتی قوتیں بھی اللہ کے رسول کی حمایت میں اپنا رول ادا کرتی ہیں۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی نافرمان قوم کے لیے پانی کا ایک ایک قطرہ مل کر اللہ تعالیٰ کا سپاہی بن گیا، جس نے ایک زبردست طوفان کی شکل میں منکرین کو تہ و بالا کر ڈالا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے نمرود کا تیار کردہ آتش کدہ گل وگلزار بن گیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعونِ مصر کے مظالم سے نجات دلانے کے لیے بنی اسرائیل کو لے کر چلے تو بپھرے ہوئے بحیرۂ قلزم نے دو حصوں میں بٹ کر ان کو راستہ دے دیا۔ قومِ ثمود کو ایک ہی کڑک نے تباہ و برباد کر دیا، قومِ عاد پر اللہ تعالیٰ نے آندھی بھیج کر اسے صفحۂ ہستی سے مٹا دیا۔

حضور نبی اکرم ﷺ کے بارے میں بھی اہل دنیا نے اس سنت الٰہی کا مختلف مواقع پر مشاہدہ کیا۔ اس حقیقت کا ایک مظہر شعب ابی طالب ہے۔ سردارانِ مکہ نے تین سال تک خاندان بنوہاشم کو ایک گھاٹی میں محصور رکھا۔ اس عرصے میں رسول اللہ ﷺ اور آپ کے جملہ متعلقین سے ہر قسم کا لین دین ممنوع تھا۔ بالآخر سماجی و اقتصادی بائیکاٹ کے لیے جو دستاویز خانہ کعبہ میں اطلاع عام و خاص کے لیے لٹکائی گئی تھی، اسے دیمک نے چاٹ لیا۔ کچھ غیر جانبدار لوگوں نے سردارانِ قریش کو شرم دلائی اور ایسے ہی لوگوں کی مداخلت سے یہ بائیکاٹ ختم ہوا۔ طائف کے پرصعوبت سفر کے بعد اللہ تعالیٰ نے نخلہ کے مقام پر جنوں کی ایک جماعت بھیج دی۔ انھوں نے قرآن سنا اور رسول اللہ ﷺ پر ایمان لے آئے۔ سفرِ ہجرت میں حضور ﷺ اپنے معتمد خاص سیدنا حضرت ابوبکر

صدیقؓ کے ساتھ غارِ ثور میں تین روز تک مقیم رہے۔ کفارِ مکہ نے آپ ﷺ کی تلاش میں بہت سے مہم جو روانہ کیے۔ بعض ایسے ہی لوگ انعام کے لالچ میں غار تک پہنچ گئے۔ غار کے دہانے پر مکڑی نے جالا بن دیا تھا۔ تعاقب کرنے والوں نے گمان کیا کہ ایسی صورت میں کسی متنفس کا یہاں قیام خارج از امکان ہے اور پھر اسی بدیہی حقیقت کا مشاہدہ دنیا نے جنگِ احزاب کے موقع پر بھی کیا۔ قریش مکہ قبائل عرب کے دس ہزار سورماؤں کو مدینہ کی نوزائیدہ ریاست پر چڑھا لائے تھے۔ اپنے سامنے ایک طویل و عریض خندق کو دیکھ کر وہ لوگ ہکا بکا رہ گئے۔ اس کے باوجود قسمت آزمائی کے لیے کم از کم پچیس روز تک وہ لوگ مدینہ منورہ کا محاصرہ کیے بیٹھے رہے۔ اس عرصے میں یہودیوں کی بدعہدی اور منافقین کی سازش کو دیکھ کر بعض کمزور دل مسلمان بھی شدید قسم کا عدم تحفظ محسوس کرنے لگے۔ قرآن حکیم نے اس کیفیت کو باین الفاظ پیش کیا ہے۔ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ (الاحزاب:۱۰) "جب خوف کے مارے آنکھیں پتھرا گئیں، کلیجے منہ کو آ گئے۔" یہ ایک اور موقع تھا جب رسول اللہ ﷺ کے حق میں رحمت الٰہی جوش میں آئی۔ زبردست طوفانِ باد و باراں کے ساتھ دشمنانِ رسالت کے خیمے اکھڑ گئے۔ کھانے کی دیگیں الٹ گئیں اور انتہائی بھگدڑ کے عالم میں انھوں نے مکہ کی راہ لی۔ ان حقائق کے بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ دشمنانِ رسالت ﷺ کو ذلیل و رسوا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے کبھی دیمک، کبھی مکڑی اور کبھی بارش اور طوفان سے بھی تحفظِ رسالت کا کام لیا۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ بھی ہے۔ یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰہِ بِاَفْوَاھِھِمْ وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ۝ (الصف:۸)

ظاہر ہے اس سارے عمل میں رسول اللہ ﷺ کے نام لیواؤں کی ذمہ داری اپنی جگہ قائم رہتی ہے۔ ہر نیا چیلنج ایک نئی ذمہ داری کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس وقت بھی جب دنیائے کفر و شرک مختلف حیلوں اور حربوں سے پیغمبر اعظم و آخر ﷺ کی اہانت پر تلی ہوئی ہے، شمع رسالت کے پروانوں کو خود ایک کائناتی قوت بن کر ورفعنا لك ذكرك کے تقاضے کو پورا کرنا ہے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے ایک سہ عملی سٹریٹیجی ضروری ہے۔

پہلے قدم کے طور پر دنیا کی مختلف زبانوں میں سیرت پاک پر جو منتشر کام ہو رہا ہے، اس کے دائرے کو وسیع تر کرنے کی ضرورت ہے اور اسے مربوط و منظم کرنا بھی ضروری ہے۔ یہ بات بھی

واضح رہنی چاہیے کہ علم و تحقیق کی اس مہم کا انداز مدافعانہ نہیں، پیش قدمی کا سا ہونا چاہیے۔ آنے والا ہر لمحہ اور وقت کی ہر کروٹ ثابت کرنے جا رہی ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ محض اپنے دور کے کوئی سماجی و اقتصادی مصلح نہیں، ہر دور اور ہر قوم کے لیے سالارِ انسانیت ہیں۔ اس پہلو سے جدید تقاضوں کی روشنی میں خصوصی تحقیق و تفحص عالم اسلام کے دانشوروں کا اصل ہدف ہونا چاہیے۔ عالم عرب اور برصغیر میں اس سلسلے میں کچھ کام ہوا ہے لیکن کمیت اور کیفیت کے لحاظ سے بجا طور پر بہت سے تحفظات موجود ہیں۔ بنیادی طور پر یہ حکومتوں کے کرنے کا کام ہے۔ بدقسمتی سے عالم اسلام میں قائم حکومتوں کی ترجیحات (الا ماشاء اللہ) مختلف بلکہ برعکس قسم کی ہیں۔ اس لیے اب عالم اسلام کے اصحاب ِخیر و اہلِ ثروت کو بھی سامنے آنا ہو گا۔ اس مقصد کے لیے اُسی سطح کے وسائل پیدا (Generate) کرنا ہوں گے جیسے زلزلہ، سیلاب یا سونامی جیسی زمینی و آسمانی آفات کے مقابلے کے لیے کیے جاتے ہیں۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ سیرت اور میلاد کی محفلیں جو ہر سال منعقد ہوتی ہیں، اُن میں منتظمین کے تعاون سے مواد اور پیش کش کے مواد پر خصوصی توجہ دی جائے۔ یہ محافل ابلاغ کا ایک نہایت موثر موقع فراہم کرتی ہیں۔ دنیا میں کوئی دوسری قوم ایسی نہیں ہے جس کے ہاں دن میں پانچ بار نمازوں اور ہفتہ میں ایک دن جمعۃ المبارک کے موقع پر مذہبی رہنماؤں کا عوام سے مسلسل رابطہ رہتا ہو۔ عیدین اور محافل سیرت و میلاد النبی ﷺ اس پر مستزاد ہیں۔ کوئی اور قوم بھی ایسی نہ ملے گی جو ان سنہری مواقع کو ایسی بیدردی سے ضائع کرنا جانتی ہو۔ بدقسمتی سے ایسے موقعوں پر بھی کم علم اور بے عمل مذہبی پیشوا انتہائی ضعیف بلکہ موضوع روایات کو اپنے بے ربط خطبات کی زینت بناتے ہیں۔ یہ لوگ سیرت کے آفاقی اور عالمی پیغام کو مسلکی اور فقہی تنگنائے میں محدود کر کے اقبال کے الفاظ میں گویا ایک دریائے تند و تیز کو جوئے کم آب میں بدل ڈالتے ہیں۔ اسلام کے یہ نادان دوست اپنے اپنے حلقوں میں رسالت مآب ﷺ اور آپ ﷺ کے عالمگیر پیغام کی صحیح تفہیم اور مناسب تبلیغ و اشاعت میں بذاتِ خود ایک بہت بڑی رکاوٹ بن رہے ہیں۔ ایک عام مشاہدہ ہے کہ مغربی ممالک میں بھی اسلام اپنے زور سے ایک قدم آگے بڑھتا ہے تو وہاں پر موجود پیرانِ حرم کی کم نگاہی کے سبب اسی اسلام کو دو قدم پیچھے ہٹنا پڑتا ہے۔ المیہ یہ ہے کہ بین المذاہب ہم آہنگی

(Interfaith Harmony) کے علمبردار مسلمان خود منتشر اور پراگندہ ہیں۔ انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت اپنی کارفرمائی کے لیے کسی خاص قوم کی محتاج نہیں ہے۔ اہلِ حرم اپنی کم نصیبی اور سیاہ بختی کا ماتم کرنے کے لیے باقی رہ جاتے ہیں اور کعبہ کو صنم خانے سے بھی نئے پاسبان مل جاتے ہیں۔ لہٰذا جس طرح عالم کفر و شرک کو درست انداز سے کردارِ مصطفے ﷺ اور پیغام مصطفیٰ ﷺ سے روشناس کرانا وقت کا اہم تقاضا ہے، بالکل اُسی طرح دورِ حاضر کے مسلمانوں کے اندر بھی اس پہلو سے بہت بڑے فکری و عملی انقلاب کی اشد ضرورت ہے۔

مذکورہ اقدامات اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ کسی نہ کسی ملک میں عملی طور پر وہ معاشرہ تشکیل پا جائے جو قرآن و سنت کی تعلیمات پر مبنی ہو۔ ایک ایسا معاشرہ جہاں بلاتمیز جنس و مذہب ہر فرد کو بنیادی حقوق میسر ہوں، انصاف دہلیز پر ملے، معاشی آسودگی کے ساتھ ذہنی سکون کی دولت حاصل ہو، قانون کی حاکمیت، عدل اجتماعی، توقیرِ مزدور اور حرمتِ نسواں جیسی اقدار کا دور دورہ ہو۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تبلیغ و تلقین کے ساتھ ساتھ مسلسل اجتماعی جدوجہد سے عملاً وہ معاشرہ قائم کر کے دکھایا جہاں اسلامی نظام کی برکات کا براہِ راست مشاہدہ کیا جا سکتا تھا۔ ظاہر ہے اسلام کسی فلسفیانہ نظریے یا محض اخلاقی تلقین کا نام نہیں۔ ایسا ہوتا تو بدر و اُحد اور حنین کے معرکوں کی ضرورت ہوتی نہ شعب ابی طالب اور سفرِ طائف کے مصائب ہوتے۔ ویسے بھی آخرت کے ساتھ ساتھ دنیا کی بھلائیوں کو سمیٹنا ہی ایک صحیح اسلامی زندگی کا مقصود و منتہیٰ ہے۔ چنانچہ تیسرا نکتہ یہ ہے کہ قرآن و سنت کی بنیاد پر وہ معاشرہ کہیں نہ کہیں برپا کرنے کی کوشش کی جائے جہاں متلاشیانِ حق کو سیرت النبی ﷺ کی برکات و حسنات کا عینی مشاہدہ کرایا جا سکے۔ دیکھنے والی آنکھیں اور سننے والے کان ہوں تو عصر حاضر کا انسان محبانِ رسول سے سوال کرتا ہے:

کون سی وادی میں ہے، کون سی منزل میں ہے
عشقِ بلا خیز کا قافلۂ سخت جاں

اشاریہ

[رجال]

---۞۞۞---

[کتب]

اردو

- تمدن عرب: ۴۸
- تفہیمات (سوم): ۲۴۳، ۳۰۶
- تفہیم القرآن (جلد دوم): ۴۸
- تفہیم القرآن (جلد سوم): ۹۶، ۱۶۱، ۲۴۵
- تفہیم القرآن (چہارم): ۱۶۰
- تفہیم القرآن (پنجم): ۲۶۷
- تفہیم القرآن (ششم): ۳۰۵
- جادہ و منزل: ۹۶
- جنسی زندگی: اسلام اور جدید سائنس: ۲۱۳
- جنسیاتی مطالعے: ۳۰۵
- حدیث اور علم النفس: ۲۱۳
- حدیثِ دفاع: ۳۱۳
- حضرت عمر فاروق: ۹۷
- حیاتِ محمدؐ (۱۹۹۰ء): ۳۹۱، ۳۹۲
- خاتونِ اسلام: ۳۰۵
- خطبات بہاولپور (حمید اللہ): ۴۶، ۲۴۶
- خطبات ڈاکٹر ذاکر نائک: ۲۶۷، ۳۰۶
- دین میں ترجیحات: ۱۶۲
- رسولؐ اللہ کی حکمرانی و جانشینی: ۹۷
- رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی: ۹۸
- رسول اکرمؐ کے آزمودہ طبی نسخے اور جدید سائنس: ۲۶۸
- زاد المعاد: ۱۶۰
- سالانہ رپورٹ: (اسلامی نظریاتی کونسل، اسلام آباد ۹۱-۱۹۹۲ء): ۲۴۵
- سالانہ رپورٹ: (اسلامی نظریاتی کونسل، اسلام آباد ۹۲-۱۹۹۳ء): ۲۴۵، ۳۰۶
- سرگذشت فلسفہ (حصہ دوم): ۴۶، ۲۱۲، ۴۶۴
- سقراط: ۴۶
- سنن ابی داؤد: ۱۶۱
- سنن نسائی: ۹۷
- سید الوریٰ (جلد اول): ۲۱۳، ۳۰۶
- سیرت ابن اسحاق: ۹۸، ۱۶۱، ۲۶۷
- سیرت ابن ہشام: ۴۸، ۹۷، ۹۹
- سیرت المصطفیٰ (جلد اول): ۴۸، ۱۶۱
- سیرت النبیؐ (جلد اول): ۲۱۱
- سیرت النبیؐ (جلد دوم): ۱۵۹
- سیرت سرور عالمؐ (جلد اول): ۴۶
- سیرت عائشہؓ: ۲۱۲
- شانتی ولو بھدریکا آریادات: ۴۶

- مقدمہ ابن خلدون: ۱۶۱، ۳۹۱
- منصفانہ اجرت کا اسلامی تصور: ۱۶۲
- نبی کریم کی معاشی زندگی: ۱۶۰
- نگارشات ڈاکٹر محمد حمید اللہ (حصہ دوم): ۴۶، ۱۶۰
- ہم کیوں مسلمان ہوئے؟: ۳۵۴

رسائل و جرائد

- ماہنامہ افکار معلم، لاہور، جون، اگست ۲۰۰۵ء: ۲۶۷، ۳۴۳
- ماہنامہ چراغِ راہ (اسلامی قانون نمبر): ۲۴۳، ۲۴۶
- ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ (رسول نمبر): ۹۷
- ماہنامہ عالمی ترجمان القرآن (جولائی ۲۰۰۸ء): ۳۴۴
- ماہنامہ عالمی ترجمان القرآن (فروری ۲۰۱۱ء): ۳۳۴
- ماہنامہ عالمی ترجمان القرآن (مارچ ۲۰۱۲ء): ۴۳۶
- ماہنامہ معارف (اسلام اور مستشرقین نمبر): ۳۹۰، ۳۹۱
- مجلہ تحقیق معاشرتی علوم (۲۰۱۰ء): ۱۶۲
- مجلہ نقوش (رسول نمبر): ۲۴۳، ۳۴۳
- روزنامہ ایکسپریس ۲۴ جون ۲۰۰۵ء: ۴۷

عربی کتب

- احکام القرآن (جصاص): ۱۶۰
- الاستیعاب: ۹۷
- الاصابۃ فی تمیز الصحابۃ: ۹۶، ۱۵۹
- الاعلام الموقعین: ۲۱۲
- البدایۃ والنہایۃ (ششم): ۴۸، ۱۶۱
- التشریع الجنائی: ۲۴۳
- الرسول القائد: ۲۳۱
- السیر الکبیر: ۲۴۶
- المراۃ بین الفقہ والقانون: ۳۰۶
- المنقذ من الضلال: ۴۶
- الموافقات فی اصول الشریعۃ (جلد دوم): ۲۴۵
- تاریخ الکبیر: ۲۶۷
- تفسیر المنار: ۳۰۶
- حرکۃ الردہ: ۲۱۲
- زاد المعاد: ۹۷
- طبقات ابن سعد: ۹۷
- فیض الباری: ۳۰۶
- کامل التفسیر: ۲۱۲

English Books

[اماکن]

ح

خ

ڈ

ر

س

ش

ص

ط

ظ

ع

غ

ف

---✿✿✿---

ISBN:978-969-9037-03-0

ادارہ معارف اسلامی کی علمی و تحقیقی کتب

مصنف کے قلم سے